ہستی کا آہنگ
ثمرہ بخاری

ہستی کا آہنگ

ثمرہ بخاری

خواتین ڈائجسٹ
37۔ اُردو بازار، کراچی

1 -	ہستی کا آہنگ	5
2 -	ہم آوارگانِ شوق	59
3 -	لاؤ اپنے حسن کی ناؤ	97
4 -	گھر تتلی کا پر	131
5 -	رہ گزارِ زیست	183
6 -	روایت	227
7 -	یہ حادثاتِ محبت	247

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل 2013

ناشرین .... خواتین ڈائجسٹ

پریس .... پرنٹ لائن

قیمت .... روپے

سول ایجنٹ:

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار کراچی

انتساب

اپنے خوابوں کو راکھ ہوتے
دیکھنے والوں کے نام

پیش لفظ

زندگی کتنا خوب صورت لفظ ہے۔ دعا کے لیے جب ہاتھ اٹھتے ہیں، پہلی دعا اپنے پیاروں کی زندگی کے لیے مانگی جاتی ہے۔

مگر وہ جن کی زندگی آزمائش سے کم نہیں، ہر صبح رات سے زیادہ تاریک ہے۔ یہ تاریکی عفریت کی طرح ہر خوشی کو نگل رہی ہے۔

گھٹاٹوپ اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہ دے۔

آرزو کی کرن اس ہیبت ناک تاریکی کو مٹانے میں ناکام ہے۔

اندھیرے میں آنکھ اندھی ہے، ذہن جاگ رہا ہے۔ خیالات کی رو چل رہی ہے۔ اندھیرا یادوں کو جنم دیتا ہے، کہانیاں یاد آتی ہیں، کہانیاں بنتی چلی جاتی ہیں۔

روتے، سسکتے اپنے خوابوں کی راکھ پر بیٹھے بہت سے وجود ایک ساتھ بول رہے ہیں اور وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے سیاہی کی چادر کو برید کر دیا ہے اور روشنی کو پالیا ہے۔

یہ سب اپنی اپنی بپتا کہتے ہیں، ہے کوئی سننے والا؟ اگر ہے، تو سنیے، صفحے پلٹتے جائیں۔ ہر صفحے پر ایک بپتا ہے۔ دیکھیے آپ کی کہانی کون سی ہے۔

ثمرہ بخاری

ہستی کا آہنگ

”ابّا میری دوست کی برتھ ڈے ہے، مجھے بھی انوائٹ کیا ہے اس نے، اگر آپ اجازت دیں تو چلی جاؤں؟“ رات کے کھانے پر جب یہ چھوٹا سا خاندان اکٹھا بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا تھا۔

ابا جواب دینے کے بجائے امی کی طرف دیکھنے لگے۔ ”میں جانتی ہوں رعنا کی اس دوست کو۔ اچھی لڑکی ہے، ایک، دو بار اپنی والدہ کے ساتھ ہمارے گھر آچکی ہے اور ان کا گھر بھی ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔“ امی نے تفصیلی جواب دیا۔

”بیٹا! جب آپ کی امی کو کوئی اعتراض نہیں تو مجھے کیسے ہوسکتا ہے۔“

وہ مسکرا کر بولے اور پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوگئے، آج امی نے کوفتے بنائے تھے، یعنی سب ہی کی پسندیدہ ڈش، سب ہی تعریفیں کرتے ہوئے کھا رہے تھے۔

”لیکن ابا! ایک مسئلہ اور بھی تو ہے نا۔“

”یقیناً گفٹ کے لیے پیسے چاہیے ہوں گے۔“

”جی ابا!“ وہ کھسیا کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”تو بیٹا! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ شکر ہے تمہاری فرینڈ مہینے کی شروع تاریخ میں پیدا ہوئی ہے، کتنے پیسے چاہئیں تمہیں؟“

”ابا! میں اور میری فرینڈ ثانیہ مل کر گفٹ دیں گے، اس لیے دو سو دے دیجیے۔“

کھانے کے بعد اس نے برتن سمیٹے اور کچن میں آکر دھونے لگی، ساتھ ہی چائے بھی چولہے پر رکھ دی کہ امی اور ابّا رات کو کھانے کے بعد چائے ضرور لیتے تھے۔

دونیہ اور چھوٹا ظفر صحن میں جا کر کھیلنے لگے۔ موسم بدل رہا تھا۔ اب پہلے کی طرح گرمی نہیں رہی تھی اور شامیں تو بہت خوش گوار ہوگئی تھیں۔ امی، ابا بھی چھوٹے سے آنگن میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ وہ

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PAKISTANIPOINT

دونوں کے لیے چائے لے کر آئی، ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھی اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

''رعنا بیٹا! میں اور تمہاری امی ابھی بات کر رہے تھے موسم بدل رہا ہے، اگر ایک بارش ہوگئی تو سردی اچانک آجائے گی۔ کسی روز بازار چلتے ہیں۔ کچھ سردیوں کے کپڑوں کی شاپنگ ہی کر لیں۔''

''آپ اور امی چلے جائیں نا! مجھے بازار کے رش سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔''

''تم ساتھ چلتیں، ورنہ تمہیں کسی کپڑے کا رنگ پسند نہیں آئے گا، کسی کے پرنٹ پر اعتراض ہوگا۔'' امی کے کہنے پر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اسے واقعی بازار جاتے ہوئے الجھن ہوتی تھی۔ مڈل کلاس طبقے کی شاپنگ کے خصوصی بازار، جہاں شدید رش ہوتا تھا۔ آوارہ مزاج لڑکے جان بوجھ کر لڑکیوں سے ٹکراتے تھے۔

اس کی سترہ سالہ زندگی ایک مخصوص خوش باش پیار بھرے ماحول میں گزری تھی، امی، ابا اور دو چھوٹے بہن بھائی۔

امی کا میکہ دوسرے شہر میں تھا، جہاں سے کبھی کبھار خالہ اپنے بیٹے ایاز کے ساتھ دو، چار روز کے لیے آجایا کرتی تھیں اور ابا کے سوتیلے بہن، بھائی تو بہت سے تھے، لیکن زندگی کے پہلے بارہ برس اس نے کسی کی صورت نہیں دیکھی، پھر اچانک ایک روز جب وہ اسکول سے آئی تو ان کے سادہ سے ڈرائنگ روم میں بڑی ہی آن بان والی شخصیت موجود تھی اور ابا ان کی آمد پر کتنے خوش تھے، اس کا اندازہ ابا کے چہرے اور لہجے سے پھوٹتی بے پناہ خوشی سے لگایا جا سکتا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ تمہارے تایا جان ہوتے ہیں۔ اونچے لمبے قیمتی لباس پہنے وہ کہیں سے ابا کے بھائی نہیں لگ رہے تھے۔

''اوہ! تو ہمارے گھر کے باہر جو گاڑی کھڑی ہے وہ یقیناً تایا ابا کی ہوگی۔'' وہ ان سے جھجک تو رہی تھی، لیکن انہیں دیکھنا اسے اچھا بھی لگ رہا تھا۔

امی نے بہت پُرتکلف کھانا بنایا تھا، جس کی انہوں نے بہت تعریف کی اور پھر وہ چلے گئے۔

اور پھر پورے تین سال بعد جب وہ میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی، تب ان کی آمد ہوئی پہلے کی طرح صرف دو گھنٹے کے لیے ہی آئے اور چلے گئے۔

''تایا ابا کو آپ سے پیار نہیں ہے ابا! اسی لیے تو اتنی دیر کے بعد آتے ہیں۔''

''وہ بہت مصروف آدمی ہیں بیٹا! اور پھر وہ میری طرح رشتوں کو ترسے ہوئے تھوڑا ہی ہیں۔ ان کی تین بہنیں بھی ہیں اور ان کے ساتھ ان کا بہت ملنا ہے۔''

''اوہ ابا! آپ کی بہنیں بھی ہیں، آپ نے کبھی بتایا کیوں نہیں؟'' وہ پُرجوش ہوئی تھی۔

''ہاں بیٹا! مجھے تمہیں یہ سب بتانا چاہیے تھا۔ اصل میں تمہارے یہ تایا ابا اور ان کی تین بہنیں میرے سوتیلے بہن، بھائی ہیں اور انہیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تمہارے تایا کا نام علیم الدین ہے اور یہ کامیاب بزنس مین ہیں، اسی طرح تینوں بہنیں بھی کھاتے پیتے گھرانوں میں بیاہی ہوئی ہیں۔ اصل میں میری دوسری والدہ بہت جائیداد والی تھیں تو ان کی جائیداد ان کی اولاد میں تقسیم ہوئی اور کچھ علیم بھائی خود بھی سمجھ دار آدمی ہیں، کاروبار شروع کیا اور اب بے حد کامیابی سے اسے چلا رہے ہیں۔''

''تایا ابا کے بچے بھی ہوں گے؟''

''ہاں ایک بیٹا ہے ان کا۔''

''صرف ایک!''

ابا اس کے انداز پر ہنس پڑے، پھر بولے۔ ''بہت سال پہلے بھابھی کی ڈیتھ ہوگئی تھی، بھائی جان نے دوسری شادی چند سال پہلے ہی کی ہے اور دوسری بیوی سے ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ صرف بڑی بھابھی سے ایک بیٹا ہے۔ عدیل نام ہے اس کا۔''

''ابا! کبھی تایا ابا نے آپ کو اپنے ہاں انوائٹ نہیں کیا؟'' کچھ سوچ کر گل رعنا نے نیا سوال کیا تھا۔

اس سوال پر ابا کے مسکراتے ہونٹ ساکت ہو گئے۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا، پھر کچھ دیر بعد بولے۔ ''وہ بڑے آدمی ہیں بیٹا اور کتنے سال تو انہیں میں یاد ہی نہیں آیا۔ اب جو آ کر مل لیے ہیں تو یہ ان کی مہربانی ہے۔''

''لوگوں کے اتنے رشتہ دار ہوتے ہیں، گرمیوں کی چھٹیوں میں کوئی ماموں کے ہاں جاتا ہے، کسی کے چچا اور پھپھو چھٹیوں میں آ کر رہتے ہیں۔ ہماری تو بس ایک خالہ ہیں۔ ان کے ہاں بھی ہم اس لیے نہیں جاتے کہ امی کہتی ہیں، ان کے مالی حالات اچھے نہیں ہیں، ہم جائیں گے تو ان پر بوجھ پڑے گا۔ وہ بھی بس کبھی کبھار صرف ایاز بھائی کو لے کر آجاتی ہیں، حالانکہ ان کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔''

''رعنا! تم کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو، کچن میں برتن دھونے والے رکھے ہیں، جاؤ دھو کر رکھو۔''

امی کے کہنے پر اسے اٹھنا پڑا، لیکن وہ جانتی تھی اس کے کچن میں آجانے کے بعد بھی امی، ابا کے درمیان اسی موضوع پر باتیں ہوتی رہیں جو موضوع وہ چھیڑ کر آئی تھی۔

❁ ❁ ❁

اور پھر دو سال بعد جب وہ کالج کی اسٹوڈنٹ تھی اور پہلے سے کچھ سمجھ دار بھی ہو چکی تھی۔ کالج سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی چھوٹی بہن دونیہ نے بتایا تھا۔

''تایا جان آئے ہیں اور آج تو تائی جان بھی ان کے ساتھ ہیں۔''

''ارے واقعی!'' وہ جلدی سے اپنے اور دونیہ کے مشترکہ کمرے میں گئی۔ بیگ اور چادر اتار کر رکھی اور الماری کھول کر کوئی اچھے سے کپڑے دیکھنے لگی۔

جب وہ لباس تبدیل کر کے فریش چہرے کے ساتھ بڑے کمرے میں آئی تو وہ دونوں سامنے ہی بیٹھے تھے۔ تایا جان کی بارعب پرسنالٹی کے باعث وہ تو سلام کے علاوہ اور کوئی بات کر ہی نہ پائی تھی اور آج ان کے برابر میں تھوڑے کم قد والی سانولی رنگت اور نرم نقوش کی مالک جو خاتون بیٹھی تھی، یقیناً یہی تائی جان تھیں۔ تایا ابا سے تو ان کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا، لیکن اگر تایا ابا سے الگ ان کی شخصیت کو دیکھا جائے تو وہ نرم مسکراہٹ والی اور اچھے دل کی مالک ایسی خاتون معلوم ہوتی تھیں، جن سے بات کرنا بالکل بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بڑی محبت سے ملیں۔ تایا ابا نے اس کے سلام کے جواب میں اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور کوئی بات نہیں کی۔

ابا ابھی گھر نہیں آئے تھے، تایا کی ساری توجہ ٹی وی کی جانب تھی، جبکہ تائی اماں دھیمی آواز میں اس سے باتیں کرنے لگی تھیں۔

''بھابھی پُن میں اکیلی لگی ہوئی ہیں، جا کر ہاتھ بٹاؤ۔'' تایا ابا نے بڑی سنجیدگی سے تائی اماں کو حکم دیا تھا۔

''نہیں نہیں، آپ بیٹھیے تائی اماں! میں جاتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن میں آئی تو پتا چلا کہ کرنے کو تو کوئی کام ہے ہی نہیں۔ وہ لوگ اتنی ساری کھانے پینے کی چیزیں بھی تو لائے تھے، امی تو صرف برتن سیٹ کرنے لگی تھیں، ابا کو فون کر دیا تھا وہ بھی بس آنے ہی والے تھے۔

''اتنا کچھ اٹھا لائے ہیں بھائی اور بھابھی جان! یہ پھل فروٹ ایک طرف، وہ ہم سب کے لیے کپڑے بھی لے کر آئے ہیں۔''

''تائی امی تو بہت اچھی ہیں امی! بے حد نرم خو مہربان سی۔۔۔''

''ہاں واقعی میرا انہیں خیال تھا بھائی صاحب جیسے بندے کی بیگم ایسی سادہ سی ہوں گی، صبح جب فون پہ تمہارے تایا ابا نے بتایا کہ بیگم کے ساتھ آ رہے ہیں تو میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔''

ابھی ماں، بیٹی میں باتیں ہو رہی تھیں کہ شاہدہ بیگم (تائی جان) بھی وہاں چلی آئیں۔

''آپ چل کر بیٹھیں بھابھی! ادھر گرمی میں کیوں آ گئیں؟''

''نہیں، گرمی کیسی، اور عورت کی تو آدھی سے زیادہ عمر کچن میں ہی گزرتی ہے۔''

''آپ کے گھر تو بہت ملازم ہوں گے تائی جان۔''

''ہاں لیکن کچن میں خود ہی دیکھتی ہوں۔ ہیلپ کے لیے ایک ملازمہ میرے ساتھ ہوتی ہے کہ اب طبیعت کچھ اچھی نہیں رہتی۔ گھر میں آنا جانا تو بہت لگا رہتا ہے۔ میرے لیے اکیلے سب سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔''

''دونوں پھپھو بھی تو اسی شہر میں ہیں، کتنے بچے ہیں ان کے؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''تمہاری بڑی پھپھو کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں اور چھوٹی پھپھو کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔''

''آتے رہتے ہوں گے آپ کی طرف؟'' اس کا اشتیاق بول رہا تھا۔

''ہاں ان کے بچوں کی عدیل کے ساتھ بہت دوستی ہے۔ آتے رہتے ہیں۔'' انہوں نے سرسری سے انداز میں کہا، پھر امی سے پوچھنے لگیں۔ ''فون پر بات ہوئی بھائی سے، کب آئیں گے؟ اور آپ کے چھوٹے بچے کدھر ہیں، نظر نہیں آ رہے؟''

یہ تو اسے کھانے کی میز پر پتا چلا کہ تایا ابا دو روز کے لیے آئے ہیں وہ تو اپنے کام میں مصروف رہیں گے لیکن تائی جان ان کے ہاں ٹھہریں گی۔

شاہدہ بیگم عمر میں اس کی امی آصفہ کے برابر تھیں۔ لیکن امی کی طرح ان کے چہرے پر اعتماد اور رونق نہیں تھی، خصوصاً تایا ابا کے سامنے تو وہ کسی شاگرد کی طرح مؤدب اور سہمی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ یقیناً تایا ابا کی بارعب شخصیت ان پر بہت زیادہ حاوی ہو چکی تھی۔ کھانا کھا کر تایا ابا تو کسی ضروری کام کا کہہ کر چلے گئے۔ وہ گئے تو تائی امی بھی ریلیکس ہو کر باتیں کرنے لگیں، جو گفٹ وہ ان کے لیے لائی تھیں وہ سب کھول لیے۔ ''تمہارے تایا نے بتایا تھا، میری بھتیجیاں بہت پیاری ہیں۔''

''اچھا یہاں آ کر تو ایسے بیٹھتے ہیں۔۔۔''

''اوں ہوں رعنا!'' امی نے ٹوک دیا۔

''ہاں! یہ تو ان کی عادت ہے، لیکن زندگی میں بھائی کی کمی وہ بھی محسوس کرتے ہیں۔ بہنیں تو ہیں، لیکن ان کا مزاج کچھ اور طرح کا ہے۔ علیم ان کے ہاں بہت کم جاتے ہیں اور ان سے زیادہ بے تکلف بھی نہیں ہیں۔''

''اور عدیل کیسا ہے، کیا وہ بھی اپنے والد جیسا مزاج رکھتا ہے؟'' آصفہ بیگم پوچھنے لگیں۔

''نہیں بھابھی! عدیل تو ان سے بہت مختلف ہے، بلکہ انہیں افسوس ہے کہ وہ ان پر کیوں نہیں گیا، لیکن بات یہ ہے اکلوتا بیٹا ہے لاڈلا بھی ہے نا صرف ان کا بلکہ دونوں پھوپھیاں بھی اسے بہت اہمیت دیتی ہیں۔''

''چلو وقت کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ہو جائے گا۔ لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' آصفہ بیگم کے کہنے پر انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے سر ہلا دیا، شاید انہیں دیورانی کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔

❁ ❁ ❁

چھوٹی چھوٹی خوشیاں مل کر کتنی بڑی دولت بن جاتی ہیں۔ وہ تینوں بہن بھائی اپنے اپنے تعلیمی اداروں سے تین بجے تک واپس آ جاتے تھے اور ساڑھے تین بجے ابا کا فون آتا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے بچے خیریت سے گھر تو پہنچ گئے ہیں نا، ہر چھٹی کے روز ان کی پسند کے مطابق کھانا بننا، ان کے لیے معلوماتی کتب کی فراہمی، اپنے بچپن کے قصے شوخی و شرارتیں وہ بھی کچھ تو شیئر کرتے تھے ان کے ساتھ۔ ایک ابا کے وجود کی بدولت جیسے دنیا کی ساری خوشیاں اس کی مٹھی میں تھیں۔

❁ ❁ ❁

غم کی آندھی اچانک ہی اٹھی اور اپنے ساتھ ساری خوشیاں اڑا لے گئی۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں ابا زندگی ہار گئے تھے۔ وہ تو ایک سکتے کے عالم میں تھی، کون آ رہا تھا، کون دلاسا دے رہا تھا، کچھ احساس ہی نہیں تھا، لیکن جب تایا ابا نے اسے سینے سے لگایا تو جیسے سکتہ ٹوٹ گیا۔

وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

''صدمہ تو بہت بڑا ہے بیٹا! تم نے بڑا نقصان اٹھایا ہے، لیکن خود کو بے سہارا مت سمجھنا۔ میں تمہارے ابا کا بڑا بھائی ہوں۔ تم خون ہو میرا، بچے ہو میرے۔'' تایا ابا کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

پھر آنے والے دنوں میں کتنے ہی فیصلے ہوتے چلے گئے۔ گھر کرائے کا تھا، انہیں چھوڑنا تھا کہ اب آمدنی کا وہ ذریعہ نہیں تھا، انہیں ابا کی پنشن ہی ملنا تھی یا کچھ فنڈ تھے، لیکن سرکاری کام اتنی جلدی کہاں ہوا کرتے ہیں۔

تایا ابا انہیں اپنے شہر اپنے گھر لے کر جا رہے تھے۔ اسی شہر میں خالہ بھی رہتی تھیں، لیکن ان کا گھر چھوٹا تھا، مالی حالات بھی اتنے اچھے نہیں تھے کہ وہ مستقل بہن اور اس کے زیرِ تعلیم بچوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔

حیران آنکھوں، سہمے چہروں کے ساتھ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک نئے شہر بلکہ ایک نئی دنیا میں جا رہے تھے۔

تایا ابا کا گھر بہت اچھا تھا اور گھر کے پچھلے حصے میں بنے جو دو کمرے انہیں دیے گئے وہ بھی بہت اچھے ہوادار اور روشن تھے۔ کمروں کے آگے برآمدہ اور سائیڈ پر چھوٹا سا اسٹور اور ایک عدد کچن جو تایا ابا نے ان کے لیے بنوایا تھا۔

''آصفہ بیٹی! (وہ بھاوج کو بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے) میں تمہیں اپنے ساتھ بھی رکھ سکتا تھا، لیکن میں نے سوچا شاید وہاں بچے اتنا ریلیکس فیل نہ کریں۔ یہ پورشن تھوڑا الگ ہے، تم لوگ اپنی مرضی سے رہ سکتے ہو یہاں۔ میں نے کچن بھی بنوا دیا ہے، لیکن تم لوگ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا کرو گے، یہاں صرف چائے وغیرہ کا سامان رکھ لو کہ سردیوں میں ہمارے کچن تک آنا تمہارے لیے مشکل ہوگا۔ ویسے میں سوچ رہا ہوں لاؤنج میں ایک دروازہ ادھر سے کھلوا دوں تاکہ تمہیں لمبا چکر نہ کاٹنا پڑے۔''

''تایا ابا بھی بالکل ابا کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔'' وہ صرف یہی سوچے جا رہی تھی۔

''میں نے دونوں بہنوں کو آپ سب کی آمد کے بارے میں بتا دیا ہے۔ آئیں گی چند روز میں ملنے کے لیے۔'' تایا ابا کو کسی کام سے جانا تھا انہیں بتا کر وہ تو رات کو آنے کا کہہ کر چلے گئے، تائی جان وہیں بیٹھ گئیں اور دھیرے سے بولیں۔

''آصفہ! تم شاید اپنی نندوں سے ملی نہیں ہوگی۔ میں تمہیں بتا دوں، وہ ذرا دوسرے مزاج کی ہیں، میں سگی بھابھی ہو کر بھی ان کے لیے عزت کی مستحق نہیں ہوں تو تم تو پھر۔۔۔ ان کی کسی بات کو دل سے نہ لگانا۔ ہاں عدیل انہیں بہت چاہتا ہے، اس کے سامنے ان لوگوں کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرنا۔''

''عدیل کہاں ہے؟ ہم نے دیکھا نہیں اسے؟''

''اس کی اپنی مصروفیات ہیں اور گھر میں اس کے لیے کوئی دلچسپی بھی تو نہیں ہے۔ دس، پندرہ روز کے لیے کوئٹہ گیا ہوا ہے کسی دوست کے ساتھ۔'' شاہدہ بیگم مسکرا دیں۔

ایک خدشہ جو یہاں آتے ہوئے تھا، پتا نہیں نئی جگہ ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔ اب بالکل مفقود تھا۔

* * *

خالہ آسیہ بھی اسی شہر میں تھیں۔ وہ ان سے ملنے کے لیے آئیں تو رعنا، ظفر اور دونیہ کو اپنے ساتھ گھر لے گئیں، ظفر کی عمر کا کوئی بچہ ان کے گھر میں نہیں تھا اور پھر خالو جان کا مزاج بھی خاصا خشک تھا، انہیں شور بالکل پسند نہیں تھا اور اب تو ایسے مہمان بچے ان کے ہاں آئے تھے جو بیوی کے رشتہ دار بلکہ غریب، یتیم رشتہ دار تھے تو آنکھیں ماتھے پر سجالی تھیں، ہاں خالہ کے بچے بہت اچھے تھے، انیلا اور روبی باجی انہیں لے کر محلے میں اپنی دوستوں سے ملوانے بھی لے گئیں اور ایاز بھائی بازار سے کبھی آئس کریم تو کبھی چکن رول لا کر ان کی خاطر تواضع کرتے رہے۔

* * *

خالہ کے ہاں تین روز گزار کر جب وہ واپس آئے تو عدیل گھر آ چکا تھا، یہ شام کا وقت تھا اور وہ لاؤنج میں رکھی ڈائننگ ٹیبل پر اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

''مرادو نی نامرادو! آج چائے میں چینی کیا تیرا دلدار آ کر ڈالے گا۔'' اس کی آواز پر لبیک کہتی مرادو کچن سے شوگر پاٹ لیے دانتوں کی نمائش کرتی حاضر ہوئی، اب تک انہوں نے مرادو کو کام چور، نکمی، بڑے مزاج کی ملازمہ کے روپ میں پایا تھا، لیکن آج تو گہری سانولی نوجوان مرادو کی بتیسی باہر نکلی ہوئی تھی۔

''وہ جی ہانڈی بھی تو ساتھ ساتھ بھون رہی تھی۔ مجھے شک ہے چینی میں نے ادھر پا (ڈال) دی ہے۔''

''شاباشے، آئندہ اگر چینی سالن میں پا دو تو پھر پتی اور دودھ بھی ادھر ہی پا دیا کرو، تاکہ دو، دو کاموں کا سیاپا ہی خلاص ہو جائے۔''

پھر آصفہ بیگم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''چچی! یہ یقیناً آپ کے نورِ نظر لختِ جگر ہیں۔''

ظفر اور دونیہ سے ہاتھ ملایا اس کی جانب دیکھا۔ پتا نہیں اس کی براؤن آنکھیں ایسے ہی جگمگاتی تھیں یا پھر یہ جگمگاہٹ اسے دیکھ کر ابھری تھی، ہاتھ اس کی جانب بڑھایا وہ جھجکی تو مسکرا کر ہاتھ پیچھے کر لیا، مگر وہ مسکراہٹ، رعنا کھسیا گئی۔ اور اسے لگا عدیل کی موجودگی کچھ آسان ثابت نہیں ہوگی۔

اسی دوران تائی جان بھی ٹیبل پر آ چکی تھیں۔

''والدہ! آپ نے مجھے ان سب کی آمد کے بارے میں کم از کم اطلاع تو کر دینا تھی۔ میں سب کے لیے گفٹ لے کر آتا۔''

''تمہارا چکر تو لگتا ہی رہتا ہے، اب کے جاؤ گے تو لے آنا۔''

''ایسا کرتا ہوں جو رشنا اور شمع کے لیے لایا تھا اس میں سے کچھ دے دیتا ہوں اور آپ نے پھپھو کے ہاں فون تو نہیں کیا ہوگا۔ میں آپ کو بتا کر گیا تھا ساجدہ پھپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' انداز کتنا جتاتا ہوا تھا اور شاہدہ بیگم صفائی میں کہہ رہی تھی۔

''تمہارے ابا سے دونوں کی بات ہوتی رہی ہے۔''

''میں جا رہا ہوں ساجدہ پھپھو کی طرف، رات کو دیر ہو جائے گی۔''

''آج ہی تو آئے ہو بیٹا!''

''تو کیا ہوا؟'' اس نے بھنویں چڑھا کر پوچھا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔

پھر یک دم اس کا موبائل بجنے لگا۔

''ہاں شمع! آ گیا ہوں۔ یار! ذرا دم تو لو اوہو! ہاں ہاں، آج ہی آیا ہوں۔''

''تمہارے لیے؟ کوئٹہ سے تو اخروٹ ہی لائے جا سکتے ہیں۔''

''کیا اخروٹ پسند نہیں، ہاں ان کے کھانے سے دماغ جو تیز ہو جاتا ہے۔''

''کیا کہا؟ پہلے ہی تیز ہے بھئی۔ میں زبان کی نہیں دماغ کی بات کر رہا ہوں۔''

وہ چائے پینے کے دوران ایسی ہی باتیں کرتا رہا، کبھی کبھی اس کے کسی فقرے پر ان سب کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رینگ جاتی، لیکن تائی جان خاموش بیٹھی تھیں، یوں جیسے اس کی کوئی بات سن ہی نہیں رہیں۔

اس کے بعد عدیل نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور پھپھو کے ہاں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''بیٹا! بچے اپنی خالہ کی طرف گئے ہوئے تھے، آج ہی واپس آئے ہیں۔ میں نے کھانا بنوایا تھا، اگر ہو سکے تو جلدی آ جانا۔ اکٹھے کھالیں گے۔''

''سوری مما! مجھے پہلے شمع کی طرف جانا ہے، پھر ساجدہ پھپھو کی طرف۔ آپ تو جانتی ہیں۔ وہ مجھے کھانا کھائے بغیر نہیں آنے دیں گی'' وہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

شاہدہ بیگم نے ان کی واپسی پر کھانے پہ واقعی بہت اہتمام کروایا تھا۔

ابھی یہ لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ تایا ابا بھی آ گئے۔ وہ بھی یوں ملے جیسے ان کی واپسی تین دنوں کے بعد نہیں تین ماہ کے بعد ہوئی ہے۔

❁ ❁ ❁

تایا ابا نے انہیں شہر کے بہترین تعلیمی اداروں میں ایڈمیشن دلوایا تھا۔ صبح ڈرائیور گاڑی پر ڈراپ کرنے جاتا تھا اور واپسی پر بھی گاڑی گیٹ پر منتظر ہوتی تھی۔

''ابا کی نیکیاں ہمارے کام آ رہی ہیں۔ اللہ نے ہمیں باپ کے بعد بھی وقت کی آندھی کی زد میں نہیں آنے دیا۔''

چھٹی کے روز وہ اور امی کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں۔ ویسے تو امی روزانہ ہی ان کا ناشتا اپنے ہاتھ سے تیار کرتی تھیں اور اب تو اکثر اس ناشتے میں تایا ابا اور عدیل بھی شریک ہو جاتے۔ تائی اماں دواؤں کے زیر اثر سوتی تھیں اور صبح دیر سے اٹھتی تھیں۔ آج تو چھٹی کا دن تھا۔ سب ہی لیٹ اٹھے تھے اور امی آج قیمے والے پراٹھے بنا رہی تھیں۔

''کیا کرتی ہیں چچی، اتنی خوشبو آ رہی ہے کہ جی چاہتا ہے یہیں بیٹھ کر کھانا شروع کر دوں، پابندی یہ لگا دی ہے سب مل کر کھائیں گے۔''

''تھوڑا صبر کر لو، میں ساتھ میں دھنیے اور پودینے کی چٹنی بھی بنا رہی ہوں۔''

''چچی! اصل میں، میں کب عادی ہوں ان سب کا۔ یہاں تو خیر ملازمہ کچن دیکھتی ہے کہ امی کی صحت اجازت نہیں دیتی۔ بڑی اور چھوٹی پھپھو کے ہاں بھی بڑا سادہ سا کھانا بنتا ہے، وہاں کسی کو بھی گھر کے کام کاج میں دلچسپی نہیں ہے اور ہاں یاد آیا۔ آج شام کو جاذبہ پھپھو آ رہی ہیں۔ ساتھ میں ان کی بیٹیاں بھی ہیں، لیکن آپ کچن میں مت گھس جایئے گا، کھانا بازار سے آئے گا، وہ بازار کا کھانا ہی شوق سے کھاتی ہیں۔''

شام کو جب جاذبہ بیگم اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ آئیں، تب تایا ابا کا موڈ خاصا خراب تھا۔ اصل میں پھپھو نے شام پانچ بجے آنے کو کہا تھا۔ اب ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ تایا ابا صرف ان کی وجہ سے اپنے ضروری کام چھوڑ کر گھر پر رکے تھے۔ دو بار عدیل نے فون کیا، پتا چلا لڑکیاں تیار ہو رہی ہیں، اسی بات نے انہیں غصہ دلا دیا تھا۔

ساڑھے چھ بجے تک تو صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جاذبہ پھپھو کے سلام کے جواب میں ہی وہ بولنے لگے تھے۔ رعنا نے تایا ابا کو اتنے غصے میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ابا تو بالکل غصہ نہیں کرتے تھے۔

ڈانٹ وہ پھپھو کی لڑکیوں کو رہے تھے اور سہم رعنا گئی تھی، جبکہ پھپھو اور ان کی بیٹیاں شاید عادی تھیں، جب ہی تو بالکل نوٹس نہیں لیا۔

لڑکیوں کی سج دھج ان کی تیاری دیکھ کر بھی اسے یہ احساس ہوا تھا وہ تو بہت سادہ ہے۔ دونوں نے تائی جان کو سلام کیا، پھر عدیل کی جانب ہاتھ بڑھائے اور ان چاروں میں سے کسی کی طرف دوسری نظر ڈالے بغیر صوفے پر جا بیٹھیں۔

آصفہ بیگم نے اٹھ کر پھپھو کو سلام کیا تو رعنا اور دونیہ نے بھی تقلید کی۔ انہوں نے آصفہ بیگم کے سلام کا جواب صرف سر ہلا کر دیا۔ ان تینوں کی جانب خاص کر رعنا کی جانب بہت گہری، بڑی سرد نگاہ ڈالی کہ اس کا جی چاہا وہ خود اس کمرے سے جا کر اپنے کمرے میں چھپ جائے۔

''بھائی بڑے دن ہوئے آپ نے نہ میری طرف چکر لگایا نہ ہی ساجدہ کی طرف گئے۔ بہنوں کو تو آپ اب بھولتے جا رہے ہیں۔''

زور ''اب'' پہ تھا۔

''میں پہلے کب زیادہ آتا جاتا ہوں۔ عدیل ہی تم دونوں کی خیر خیریت بتا دیتا ہے یا پھر تم لوگ چکر لگا لیتے ہو۔ اور سناؤ تمہارے میاں اور بیٹے کا کیا حال ہے؟''

''میں ٹھیک ہیں، اپنے حال میں مگن اور میرے بچے کا آپ کیا پوچھتے ہیں بھائی! کئی بار کہہ چکی ہوں آپ سے اسے اپنی کمپنی میں رکھیں۔ نوکری پر اپنے ساتھ لگا لیں۔''

''پہلے وہ تعلیم کو مکمل کر لے اسے کہو آوارہ گردی چھوڑ کر پڑھائی پر دھیان دے۔''

بھائی کی جانب سے ایسی بات جاذبہ کو بری تو لگی، خصوصاً آصفہ بیگم کے سامنے سبکی محسوس ہوئی، لیکن وہ چہرے کے تاثرات پر کنٹرول رکھنے میں مکمل مہارت رکھتی تھیں۔

''ماموں! آج ہم سب کھانا کھانے باہر جائیں گے؟'' شمع پر ان کے موڈ کا مجال ہے کہ کوئی اثر ہوا ہو۔

''کئی بار میں تم بہنوں کو کسی نہ کسی فوڈ اسٹریٹ میں دیکھ چکا ہوں۔ جاذبہ! تم نے کیا بیٹیوں کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔''

''کہاں بھائی، ہمارے حالات ایسے کب سے ہو گئے کہ بچے آئے دن ہوٹلنگ کریں۔ وہ تو ان کی کچھ سہیلیوں نے ٹریٹ وغیرہ دی تھی، ورنہ تو ساری فرمائشیں بس آپ سے ہوتی ہیں۔''

''کھانا منگوایا ہے میں نے۔ گھر بیٹھ کر کھا لینا۔'' اب کے کوئی کچھ نہیں بولا۔

علیم الدین کچھ دیر بیٹھے پھر اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی رعنا اور آصفہ کو بھی یہاں بیٹھنا مشکل لگنے لگا۔ دونیہ اور ظفر تو بچے تھے، اٹھ کر لان میں جا چکے تھے، پھر انہوں نے دیکھا، وہ تینوں عدیل کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں۔ ان کی طرح انہوں نے شاہدہ بیگم کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی یہاں بیٹھی تھیں تو یہ بھی خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

''اے لڑکی! کیا نام ہے تمہارا میرے لیے ایپل جوس تو لے آؤ۔'' کچھ دیر بعد پھپھو نے بڑی رعونت سے حکم دیا تھا۔ وہ اٹھنے لگی تو شاہدہ بیگم نے چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور مرادو کو آوازیں دینے

لگیں۔

''جی بی بی!'' وہ سستی سے چلی آئی۔

''یہ نامرادوا بھی تک یہیں ہے۔ نکالا نہیں اسے۔ پچھلی مرتبہ جب میں آئی تھی۔ اس نے خالی چائے لاکر رکھ دی تھی میرے سامنے۔ میں کہہ کر گئی تھی آئندہ یہ دکھائی نہ دے۔'' جاذبہ کا موڈ اسے دیکھ کر خراب ہوا۔ وہ بھابھی سے جواب طلب کرنے لگیں۔

''پھپھو! جانے دیں، مرادو! پھپھو کے لیے ایپل جوس لے کر آؤ۔'' عدیل نے مرادو کو وہاں سے چلتا کیا، پھر بولا۔

''کیا کرتی ہیں آپ؟ بے چاری کیا سوچے گی اور آپ کو پتا تو ہے امی بیمار رہتی ہیں۔ زیادہ کام نہیں کر سکتیں، ملازمہ ملنا کوئی آسان تھوڑا ہی ہے۔''

''کیوں اب ملازموں کی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے۔'' اسے اور امی کو دیکھ کر کیسے جتاتے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ اسے لگا شاید اس کے ہاتھ دھیرے دھیرے کانپ رہے ہیں۔

''اب تو زیادہ ضرورت ہے۔ ہم لوگ زیادہ ہوگئے ہیں نا!'' عدیل نے رسان سے کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد گل رعنا خاموشی سے اٹھی اور وہاں سے باہر نکل گئی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے برابر کرتے ہوئے عدیل کو ان دونوں کے ساتھ باہر جاتے دیکھا۔ کھڑکی کے شیشے کے پار دھند اتر رہی تھی، اس وقت شام گہری ہو رہی تھی، سردیوں میں اندھیرا جلدی اتر آتا تھا، وہ کتابیں لے کر رائٹنگ ٹیبل پر آبیٹھی۔

❁ ❁ ❁

رات کو ٹیبل یہاں سے وہاں تک بھری ہوئی تھی اور ان کا انتظار کیے بغیر کھانا شروع ہو چکا تھا۔ تائی جان ٹیبل پر موجود نہیں تھیں۔ عدیل موبائل کان سے لگائے ڈائننگ ٹیبل سے قدرے فاصلے پر کھڑا دھیمی آواز میں کسی سے بات کر رہا تھا۔ ٹیبل پر یہ تینوں ماں، بیٹیاں ہی تھیں۔ اتنے میں شاہدہ بیگم چلی آئیں۔

''ارے شاہدہ! بریانی گھر میں بنوانے کی کیا ضرورت تھی، نہ مرچ، نہ مسالا، پھیکی سیٹھی ہے۔''

''بالکل مزا نہیں آرہا۔'' شمع نے بھی اعتراض میں حصہ لیا۔ پھر مڑ کر ابھی تک موبائل پر مصروف عدیل کو دیکھا اور بولی۔

''ہم کھانا باہر سے کھا آتے تو بہتر تھا۔''

''بھابھی! لقمان اور اس کے ابا گھر پر ہی ہیں، ان کے لیے کھانا بندھوا دیں، ہم لے کر جائیں گے۔'' کھانے میں نقص نکالنے کے دوران جاذبہ نے یہ حکم دیا تھا اور ٹیبل پر آتا عدیل ہنس پڑا تھا۔

''تمہیں کیا ہوا اور اتنی لمبی بات کس سے کر رہے تھے؟'' رشنا پوچھنے لگی۔

''تمہاری خالہ زاد بہن بات کر رہی تھی۔''

''ہونہہ بہن! اللہ معاف رکھے ایسے رشتہ داروں سے۔ تم نے بھی نا ساجدہ خالہ کی اس بیٹی کو بڑا سر چڑھا رکھا ہے۔''

''لائیں امی یہ ڈش ادھر کریں۔ اور پلیز کباب بھی پکڑا دیں۔ تھوڑا سا کھاؤں گا۔ آج نیند بہت

آرہی ہے۔'' وہ ان سنی کرتے ہوئے ماں سے بولا تھا۔

''کیا! ہم آئے بیٹھے ہیں تم سونے کی بات کر رہے ہو۔''

''اوہو اچھا میرا تو خیال تھا کھانے کے بعد آپ لوگ اجازت چاہیں گے۔''

''دیکھ لیں امی!'' شمع منہ بنا کر ماں سے شکایت کرنے لگی۔

''مذاق کر رہا ہے۔ ورنہ کیا میں نہیں جانتی کتنا پیار کرتا ہے یہ ہم سے۔'' پھپھو جاذبہ کھانے میں مصروف بولی تھیں۔

''ایسے ہی بناتے ہیں یہ صاحب ہمیں۔'' رشنا کچھ خاص اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

''ادھر لاؤ یہ کوفتے۔ توبہ، ہر چیز ہی بے ذائقہ۔'' جاذبہ نے پھر تبصرہ کیا۔

''پھپھو! اب تو لگتا ہے مجھے ہی کوکنگ سیکھنی پڑے گی۔'' وہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔

''کیوں لوگ کم تھوڑی ہیں گھر میں۔ یہ سیکھیں، حالات اچھے نہ ہوں تو ہنر ہاتھ میں ضرور ہونا چاہیے۔ یہی کام آجاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے، کوئی دوسرا بھلا کتنے عرصے بوجھ اٹھا سکتا ہے۔'' اور ان کے ہاتھ رک گئے تھے۔

اپنی بات کہہ کر وہ پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

باہر بھی ویسی ہی تاریکی اور کہر تھی، جیسی رعنا کے اندر اترنے لگی تھی۔

''ابا، میرے اچھے ابا۔'' اس کا جی چاہا، وہ چیخ چیخ کر رونے لگے۔

❁ ❁ ❁

ساجدہ کو پتا چلا تھا جاذبہ بھائی کے ہاں آئی تھی تو انہوں نے بھی بیٹی کے ساتھ ادھر آنے کا پروگرام بنا لیا۔

''امی! آپ فون پر ان سے پوچھ لیں، وہ کیا کھانا پسند کریں گی، مہمان کو اگر کھانا بھی اس کی پسند کا نہ ملے تو اس سے بری بات کیا ہوگی اور یہ تو ان کے بھائی کا گھر ہے، اس گھر پر پورا حق ہے ان کا۔''

''جاذبہ کے آنے پر جو کچھ بنا، وہ تمہارے ابا کے کہنے کے مطابق ہی تھا۔'' شاہدہ بیگم نے وضاحت کی تھی۔

''پاپا کو تو بس اپنی مرضی ٹھونسنے کی عادت ہے۔ یہی بہتر ہے، اس مرتبہ آپ پھپھو سے پوچھ لیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' باوجود ناگواری کے شاہدہ بڑے تحمل سے بولی تھیں، جانتی تھیں۔ یہ سب شکایت جاذبہ اور لڑکیوں نے اس سے کی ہے، حالانکہ انہوں نے اس روز کھایا بھی ٹھیک ٹھاک اور گھر بھی لے کر گئی تھیں۔

''بی بی صاحبہ! کوئی ملنے والے آئے ہیں۔ ایاز نام بتا رہے ہیں، ساتھ میں ایک خاتون بھی ہیں، کہہ رہے ہیں ظفر میاں کی والدہ سے ملنا ہے۔''

''ایاز بھائی ہوں گے۔'' رعنا ایک دم جوش سے بولی تھی تو عدیل نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

''بلاؤ نا انہیں، بلکہ امی ہم انہیں ادھر اپنے پورشن میں لے چلتے ہیں۔''

''نہیں ادھر ہی بلالو۔ یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے، میں چائے پر کچھ انتظام بھی کرواتی ہوں۔'' شاہدہ بیگم کے کہنے پر ایاز اور انیلا باجی ادھر ہی آ گئے، سادہ سے پرخلوص چہرے، رعنا کو لگا اس وقت تو اسے ان کی بہت ضرورت تھی۔ وہ انیلا باجی کے گلے لگ گئی۔ ایاز کو سلام کیا۔ خالہ اور گھر کے باقی افراد کا حال پوچھنے لگی۔

''آج پہلی بار اسے اتنی آواز میں بولتے سنا ہے۔'' عدیل نے بے اختیار سوچا تھا۔ ایاز اور انیلا سے وہ بھی اچھے طریقے سے ملا، پھر کہیں جانا تھا، اس لیے اٹھ کھڑا ہوا، یہ لوگ ادھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے، پھر انیلا بولی۔

''اپنا کمرا تو دکھاؤ۔ میں دیکھوں تو سہی، کیسے سیٹ کیا ہے، کتنی سگھڑ ہو تم۔''

''سگھڑ تو میں بالکل نہیں ہوں، بس ابھی تک صرف پڑھائی کی طرف ہی توجہ ہے نا! میٹرک کی چھٹیوں کے بعد امی کے ساتھ کھانا بنانے میں لگی تھی۔ کچھ سیکھ بھی لیا ہے، باقی اور تو ابھی کچھ نہیں آتا۔''

''پڑھنے کا شوق ہے، کیا بننا چاہتی ہو؟''

''یہ تو نہیں سوچا، لیکن میں اپنے پیروں پہ کھڑے ہونا چاہتی ہوں۔ میرا بھی نام ہونا چاہیے۔ میری پہچان میرے اچھے کام سے ہونی چاہیے، میں مضبوط لڑکی کہلانا چاہتی ہوں، مجھے یہ بھی پتا ہے ہمارے معاشرے میں یہ آسان نہیں ہے۔''

''ارے رعنا! انیلا نے اک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا، تم اتنی بڑی بڑی باتیں کب سے کرنے لگیں۔''

''میں نے اپنے گھر میں عورت کی عزت دیکھی ہے، بیوی کے روپ میں بھی اور بیٹی کے روپ میں بھی، لیکن جب میں نے اپنے گھر سے باہر نظر ڈالی تو وہاں ایسا نہیں ہے تب میں نے سوچا مجھے ہر جگہ اپنی عزت کروانی ہے اور اس کے لیے تعلیم حاصل کرنا بھی تو ضروری ہے۔''

''دنیا بہت ظالم ہے رعنا! میری دعا ہے تمہیں زندگی میں ہمیشہ اچھے لوگ ملیں۔'' انیلا نے دل سے کہا تھا۔

* * *

آصفہ بیگم اکثر اب خود ہی کچن دیکھنے لگی تھیں۔ آج بھی انیلا اور ایاز کی آمد پر وہ خود ہی کچن میں لگ گئیں اور اک احساس تلے دب کر انہوں نے اپنے رشتے داروں کے لیے زیادہ اہتمام بھی نہیں کیا۔ چکن کا سالن، سبزی پلاؤ اور سلاد لیکن ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ سب اچھا بنا تھا۔

کھانے کے بعد جب وہ لوگ رخصت ہو رہے تھے۔ اسی وقت عدیل گھر میں داخل ہوا تھا۔

''یہ ایاز صاحب کرتے کیا ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی کہ سردی بہت زیادہ تھی۔ اسے رہ رہ کر انیلا اور ایاز کا خیال آ رہا تھا۔

''کھانا کھاؤ گے بیٹا؟'' عدیل کو دیکھ کر شاہدہ بیگم پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں، میں ساجدہ پھپھو کی طرف چلا گیا تھا۔ کھانا بھی وہیں کھا لیا اور ایک نئی خبر بھی ہے۔

پھپھو اپنے ہونہار صاحب زادے جناب عقیل صاحب کی بات تقریباً پکی کر چکی ہیں۔ عنقریب منگنی کی تقریب سعید متوقع ہے۔''

پتا نہیں وہ کیوں ہنس رہا تھا۔

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، کہاں پکی کی عقیل کی بات، میرا تو خیال تھا وہ جاذبہ کی لڑکیوں میں سے کسی ایک کو لیں گی۔ آخر کو بھانجیاں ہیں۔''

''بھانجیاں ہیں تو یہ کہاں لکھا ہے کہ بھانجیوں کے ساتھ دشمنی کرو، عقیل کو تو جاذبہ پھپھو اچھی طرح جانتی ہیں، بھلا دیتیں وہ شمع یا رشنا میں سے کسی کا رشتہ اور تو اور لڑکیاں تو ایسی بات پر ہی قیامت اٹھا لیتیں۔ اب بھی کوئی عقل کا اندھا ہی ہوگا جس نے بیٹی ایک بوجھ سمجھ کر انہیں دے دی ہے۔''

''بیٹی کو بوجھ کون سمجھتا ہے، بس غیروں میں سو عیب چھپ جاتے ہیں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ بہرحال سب بہت خوش تھے۔ روزینہ باجی اور ان کے میاں صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے اور یہ بھی ایک الگ ہی لطیفہ ہیں۔ روزینہ باجی کے ساتھ تو ذرا نہیں جچتے، میں نے تو بینا سے کہہ دیا تم بچ جاؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔ کہیں پھپھو روزینہ باجی کے میاں جیسا ہی نہ تمہارے لیے اٹھا لائیں۔''

''تمہارے ابا ابھی تک گھر نہیں آئے۔ ٹائم خاصا ہو رہا ہے۔ نمبر تو ملاؤ ان کا۔'' اس بار انہوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

''اوہو! اب اس عمر میں ابا نے کہاں جانا ہے۔ کیوں فکر کرتی ہیں، آ جائیں گے۔''

''میرا یہ مطلب تھوڑی تھا، میں تو۔۔۔''

''آ جائیں گے، مت پریشان ہوں اور ابھی ابا سے عقیل کے رشتے والی بات کا تذکرہ مت کیجیے گا۔ سوچیں گے، بہن نے بتایا تک نہیں، جبکہ ساجدہ پھپھو دو ایک روز میں مٹھائی کے ساتھ آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔''

''اگر تمہارے ابا ایسا سوچیں گے تو غلط نہ ہوگا، ہر ہر قدم پر بہنوں کا خیال رکھا ہے اور اب جب بیٹے کا رشتہ کرنے کا وقت آیا تو کسی سے مشورہ تک نہیں مانگا۔ بات پکی کر کے مٹھائی دینے آ رہے ہیں۔''

''بس، ایک تو آپ عورتوں کی یہ باتیں، کوئی نہ کوئی اعتراض کا پہلو نکال ہی لیتی ہیں، رنجشیں بڑھانے میں جواب نہیں۔'' وہ اچھا خاصا خفا ہوا اور لاؤنج سے اوپر جاتی سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''باپ کی پروا نہیں، بس پھوپھی کی حمایت ہر حال میں کرنی ہے۔ علیم نے کیا نہیں کیا ان بہنوں اور ان کے بچوں کے لیے، جائیداد میں سے شرعی حصہ سب کو ملا تھا۔ لیکن دونوں ہی بہنوئی کاروبار کے شوق میں سب گنوا بیٹھے۔ بہنوں پر تنگی آئی تو علیم نے ہر طرح سے ہمیشہ ان کی مدد کی ہے اور اب تک کرتے آ رہے ہیں، لیکن اب عقیل بھی ملازم ہو گیا ہے اور چھوٹا بھی کمانے لگا ہے تو ساجدہ نے کتنی آسانی سے بھائی کو بھلا دیا اور یہ علیم کا لاڈلا اکلوتا بیٹا اسے پروا ہی نہیں کہ باپ یہ سن کر کیا محسوس کرے گا۔ زرینہ کی شادی پر سارا خرچ علیم نے اٹھایا۔ حالانکہ وہ اس رشتہ کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن بہن، بہنوئی سے

زیادہ اظہار نہیں کیا کہ ان کی بیٹی ہے اس کے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا۔''

''چھوڑیے بھابھی! آپ کیوں اپنی طبیعت خراب کرتی ہیں۔''

''افسوس ہوتا ہے آصفہ! ان دونوں بہنوں کی خود غرضی پر اور غصہ بھی آتا ہے۔'' انہوں نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

۞ ۞ ۞

انہوں نے واقعی علیم الدین سے بالکل ذکر نہیں کیا۔ انہیں تب ہی خبر ہوئی جب چھٹی کے روز دن کے بارہ بجے ساجدہ، میاں اور بچوں کے ساتھ مٹھائی لیے چلی آئیں۔ عدیل نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور بینا اس کے ساتھ چلتی اس کے برابر میں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

ساجدہ بھائی کو سلام کرنے کے بعد کتنی دیر ان سے لپٹی کھڑی رہیں۔

''امی! آپ آکر بیٹھ جائیں۔'' روزینہ نے ہاتھ پکڑا۔

''پیچھے ہٹو، مجھے اپنے والدین کی خوشبو محسوس کرنے دو، بھائی کے پاس آکر اس چھاؤں کا احساس ہوتا ہے، جو ماں، باپ کی زندگی میں محسوس کیا کرتے تھے۔'' وہ جذباتی بیان داغنے میں کمال رکھتی تھیں۔ ایسی گفتگو کے بعد جب عقیل کی بات پکّی ہونے کی اطلاع دی جاتی تو بھلا علیم صاحب کوئی اعتراض کرنے کے قابل رہ جاتے بھلا۔

''اچھا تو یہ ہیں وہ بے سہارا بچے جنہیں آپ نے اپنے گھر میں رکھا ہے۔'' روزینہ کے میاں نے ان تینوں پر نظر ڈالی، پھر رعنا پر نظریں جما کر فرمایا۔

''کیا مطلب بھئی یہ خون ہیں میرا۔ میرے بھائی کی اولاد، میرے بچے۔'' تایا ابا غصہ ضبط نہیں کر سکے تھے۔

''میرے بھائی! تمہارا دل ہی بہت بڑا ہے۔'' ساجدہ نے داد دی، پھر مٹھائی کا ڈبا کھولنے لگیں۔ اپنے ہاتھ سے پیارے بھائی کو کھلایا، پھر عدیل کی جانب دیکھا۔

''ادھر آنا پھوپھی کی جان، تو بھی میرے ہاتھ سے کھا۔'' برفی کا ٹکڑا بڑے پیار سے کھلانے کے بعد پیشانی بھی چوم لی۔ ان لوگوں کا تو ذکر ہی کیا شاہدہ بیگم بھی یاد نہیں آئیں۔

''بس بھائی تمہاری دعاؤں سے اللہ نے اچھی جگہ بات بنادی ہے، لڑکی کے نام مکان بھی ہے اور بینک میں بھی کہتے ہیں کافی رقم ہے، اس کے نام پر۔''

''ہاں، ورنہ لڑکی تو یہ بھی اچھی ہے۔'' عقیل نے بینا کے کان میں سرگوشی کی، جسے عدیل نے بھی سنا اور پہلو بدل کر رہ گیا۔

''یہ والی ہونہہ! ایسی کون سی خوبی ہے اس میں، ذرا بتانا تو۔'' بینا نے منہ بنایا۔

''رعنا! مرادو سے کہو چائے رکھ دے اور پلیز اپنی نگرانی میں تیار کروالینا۔'' عدیل نے رعنا کو کچن میں بھیج دیا۔

''یار! اتنی جلدی کیا پڑ گئی چائے کی۔'' عقیل نے کمینگی سے آہ بھری۔

آج ساجدہ کی فیملی کا سارا دن ادھر ہی گزرنا تھا، جس میں بیاہی بیٹی روزینہ اس کا نظر باز میاں، دو

بدتمیز بچے بھی شامل تھے۔ باقی بینا، عقیل اور چھوٹا وحید بھی کسی سے کم نہ تھے، گھر آوازوں سے گونج رہا تھا۔ سب ہی بہت اونچی آواز میں بولنے اور ہنسنے کے شوقین تھے۔

جاذبہ کی فیملی کی طرح انہیں بھی گھر کا کھانا پسند نہیں تھا، آج بھی ان کی پسند پر تایا ابا نے آرڈر لکھوایا تھا، باقی کچھ کام گھر پر بھی ہو رہا تھا۔

''علیم! میرے بھائی! میں کہے دیتی ہوں۔ بھانجے کی منگنی کی ساری تیاری تمہیں ہی کرنا ہے۔ کیا دینا دلانا ہے۔ کیا کھانے میں رکھنا ہے بس میں نے کہہ دیا تمہارے بہنوئی سے جو میرا بھائی فیصلہ کرے گا وہی ہوگا۔''

''ارے آپا! مجھے تو تمہاری خوشی عزیز ہے، تم جو کہو گی، میں ایسا ہی کروں گا۔''

''جیتا رہ میرا بھیا! اللہ تعالیٰ اور بھی دے، اتنا دے کہ تمہاری نسلیں بھی سنبھالتے سنبھالتے تھک جائیں۔''

''شاہدہ! کہاں رہ گئی ہو، چائے لے بھی آؤ۔''

''چھوڑو بھائی! کیا کہتے ہو یہ تو ہمیشہ کا رونا ہے۔'' بھابھی کے لیے ایسا انداز، آصفہ تو گھبرا ہی گئیں اور خود بھی اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔

''آؤ آصفہ! آج تو سارا دن کچن میں ہی گزرے گا اور ایک طرح سے تو یہ غنیمت ہی ہے۔'' شاہدہ دھیرے سے بولی تھیں۔

۞ ۞ ۞

عقیل کی منگنی کی ڈیٹ فکس ہوگئی تھی، اس سلسلے میں علیم اور عدیل بھی گئے تھے۔ شاہدہ بیگم کو بھی سرسری انداز میں آنے کو کہا تو گیا تھا، لیکن وہ جا نہیں سکیں، جس پر علیم صاحب کو گلہ بھی تھا۔ لیکن شاہدہ کا کہنا تھا، ساجدہ نے کون سا زور دیا تھا اور میرے جانے نہ جانے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا اور علیم صرف یہ سوچ کر خاموش ہو گئے تھے کہ گھر میں آصفہ اور بچے بھی رہتے تھے۔ ساجدہ نے انہیں بھی نہیں بلایا تھا۔ اگر ہم لوگ انہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے تو یہ محسوس کریں گے۔

تقریب تو ساجدہ کے گھر میں ہونا تھی۔ لیکن ساری رونق جیسے ادھر اتر آئی تھی۔ بینا اکثر عدیل کے ساتھ شاپنگ کرنے کے لیے چلی آتی۔ ساجدہ لڑکی کا جوڑا، زیور، دوسرا سامان علیم تو کبھی عدیل کے ساتھ جا کر خرید آتی۔ اکثر وحید بھی چلا آتا اور رعنا اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتی، لیکن پھر پھپھو کو اس پر بھی اعتراض ہونے لگا تو اس نے ایاز کو فون کر دیا۔

''آپ پلیز آکر مجھے لے جائیں، میں کچھ دن آپ کے گھر رہنا چاہتی ہوں۔'' جس وقت وہ ایاز کی بائیک پر بیٹھ کر اس کے گھر جا رہی تھی۔ اسی وقت عدیل بینا اور روزینہ کو لیے گھر میں داخل ہوا تھا۔

''لو ہمارے ساتھ تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی، یہ کون سگا ہے اس کا، جس کے ساتھ سیروں پر جا رہی ہے۔'' بینا نے کہا تو روزینہ بولی۔

''پوری گھنی میسنی ہے۔ یہ سب بھی توجہ حاصل کرنے کے بہانے ہوتے ہیں۔''

''ابھی اتنی عمر نہیں ہے اس کی۔ سادہ سی لڑکی ہے۔'' عدیل بے ساختہ بول اٹھا۔

اور اس کے بعد کمنٹ بھی ان کا لیکچر جاری رہا تھا۔

''رعنا کہاں گئی ہے؟'' ان کی باتوں کا اثر ہی تھا کہ وہ شاہدہ بیگم سے پوچھ رہا تھا۔

''اپنی خالہ کے ہاں گئی ہے، چند روز کے بعد آ جائے گی۔''

''کیوں ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی؟''

''بھئی۔ جیسے یہ تایا ہیں اسی طرح وہاں اس کی خالہ ہیں اور وہ بہت مانوس ہے اُس گھر سے۔ اور جب آصفہ نے اجازت دی ہے تو ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے۔''

''ہاں ہم تو الو کے پٹھے ہیں، کل کو کوئی مسئلہ ہوا تو پھر الزام کس کے سر آئے گا۔''

''کیسا مسئلہ؟'' وہ اس کے تیور دیکھ کر حیران تھیں۔ عدیل نے جواب نہیں دیا۔ جا کر بینا اور روزینہ کے پاس بیٹھ گیا۔

رعنا کو تو تقریب میں شامل ہونا ہی تھا۔ اس لیے صرف دو روز کے بعد ہی آنا پڑا۔

تقریب کے دوران اندازہ ہوا جاذبہ اور ساجدہ پھپھو کی لڑکیاں ایک دوسرے سے خاصی بے زار بلکہ خار کھائی ہیں اور تو اور رشنا اور شمع سگی بہنیں ہیں۔ رُوٹھی روٹھی سی ہیں؛ خاص کر عدیل کے معاملے میں وہ تینوں ایک دوسرے کو کوئی بھی رعایت دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھیں اور تینوں کو اس سے کیا دشمنی ہے؟ اسے دیکھتے ہی تیوری کیوں چڑھا لیتی ہیں، یہ بات وہ بالکل سمجھ نہیں پائی تھی۔ تقریب کے روز جب وہ ہلکی سی ایمبرائیڈری سے سجا نیلے رنگ کا سوٹ پہن کر تیار ہو کر سامنے آئی تو عدیل نے بے ساختہ ''بہت اچھی لگ رہی ہو'' کہا تھا۔ وہ عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جہاں دامن بچاتے بچاتے بھی جل جایا کرتے ہیں اور دل ذرا ذرا سی بات پر دھڑک اٹھتا ہے۔ عدیل کوئی نظرانداز کر دینے والی ہستی تو نہیں تھا لیکن اپنے اور اس کے درمیان جو فرق تھا وہ اس سے بہ خوبی واقف تھی۔ اور وہ تایا ابا کی شکر گزار تھی۔ شکر گزار ہمیشہ سر جھکا کر رہتا ہے، لیکن عدیل کی آنکھوں میں، اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا جو آج اس کا دل دھڑکا گیا اور وہ ہتھیلیوں میں نمی لیے اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ لیکن کہاں چھپ سکتی تھی، وہ دونیہ کے ساتھ ذرا الگ تھلگ بیٹھی تھی۔

''باجی! یہ وحید بھائی بار بار آپ کی جانب اشارہ کر کے اپنے دوستوں سے کچھ کہہ رہے ہیں۔''

دونیہ کے کہنے پر اس نے سر اٹھایا۔ واقعی وہ چند اپنے جیسے دوستوں میں کھڑا اسی کو دیکھ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ (تقریب کا انتظام کھلے صحن میں شامیانے لگا کر کیا گیا تھا۔) پھپھو ساجدہ کے گھر کے نقشے سے وہ واقف نہیں تھی۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ آگے بڑھ کر ایک دروازہ کھولا اور اس کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ عدیل اور شمع ایک دوسرے کے قابلِ اعتراض حد تک قریب اخلاقی اور مذہبی اقدار کو پامال کرتے۔۔۔

وہ اندھیرے میں تھی، دوسرے وہ جس عالم میں تھے، انہیں کہاں ہوش تھا۔ اس کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا اور وہ بے جان قدموں کے ساتھ واپس پلٹ آئی۔ دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا، اسے سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی، بار بار سر کو جھٹکتی۔ لیکن وہ منظر ذہن سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔

خوب صورت چہروں والے یہ مکروہ کردار کے مالک لوگ۔۔۔ اور وہ تو اسی کے گھر میں رہتی

ہے۔۔۔

''رعنا کیا ہوا ہے تمہیں؟ طبیعت خراب ہو رہی ہے؟'' شاہدہ بیگم قریب چلی آئیں۔

''تائی امی!'' وہ ان سے لپٹ گئی۔

''ارے تم تو کانپ رہی ہو، چلو اندر چل کر لیٹو۔''

''نہیں نہیں۔ میں اندر نہیں جاؤں گی، پلیز مجھے یہیں بیٹھا رہنے دیں۔''

وہ انہیں کیا بتاتی، دوپٹے کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر وہ غیر شعوری طور پر اپنے گرد حفاظتی حصار بنا رہی تھی اور پھر یہ کوشش وہ ہمیشہ کرنے لگی، دوپٹا سر پر اور اس کے جسم پر ہر وقت بہت اچھی طرح لپٹا دکھائی دینے لگا، وہ لاؤنج میں ایسے وقت میں آنے سے گریز کرتی جب عدیل وہاں موجود ہوتا۔ وہ کچن میں مرادو کے ساتھ کام کرواتی رہتی یا پھر اپنے کمرے میں جا کر پڑھتی رہتی، اس کا جی چاہتا تھا وقت پَر لگا کر اڑ جائے وہ جلد از جلد تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔

۞ ۞ ۞

''کیا بن رہا ہے؟'' وہ کچن میں کھڑی چاول چن رہی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا کب عدیل آ گیا، وہ تو ڈر گئی۔

''کن خیالوں میں گم تھیں؟'' اس کے ڈرنے پر وہ ہنس پڑا تھا۔ رعنا آہستگی سے اس کے قریب سے ہٹ گئی اور چاولوں کا تھال بھی سلیب سے اٹھا لیا۔

''کہاں رہتی ہو دکھائی ہی نہیں دیتیں۔'' اس نے نوٹس نہیں لیا اس کے کترانے کا اور سلاد کی پلیٹ سے ٹماٹر اٹھا کر کھانے لگا۔

''ادھر ہی ہوتی ہوں، پڑھتی رہتی ہوں۔'' وہ پھر چاولوں کی جانب متوجہ ہوئی۔

''کوئی مشکل تو نہیں پیش آ رہی، تم میری ہیلپ لے سکتی ہو، کھانا بنانے میں نہیں، اسٹڈی میں۔''

''جی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم ہنستی بولتی نہیں ہو؟'' پھر جیسے یاد آیا، بولا۔ ''نہیں نہیں ہنستی بولتی تو ہو، میں پوچھنا چاہتا تھا ہم سے ہنسنا بولنا منع ہے کیا؟''

عدیل نے ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ عورت کا گھبرانا، کترانا، مرد کو اس کی مردانگی کا احساس دلاتا ہے۔ عدیل نے بھی مسکراتے لبوں کے ساتھ گہری سانس لیتے ہوئے یہ منظر دیکھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا اس کا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔

''بہت بھولی، بہت سویٹ ہو۔ کبھی کبھی تو بہت حیرت ہوتی ہے مجھے تم پر۔''

''ہا۔۔۔ ہاتھ تو چھوڑ دیں، پلیز پلیز ایسے مت کریں۔'' اس میں اس وقت اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ کھینچ لیتی۔

''ارے رونے کیوں لگی ہو؟'' اور اس کا ہاتھ اس کے معصوم کنوارے اَن چھوئے چہرے پر آ گیا، اس نے رعنا کے آنسو چُن لیے۔ اور اس روز شدید سردی کے موسم میں پتا نہیں کتنی بار رعنا نے منہ دھویا۔ لیکن گندگی دور ہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ، وہی ہاتھ اس روز تنہائی میں شمع کے ساتھ۔۔۔ اور رعنا کانپنے

لگتی۔

❁ ❁ ❁

ایک سال آخر بیت ہی گیا۔ عدیل کسی کام کے سلسلے میں باہر چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد رعنا کے سر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا۔ اس کے جانے کے بعد دونوں پھپھوؤں اور ان کی لڑکیوں کی آمد بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ اس ایک سال نے رعنا کو بہت کچھ دیا، جس میں سب سے اہم اعتماد تھا، اور اسے بااعتماد لڑکی بنانے میں انیلا، روحی اور ایاز بھائی کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ کبھی ڈبیٹس میں حصہ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایاز بھائی نے تقریر لکھ کر دی اور روحی نے تیاری کروائی تھی۔ اسے سیکنڈ پرائز ملا اور پھر تو دھن سوار ہوگئی، مجھے آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ عورت کمزور نہیں ہے۔ رعنا کو شمع نہیں بننا، جسے مرد جب چاہے جیسے چاہے محبت کا جھانسہ دے کر استعمال کرے، وہ آج بھی اس منظر کو نہیں بھولی تھی، وہ منظر آج بھی اسے مضطرب کرتا تھا اور اسے اپنی پھپھو کی بیٹیاں اتنی ہی بری لگتی تھیں جتنا عدیل۔

باپ کی دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والا اپنی خوبروئی کے گھمنڈ میں سب کچھ کر گزرنے والا سطحی سوچ کا مالک بڑا عام سا مرد۔ اس نے اپنے باپ سے کچھ نہیں لیا۔ سوائے مردانہ وجاہت کے، لیکن کردار کا گھناؤنا پن صورتوں پر مکروہ تاثر پیدا کر دیتا ہے۔

❁ ❁ ❁

وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ جس نے اس کی شخصیت میں اعتماد پیدا کیا تھا۔ لیکن وہ اپنی قدروں کو کبھی نہیں بھولی تھی۔ تایا ابا کے سامنے ہمیشہ سر پر دوپٹا اوڑھ کر اور نظر جھکا کر آتی تھی۔ گھر کے کاموں سے اس نے کبھی جی نہیں چرایا تھا کہ اسے کبھی اپنے عورت ہونے پر افسوس یا شرمندگی نہیں ہوئی تھی۔ مردوں والے کام وہ لڑکیاں کرتی ہیں، جو عورت کو مرد سے کمتر جانتی ہیں۔

اب ایک سال بعد عدیل واپس آ رہا تھا۔ تایا ابا بے حد خوش تھے، جاذبہ اور ساجدہ کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ وہ دونوں گھبرا گئیں۔

''اے ہے بھابھی! بس یہی کچھ پکوایا ہے۔ اتنے عرصے کے بعد میرا بچہ گھر آ رہا ہے اور یہاں پر نہ کوئی خوشی، نہ کوئی اہتمام۔ مجھے ہی بتا دیا ہوتا، میں گھر سے کچھ پکوا کر لے آتی۔'' ساجدہ کی بات کا شاہدہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ ویسا ہی تھا، شوخ، زندہ دل اور وجاہت میں تو مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ بینا، رشنا اور شمع کے ساتھ باتیں کرتا ان کی باتوں پر ہنستا۔ بقول شاہدہ بیگم ''میرا بچہ تو بالکل شہزادہ لگ رہا ہے۔'' تایا ابا بھی اس کی واپسی پر بے حد خوش تھے اور اپنے معمول کے خلاف بہت ہنس بول رہے تھے۔

وحید اسے بتا رہا تھا کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء پر ہمارے عقیل بھائی کی منگنی ختم ہوگئی تھی۔ آج کل لڑکی کی تلاش جاری ہے۔

''کیسی ہو رانی؟'' وہ چائے کے برتن سیٹ کر رہی تھی، جب عدیل کچن میں چلا آیا اور اس کے طرزِ مخاطب پر وہ چونک گئی۔

''بہت یاد آتی تھیں تم اور مجھے ایک ڈر بھی تھا، پتا نہیں تم اب بھی ویسی ہی دوپٹے میں لپٹی شرمیلی سی

لڑکی رہی ہوگی یا زمانے کی ہوا کا شکار ہوگئی ہوگی۔ لیکن تم اب بھی وہی ہو اور مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''آپ چلیں عدیل بھائی! میں چائے لا رہی ہوں۔'' ناگواری کے احساس کو چھپا کر اس نے سہولت سے کہا تھا۔

''اے، اے خبردار! آئندہ بھائی مت کہنا۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔

''کہاں رہ گئے ہو عدیل! توبہ یہ بھی کوئی جگہ ہے۔'' شمع بولتی ہوئی اس کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ پھر سرد سی نگاہ رعنا پر ڈال کر بولی۔

''کیا کر رہے تھے تم یہاں؟''

''یہاں رعنا کے سوا کون ہے؟ میں تو اسی سے باتیں کر رہا تھا۔''

''ایسی کون سی خاص باتیں ہیں جو سب کے درمیان نہیں ہوسکتی تھیں۔'' وہ جرح کر رہی تھی۔

''تم کیوں چلی آئیں؟''

''تمہیں دیکھتے ہی آئی ہوں، اب آ بھی چکو یا یہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔''

''شمع! تم جاؤ اور مجھے یہ جاسوسی بالکل پسند نہیں۔'' وہ ایک دم اجنبی سا بن گیا تھا۔

یہاں سے جانے کے بجائے شمع نے بھی برتن ٹرالی میں رکھنے شروع کر دیے تو وہ خود باہر نکل گیا۔

''کیا کہہ رہا تھا تم سے؟'' شمع خاصے رعب سے پوچھ رہی تھی۔

''کہہ رہا تھا ان تینوں لڑکیوں میں سے کون سی بہتر لگتی ہے؟''

''پھر۔۔۔ پھر تم نے کیا کہا؟'' وہ بے تابی سے بولی۔

''ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔'' اس نے ابرو چڑھا کر شمع کی جانب دیکھا، پھر سر جھٹک کر ٹرالی لے کر چل پڑی۔

چائے کے دوران شمع خوامخواہ رعنا کی مدد کے لیے اٹھتی رہی، کبھی کسی کو پلیٹ تھماتی، تو کبھی اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر خود آگے پہنچاتی۔ چائے بھی اسی نے بنائی اور چائے کے دوران ہی آئندہ کے پروگرام بھی بنتے رہے۔ دو روز کے بعد جاذبہ پھپھو کے ہاں کھانا تھا تو اس سے اگلے روز ساجدہ پھپھو نے انوائٹ کیا تھا اور ساتھ یہ بھی کہا تھا۔

''دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں، سامان لے کر آنا۔ کچھ روز تو اپنے ہاں رکھوں گی۔''

''ہاں بھئی چاند! بہت اداس ہیں ہم تمہارے لیے، میں اور بچیاں تو اپنے کچھ کپڑے لے کر آئی ہیں، اب یہ دو روز ادھر ہی گزاریں گے۔''

جاذبہ کی چالاکی پر بینا اور ساجدہ کلس کر رہ گئیں۔

❁ ❁ ❁

آنے والے دنوں میں دھماکا تو ساجدہ پھپھو نے کیا تھا۔ وہ عقیل کے لیے رعنا کا رشتہ چاہ رہی تھیں، جہاں اس خبر نے امی اور تائی امی کو حیران پریشان کیا تھا، وہاں وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اسے ان

دونوں خواتین سے عجیب سا خوف محسوس ہوتا تھا۔ ان کی موجودگی میں وہ وحشت زدہ رہتی تھی اور عقیل۔۔۔ اسے سوچ کر ہی جھرجھری سی آ گئی۔

''اگر تایا ابا نے یہ رشتہ قبول کرلیا تو کیا امی یا میں انکار کرسکیں گی؟'' مگر ان کے انکار سے پہلے عدیل نے اس رشتے میں ہزار نقص گنوادیے۔

''میں تو خود بھی حامی نہیں ہوں۔ عقیل کو جانتا ہوں۔ کوئی پرسنالٹی نہیں ہے اس کی۔ ماں، بہنوں نے دبا کر رکھا ہے اسے۔''

''رعنا تو بڑی ذہین اور پیاری بچی ہے۔ ٹھیک ہے، ساجدہ نے بیٹے کی محبت میں رشتہ مانگ لیا، لیکن ہم اسے قبول نہیں کرسکتے۔''

یہ جواب تایا ابا کا تھا اور اس کے دل سے سارے خوف مٹ گئے تھے۔ جہاں ساجدہ کو انکار سن کر بے حد سبکی کا احساس ہوا تھا۔ وہیں عقیل بھی جواب ہاں میں سننے کا یقین لیے بیٹھا تھا۔

''تم لوگوں نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔ تم سمجھتی کیا ہو خود کو؟'' مسلسل بیل ہونے پر اس نے ریسیور اٹھایا تو اس کی آواز سن کر وہ برس پڑا تھا۔

''ویسے عدیل! ماموں نے رعنا کی بات ساجدہ خالہ کے ہاں نہ پکّی کر کے غلطی ہی کی ہے، بے سہارا لڑکی ہے۔ اچھا تھا ٹھکانے لگ جاتی۔'' شمع ان کے یہاں آئی ہوئی تھی اور اس نے اپنے کانوں سے اسے عدیل سے یہ کہتے سنا تھا۔

''وہاں تو انکار ہو گیا ہے، تم کہو تو تمہاری بات عقیل سے پکّی کروادیتا ہوں۔''

یہ سن کر وہ غصے کا اظہار کرنے لگی تھی اور عدیل ہنس رہا تھا۔

رعنا دروازے سے ہی پھر پلٹ کر کچن میں آ گئی تھی۔ وہ تب تک لاؤنج میں نہیں گئی، جب تک ان کی باتوں کی آوازیں آتی رہیں۔

۞ ۞ ۞

''رانی! آج شاہی ٹکڑے بناؤ۔ تم بہت مزے کے بناتی ہو۔''

''پلیز مجھے رانی مت کہا کریں۔ میرا نام رعنا ہے۔ سب مجھے اسی نام سے بلاتے ہیں۔''

''بلانے دو، لیکن میری تو تم رانی ہی ہو۔''

''لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ لہجے کو مزید سخت بنا کر بولی تھی۔

''یہ دیکھو۔ میں کیا لایا ہوں تمہارے لیے۔ چھوڑو نا پڑھائی تو ہوتی رہتی ہے، ادھر دیکھو۔'' اس نے بے تکلفی کی انتہا کرتے ہوئے اس کے گال پر ہاتھ رکھا اور چہرہ اپنی جانب موڑ لیا۔ رعنا کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''آپ انہیں لے جایئے اور آئندہ ایسی زحمت مت کیجیے گا۔''

عدیل کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''تمہیں میں اچھا نہیں لگتا، شک تو مجھے پہلے بھی تھا۔ آج تم نے یقین دِلا دیا، مگر خیر مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ تمہیں میں نہیں تو کون اچھا لگتا ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ میں تمہیں اپنانے کا ارادہ رکھتا

ہوں۔''

''میری مرضی کے خلاف ممکن نہیں۔'' اندر کی عورت تن کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''آ۔۔۔ اچھا جی!'' وہ کھل کر ہنسا تھا۔ رعنا کے تاثرات نہیں بدلے تو ہاتھ اٹھا کر لاپروائی سے بولا۔

''چلو دیکھیں گے اور ہاں یہ ٹاپس میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے پہناؤں گا، یاد رکھنا۔''

موبائل کی مخصوص ٹون بجنے لگی تھی۔ عدیل نے جیب سے سیل نکالا، بینا بات کررہی تھی۔ عدیل کا لہجہ ہی بدل گیا۔

''دیکھو تیار ہونے میں زیادہ دیر نہ لگانا۔''

''او یار! تجھے ضرورت ہی نہیں ہے نا لمبے چوڑے میک اپ کی اور سن آج کھانا میری پسند کا ہوگا۔''

''ہاں۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے آرہا ہوں بابا!''

''پاگل دی بچی! اتنا میک اپ تھوپ لیتی ہے کہ بندریا لگنے لگتی ہے۔'' موبائل آف کر کے تبصرہ کرتا وہ باہر نکل گیا تھا۔

''کبھی یہ تین کزنز اور کبھی دوسری بہت سی لڑکیاں کال کررہی ہیں۔ ملنے کو بے تاب ہیں۔ عورت نے خود کو اتنا ارزاں کیوں کرلیا ہے اور یہ ابھی کیا کہہ کر گیا ہے۔ میرے خدا! رحم کر میرے حال پر، تایا ابا کا لاڈلا ہے اور ان کے بہت احسانات ہیں ہم پر، مگر مگر میں خود کو داؤ پر کیسے لگا سکتی ہوں۔ ایک بے کردار، خود پسند مرد کے ساتھ زندگی گزارنا تو بذاتِ خود ایک سزا ہے، میں اپنے لیے یہ سزا کیسے تجویز کرلوں۔'' وہ سوچ سوچ کر لرز رہی تھی۔

۞ ۞ ۞

عدیل جان گیا تھا وہ اس سے کترانے لگی ہے اور وہ اب جان بوجھ کر اس کے قریب آتا اور ذو معنی جملہ بول جاتا تھا۔ رعنا خود سے بے زار ہوئی جاتی تھی۔ اسے یہی حل سوجھا کچھ دنوں کے لیے خالہ کے گھر چلی جائے۔ امی سے اجازت لے کر ایاز بھائی کو فون کیا اور بیگ میں ضرورت کی چیزیں اور کپڑے رکھنے لگی۔

اسی وقت عدیل کمرے میں آیا اور آصفہ بیگم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''کیا حال ہے چچی! کیا آپ لوگ مجھ سے پردہ کرنے لگے ہیں۔ نظر ہی نہیں آتے۔'' وہ اسے جتا رہا تھا۔

''نہیں بیٹا! ہم تو ادھر ہی ہوتے ہیں۔ اسی گھر میں، ہاں البتہ تم گھر میں کم ہی ہوتے ہو۔''

''کہاں کی تیاری ہے۔'' اسے بیگ تیار کرتے دیکھا تو پوچھنے لگا۔

''وہ رعنا چند روز کے لیے اپنی خالہ کے ہاں جانے کو کہہ رہی ہے۔''

''کیوں خیریت تو ہے؟'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''ہاں ہاں اللہ کا فضل ہے۔ بس اس کا دل چاہ رہا تھا وہاں لڑکیاں ہیں نا، اسی لیے دل لگتا ہے اس کا۔''

"آدھا دن کالج میں لڑکیوں کے ساتھ ہی گزار کر آتی ہے۔" اس نے ان کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

وہ اس کی خفگی کی وجہ بالکل نہیں سمجھیں۔

"چلو، میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" کچھ سوچ کر وہ کہہ رہا تھا۔

"نہیں نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"ہاں بیٹا! ایاز کو فون کیا ہے اس نے، بس آتا ہی ہوگا۔" عدیل چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

"شاید عدیل کو تمہارا آپا کے ہاں جا کر رہنا پسند نہیں۔"

"اور یہ عدیل صاحب جو کچھ کرتے پھرتے ہیں۔ کیا ہماری ناپسند، پسند کو دیکھ کر کرتے ہیں۔ امی! جب ہر شخص اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہے تو ہم کیوں نہیں۔"

"کیا بات ہے رعنا! تم کس طرح بول رہی ہو۔ کیا تمہارا عدیل کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے؟"

"مجھے اس کا اپنے معاملے میں ٹانگ اڑانا بالکل پسند نہیں۔ میں کپڑے تبدیل کر لوں۔ ایاز بھائی آتے ہی ہوں گے۔" وہ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کمرے سے نکل گئی مگر ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ عدیل گیا نہیں تھا۔ دروازے کے باہر ہی رُک گیا تھا۔

"ہونہہ! چلو اچھا ہے، سب سن لیا ہے۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

خالہ کے ہاں ہمیشہ کی طرح کھلے دل سے استقبال کیا گیا۔ رات یہ سب دیر تک جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ آج کل خالہ ایاز بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں۔ وہ اب جلد ہی ان کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں، یہی موضوع گفتگو رہا اور ان کی باتیں سن کر مسکراتے ایاز بھائی اسے بہت اچھے لگے۔ صبح وہ ایاز بھائی کے ساتھ کالج گئی تھی۔ واپسی پر البتہ کہہ دیا تھا کہ اس کی دوست کا گھر ان ہی کی کالونی میں ہے، وہ گاڑی پر آئی ہے۔ لہٰذا وہ بھی اس کے ساتھ آ جائے گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ابھی دوسرا پیریڈ ہی آف ہوا تھا کہ اسے اطلاع ملی، پرنسپل کے آفس میں کوئی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اور آفس میں عدیل کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"رعنا آنٹی آصفہ چچی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم جلدی سے میرے ساتھ چلو۔"

ماں کی بیماری کا سن کر قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اس نے کیسے چھٹی کی اجازت لی، کس طرح عدیل کے ساتھ باہر آ کر اس کی گاڑی میں بیٹھی، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ سارا دھیان ماں کی طرف تھا۔

"کیا ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

"ہوں!" اس نے مختصراً کہا تھا، حالانکہ یہ اس کی عادت کے خلاف تھا۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا وہ گھر کی جانب نہیں جا رہی تو عدیل سے پوچھنے لگی۔

"چچی اسپتال میں ہیں؟" اس نے نگاہ سامنے روڈ پر رکھتے اور رش ڈرائیونگ کرتے جواب دیا تو وہ رونے لگی۔

"یا اللہ! میری ماں کو کچھ نہ ہو، مالک رحم کر ہمارے حال پر۔" وہ روتی رہی اور چادر سے آنسو پونچھتی رہی۔ عدیل کی غیر معمولی چپ اسے کچھ انہونی کا احساس دلا رہی تھی۔ پھر آبادی ختم ہوئی اور ایسا علاقہ شروع ہوا جہاں تعمیر جاری تھی، یہ کسی نئی آبادی کے آثار تھے۔

ایسی ہی زیر تعمیر ایک عمارت میں جا کر اس نے گاڑی روک دی۔

"یہ تم۔۔ یہ اسپتال تو نہیں ہے، کہاں لائے ہو مجھے۔" وہ سخت خوف زدہ ہوگئی۔ عدیل نے بازو سے پکڑ کر اسے گاڑی سے اتارا اور بولا۔

"چلّانا مت، ویسے بھی تم دیکھ رہی ہو یہاں دور، دور تک چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔ چلو جلدی چلو۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔" وہ رونے اور چلّانے لگی۔

عدیل نے بازو نہیں چھوڑا، کھینچتا ہوا عمارت کے تعمیر شدہ کمروں میں سے ایک میں لے گیا، یہاں تین اور لڑکوں کو دیکھ کر وہ تو مارے خوف کے رونا اور چلّانا ہی بھول گئی۔

"آ گئے ہیں کیا؟" عدیل نے ان سے پوچھا۔

"بس پہنچنے والے ہیں ابھی عاقب کا فون آیا تھا۔" وہ تینوں اٹھ کر باہر نکل گئے۔

"مجھے کیوں لائے ہو؟" سسکنے لگی۔

"اتنی بھولی ہو۔ سمجھ میں نہیں آیا کیوں لایا ہوں؟"

"پلیز رحم کرو میرے حال پر، کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟"

"بس۔۔۔ اتنی سی اکڑ تھی، ارے جب تم لڑکیاں اتنی سی بات پر پیر پکڑنے کو تیار ہو جاتی ہو تو اتراتی کس بات پر ہو۔ کس برتے پر بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں، کیوں بھولتی ہو اپنی اوقات۔ تم دل بہلاوے کی چیز ہو، مرد کے عیش کے سامان میں سے سب سے اہم سامان، یاد رکھو۔ چور چور کر کے پھینک سکتا ہوں تمہیں۔ اس سر کو ہمیشہ کے لیے جھکا سکتا ہوں، لیکن تسلی رکھو۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ نکاح خواں کو بلوایا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔"

"نک۔۔۔ نکاح!" اس نے بڑی دقت سے یہ لفظ ادا کیا۔

"کیوں اعتراض ہے نکاح پر، ویسے ہی راضی ہو؟" وہ خباثت سے ہنسا تھا، پھر بولا۔

"نکاح کر رہا ہوں۔ تمہیں اعتراض تھا نا! تم انکار کا ارادہ لیے بیٹھی تھیں، بس اسی لیے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ یہ نکاح خفیہ رہے گا، گھر میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ یہ تو بس اس لیے کر رہا ہوں کہ تم میری پابند ہو جاؤ۔ انکار نہ کر سکو، باقی جب ابا چاہیں تب کر لیں گے اور سنو، گھر جا کر واویلا کرنے کی کوشش مت کرنا، ثبوت کوئی نہیں ہے تمہارے پاس۔ اگر واویلا کرو گی بھی تو نقصان اپنا ہی کرو گی جو شادی سال ڈیڑھ سال کے بعد ہونا ہے، وہ ابا فوراً کر دیں گے اور اگر انہوں نے نہ بھی کی تو طلاق دینے سے پہلے میں اپنا حق تو ضرور وصول کروں گا۔ تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔"

وہ ماؤف ذہن لیے بیٹھی مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ کب نکاح ہوا، اس نے کہاں سائن کیے، کچھ ہوش نہیں تھا۔

''مبارک ہو۔'' اس نے مٹھائی کا ٹکڑا زبردستی اس کے منہ میں ڈالا تو اسے ابکائی آ گئی۔

''دل بے ایمان ہو رہا ہے اب تو چیز بھی اپنی ہو، لیکن وقت کا تقاضا کچھ اور ہے، تمہیں کالج کے گیٹ پر اتارنا ہے۔''

وہ اسے تھام کر گاڑی تک لانا چاہتا تھا۔ لیکن اپنی جانب بڑھنے والے اس ہاتھ کو دیکھ کر جیسے اس کی ساری حسیں بے دار ہو گئیں۔ وہ خود اپنی جگہ سے اٹھی اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔ یہاں سے کالج تک کا فاصلہ اور کالج سے گھر تک کا فاصلہ، دل پر جو بیت رہی تھی وہی جانتی تھی، جی چاہتا تھا چیخ چیخ کر روئے اور لوگوں کو بتائے اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، لیکن وہ جانتی تھی عدیل جیسا شخص اگر مکر گیا تو پھر اس کی زندگی کیا ہو گی۔ وہ تو اس نکاح کا کوئی ثبوت اپنے پاس نہیں رکھتی۔ اس کے حق میں بہتر ہوا کہ روحی اور انیلا بازار گئی ہوئی تھیں۔ خالہ کچن میں تھیں۔ ایاز بھائی تو آفس سے چار، پانچ بجے کے قریب ہی لوٹتے تھے۔ تکیے میں منہ چھپا کر وہ خوب روئی اور ساری چیخیں اسی میں دفن کر دیں۔ وہ ماں کے پاس جانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ خیال کہ وہاں وہ بھی موجود ہو گا اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتا تھا۔ اس پر کپکپی طاری ہونے لگی اور کچھ دیر بعد تیز بخار نے آ لیا۔ ایاز پڑوس میں رہنے والے ڈاکٹر صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے دوا لکھ کر دی۔ رات دس بجے تک اس کا بخار خاصا کم ہو چکا تھا۔ لیکن وہ بری طرح نڈھال دکھائی دیتی تھی۔

گیٹ کی بیل بج رہی تھی، اس وقت وہ سب اسی کے گرد جمع تھے اور اسے کچھ نہ کچھ کھا لینے کے لیے کہہ رہے تھے، ایاز گیٹ پر گیا۔ واپسی پر عدیل بھی ساتھ تھا۔ وہ سب تو تپاک سے ملے، لیکن رعنا کو لگا اس پر ایک بار پھر کپکپی طاری ہونے لگی ہے۔

''چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

''اسے بہت تیز بخار رہا ہے۔ آج کا دن ریسٹ کرنے دو، کل ایاز چھوڑ آئے گا۔'' خالہ سمجھا رہی تھیں۔

''نہیں اسے آج ہی جانا ہے۔ مجھے ابا نے بھیجا ہے۔''

''میں تایا ابا سے خود بات کر لیتی ہوں، انہیں بتا دیتی ہوں کہ ابھی میں آنا نہیں چاہ رہی۔'' اس کے جھوٹ پر وہ خاموش نہیں رہ سکی۔

''اچھا!'' عدیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ جتایا تھا۔

''ہاں۔ میں کل ہی آؤں گی۔'' اس کا لہجہ اٹل تھا۔

عدیل کچھ دیر بیٹھا۔ خالہ چائے اور کھانے کے لیے کہتی رہی، لیکن وہ نہیں مانا، یہاں سے جانے کے بعد اس نے رعنا کو فون کیا تھا۔

''تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ میری بات مانتی رہو، ورنہ تم پھر مجھے تو جانتی ہو، ہاں میں یہ وعدہ کرتا ہوں، اگر تم میری بات مانتی رہیں تو میں رخصتی تک انتظار کروں گا، کل آؤں گا تمہیں لینے کے لیے۔ تیار رہنا اور یہ بھی سن لو، مجھے تمہارا ان رشتے داروں کے گھر جا کر رہنا بالکل پسند نہیں ہے۔ آئندہ اس سلسلے میں بھی احتیاط رکھنا۔''

نفرت تو لہو بن کر اس کے جسم میں دوڑ ہی رہی تھی اور اب ایک اور جذبے نے بھی سر اٹھایا تھا۔

''میں دیکھتی ہوں عدیل صاحب! کہاں تک جاتے ہو تم، عورت کو مرد کی عیاشی کے لیے پیدا کی گئی حقیر ہستی کہا تھا نا تم نے، تو بس یہ میرا عہد ہے یہ حقیر ہستی تمہیں چین سے جینے نہیں دے گی، اپنے لیے دیکھے میرے تمام خواب تم نے جلا کر راکھ کر دیے تو اب میری زندگی کا مقصد تمہیں بھی خوشیوں سے محروم کر دینا ہی ہو گا۔'' وہ خود سے عہد باندھ رہی تھی۔

❀ ❀ ❀

اگلے روز وہ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔

''اتنی جلدی کیا پڑ گئی ہے؟'' خالہ نے شکوہ کیا۔

''اب انیلا باجی اور روحی آپی تو پڑھانے کے لیے اسکول جائیں گی۔ ایاز بھائی اپنے آفس، آج خالو جان گھر پر ہیں، میں تو کمرے سے نکلتے ہوئے بھی ڈروں گی۔ بہتر ہے ابھی چلی جاؤں۔''

بات معقول تھی۔ واقعی خالو کا رویہ اس کے ساتھ بہت سرد ہوتا تھا۔ سو ایاز اسے باہر ہی سے ڈراپ کر کے چلا گیا۔

وہ سیدھی اپنے پورشن میں آئی، دونوں بہن، بھائی اسکول جا چکے تھے، امی سے کہہ دیا۔

''میری آمد کی اطلاع فی الحال کسی کو نہ دیں۔ ناشتا میں کر کے آئی ہوں، طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، سونا چاہتی ہوں۔''

''تایا ابا کو سلام تو کر آؤ۔''

''شام کو مل لوں گی، سر میں بہت درد ہے۔'' وہ اپنے کمرے میں جا کر دروازہ لاک کر کے لیٹ گئی۔

دوپہر میں جب عدیل گھر آیا۔ وہ کچن میں تھی۔ اس کی آواز سن کر وہ لاؤنج میں چلی آئی کہ اسے تنہائی کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

''روٹی بن گئی ہے بیٹا تو کھانا لگا دو۔''

''جی اچھا امی!'' وہ کہہ کے بھی بیٹھی رہی، جب عدیل چینج کرنے اپنے کمرے میں گیا، تب اس نے کھانا میز پر لگایا۔ عدیل نے سب سے نظر بچا کر اسے دو، تین بار گھور کر دیکھا، لیکن وہ نظر انداز کر کے کھانا کھاتی رہی، لیکن جیسے ہی تایا ابا ٹیبل سے اٹھے وہ ضبط نہیں کر سکا۔

''میں نے کہا تھا تم سے کہ میں پک کر لوں گا، پھر کیوں چلیں آئیں؟''

''میں بھول گئی تھی۔'' اس نے آرام سے کہا۔

''کیا؟ بھول گئی تھیں تم؟'' وہ خاصا اونچا بول گیا تو شاہدہ اور آصفہ حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

''جواب دو میری بات کا۔'' اسے آرام سے کھانا کھاتے دیکھ کر اس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔

''کہا تو ہے بھول گئی تھی۔''

''کیوں بھوسا بھرا ہوا ہے سر میں؟''

"ایا، وا عدیل! تم ایسے کیوں بات کر رہے ہو؟" شاہدہ بیگم خاموش نہیں رہ سکیں۔

وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا، کھانا بھی نہیں کھایا۔

"تم بتاؤ، بات کیا ہوئی ہے؟" دونوں اس سے پوچھنے لگیں۔

"یہ ہر کسی کو اپنا ملازم سمجھتے ہیں، ملازم بھی کیا بلکہ نچلے درجے کی مخلوق خیال کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے تایا ابا کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ ان کی ہر بات ماننا ان کے ہر حکم پر سر جھکانا ہمارا فرض بنتا ہے۔"

"ارے یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو رعنا! علیم تمہیں اتنا ہی چاہتے ہیں جتنا کہ سگی بیٹی کو چاہا جا سکتا ہے۔ میں علیم سے بات کرتی ہوں۔ تم اس طرح مت سوچو، دراصل عدیل کا دماغ اس کی پھپھیوں اور ان کی بیٹیوں نے خراب کر رکھا ہے۔"

اور شاہدہ بیگم نے واقعی عدیل کی شکایت علیم صاحب سے لگا دی۔ شام کی چائے پر اس کی پیشی تھی اور سب کے سامنے تایا ابا نے اسے سخت سست سنائی تھیں، آخر میں کہا تھا۔

"آئندہ کبھی رعنا سے اونچی آواز میں بات بھی نہ کرنا۔"

"ابا! آپ اسے منع نہیں کرتے یہ جو۔۔۔"

"میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا، یاد رکھو، یہ شمع، رشنا یا بینا نہیں ہے۔ ان تینوں کو ماؤں نے بے جا آزادی دے کر بگاڑ رکھا ہے۔ رعنا میری بیٹی ہے۔"

رشنا اور شمع واقعی ماں، باپ کی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ غیر ملکی فلموں نے ان کے مزاج پر گہرا اثر چھوڑا تھا اور اب انہیں اپنی بہت سی روایات معیوب دکھائی دیتی تھیں ان کے نزدیک زندگی کا مزا ہلے گلے اور موج مستی میں تھا۔ لباس سے لے کر کھانا پینا، بول چال سب بدیسی تھا۔ بینا پر بھائیوں کی طرف سے کچھ پابندی تھی، اس لیے وہ ان کے مقابلے میں تھوڑی پیچھے تھی، جس کا اسے بے حد قلق تھا اور وہ ان دونوں سے خار کھاتی تھی۔

❁ ❁ ❁

عدیل کے معمولات اب بھی وہی تھے ہاں اب دن کے اوقات میں اس کا وقت باپ کے آفس میں گزرنے لگا تھا کہ یہ ان کی ہدایت تھی، مگر وہ دو بجے کے قریب وہاں سے نکل آتا تھا اور پھر رات تک اس کے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا۔

جو کچھ اس نے رعنا کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد رعنا کو زندگی بے مقصد لگنے لگی تھی، بہت دنوں تک وہ کتابوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکی۔ اس کے دماغ میں ایک فلم سی چلتی رہتی تھی اور ہر سوچ انتقام پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ کبھی عدیل کو زہر دینے کا خیال آتا تو کبھی کسی اور طریقے سے اسے تکلیف میں مبتلا کرنے کا سوچتی۔

ایک ہی بات بار بار سوچتے آخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ زندگی ختم نہیں ہوئی۔ اسے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے اور اس کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے لہٰذا وہ ایک بار پھر پڑھائی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

ان ہی دنوں یہ خوش خبری ملی کہ عدیل کو تایا ابا اسلام آباد بھیج رہے ہیں، وہ نئی برانچ کھول رہے تھے

اور اس کی نگرانی کے لیے اسے اب اسلام آباد رہنا ہوگا۔ کتنا اچھا ہو گیا تھا، ورنہ اس کی موجودگی میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے طمانیت سے سوچا تھا۔

اس کی تینوں کزنز اور اس شہر میں رہنے والی انہی جیسی اس کی دوست لڑکیاں بے حد اداس تھیں۔

رات گیارہ بجے دونوں بہن بھائی سو چکے تھے امی بھی یقیناً اپنے کمرے میں سو رہی تھیں، جبکہ وہ نوٹس تیار کرنے میں لگی تھی، اسے پتا ہی نہیں چلا وہ کب کمرے میں آیا اور بہت قریب آ کر ہاتھ اس کی گردن پر رکھ دیا، رعنا ڈر کر اچھل پڑی۔

"تمہیں ڈرنا ہی چاہیے کہ یہ میں ہوں۔" وہ اب سامنے آ گیا۔ اور رعنا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، آج وہ کیسے اور کیوں دروازہ لاک کرنا بھول گئی۔ حالانکہ بہت محتاط رہنے لگی تھی۔

"جا رہا ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ من مانیاں شروع کر دو، اور یہ زیادہ پڑھائی وڑھائی کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نے تم سے نوکری تھوڑا ہی کروانی ہے۔"

اس نے گھبراہٹ میں کھڑی ہو جانے والی رعنا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ چھوڑو مجھے۔۔۔" خوف سے اس کی آواز بند ہونے کو تھی۔

"بیوی ہو میری۔ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" وہ مسکرایا تھا۔

رعنا نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ "کبھی مسکرا کر پیار سے بھی دیکھ لیا کرو، ترس گیا ہوں تمہاری آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنے کے لیے۔ دیکھو، جو کچھ بھی کیا اسی لیے کیا ہے نا کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ مجھے ڈر تھا کہیں چچی تمہیں اپنے بھانجے ایاز سے منسوب نہ کر دیں کہ یقیناً تمہاری بھی یہی خواہش تھی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ تم میرے ساتھ خوش رہو گی۔ وہ ایاز بھلا کیا دے سکتا ہے تمہیں۔"

(اس نے اسے ایاز سے متعلق غلط فہمی سے نکالنا ضروری نہیں سمجھا) "ارے خوش قسمت ہو جو میری بیوی بن گئی ہو، پتا ہے آدھے شہر کی لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر۔"

(تو یہ ابھی اس شہر پر ایسا بھی عذاب نہیں آیا۔ ہاں چند بے راہ رو ضرور ٹائم پاس کرتی ہیں۔) وہ صرف سوچ سکتی تھی بولنے کی سکت نہیں تھی اس میں۔

"آؤ نا۔" اس نے قریب کرنا چاہا۔

"امی، امی!" رعنا چلانے لگی۔ کہاں تو آواز نہیں نکل رہی تھی اور کہاں اب اس کا چلانا رات کے سناٹے کو چیر گیا تھا۔

جب آصفہ کمرے میں آئیں تو وہ کرسی پر بیٹھی کانپ رہی تھی۔ دونوں چھوٹے بچے سو رہے تھے۔ اور کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

"کیا ہوا رعنا! اتنے زور سے کیوں چلائی تھیں؟"

"کک کچھ نہیں امی! بس یہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور پھر میں ڈر گئی۔"

"اف جان نکال دی میری تو تم نے، اٹھو بستر پر جا کر لیٹو، دن میں بھی آرام نہیں کرتیں، اسی لیے بیٹھے بیٹھے سو گئیں اور کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ لیا ہوگا۔"

"آہ کاش! یہ خواب ہی ہوتا۔" امی چلی گئیں اس نے دروازہ لاک کر لیا، لیکن نیند دیر تک نہیں آئی

تھی۔

اس کے اسلام آباد جانے کے بعد وہ کچھ سنبھل گئی تھی، گھر میں رہتے ہوئے جو احساس اس کی موجودگی میں چھایا رہتا تھا۔ ایسا نہیں تھا، لیکن انہی دنوں ساجدہ پھوپھو نے وحید کے لیے اس کا رشتہ مانگ کر اسے پھر سے بے چین کر دیا۔ خبر اسلام آباد میں عدیل کو بھی پہنچ گئی تھی۔

اس نے شاہدہ بیگم سے کہا تھا ابا سے رعنا کے لیے بات کریں۔ شاہدہ بیگم کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ تو سمجھتی تھیں، عدیل ساجدہ یا جاذبہ میں سے کسی کی لڑکی کو پسند کرلے گا۔ انہوں نے بڑے جوش کے عالم میں علیم سے بات کی تھی اور کہا تھا۔ ''یہ عدیل کی مرضی بھی ہے۔''

''عدیل نے رعنا کو پسند کر کے سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں وہ رعنا کے لیے مناسب نہیں۔ مجھے رعنا کا باپ بن کر بھی تو سوچنا ہے اور جب میں ایسا سوچتا ہوں تو عدیل مجھے مناسب نہیں لگتا۔''

جب اگلے ہی روز اس کا فون آنے پر شاہدہ نے اسے یہ بات بتائی تو اس نے کہا۔

''آپ ابا سے کہیں وہ رعنا اور چچی سے پوچھ لیں، اگر انہیں اعتراض نہیں تو پھر ابا کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''وہ پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ آصفہ بے چاری تو کبھی انکار نہیں کرے گی، لیکن میں یتیم بچی پر ظلم نہیں کر سکتا۔''

''اوہو، یہ ابا بھی نا! کیا انہیں میری خوشی کا خیال نہیں؟'' وہ جھنجھلا رہا تھا۔

''تم خود اپنے ابا سے بات کرلو، شاید تم انہیں اطمینان دلا سکو، اصل میں انہیں تمہارا بھروسہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے میں خود بات کرلوں گا۔'' اس نے رکھائی سے کہہ کر فون بند کر دیا اور دو روز بعد وہ گھر میں بیٹھا تھا۔

''ابا تم سے بات کریں تو تمہارے لیے ہاں میں جواب دینا ہی بہتر ہے۔ دوسری صورت میں، میں بڑی سے بڑی قسم کھالوں گا، مگر یہ نہیں مانوں گا کہ تم سے نکاح کیا ہے، لیکن تمہیں بھی چھوڑوں گا نہیں۔''

''میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟''

''بہرحال ابا تمہاری مرضی پوچھیں تو جواب ہاں میں دینا اور جواب نہ میں ہونے کی صورت میں تیار رہنا میں ہوٹل میں کمرا بک کروالوں گا۔''

وہ اندر سے کانپ گئی۔ عدیل معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کے قریب آبیٹھا۔ اسی وقت آصفہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور ان دونوں کو اتنے قریب بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

''چچی! ہم دونوں پسند کرتے ہیں ایک دوسرے کو۔ ابا رشتہ ڈالیں گے، پلیز ہماری خوشیوں کا خیال کیجیے گا۔''

وہ چپ رہیں اور رعنا کو ماں کی چپ بری طرح گھائل کر گئی۔

''کیا اس میں تمہاری مرضی بھی شامل ہے؟'' امی نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

''امی! یہ صرف عدیل کی خواہش ہے۔'' ماں کے سوال پر وہ گڑبڑا گئی، پھر بولی۔ ''میرا خیال ہے، اس میں ہرج بھی نہیں ہے۔''

''ہاں ویسے تو عدیل اچھا ہے، لیکن آزاد خیال ہے۔ بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی ہے۔ شادی کے بعد بھی دوستی نہ چھوڑی تو تمہارے لیے مشکل ہوگی۔''

''وہ کہتا ہے سب چھوڑ دوں گا اور پھر تایا ابا بھی تو ہیں نا۔ وہ اسے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔''

''ہاں بھائی صاحب کی طرف سے تو مجھے مکمل اطمینان ہے۔'' اور اسی اعتماد کے سہارے جب تایا ابا نے رعنا کا رشتہ مانگا تو آصفہ بیگم نے ہاں کردی۔ جیسے ہی اس رشتے کی خبر ساجدہ اور جاذبہ تک پہنچی انہیں پہلے تو یقین ہی نہیں آیا، پھر یہی سوچا ضرور علیم نے زبردستی کی ہوگی۔

شمع نے جس وقت عدیل کو فون کیا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور رعنا بھی ملازمہ کے سر پر موجود صفائی کروا رہی تھی۔

''ارے ہاں بھئی رشتہ پکا ہوا ہے، گھبراتی کیوں ہو، وہ پرانے زمانے کی باتیں نہیں کہ بیوی زندگی کی ساتھی ہے، یہ ہے تو وہ ہے۔ اب تو ساری اہمیت محبوبہ کی ہوتی ہے، گھر میں سمجھو ایک مشین لا رہا ہوں، جو میرے لیے وقت پر کھانا بنا سکتی ہے، میرے کپڑوں کا خیال رکھ سکتی ہے، میرے پاؤں دبا سکتی ہے اور بچے پیدا کر سکتی ہے۔ (قہقہہ) ارے جانو!! تمہاری جگہ کون لے سکتا ہے۔ بیوی تو سمجھو وہ عورت ہوتی ہے جس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا جاتا، تھکن کی ماری، ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اپنا آپ بھلا دینے والی عورت۔ میں تو سمجھتا ہوں کوئی بھی مرد بیوی کی کمپنی کو پسند نہیں کرتا اور میرے جیسا مرد تھکی ہاری عورت کو پسند نہیں کرتا۔''

رعنا کو اس کی باتوں نے ہراساں نہیں کیا۔ وہ اداسیوں میں نہیں گھری، بلکہ اس کے اندر سلگنے والی آگ کو ہوا ملی تھی اور وہ بھڑکنے لگی تھی۔ اس کا جی چاہا دوسری طرف جو بھی عورت ہے جا کر اس کا بھی منہ نوچ لے جو عورت کو ذلیل کروا کر بھی سر اٹھا کر بیٹھی تھی اور ذلیل کرنے والے کے لیے مری جا رہی تھی۔

''شمع تھی بے چاری، رو رہی ہے، کہو تو اس سے بھی نکاح کرلوں۔ اسلام میں چار کی اجازت ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے بلکہ میں خود تایا ابا سے بات کرتی ہوں۔ پہلے تم اسے گھر لے آؤ۔ میں تو پڑھ رہی ہوں اور مجھے تو کوئی خواہش بھی نہیں ہے۔ اچھا ہے کچھ دیر کے لیے ناپسندیدہ زندگی ٹل جائے گی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ بوکھلایا۔

''وہی تو کہہ رہی ہوں خود تایا ابا سے بات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ تمہاری تو ایسی بات وہ نہیں مانیں گے۔''

''یہ تم مجھے تم، تم کیوں کرتی رہتی ہو آپ کہہ کر بلایا کرو اور کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں ابا سے اس قسم کی بات کرنے کی۔''

’’میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں، بے کردار لوگ میرے خیال میں کسی عزت کے مستحق نہیں ہوتے۔‘‘

ملازمہ کام چھوڑ کرانہیں دیکھنے لگی تو وہ اٹھ کراپنے کمرے میں چلا گیا۔

آصفہ اور شاہدہ شادی کی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔ جبکہ اسے سوائے اپنی پڑھائی کے اور کسی چیز کی ہوش بظاہر نہیں تھا۔ شادی سے ایک ہفتہ قبل عدیل، اسلام آباد سے آ گیا، اس نے دونوں پھپھیوں کو بھی ادھر آ جانے کو کہا، جاذبہ کو غصہ زیادہ تھا کہ وہ تو عدیل کو اپنا داماد تسلیم کیے بیٹھی تھیں، وہ نہیں آئیں۔ ساجدہ نے سوچا، بھائی سے بگاڑ مناسب نہیں، عدیل تو ہاتھ سے نکل ہی چکا ہے، باقی کے فوائد تو اپنی جگہ موجود ہی ہیں وہ اور ان کے بچے آ گئے تھے۔ آصفہ نے اپنی بہن اور بچوں سے بھی پہلے ہی آ جانے کو کہا تھا۔ مہندی سے ایک روز پہلے روحی اور انیلا بھی آ گئیں تھیں۔

دلہن بن کر اس پر بہت روپ آیا تھا جس نے دیکھا سراہا تھا۔

’’دیکھو رعنا! تم کتنی پیاری لگ رہی ہو۔‘‘ انیلا نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے لا کھڑا کیا تھا، خود کو دیکھا دل سے ہوک اٹھی۔ ’’کس کے لیے ہے یہ سب کچھ۔ مجھے کس کے لیے سنوارا گیا ہے۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔

’’پاگل ہوئی ہو۔ میک اپ بہہ جائے گا، سب بگڑ جائے گا۔‘‘ لیکن وہ روتی رہی۔

’’پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو، میرے سر میں شدید درد ہے۔‘‘ ان سب کے جاتے ہی وہ تیزی سے اٹھی، الماری سے نیند کی ایک گولی نکال کر پرس میں رکھ لی۔

کچھ دیر کے بعد رخصتی کا شور اٹھا، اسے رخصت ہو کر کہیں دور نہیں جانا تھا۔ فرسٹ فلور پر عدیل کے کمرے میں ہی جانا تھا اور اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ عدیل ہوٹل میں کمرا بک کروا رہا تھا۔ لیکن اس نے شاہدہ بیگم سے کہہ دیا تھا۔ وہ ہوٹل نہیں جائے گی۔

رات کے گیارہ بجے اسے عدیل کے کمرے میں لا کر بٹھایا گیا۔

’’پانی تو ہے نا۔‘‘ اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہی پوچھا تھا۔

’’ہاں ہاں، یہ رکھا ہے۔ ڈال کر دوں۔‘‘ رشتے کی ایک آنٹی کہہ رہی تھیں، اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ لڑکیاں تقریباً آدھے گھنٹے تک موجود رہیں، عدیل کو دوستوں نے گھیر لیا۔ لڑکیوں نے کمرا خالی کیا تو اس نے پرس کھول کر ایک پرچہ نکال کر اپنے تکیے کے قریب رکھا، پھر چند گولیاں نکال کر پانی سے نگل لیں، لباس تبدیل کیا اور بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

جس وقت فتح کے نشے میں چور وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہاں اس کے لیے سجی بنی کوئی عورت موجود نہیں تھی، بلکہ اپنی تذلیل پر انتقام بن کر کھولتا وجود سو رہا تھا۔ اس نے بلیک کلر کا سادہ سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ کمبل میں چھپائے وہ اتنی گہری نیند میں تھی کہ عدیل کے جھٹکے سے کمبل کھینچنے پر بھی نہیں اٹھی۔ کسی انہونی کے احساس سے عدیل کی پیشانی تر ہوئی۔ اس کی ناک کے آگے ہتھیلی کی، سانس معمول کے مطابق تھی اور پھر نظر تکیے کے برابر پڑے پرچے پر گئی، لکھا تھا۔

’’گھبراؤ نہیں، خودکشی نہیں کر رہی، بس آج کی رات کے لیے نیند کی گولیاں کھائی ہیں۔‘‘ عدیل نے زیرِ لب اسے گندی گالی دے ڈالی، پھر جھنجھوڑنے لگا۔ لیکن بے فائدہ رہا۔ اس نے کبھی نیند کی دوا استعمال نہیں کی تھی، اسی لیے چند گولیوں نے ہی بے سدھ کر دیا تھا۔

اسے عدیل سے اس شدت پسندی اور اجڈ پن کی امید نہیں تھی۔ رات کا بدلہ جس طرح صبح اس نے لیا۔ رعنا کی روح کانپ اٹھی اور جی میں آئی ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی، لیکن بے اختیار تھی اور ہچکیوں کے ساتھ روئی تھی۔

’’آئندہ میرے مقابل آنے کے بارے میں کبھی خواب میں بھی مت سوچنا۔‘‘ بالوں سے پکڑ کر اس کا سر پیچھے کیا تھا اور چہرے پر اتنی زور کا طمانچہ مارا تھا کہ کچھ دیر تک تو اسے لگا اس کی بینائی ختم ہو گئی ہے۔

’’یہ خیال دل سے نکال دو کہ کبھی مجھ سے چھٹکارا پا لو گی، جو چیز ایک بار میری ہو جاتی ہے پھر وہ میری ہی رہتی ہے، دل بھر جائے تو اسے توڑ دیا کرتا ہوں، لیکن کسی کو دینا پسند نہیں کرتا۔‘‘

اسے جتا کر وہ واش روم میں گھس گیا۔ فریش ہو کر نکلا تو وہ ابھی تک رو رہی تھی، بیڈ سے ذرا فاصلے پر رک کر عدیل نے اس کے جھٹکے لیتے جسم کو دیکھا، سسکیوں کو سنا۔

’’اب یہ رونا دھونا بند کرو۔ اٹھ کر فریش ہو جاؤ، ابھی ناشتا لے کر کوئی آ جائے گا۔‘‘

رعنا تیزی سے بیڈ سے اتری اور واش روم میں گھس گئی، نیلے رنگ کا جوڑا جس پر سلور کام تھا، ہینگ کیا ہوا تھا۔ اتنا بھاری کام وہ واپس پلٹی، الماری کھول کر ایک سادہ سا سوٹ نکال لیا۔

نہا کر نکلی تو شاہدہ بیگم ناشتے کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور بڑے اشتیاق سے اس کی جانب بڑھیں، لیکن قریب آتے آتے ٹھٹک گئیں، دلہنوں والا کوئی روپ اس کے چہرے پر نہ تھا، بجھی بجھی آنکھیں اور پریشان چہرہ۔

’’تم ٹھیک تو ہو نا رعنا؟‘‘

’’رات سے اس کے سر میں درد ہے۔‘‘ جواب عدیل نے دیا تھا۔

’’اوہو، آ کر مجھ سے ٹیبلیٹ ہی لے جاتے۔‘‘

اس بات کا عدیل نے جواب نہیں دیا، اسے ناشتے کے لیے بلانے لگا۔ وہ اس کے سامنے جا بیٹھی، جونہی شاہدہ بیگم کمرے سے نکلیں وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

’’اب کیا مسئلہ ہے، ناشتا تو کر لو۔‘‘

’’میں تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی، مجھے تم سے گھن آتی ہے۔‘‘ عدیل نے دانت پیس کر زیرِ لب کچھ کہا، پھر ناشتا کرنے لگا۔ جونہی وہ ناشتا ختم کر کے اٹھا، رعنا آ بیٹھی اور دل جمعی سے ناشتا کرنے لگی۔

ولیمہ کا فنکشن بہت بھرپور تھا۔ اس کو شہر کے مشہور پارلر سے تیار کروایا گیا اور جب وہ اسٹیج پر آئی تو

سب ہی نے سراہا۔ عدیل اس وقت ایک بے حد ماڈرن سی لڑکی کے ساتھ سامنے ہی کھڑا تھا۔ لڑکی نے اس کی جانب دیکھ کر کچھ کہا، جواب میں عدیل نے بھی کچھ کہہ کر آنکھ ماری تھی اور دونوں ہنس پڑے تھے، پھر وہ دونوں اسٹیج پر آ کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

''ہیلو میرا نام زری ہے۔ یہ ہانگڑو بڑی تعریف کر رہا ہے تمہاری۔''

رعنا نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ نظر جھکا کر نہیں بیٹھی تھی، سر اٹھا کر بڑی ہی بے نیازی سے دیکھ رہی تھی۔

''عدیل! تم تو کہتے تھے بڑی معصوم، بڑی سادہ سی دلہن ہے میری۔'' اس کی بے نیازی پر وہ خاموش نہیں رہ سکی۔

''بس راتوں رات کایا پلٹ گئی ہے اس کی۔''

''ہاں بھئی، اب یہ تمہاری جو بنا دی گئی ہے۔''

''ایکسکیوزمی! بھلا ان میں ایسی کون سی خوبی ہے جو میں اتراؤں گی۔'' وہ چبا چبا کر بولی تھی۔

زری پہلے تو ٹھٹکی، مگر بہت تیز اور بے باک لڑکی تھی۔ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''ارے آپ کو ابھی تک اندازہ نہیں ہوا، حیرت ہے۔'' اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''آپ اپنی باتیں ذرا سائیڈ پر جا کر کرلیں، یہاں مجھ سے ملنے اور لوگ بھی آنا چاہتے ہیں۔''

زری کی معنی خیز گفتگو اسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

''ہمیں کہاں بیٹھنا ہے، کہاں نہیں بیٹھنا۔ خوب جانتے ہیں۔ تمہیں مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عدیل نے بھڑک کر کہا۔

''جانے دو عدیل! ابھی بے چاری نہیں جانتی کہ تمہاری لائف میں میری کیا حیثیت ہے۔'' زری نے اسے جتاتے ہوئے عدیل کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''او کے پھر میں ہی چلی جاتی ہوں۔''

وہ تیزی سے اٹھی اور ان کی سمجھ میں کچھ آنے سے پہلے اسٹیج سے اتر کر سامنے کرسیوں میں سے ایک کرسی پر جا بیٹھی اور عدیل کی قسمت علیم الدین اس وقت اُدھر قریب ہی کھڑے تھے، جب وہ تیزی سے اسٹیج سے اتر کر نیچے آ بیٹھی تو وہ فوراً اس کی جانب لپکے۔

''کیا ہوا رعنا بیٹی! تم ادھر کیوں آ گئیں؟''

''وہاں عدیل ان صاحبہ کو بٹھانا چاہتا ہے۔'' اس نے اونچی آواز میں کہنے کے ساتھ اشارہ بھی کیا۔

علیم الدین صاحب کے کتنے ہی ملنے والے دور و نزدیک کے رشتہ دار سب ہی موجود تھے۔ ایسی بات پر تھوڑی شرمندگی ہوئی، غصہ زیادہ آیا، اس سے پہلے کہ جا کر عدیل کو کچھ کہتے، صورتِ حال دیکھ کر وہ خود ہی چلا آیا اور بولا۔

''ابّا! وہ تو بس میری ایک پرانی کلاس فیلو اور دوست ہے۔ پتا نہیں رعنا کیوں اس طرح سوچ رہی ہے۔''

''تم یاد رکھنا عدیل! جو جگہ میں نے رعنا کو دی ہے۔ اس پر کوئی دوسری عورت نہیں بیٹھ سکتی۔'' آواز

آہستہ لیکن انداز اٹل تھا۔ عدیل نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ ایک بار پھر اسٹیج پر بٹھا دی گئی اور زری کو اٹھنا پڑا۔

رعنا کا خیال تھا عدیل برابر میں بیٹھ کر پھر کوئی چوٹ کرے گا، لیکن وہ بیٹھا مسکراتا رہا اور اسے اندازہ ہوا تایا ابا کے حکم سے سرتابی کبھی نہیں کر سکتا۔

کچھ دیر کے بعد دونوں کے لیے کھانا اسٹیج پر لگا دیا گیا۔ رعنا نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

گھر آ کر وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی اور روحی سے کھانا لانے کو کہا۔

''اوپر کمرے میں لے چلیں۔'' عدیل نے کھانا لاتی روحی سے کہا۔ لیکن رعنا نے کہا۔ ''میں کھانا یہیں کھاؤں گی۔''

وہ اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا، چینج کر کے اس کا انتظار کرنے لگا۔ ایک گھنٹہ بیتنے کو تھا۔ تھکن شدید تھی، بار بار جھونک بھی آ رہی تھی۔ غصہ بھی، لیکن وہ نہیں آ رہی تھی، یہاں تک کہ عدیل نیند کی وادی میں اتر گیا۔

صبح عدیل کا موڈ سخت خراب تھا، اس نے صوفے پر رات گزارنے والی اس لڑکی کو دیکھ کر ایک لفظ بھی نہیں بولا، بلکہ اس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا، جب ان کا ناشتا کمرے میں آیا تو وہ بستر سے اٹھ کر واش روم گیا، تب رعنا نے ٹرے کی جانب ہاتھ بڑھایا اور جب تک وہ برآمد ہوا یہ اپنا حصہ ختم کر کے چائے پی رہی تھی۔

''میرے لیے اور بنا کر لاؤ۔ میں کسی کا جوٹھا نہیں کھاتا۔'' حکم دیا گیا جسے اس نے سنا ہی نہیں۔

''تم اٹھتی ہو یا نہیں؟'' اس نے ہاتھ زور سے صوفے کی بیک پر مارا۔

''نہیں۔ میں تو نہیں بنا رہی۔''

''کیسے نہیں بنا رہیں؟'' اس نے بالوں سے پکڑا، کمرے کی کھڑکی اس وقت کھلی ہوئی تھی، رعنا نے پورے زور و شور سے چلّانے کا آغاز کیا اور اس نے گھبرا کر بال چھوڑ دیے۔

''چپ کر جاؤ، بدذات!'' وہ دبے دبے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ایسے ہی چپ ہو جاؤ، سب کو پتا تو چلے نا عدیل صاحب کتنے مرد ہیں، ہونہہ عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔'' اس نے پھر چلّانے کے لیے منہ کھولا، عدیل نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اب اگر شور کیا تو گلا گھونٹ دوں گا۔'' اسے صوفے پر پٹخ کر وہ دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''گھونٹ دو۔ یہی تو میں چاہتی ہوں تمہارے ساتھ زندہ رہنے سے کہیں بہتر مر جانا ہے اور پھر یہ خیال کہ میری موت کے بعد تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو گے کتنا خوش کن ہے تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔''

❀ ❀ ❀

مرد کے لیے اپنی ذات اپنی چھوٹی بڑی خوشیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں، ذرا سی کمی پر اس کا دل اپنے لیے رنجور ہونے لگتا ہے، یہی حال عدیل کا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رعنا شادی کے بعد ایسے کٹھور پن کا مظاہرہ کرے گی۔ اس کا خیال تھا وہ مشرق کی کمزور عورت کی طرح اس کے سامنے سر جھکا کر باوفا

بیوی کا کردار ادا کرنے لگی گی، جس کی دنیا شوہر سے شروع ہو کر شوہر پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اب جو ایسا نہیں ہوا تو بہت سی محرومیاں اسے ستانے لگیں۔

''باہر سے آؤ تو یہ سراپا انتظار نہیں ملتی۔ اسے میرے کھانے پینے اور کپڑوں کی فکر نہیں ہوتی، یہ میرے لیے سجتی سنورتی نہیں اور میں چپکے چپکے اس کے کان میں سرگوشیاں کر کے اسے شرماتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، نئے نویلے جوڑے تو محفلوں میں بیٹھ کر بھی آس پاس کو بھول کر ایک دوسرے میں کھو جایا کرتے ہیں اور وہ تو سب کے درمیان بیٹھ کر مجھے بھول ہی جایا کرتی ہے، کبھی میرے برابر نہیں بیٹھتی۔ مجھے زندگی میں یہ رنگ بھی چاہیے۔''

رات کو اس نے علیم الدین کے ساتھ تنہائی میں بڑی دیر تک بات کی تھی۔ انہیں بتایا تھا کہ رعنا شاید ابھی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں تھی، وہ شادی شدہ زندگی کی کسی بھی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ''میں بڑی ہمت سے اسے ڈیل کر رہا ہوں، لیکن آپ سب کو بھی اس سلسلے میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ میرے خیال میں اس کا بہترین حل یہی ہے کہ اب جب میں اسلام آباد جاؤں تو آپ اسے بھی میرے ساتھ بھجوا دیں۔ دیکھیے نا ابا! یہاں گھر میں بہت سے لوگ ہیں، وہ مجھے نظر انداز کر کے کسی کے بھی پاس جا بیٹھتی ہے۔''

واقعی اس کی بات معقول تھی، یہ تو وہ بھی دیکھ رہے تھے، رعنا کے چہرے پر نئی دلہنوں والا نکھار نہیں تھا، وہ تو بالکل پہلے جیسی ہی دکھتی تھی، اب تک وہ اس کی ذمہ داری عدیل کے سر ڈال کر اس سے کسی روز سختی سے بات کرنے کا سوچ رہے تھے، لیکن آج عدیل نے پہلے خود یہ بات کر کے سب کلیئر کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

''وہ میرے کہنے کو اہمیت نہیں دے گی۔ آپ کہیں گے تو ہی تیار ہوگی۔''

''میں کہہ دوں گا۔'' انہوں نے تسلی دی تھی۔

❁ ❁ ❁

ڈرائیونگ کے دوران عدیل نے اس سے دو تین بار بات کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ سپاٹ چہرہ لیے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اس کی بات دھیان سے سنی ہی نہیں، رعنا کا خیال تھا اسلام آباد کے کسی اچھے سے رہائشی علاقے میں اس کا گھر ہوگا، لیکن شہر کی آبادی کے وہاں کوئی آثار ہی نہیں تھے، جہاں عدیل نے گاڑی روکی تھی۔ پرانی لیکن بڑی سی عمارت جس کے گرد باؤنڈری وال چھوٹی سی تھی، لکڑی کا گیٹ جس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا، بے شمار درختوں نے اس جگہ اور اس کے آس پاس ایک چھوٹے موٹے جنگل کا سماں پیدا کر دیا تھا۔

عدیل نے ہارن دیا تو ایک مقامی باشندے نے آ کر گیٹ کھولا اور عدیل کو دیکھتے ہی ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کیا۔ گاڑی عمارت میں داخل ہو کر ایک بار پھر رک گئی۔

''اترو منزل آ گئی ہے۔'' وہ اپنی جانب کا دروازہ کھول کر اترا تو اسے بھی اترنا پڑا۔ دو سیڑھیاں چڑھ کر برآمدہ تھا اور آگے کمرے بنے ہوئے تھے، دروازہ کھول کر وہ کوریڈور میں داخل ہوا اور پھر ایک کمرے میں آ گیا، جو یقیناً اس کا بیڈ روم تھا۔

''جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ میں چائے کا کہہ کر آتا ہوں۔ یہ ادھر واش روم ہے۔'' اور جونہی وہ ادھر کو چلی۔ عدیل کے موبائل کی مخصوص ٹون بجنے لگی اور واش روم کا دروازہ کھولتے اس نے شمع کا نام سنا۔ وہ دروازہ مکمل بند کرنے کے بجائے تجسس میں تھوڑا کھول کر وہیں کھڑی ہو گئی۔

''ہاں بھئی۔ لے آیا ہوں اسلام آباد۔ یار! ابا کا حکم تھا، کیسے ٹالتا، مگر تجھے فکر کیوں ہو رہی ہے۔ تجھے تو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اسے تو بس چار دن کی چاندنی دکھائی ہے۔ نہیں خفا مت ہو یار! تیری خفگی نہیں برداشت کر سکتا۔''

پھر وہ کیا کیا کہتا رہا، اس کے لیے تو بس اتنا ہی سننا کافی تھا۔ اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا اس کے اٹیچی میں امی نے دو، تین سویٹر بھی رکھے تھے، پتا نہیں سامان گاڑی سے نکلوایا بھی ہے یا نہیں، وہ یہی دیکھنے کمرے سے باہر آئی۔ وہ موبائل کان سے لگائے دوسری جانب رخ کیے دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔

''ابھی کہاں، لاہور میں ہی پھنسا ہوا ہوں۔ بس کچھ کام پڑ گیا ہے۔ دس، پندرہ روز تک ہی اسلام آباد آ سکوں گا اور آتے ہی تم سے ملوں گا، میں جتنا اداس ہوں تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔''

''بی بی! کچھ چاہیے تھا؟'' سامنے کچن میں ادھیڑ عمر ملازمہ چائے بنا رہی تھی، اسے دیکھا، سلام کیا، پھر پوچھنے لگی اور عدیل نے بھی مڑ کر دیکھا پھر موبائل آف کر دیا۔

''باہر کیوں آ گئیں؟''

''سامان چاہیے تھا اپنا۔''

''ہاں وہ رفیق لا رہا ہے۔ تم اندر چلو۔ ایک تو یہاں ویسے بھی سردی لاہور سے زیادہ ہوتی ہے اور علاقہ بھی کھلا ہے۔ میرا خیال ہے رات کو ہیٹر آن کرنا پڑے گا۔''

''تم سویٹر تو لے کر آئی ہو نا؟'' اس پر نظر پڑی تو پوچھنے لگا، رعنا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''فکر نہ کرو، کل ہم مزید شاپنگ کر لیں گے۔''

ایک آدھ ہی کافی ہے۔ مجھے زیادہ عرصہ یہاں رہنا تو ہے نہیں۔'' وہ بڑی بے نیازی سے بولی تھی۔

''کیا مطلب تو پھر کہاں رہنا ہے؟'' اس نے بھنویں سکوڑ کر پوچھا تھا۔

''واپس جانا ہے مجھے۔ خیر دیکھا جائے گا اور فی الحال تم میرے بہت اچھے موڈ کو خراب مت کرو۔''

''کتنے کمرے ہیں اس گھر میں؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''بہت سے، لیکن صرف تین ہی سیٹ کیے ہیں، ایک گیسٹ روم، ڈرائنگ روم اور یہ میرا بیڈ روم۔''

''کدھر ہے گیسٹ روم؟ میں اپنا سامان ادھر ہی رکھواؤں گی۔''

''تماشا مت بناؤ، یوں رہو گی تو گھر کے ملازم شک کی نظر سے دیکھیں گے تمہیں، کچھ تو سوچ لیا کرو۔'' عدیل نے جھلا کر کہا تھا۔

''دماغ تو مرد کے پاس ہوتا ہے، عورت کے پاس تھوڑا ہی۔'' اس نے جتایا تھا۔

''بہر حال تمہیں اسی کمرے میں رہنا ہے اور ہاں تم نے دیکھا ہے برآمدے کے آگے گرل لگی ہوئی ہے، صرف اندر آنے کا ایک ہی دروازہ ہے، وہ بھی لوہے کی مضبوط جالی کا ہے، یہ سب اس لیے کہ اس علاقے میں بھیڑیے، بندر اور جنگلی بلیاں بہت ہیں، کبھی کبھی چیتے بھی دیکھے گئے ہیں، غلطی سے بھی دروازہ کھلا مت چھوڑنا اور شام میں تو بالکل بھی نہیں، یہ ملازم بھی احتیاط رکھتے ہیں، تم بھی شام کے اوقات میں برآمدے کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔''

عدیل نے یہ بات ایسے وقت میں کہی تھی جب وہ دوسرے کمرے میں رہنے کی بات کر رہی تھی، پتا نہیں وہ سچ کہہ رہا تھا یا اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کو بات بنائی تھی، لیکن جو بھی تھا، وہ خوں خوار درندوں سے ڈرتی تھی۔ اس نے خاموشی سے اپنا سامان اسی کمرے میں رکھ لیا۔

❁ ❁ ❁

صبح عدیل کا موڈ بے حد خوش گوار تھا اور وہ بہت بدمزاج ہو رہی تھی۔

''مجھے واپس لاہور جانا ہے۔''

''تو میرا کیا بنے گا جانی؟'' بڑے رومانٹک انداز میں اس نے کہا تھا۔

تب ہی موبائل کی مخصوص ٹون بجنے لگی اور رعنا جتاتے ہوئے انداز میں طنزیہ ہنسی ہنس پڑی۔

''شک نہ کیا کرو، منیجر کا فون ہے۔'' اسکرین کی جانب نظر ڈال کر وہ کہہ رہا تھا۔

''تو کیا ہوا ابھی دوسرا فون بھی آجائے گا۔'' عدیل موبائل پر بات کرنے لگا۔

''جا کر دیکھو، ناشتا تیار ہے۔'' کال اٹینڈ کرنے کے بعد وہ کہہ رہا تھا۔

''خود ہی دیکھ لو۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بھئی بڑی ہی بے مروت ہو۔ ہم سے تو بلیاں اچھی ہیں جن کا کچھ رعب، کوئی دہشت تو ہے تم پر۔'' وہ یہ کہتا کمرے سے چلا گیا۔ اسے پھر سے رات کو گونجنے والی خوف ناک آوازیں یاد آگئیں۔

اکیلے ہی ناشتا کر کے وہ اپنے آفس چلا گیا تو یہ بھی اٹھ کر کچن میں آگئی۔ ملازم عورت نے ادب سے سلام کیا، پھر ناشتا بنانے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''تم جاؤ۔ میں خود بنا لوں گی۔''

''ٹھیک ہے بی بی! میں اتنی دیر میں برتن دھو لیتی ہوں۔''

رعنا نے اِدھر اُدھر دیکھا، کچن کی حالت خاصی ابتر نظر آئی۔

''تم صفائی ٹھیک سے نہیں کرتیں۔''

''اب آپ آگئے ہو، جیسا بولو گے کروں گی۔'' مگر کہنے کے ساتھ ہی رعنا کو خیال آگیا تھا۔ بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے، جس کا گھر ہے وہ جانے، میری بلا سے۔ اپنے لیے ناشتا بناتے ہوئے پتا نہیں کیا کیا سوچ کر وہ آزردہ ہو رہی تھی۔

''یہ بتاؤ۔ اس جنگل میں جانور بھی ہوتے ہیں؟''

ادھر جنگل کہاں ہے بیگم صاحبہ! یہ تو بس چند درختوں کا جھنڈ ہے، لیکن آپ کو پتا ہے یہ پوٹھوہار کا علاقہ ہے، راستے اونچے نیچے پہاڑی نما ہیں، پھر ذرا دور تو بہت گھنے درخت اور غار ہیں۔ ادھر جانور

ہوتے ہیں اور رات کو وہ ادھر بھی آجاتے ہیں، لیکن دن میں ادھر خطرہ نہیں ہوتا۔''

''پھر بھی برآمدے کا دروازہ لاک رکھا کرو، صرف شام میں ہی نہیں دن میں بھی۔''

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! دوپہر میں کیا پکاؤں؟''

''کچھ بھی بنا لینا۔''

ناشتا تیار کر کے ٹرے میں لگایا اور کمرے میں چلی آئی۔

ناشتا کر کے لاہور میں سب سے بات کی، لیکن کتنی دیر امی اور تائی امی ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔

''اب وہ تمہارا گھر ہے اسے سجاؤ سنوارو دلچسپی لو۔'' وہ یہ سب سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا عدیل کی واپسی شام تک ہوگی، کچھ دیر ایک کمرے سے دوسرے میں گھومنے اور گرل سے باہر جھانکنے کے بعد آخر وہ پھر سے کمرے میں آبیٹھی۔ کچھ نہیں سوجھا تو اپنے کچھ کپڑے ہی پریس کرنے لگی۔

عدیل کی واپسی بہت جلدی ہوگئی اور اسے اس کی آمد پر کیا خوشی ہو سکتی تھی۔

''ایک دوست نے انوائٹ کیا ہے۔ میں رات کو دیر سے آؤں گا۔ ڈرنا نہیں، یہ جانور اندر نہیں آسکتے۔''

وہ خاموش بیٹھی اس کی تیاری کو دیکھتی رہی، جو بہت دل لگا کر کی جا رہی تھی۔

''کیسا لگ رہا ہوں؟'' بڑے اعتماد کے ساتھ وہ پوچھ رہا تھا۔

''ہونہہ، جب دل ہی کالے ہوں پھر اجلی صورتیں بھی دھندلی لگتی ہیں۔'' اس جواب پر اس نے قہقہہ لگایا۔

''دلوں کو کس نے دیکھا ہے۔ خوش قسمت ہو بھئی کہ ہم جیسا نصیب بنا ہے۔ ارے لڑکیاں دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی ہیں۔''

''آہیں تو میں بھی بھرتی ہوں، بڑا روتی ہوں نصیب پر۔'' اس کا پُرغرور انداز سیخ پا کر گیا تھا۔

''تو بس پھر روتی رہو، بھرتی رہو آہیں۔'' اب کے اس کا موڈ بھی خراب ہوا تھا، مزید اس سے کچھ کہے بغیر، پھر اپنی تیاری میں لگ گیا، جو کسی طرح مکمل ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ چلا گیا تو رعنا کتنی دیر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔ ملازمہ اپنے کوارٹر میں چلی گئی تو اس نے اٹھ کر برآمدے کا دروازہ بند کیا۔

کمرے سے باہر آکر اسے احساس ہوا بہت تیز ہوا چل رہی تھی اور دوپہر سہ پہر میں ڈھل رہی تھی۔

''اتنے بڑے گھر میں، میں بالکل اکیلی۔ مجھے ملازمہ کو نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔'' کچن میں آکر چائے بنانے کھڑی ہوئی تو ہوا کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ یک دم اسے لگا اس کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ تیزی سے پلٹ کر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا مگر اب اس کا دل معمول سے زیادہ تیز دھڑکنے لگا تھا۔ بمشکل چائے بنائی، بسکٹ نکالے اور تیز قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی۔ کھڑکی پر درختوں کی شاخیں زور سے لگتی تھیں تو عجیب سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ دفعتاً بجلی چمکنے لگی، شاید ہلکی بارش بھی ہونے لگی تھی۔ اس نے ٹائم دیکھا، عدیل کو گھر سے نکلے چار گھنٹے ہو چکے تھے، اب تو شاید واپس آنے والا ہوگا۔

آج پہلی بار اسے اس کی واپسی کا انتظار تھا۔

چائے اور بسکٹ لینے کے بعد اس نے بیڈ پر نیم دراز ہو کر کمبل اپنے اوپر پھیلا لیا، وہ کچھ دیر سونا چاہتی تھی۔ جیسے تیسے دو گھنٹے گزر ہی گئے، شام رات میں ڈھل گئی اور اسے لگنے لگا، یہ گھر بھوتوں کی آماجگاہ ہے۔ گھبرا کر اس نے عدیل کا نمبر ملایا لیکن وہ اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ وہ بھی بار بار کوشش کرتی رہی اور آخر عدیل نے اٹینڈ کر ہی لیا۔

''کیا ہے، کیوں بار بار رنگ کر رہی ہو؟ بتایا تو تھا دیر سے آؤں گا۔'' اس کی آواز کے ساتھ ساتھ وہ پس منظر میں بجنے والی موسیقی اور لوگوں کی ہنسی اور باتوں کی آواز بھی سن رہی تھی۔

عدیل کے لہجے نے اسے احساس دلایا، وہ کتنی بڑی غلطی کر چکی ہے۔

''کیا ضرورت تھی مجھے اس کا نمبر ملانے کی۔'' اب وہ خود سے الجھ رہی تھی۔ اسے احساس نہیں ہوا، غصے اور دکھ کی اس کیفیت میں خوف کی کیفیت کم ہو گئی ہے۔ باہر سے آتی آوازیں اب کم ہو رہی تھیں۔ شاید آندھی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ جانے کتنی رات بیت رہی تھی کہ اس کی آنکھ اپنے موبائل کی رنگ پر کھلی۔ عدیل کا نام اسکرین پر روشن ہو رہا تھا۔ جی چاہا، آف کر دے پھر کچھ سوچ کر کان سے لگا لیا۔

''برآمدے سے باہر کھڑا ہوں، دروازہ کھولو۔'' اور وہ بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سو گئی تھیں، بتولاں کہاں ہے؟''

''کون بتولاں؟''

''ارے بھئی، وہی عورت جو یہاں کام کرتی ہے۔ کمال ہے تم نے ابھی تک اس سے نام بھی نہیں پوچھا۔'' وہ بڑا فریش اور خوش گوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔

''وہ دوپہر میں اپنے کوارٹر چلی گئی تھی۔''

''اوفو۔۔۔ جانے کیوں دیا؟ وہ تو رات تک ادھر ہی ہوتی ہے، اب دیکھ لیا ہوگا۔ احمق سی بیگم صاحبہ آ گئی ہے تو چکمہ دے گئی۔ ڈر تو نہیں لگا؟ فون کیوں کیا تھا؟'' اسے شانوں سے تھام لیا۔

''میں سو رہی تھی۔'' اس نے یاد دلایا اور اس کے ہاتھ ہٹانے چاہے۔

''سوتی رہنا یار! سونے کو عمر پڑی ہے لیکن آج موسم بڑا بے ایمان ہے۔'' وہ اسی طرح اسے تھامے ہوئے کمرے تک آیا تھا۔

''میں اس وقت سونا چاہتی ہوں۔''

اس کی مسکراہٹ معدوم ہوئی۔ اور چہرے پر سختی چھا گئی۔

پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے بے بس کیا اور بولا۔

''تمہیں پتا تو ہے ایک نہیں چل سکتی تمہاری۔''

ہر بات میں من مانی صرف اپنی مرضی اور دھونس بھرا انداز۔

رعنا کے پاس ایک ہی حربہ تھا، جب بھی وہ اس سے خوش گوار موڈ چاہتا تو وہ ایسی بات کر جاتی کہ اس کا مزاج بھی درہم برہم ہو جاتا۔

❁ ❁ ❁

شمع کے فون اب بھی تواتر سے آتے تھے اور عدیل، رعنا کی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑے نثار ہونے والے انداز میں باتیں کیا کرتا تھا۔

''تم نے شمع سے شادی کیوں نہیں کر لی؟'' ایک روز جب اس سے بات کر کے وہ بڑے مزے سے بیٹھا تھا، اس نے پوچھ لیا۔

''کر لیں گے، فی الحال نہ اسے جلدی تھی نہ مجھے۔''

وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر آ گئی۔

اس رات بھی آندھی کے ساتھ بارش آئی تھی۔ موسم میں خنکی بہت بڑھ گئی تھی۔ سویٹر پہن کر اس نے شال بھی اوڑھ لی اور آ کر لان میں بیٹھ گئی۔ آج موسم صاف تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سرسبز پیڑ پودے اور لکڑی کے گیٹ سے اندر آتا سرخ اینٹوں کا راستہ۔ بتولاں نے بتایا تھا یہ عمارت بہت پرانی ہے، کبھی یہ انگریز کی ملکیت بھی رہ چکی ہے۔ بڑے بڑے انگریز افسر اور گوریاں یہاں آ کر ٹھہرا کرتے تھے اور رت جگا منایا جاتا تھا اور یہ کوٹھی کبھی بھی ویران نہیں رہی اور جس نے بھی خریدی ہے، بڑے پیار سے خریدی ہے۔

''اب یہ کوٹھی جو بظاہر آباد دکھائی دیتی ہے لیکن ویران ہی تو ہے۔'' اس نے گہری سانس کھینچ کر سوچا ضرور تھا، کہا کچھ نہیں۔

''کیا یہاں آس پاس آبادی ہے؟''

''جی ہاں، بالکل ایسے ہی بڑے بڑے اور بھی مکان ہیں اور نیچے ہمارا گاؤں بھی ہے۔ اگر آپ باہر سڑک پر آ کر دیکھو تو بل کھاتے راستوں سے آگے آپ کو کچھ مکان دکھائی دیں گے، بس وہی گاؤں ہے۔ یہ گوشت، مرغی، انڈے، سبزی اور ضرورت کا اور سامان بھی میں ادھر سے لے کر آتی ہوں۔''

''رعنا! ادھر آؤ۔'' عدیل برآمدے کی پہلی سیڑھی پر کھڑا اسے آوازیں دے رہا تھا۔ وہ قریب جا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''شام کو میرے کچھ دوست آ رہے ہیں، تم تیاری کر لینا۔''

''کیسی تیاری؟''

''میرا مطلب ہے چڑیل بن کر مت گھومتی رہنا کچھ تیار ہو جانا، ان میں سے کچھ میرڈ ہیں۔ بیگمات بھی ساتھ ہوں گی۔''

''مجھے کسی سے نہیں ملنا۔''

''ملنا تو ہے۔'' وہ پھر سے اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''جب میں نے کہا ہے، مجھے تمہارے دوستوں سے نہیں ملنا پھر کیوں زبردستی کرتے ہو؟''

''میرے دوستوں میں میل ہی نہیں، فی میل بھی تو شامل ہیں۔''

''ہاں، وہ جن کے عورت ہونے پر مجھے شرمندگی اور افسوس ہے۔''

''ہاں جی، آپ تو ولی ہیں نا!'' وہ ہنستے ہوئے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تو رعنا تیزی سے اٹھ کر اندر

چلی گئی۔ وہ بھی اٹھا اور پیچھے چلا آیا۔

''میری دوستیں یہ دیکھنا چاہتی ہیں، آخر وہ کون ہے جسے میں نے شادی کے لیے منتخب کرلیا ہے۔''

''ہاں، اب مجھ سے ملنے کے بعد پھر تمہارے ساتھ میری ذات پر تبصرے کیے جائیں گے۔ ہر لڑکی بار بار یہی کہے گی، اتنی خاص تو نہیں۔ تمہیں کیا نظر آگیا تھا۔''

''مجھے اپنے ڈریس دکھاؤ، اگر مجھے پسند نہ آئے تو ابھی بازار چلیں گے۔''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''تمہاری طبیعت کی ایسی کی تیسی۔''

''سوچ لو، ضد پر آگئی تو ساری پارٹی دھری کی دھری رہ جائے گی اور ہاں، مجھ سے یہ امید نہ رکھنا کہ میں تمہاری تھرڈ کلاس دوستوں سے کسی تمیز ادب آداب سے پیش آؤں گی۔''

''ضدی لڑکی! میں نے انہیں یہاں ذلیل کروانے کے لیے نہیں بلایا۔''

''میں مقابل کو اس کے کردار کے مطابق ہی عزت دیا کرتی ہوں۔''

پھر اچھی خاصی لڑائی ہوگئی۔ عدیل کا اس پر ہاتھ بھی اٹھ گیا، وہ کمرا بند کر کے روتی رہی اور یہ ٹی وی لگا کر چینل سرچ کرتا رہا۔

''بات بات پر ہاتھ اٹھاتا ہے، مجھے زرخرید سمجھتا ہے اور میں پھر بھی اس کے ساتھ رہ رہی ہوں۔''

یہ خیال ذہن میں آج ہی جاگا تھا، وہ فوراً اٹھی۔ دروازہ کھولا پھر برآمدہ پار کیا، اس کے بعد لکڑی کا پھاٹک کراس کر کے وہ اونچی نیچی سڑک پر چلنے لگی۔ ہتھیلیوں سے آنکھوں میں آنے والے آنسو بار بار پونچھتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ تھک کر سنگِ میل پر بیٹھ گئی اور اونچائی پر بنے گھروں کو بظاہر بڑے انہماک سے دیکھنے لگی۔

''کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔'' کوئی بہت قریب آکر بولا تھا اور وہ جو دکھوں کے پاتال میں اتری ہوئی تھی، یہ آواز سن کر اچھل پڑی۔

''دیکھیے یہ جگہ قطعی محفوظ نہیں ہے۔'' رعنا نے اب تک پھیلے گھرے ہوتے اندھیرے کی طرف پھر اس کی طرف دیکھا، وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے بازو اور ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی، یقیناً وہ زخمی تھا، خوف کچھ کم ہوا۔

''اگر آپ کہیں تو آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں؟''

''مم۔۔۔ میں تو راستہ نہیں جانتی۔ ہم لوگ ابھی یہاں آئے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''اوہ مہمان ہیں آپ ادھر۔''

''آپ فون نمبر بتائیں، میں رابطہ کرتا ہوں۔''

وہ رونے لگی۔ ''مجھے نمبر بالکل یاد نہیں۔ میرے موبائل میں ہے نمبر لیکن موبائل تو گھر پر ہے۔ اف۔۔۔ اب میں کیا کروں؟''

''روئیں نہیں، میرے ساتھ آیئے۔ میرے گھر میں میری سسٹر اور ان کے بچے موجود ہیں۔

گھبرایئے نہیں، یہ جگہ تو بالکل محفوظ نہیں۔''

یہ تو وہ خود بھی دیکھ رہی تھی۔

''شکل سے شریف آدمی لگتا ہے اور پھر زخمی بھی ہے۔ میرا خیال ہے بھروسہ کر ہی لوں۔'' اس نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کے ساتھ ہولی۔ گھر میں واقعی ایک خاتون اور تین بچے موجود تھے۔

سامنے گھڑی پر نگاہ گئی، رات کے ساڑھے آٹھ ہو رہے تھے۔

''اب تک عدیل کے مہمان آچکے ہوں گے اور میرے لیے تو اس کا غصہ آخری حدوں کو چھو رہا ہوگا۔ کوئی پتا نہیں آج وہ گھر پہنچنے پر مجھے مار ہی ڈالے۔''

ان سب نے رعنا کی جانب دیکھا، خاتون اس کے پاس آئیں۔ نام پوچھا اور یہ جان کر کہ وہ اپنے گھر کا پتا بھول چکی ہے، خاص پریشان ہوئیں۔

''انسپکٹر زمان کو فون کرو شہاب!'' وہ بھائی سے مخاطب تھیں۔

''اوہو، ایسی بھی آفت نہیں آگئی کہ پولیس طلب کرلی جائے۔ آپ یہ بتائیں اپنے سیل کا نمبر تو یاد ہے نا آپ کو۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر نمبر بول دیا۔ ''تو ٹھیک ہے، اسی پر ٹرائی کرتے ہیں۔ سیل تو آپ کا گھر میں ہی ہے نا کوئی تو اٹھائے گا۔''

شہاب نے نمبر ملایا، بیل جاتی رہی۔ پہلی بار دوسری بار پھر تیسری بار، یقیناً وہ ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے ساتھ مصروف ہوگا اور اس کا موبائل تو بیڈروم میں رکھا تھا۔

''اوہو، آپ کہیں اس پرانے بنگلے میں تو نہیں رہتیں جس کے آس پاس بہت سے درخت ہیں اور جس کے دروازوں، کھڑکیوں پر تازہ تازہ گرین کلر کا پینٹ کیا گیا ہے۔ دور ہی سے دکھائی دیتا ہے؟''

''جی جی۔۔۔ بالکل۔۔۔'' اس نے جھٹ سے کہا۔

''پھر تو پریشانی کی بالکل کوئی بات نہیں، میں اور بچے کبھی کبھار سیر کے لیے اس طرف چلے جاتے ہیں۔ خوب پہچان ہے اس راستے کی۔ شہاب! گاڑی نکالو، میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ راستہ بتاتی جاؤں گی۔'' وہ خاتون اس بار طمانیت سے بولی۔

جس وقت وہ عدیل کی رہائش گاہ پر پہنچے، سرد رات پر پھیلائے دلوں پر بھی کہر اور خوف اتار رہی تھی۔ وہ دونوں سوچ رہے تھے، پتا نہیں اس کا شوہر کس مزاج کا ہوگا اور اجنبیوں کے ہمراہ اپنی بیوی کو دیکھ کر کس رویے کا مظاہرہ کرے گا جبکہ وہ اس کی مار سے خوف زدہ تھی۔ تکلیف اور تذلیل کا احساس ابھی سے رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ چھوٹی سی باؤنڈری وال سے نظر آرہا تھا کہ اب وہاں عدیل کی گاڑی کے علاوہ کوئی گاڑی نہیں تھی، یقیناً اس کے مہمان جاچکے تھے۔

گاڑی کے ہارن پر خدا بخش نے گیٹ کھولا تھا اور آواز سن کر ہی عدیل بھی باہر آگیا تھا۔

''آپ کی بیگم راستہ بھول گئی تھیں۔'' فرح خود نیچے اتری تھی اور عدیل کو بتا رہی تھی۔

''اوہ۔۔۔ بے حد شکریہ آپ لوگوں کا، اندر تو آیئے۔'' وہ بڑی شائستگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''نہیں پھر کبھی سہی، فی الحال تو آپ سنبھالیے اپنی معصوم سی بیگم کو۔ ہم بچوں کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر

آئے ہیں، ٹھہر نہیں سکتے۔''

وہ واپس چلے گئے۔ رعنا دھڑکتے دل کے ساتھ اندر آ گئی۔ اسے سردی لگ رہی تھی اور وہ بے حد تھکن اور کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ کمرے میں آ کر جیسے ہی بیڈ پر بیٹھی عدیل کی سرد آواز آئی۔

''اپنا تکیہ اٹھاؤ اور صوفے پر چلی جاؤ۔''

اس نے تکیہ اٹھا لیا مگر صوفے پر بغیر کمبل کے کہ کمبل تو ایک ہی تھا اور اسے سردی بھی لگ رہی تھی۔ عدیل نے سر سے پاؤں تک کمبل اوڑھ لیا تھا۔ وہ ہلکی سی شال اوڑھے صوفے پر احمقوں کی طرح منہ اٹھائے بیٹھی تھی۔ عدیل نے اسے مکمل نظر انداز کر دیا تھا۔

''کیا میں اس کی غلط فہمی دور کروں؟ اسے بتاؤں میں نے جان بوجھ کر دیر نہیں کی لیکن کیا یہ خود غرض شخص اس قابل ہے کہ اسے وضاحتیں دی جائیں۔ نہیں، بالکل نہیں۔'' اور وہ سمٹی سمٹائی پھر سے لیٹ گئی۔ خوف اور تھکن نے اسے کمزور کر دیا تھا لیکن ٹھنڈک سونے بھی نہیں دے رہی تھی۔

ساری رات سونے جاگنے کی کیفیت میں گزر گئی۔ صبح جسم ٹوٹ رہا تھا۔ وہ وقت پر اٹھ نہ سکی۔ عدیل تیار ہو کر آفس چلا گیا۔ کچن سے کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً بتولاں برتن دھو رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹی اور سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے، زور کی بھوک لگ رہی تھی اور سر میں درد بھی تھا۔ فریش ہو کر وہ کچن میں آئی۔ برتنوں کا ایک ڈھیر تھا جو بتولاں نے دھو کر رکھا تھا۔

اس نے فریج کا جائزہ لیا، رات کا بچا بہت کچھ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسی میں سے تھوڑا سا نکالا اور چائے بنا کر ناشتا کر لیا۔

''اب ایک تو بجنے لگا ہے، دو بجے تک عدیل گھر آ ہی جایا کرتا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہی رہ گیا ہے۔'' اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عدیل آج دو ڈھائی کے بجائے شام کے چار بجے گھر آیا اور اس کے ساتھ دو بے حد ماڈرن بے باک سی لڑکیاں بھی تھیں، وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بجائے بیڈ روم میں آ گئی تھیں اور انہوں نے رعنا کے وجود کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر گیسٹ روم میں آ بیٹھی۔ یہاں بیڈ اور بیڈ پر تہہ کیا ہوا کمبل بھی موجود تھا۔ ''اوہ رات کو دھیان ہی نہیں آیا، ایسے ہی سردی میں ٹھٹھرتی رہی۔'' وہ پیروں پر کمبل ڈال کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''کیا مجھے یہ انتظار کرنا چاہیے کہ وہ مجھے اپنے منہ سے جانے کو کہے لیکن وہ کبھی نہیں کہے گا، وہ تایا ابا کے ڈر سے ایسا نہیں کہہ سکتا، وہ بس مجھے یونہی ذلیل کرتا رہے گا۔ یہ لڑکیاں مسلمان ہیں، کیسے گھروں سے تعلق ہے ان کا، ان کے لباس، انداز، کتنا فضول ہے اور وہ جسے تقدیر نے میرا شوہر بنا دیا ہے۔ ان پر مرتا ہے۔'' اسے پتا نہیں چلا آنسو تواتر سے چہرہ بھگو رہے تھے۔ ایک ہی رخ پر بیٹھے اسے کتنی ہی دیر گزر گئی، باتوں اور ہنسی کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔

کھانا کھا کر اس نے نماز پڑھی اور سجدے میں سر رکھ کر دیر تک روتی رہی۔ کیا مانگے خدا سے، اسے یہ سمجھ میں نہیں آیا مگر وہ روتی چلی گئی۔

گیارہ بجے کے قریب اس نے گاڑی کی آواز سنی تھی۔ یقیناً عدیل کے مہمانوں کی واپسی ہو رہی

تھی، وہ جانتی تھی اسے بلانے نہیں آئے گا۔ وہ دروازہ لاک کر کے لیٹ گئی۔ صبح اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کس وقت تیار ہو کر چلا گیا، ہاں جب شام کے پانچ بجے اس کی واپسی ہوئی تو وہ کچن میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

''سنو یہ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے کہ جہاں جی چاہے استراحت فرماؤ، آج بیڈ روم میں سونا ہوگا سمجھیں۔'' وہ حکم سنا کر چلا گیا اور اس نے چائے سنک میں انڈیل دی۔

یہ تیسرا روز تھا جب وہ اس سے بات نہیں کر رہا تھا مگر من مانی جاری تھی۔

''شمع اور رشنا آ رہی ہیں، میں نہیں چاہتا ہمارے درمیان جو بھی ہے، اس کی بھنک بھی خاندان میں کسی کو پڑے، اس لیے کچھ دنوں کے لیے ہم دونوں کو اداکاری کرنا پڑے گی۔'' وہ دوبارہ اس کے سر پہ کھڑا کہہ رہا تھا۔

''تم میری بات سن رہی ہو؟'' اس کے خاموش رہنے پر وہ جھلا گیا۔

''ظاہر ہے بہری نہیں ہوں، سن ہی رہی ہوں۔''

''تو پھر اس پر عمل بھی کر لینا، تمہاری ہی عزت کا سوال ہے۔''

''ہونہہ!'' وہ سر جھٹکے بغیر رہ نہیں سکی، عدیل نے اس انداز کو دیکھا ضرور لیکن فی الحال خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

وہ الجھن میں تھا کہ آخر ان دونوں نے اچانک کیوں پروگرام بنا لیا۔ مانا کہ جا کر ابا سے وہ دونوں ہرگز کوئی شکایت نہیں لگائیں گی لیکن جو اندازہ لگائیں گی، گھر جا کر ضرور بتائیں گی اور پھپھو تو جب تک سارے خاندان کو سنا نہ دیں چین نہیں پڑے گا۔

اور ادھر وہ سوچ رہی تھی، یہ دونوں عدیل سے ملنے یہاں تک چلی آئی ہیں۔ کوئی آس دِلا رکھی ہے تب ہی تو۔۔۔ عدیل صاحب تیار ہو جائیے آپ بھی، بہت دن زیادتی برداشت کر لی میں نے۔

ایسی سوچ ذہن میں ابھری تھی کہ وہ سیدھی ہو بیٹھی اور اندرونی سوچ کا عکس اس کے چہرے پر بھی ابھرنے لگا۔ عدیل بھی اسے دیکھ کر چونکا مگر کہا کچھ نہیں۔

''دیکھ لینا، گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا، لیتا آؤں گا۔ وہ دونوں پرسوں دوپہر تک پہنچ جائیں گی۔''

رعنا نے اٹھ کر الماری سے اپنے کپڑے نکالے اور واش روم میں گھس گئی۔

❁ ❁ ❁

جس روز شمع اور رشنا نے آنا تھا، عدیل آفس ہی نہیں گیا۔ بتولاں کے ساتھ مل کر لسٹ بنائی اور مارکیٹ سودا لینے چلا گیا۔

''کوئی خاص مہمان آ رہے ہیں؟'' اس کے جانے کے بعد بتولاں، رعنا سے پوچھ رہی تھی۔

''تمہارے صاحب کی ملنے والیاں ہیں۔''

بتولاں نے برا سا منہ بنا کر لمبی سانس کھینچی اور خاموشی سے کچن میں جا کر دھلے برتن خشک کرنے لگی۔

بتولاں نے یہ سن کر کہ لڑکیاں عدیل کی ملنے والیاں ہیں، بے دلی سے کھانا تیار کیا۔ وہ دونوں آئیں تو سلام کرنے بھی کچن سے باہر نہیں نکلی اور رعنا بھی ان کی آمد کے بعد کچن میں ہی کرسی رکھ کر بیٹھ گئی۔ عدیل کچھ دیر بعد آیا۔

''تم ادھر آ کر کیوں بیٹھ گئی ہو۔ مہمان آئے ہیں تمہارے گھر میں، یوں اچھا لگتا ہے کیا؟''

''وہ میری نہیں، تمہاری مہمان ہیں۔ تم اٹینڈ کرو۔''

''میں نے تم سے کچھ کہا تھا رعنا!'' وہ بڑی مشکل سے ضبط سے کام لے رہا تھا۔

''میں بھول گئی ہوں۔''

''باہر آ کر بات سنو۔'' وہ بتولاں کے سامنے کچھ کہنا نہیں چاہ رہا تھا۔ رعنا اٹھ کر باہر آئی۔

''ہر وقت تماشا کرنا ضروری ہوتا ہے، تمہیں ذرا بھی تمیز نہیں ہے۔''

''اگر آنے والے کسی عزت کے مستحق ہوں گے تو میں ضرور انہیں عزت دوں گی۔''

''اندر آ کر بیٹھو۔'' اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں لیکن بظاہر آرام سے کہا تھا۔

رعنا نے کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ عدیل گیسٹ روم میں اس سے پہلے داخل ہوا۔ دونوں لڑکیوں کی زور و شور سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آنے لگیں، جیسے ہی رعنا کمرے میں داخل ہوئی، نت نئی فرمائشیں کرتے کرتے دونوں بالکل چپ ہو گئیں۔ رعنا نے جتانے والے انداز میں عدیل کی جانب دیکھا۔

کھانا صرف اس کی موجودگی کی وجہ سے بڑی خاموشی سے کھایا گیا اور اس کے بعد وہ اٹھ کر بیڈ روم میں آ گئی۔ وہ بدستور صوفے پر ہی سو رہی تھی لیکن روزانہ اس کے پاس گیسٹ روم والا کمبل ہوتا تھا۔ عدیل کو مہمانوں کا تو خیال رہا کہ ان کے آنے پر کسی چیز کی کمی نہ ہو لیکن رعنا کا خیال نہیں آیا، اب وہ رات کو کیا اوڑھ کے سوئے گی، اس نے اسے بیڈ روم میں تو بلا لیا تھا لیکن بیڈ پر سونے کو نہیں کہا تھا اور رعنا کو بھی خودداری روکتی تھی۔ وہ آج پھر دونوں گرم شالوں کو ملا کر صوفے پر لیٹ گئی تھی۔ عدیل جب کمرے میں آیا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ رعنا کو نیند نہیں آ رہی تھی لیکن وہ سوتی بن گئی۔

۞ ۞ ۞

ناشتے کی ٹیبل پھر وہ اور ان کی باتیں تھیں، اب تو وہ رعنا کی موجودگی میں بھی خاموش نہیں ہوئی تھیں۔ انہیں خوب صورت کڑھائی والے گرم سوٹ اور سویٹر لینے تھے۔ یہاں کی کچھ خاص سوغاتیں اور جیولری بھی چاہیے تھی۔

''آج تو آفس جانا ہے، بابا مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ کل بھی انہوں نے آفس فون کیا تھا اور جب پتا چلا کہ میں آفس نہیں آیا تو بہت خفا ہوئے تھے۔''

''پھر آج شام کو چلیں گے۔'' شمع نے جھٹ سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عدیل کے جاتے ہی رعنا نے بتولاں سے پوچھا۔ ''ادھر ٹیکسی کدھر سے ملے گی؟''

''فون کر کے منگوائی جا سکتی ہے، آپ کو کہیں جانا ہے کیا؟''

''بتولاں! وہ ابھی ابھی میرے گھر سے فون آیا ہے، ضروری کام ہے۔ مجھے جانا پڑے گا، تم خدا

بخش سے کہہ دو ٹیکسی منگوا دے اور میرے ساتھ کوچز کے اڈے تک چلے۔''

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! میں کہہ دیتی ہوں۔''

کمرے میں آ کر اس نے ضرورت کی چیزیں اور کپڑے جلدی جلدی بیگ میں ڈالے جیسے ہی ٹیکسی آئی، وہ خدا بخش کے ساتھ نکل آئی۔

۞ ۞ ۞

جس وقت وہ لاہور پہنچی، شام کے سات بج رہے تھے۔ اندھیرا چھا چکا تھا، اس نے راستے میں ہی تایا ابا کو فون کر کے ڈرائیور کو بھیجنے کے لیے کہہ دیا تھا لیکن وہ تو خود لینے آئے تھے۔

''تم اچانک۔۔۔ خیر تو ہے بیٹا!''

''جی تایا ابا! خیر ہی ہے، بس آپ لوگوں سے ملنے چلی آئی۔ یوں بھی آج کل رشنا اور شمع اسلام آباد آئی ہوئی ہیں تو میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔''

وہ جیسے سمجھ گئے اور خاموش ہو گئے لیکن گھر پہنچتے ہی انہوں نے نمبر ملا کر عدیل کی خوب خبر لی تھی جس کے نتیجے میں کچھ دیر بعد وہ اس کے موبائل پر تھا اور خوب ہی برسا تھا۔ اچھی خاصی سنانے کے بعد اس نے کہا تھا۔

''میرا خیال ہے رعنا بی بی! ہمارا ساتھ اتنا ہی بہت تھا۔ بھئی مجھے تمہیں حاصل کرنا تھا کر لیا، اب اپنے عاشق سے بیاہ رچاؤ یا کسی اور کے پلے بندھ جاؤ، مجھے پروا نہیں۔''

وہ سن سی کھڑی رہ گئی پھر وہ اس رات ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سو سکی تھی۔

۞ ۞ ۞

اگلے روز رشتے کی ایک چچی اچانک ہی چلی آئیں، رعنا کو دیکھا تو ٹھٹکیں۔

''ساجدہ تو بتا رہی تھی، اس کی دونوں لڑکیاں اسلام آباد گئی ہوئی ہیں۔ تم تو یہاں ہو۔''

''جی عدیل تو وہیں ہیں نا۔'' اس نے جس طرح کہا، چچی تو خاندان کے ایک ایک فرد کو خبر سنانے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔ یہ ان کی اعلا کارکردگی کا نتیجہ تھا کہ اگلے ہی روز دونوں لڑکیوں کو سارے پروگرام کینسل کر کے واپس لاہور آنا پڑا۔

تایا ابا نے عدیل کو فون کر کے کہا کہ وہ آ کر رعنا کو لے جائے۔ جواب میں اس نے کہا تھا۔

''ابا! رعنا کو یہاں لا کر رکھنا میری غلطی تھی، وہاں تو وہ آپ لوگوں کی نگرانی میں ہے۔ یہاں میں تو آفس چلا جاتا ہوں، وہ اِدھر اُدھر گھومنے نکل جاتی ہے۔ میری تو اس کی نظر میں دو کوڑی کی بھی عزت نہیں۔ یہاں اس ویران علاقے میں وہ بڑے آرام سے ایک غیر مرد کی گاڑی میں رات کے دس بجے گھر آتی ہے۔''

''تم بکواس کر رہے ہو عدیل!''

''مجھے پتا تھا ابا! آپ یہی کہیں گے لیکن کسی بھی غیرت مند مرد کے لیے یہ برداشت کرنا بہت مشکل ہے، چاہے اس کے باپ کا حکم ہی کیوں نہ ہو۔''

بعد میں یہ سب اس نے خود ہی رعنا کو بتا کر اسے بے سکون کر دیا تھا۔ اسی شرمندگی اور دکھ نے

اسے بیمار کر ڈالا۔ بخار تھا کہ ٹوٹنے میں ہی نہیں آتا تھا۔ تایا ابا قریب آ کر بیٹھتے تو وہ رونے لگتی لیکن اس کے لب اس بارے میں کوئی بھی بات کرنے سے قاصر تھے۔

تیسرے روز اسے پتا چلا تایا ابا اور تائی جان اسلام آباد چلے گئے ہیں۔ ان کی واپسی ایک ہفتہ بعد ہوئی، تب تک اس کا بخار تو اتر چکا تھا لیکن ابھی وہ بہت کمزور تھی۔ تایا ابا نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور پاس بٹھا کر آزردگی سے کہا تھا۔

''عدیل نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا، اسے معاف کر دینا بیٹا! پاک باز عورت پر تہمت بڑا گناہ ہے اور اس نے تمہارے کردار پر چھینٹے اچھال کر اس کی سزا پالی ہے۔ وہ تمہارا مجرم ہے بیٹا! معاف کر دو اسے۔''

وہ کچھ نہیں سمجھ رہی تھی، تب آصفہ بیگم نے بتایا۔ ''عدیل کا بہت بری طرح ایکسیڈنٹ ہوا ہے، وہ چلنے پھرنے سے معذور بستر پر پڑا ہے۔ اس وقت اسے تمہاری بہت ضرورت ہے۔''

وہ دوبارہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن ماں کے مجبور کرنے پر ایک بار پھر جا رہی تھی، اس بار تایا اور تائی جان اس کے ہمراہ تھے۔ عدیل ہاسپٹل سے گھر آ چکا تھا۔ ایک ٹانگ اور بازو فریکچر تھا۔ کمر میں بھی شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ اس وقت مکمل طور پر دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔

❁ ❁ ❁

جس وقت وہ لوگ اسلام آباد پہنچے، کاریڈور میں خدا بخش سے ملاقات ہوئی اور اس نے بتایا وہ ابھی ابھی صاحب کا لباس تبدیل کر کے آ رہا ہے۔ رعنا نے دیکھا اس کے ہاتھ میں عدیل کے اتارے ہوئے کپڑے تھے، وہ شخص جو ملازموں کو زیادہ لفٹ دینے کا قائل نہیں تھا، خدا بخش کے ساتھ تو ہمیشہ بڑے روکھے انداز میں بات کرتا تھا، آج۔۔۔ اُف! کیا ہے انسان بھی لیکن وہ اپنی اوقات بھول جاتا ہے، بڑھ بڑھ کر بولنے اور دعوے کرنے لگتا ہے۔

بتولاں ٹرے میں یقیناً عدیل کا کھانا رکھے ادھر آئی تھی۔ انہیں دیکھا تو سلام کیا اور رعنا کو دیکھ کر تو بہت خوشی کا اظہار کیا۔

کمرے میں شاہدہ بیگم اور علیم الدین پہلے داخل ہوئے۔ ان سے پیچھے بتولاں تھی اور سب سے آخر میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ تھی۔ برا تو اس کے ساتھ عدیل نے کیا تھا لیکن سمجھ میں اسے نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کا سامنا کیسے کرے۔

''کیسا ہے میرا بیٹا!'' علیم الدین نے بیڈ پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے محبت سے پوچھا تھا۔

''بس جی رہا ہوں ابا!'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑا تھا۔

''گھبراؤ نہیں، مایوس کیوں ہو؟ چند روزہ تکلیف ہے پھر تم پہلے کی طرح بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔''

''پتا نہیں وہ دن کب آئے گا ابا! بہت تھک گیا ہوں میں۔ اکتا گیا ہوں۔''

''میرے ساتھ رعنا بھی آ گئی ہے، اب یہ تمہیں کمپنی دے گی، بور نہیں ہونے دے گی۔''

تب اس نے چہرہ موڑ کر چپ چاپ کھڑی رعنا کو دیکھا، بولا کچھ نہیں۔ بتولاں ابھی تک برتن اٹھائے کھڑی تھی، شاہدہ بیگم سے بولی۔

''اب آپ آ گئے ہو، اپنے پتر کو خود کھلاؤ۔ مجھ سے تو جی یہ مانتے ہی نہیں ہیں۔''

''بری بات عدیل! ایسا نہیں کرتے۔ تم تو سمجھ دار ہو، جانتے ہو جلدی صحت یاب ہونے کے لیے خوراک لینا بھی تو ضروری ہے۔''

علیم صاحب نے سہارا دے کر اسے بٹھایا۔ دائیں بازو پر پلستر تھا اور بائیں سے کھانے میں یقیناً اسے دقت ہوتی تھی، اسی لیے شاہدہ خود کھلانے لگیں۔

''میں آپ دونوں کے لیے کمرا دیکھ لوں۔'' رعنا یہ بہانا بنا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''رات کا کھانا اس نے بتولاں کے ساتھ مل کر بنایا۔ مٹر گوشت کا سالن، شامی کباب اور پھلکے۔ عدیل کے لیے وہ خود کھانا لے کر آئی۔ بیڈ کے ساتھ چھوٹی ٹیبل رکھ کر اس پر ٹرے رکھی اور اپنے لیے کرسی رکھ کر بیٹھ گئی اور چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اس کی طرف بڑھانے لگی۔ بہت خاموشی سے یہ مرحلہ طے ہوا۔ دوا کھلانے کے بعد وہ باہر آ گئی۔ کچن میں بیٹھ کر کھانا کھایا، سامان ابھی تک کاریڈور میں رکھا تھا اور اس میں اس کا لایا ایک عدد گرم کمبل بھی تھا۔

تایا جان اور تائی جان اپنے کمرے میں تھے۔ اس نے سامان اٹھایا، الماری میں بیگ یونہی رکھ دیا اور پھر کمبل اٹھا کر صوفے کی جانب بڑھ گئی۔ عدیل نے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔

''رات میں اگر میری ضرورت پڑے تو آواز دے لینا۔'' وہ کہہ رہی تھی پھر اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر کمبل اوڑھ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ آج پھر بلیوں نے درخت پر آ کر بہت شور مچایا، اب وہ ڈری تو نہیں لیکن نیند بری طرح اچاٹ ہوئی۔ عدیل بھی یقیناً جاگ رہا تھا۔

''ناشتے میں کیا لو گے؟'' صبح وہ پوچھ رہی تھی۔

''جو بھی مل جائے۔'' عدیل کی آواز پست تھی۔ اسے خیال آیا، وہ تو ابھی سو کر اٹھا ہے اور صبح اٹھنے کے بعد کی ضروریات سے اسے ہی فارغ کرانا ہے۔

❁ ❁ ❁

تایا ابا اور شاہدہ بیگم نے دیکھ لیا تھا، وہ جی جان سے اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ ایک اونچے پورے مرد کو سنبھالنا، سہارا دے کر بٹھانا، لٹانا، ڈاکٹر کی بتائی ٹیوب سے اس کی کمر کی مالش کرنا۔ اسے خود کھانا کھلانا، یہ سب کچھ اتنا آسان تو نہیں تھا لیکن وہ اپنا فرض ادا کر رہی تھی تو دو روز بعد انہوں نے بھی واپسی کی ٹھانی۔

وہ اسے شام کی چائے پلا رہی تھی جب بتولاں نے بتایا۔

''آپ سے کوئی فرح نامی خاتون ملنے کے لیے آئی ہیں۔''

''اوہ اچھا۔۔۔ بٹھاؤ انہیں۔'' اسے انہیں یاد کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔

''کون ہے؟'' اس نے رعنا کو اتنا خوش دیکھ کر پوچھا۔

''میری ملنے والی ہیں۔''

''وہی تو نہیں جو ایک رات اپنے میاں کے ساتھ تمہیں چھوڑنے آئی تھیں۔''

''میاں نہیں، بھائی ہے وہ ان کا۔'' چائے ختم ہو چکی تھی، وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ فرح سے تپاک سے

ملی اور بتولاں سے اچھی سی چائے لانے کا کہہ کر وہ کافی دیر فرح کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اسے عدیل کے ساتھ ہونے والے حادثے کا پتا چلا تو اس کے کمرے میں بھی چلی آئی۔ کچھ دیر حال احوال پوچھنے کے بعد بولی۔

''آپ تو اکیلے پڑے بور ہو جاتے ہوں گے، آئندہ شہاب کو لے کر آؤں گی، وہ آپ کو کمپنی دے گا۔''

اور واقعی چند دنوں کے بعد شہاب کے ساتھ موجود تھی۔ رعنا کو شہاب اچھا لگا تھا کہ اس کے چہرے پر شرافت کا بالکل ویسا ہی رنگ تھا جو اس نے اپنے ابا اور پھر ایاز بھائی کے چہرے پر دیکھا تھا۔

❁ ❁ ❁

فرح تو اکثر چلی آتی اور اسے لینے کے لیے شہاب اور بچوں کو آنا پڑتا کہ رعنا کے ساتھ باتوں میں لگ کر وہ واپسی کو تو بھول ہی جاتی تھی اور عدیل کا خیال تھا، یہ بہن بھائی مل کر ڈرامہ کر رہے ہیں لیکن وہ رعنا سے صاف بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جانتا تھا اس کے رحم و کرم پر ہے، اگر وہ خفا ہو گئی تو بہت مہنگا پڑے گا۔

آج پھر دوپہر میں فرح آئی تھی، رعنا نے کھانے پر بھی روک لیا اور بڑا دل لگا کر سب تیار کیا۔ ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ شہاب بھی پہنچ گیا اور فرح نے اسے بھی کھانے پر بٹھا لیا، حالانکہ وہ انکار کر رہا تھا لیکن جب کھانا شروع کیا تو ہاتھ روک نہ سکا۔ دونوں بہن بھائی اس کے سلیقے کی تعریف کرتے رہے۔ کھانا واقعی بہت اچھا تھا اور عدیل نے سوچا۔ ''میں نے تو آج تک رعنا کے بنائے کھانے کی تعریف نہیں کی۔ حالانکہ یہ سچ ہے اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔''

روشن دان کے شیشوں سے اچانک بجلی کی چمک دکھائی دینے لگی پھر فضا میں بادلوں کا شور گونجنے لگا تو وہ دونوں جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شکر ہے کہ شہاب گاڑی لے کر آیا تھا، ورنہ گھر پہنچنے تک دونوں بھیگے ہوتے اور یہ سرما کی بارش نہانے کے لیے تو ہرگز نہیں ہوتی اور اس روز بارش بھی وہ ہوئی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

وہ بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی چائے پی رہی تھی اور ساری توجہ بارش کے شور اور شیشے سے جھلکتی بجلی کی چمک پر تھی۔ جب عدیل نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونکی پھر دوبارہ یوں پہلے والے منظر میں محو دکھائی دینے لگی۔ جیسے اس نے کچھ محسوس ہی نہیں کیا۔

''بیڈ پر آ جاؤ۔'' وہ خمار آلود لہجے میں کہہ رہا تھا۔

اس نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔

''یاد ہے جب لاہور سے یہاں آئی تھیں، جنگل کا شور تمہیں بہت پریشان کرتا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے یاد دلا رہا تھا۔

''اب اندر کا شور پریشان کرتا ہے۔'' اس نے سپاٹ سے انداز میں کہا تھا۔

''ایک تو تمہیں باتیں بہت آتی ہیں یار!''

''ٹھیک ہو جاؤ تو کرنا کچھ اس کا بھی علاج۔'' وہ کہہ کر چائے پینے لگی۔

''آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بہت ہی اچھی۔'' اس نے بڑے انداز سے سراہ کر اس کا اثر رعنا کے چہرے پر تلاشنا چاہا تھا لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

''کچھ بات بھی تو کیا کرو نا، بور ہو جاتا ہوں۔''

''موبائل تمہارے پاس ہے، یہ ٹی وی کا ریموٹ بھی رکھا ہے، جب جی چاہے استعمال کرو۔''

''میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے پاس تو کہنے کو کچھ نہیں اور تمہاری کسی بات کا مجھے اعتبار نہیں۔''

''ایسے مت کہو رعنا! اور سنو میں جتنا اس وقت جسمانی طور پر معذور ہوں، اس سے کہیں زیادہ ذہنی طور پر شکستہ ہوں۔ مجھے اس وقت ایک ساتھی، ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔''

''شمع کو فون کر لو، ویسے بھی اس شہر میں تمہاری کافی جاننے والیاں موجود ہیں۔ میں کچھ جتا نہیں رہی، خلوص سے مشورہ دے رہی ہوں۔ اگر تمہیں یہ ڈر ہے کہ پھر میں تمہاری دیکھ بھال چھوڑ دوں گی تو ایسا نہیں ہو گا کہ مجھے پتا ہے یہ تو چار دن کے لیے تمہیں بستر پر لیٹنا پڑ گیا ہے، اٹھو گے تو وہی دن رات ہوں گے۔''

''ایسا نہیں ہو گا۔''

''پلیز پلیز۔ چپ ہو جاؤ یا کوئی اور بات کرو۔'' وہ ایک دم چلا کر بولی تھی۔

عدیل خاموش ہو گیا تو کہنے لگی۔ ''یہ میری برداشت سے باہر ہے، مجھے تمہاری ایسی باتیں سن کر وحشت ہونے لگتی ہے کہ میں جانتی ہوں یہ جھوٹ ہے۔''

''اور میں جانتا ہوں تم میرا اعتبار کرنا ہی نہیں چاہتیں۔''

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی جسے عدیل نے ہی توڑا اور بولا۔

''ایک بات تو بتاؤ رعنا! تمہیں مجھ میں ایسا کیا برا لگتا تھا جو شادی سے پہلے بھی مجھ سے کتراتی تھیں۔''

''چھوڑو، جو گزر گیا وہ گزر گیا۔ اب ان دنوں کی کیا بات کریں جو قسمت میں لکھا تھا ہو کر رہا۔'' وہ بکھری بکھری سی لگ رہی تھی۔

بات کرتے کرتے شکست کا ایسا تاثر اس کے چہرے پر اترا تھا کہ فاتح شرمندہ ہو کر پھر کچھ کہہ نہیں سکا۔ وہ اٹھی اور ٹی وی آن کر دیا۔ بے مقصد سا پروگرام آ رہا تھا لیکن وہ دھیان میں کب تھی۔ عدیل اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''بہت دکھ ہے تمہیں؟'' یہ پوچھنا اس کے لیے کچھ آسان نہیں تھا اور رعنا نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''بہت سینت سینت کر رکھا تھا خود کو۔ میں تو سوچ بھی اتنی ہی پاکیزہ رکھتی تھی پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ناانصافی میرے حصے میں کیوں آئی؟'' وہ سسکیاں بھرنے لگی پھر اس کی جانب دیکھ کر بولی۔

''تمہیں شمع یا اس جیسی ہی ملنا چاہیے تھی، تم اسی کے قابل تھے۔''

عدیل چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا اور وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

آنے والے دنوں میں وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ رعنا پہلے کی طرح معمول کے مطابق اس کے سارے کام نبٹاتی رہی۔ عدیل کی صحت تیزی سے ٹھیک ہو رہی تھی، اس عرصہ میں علیم صاحب بھی آئے اور رعنا کی والدہ نے بھی شاہدہ بیگم کے ساتھ چکر لگایا۔ وہ اپنی بیٹی کو ایک وفا شعار بیوی کے روپ میں دیکھ کر بہت خوش تھیں اور اس کی خاموشی اور اداسی کا مطلب عدیل کو ہی لیا تھا۔ لہٰذا تسلی دیتی رہیں۔ ''وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ تم خوش رہا کرو، اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے اس کا دل بہلایا کرو۔'' ایسا ہی ایک بار عدیل کے سامنے کہا تو وہ بولی۔

''آپ پھپھو کی شمع کو ساتھ لے آتیں، عدیل کی اس کے ساتھ بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔''

''لو بھلا یہ کیا بات ہے۔ ٹھیک ہے، وہ کزن ہے لیکن یہ کوئی ایسا تعلق تو نہیں ہوتا۔''

''اچھا میں تجھی شاید ہوتا ہے۔'' وہ جسے سنا رہی تھی، وہ سمجھ رہا تھا۔

کچھ دن ٹھہر کو وہ لوگ واپس چلے گئے، رعنا اس روز عدیل کے سو جانے کے بعد کمرے میں بیٹھنے کے بجائے لمبی لمبی گھاس والے بے ترتیب لان میں آ گئی کہ دھوپ بہت اچھی تھی آج اور ایسے میں جب اس نے شہاب کو آتے دیکھا تو ایک دم سے خوش ہو گئی اور اسے خود بھی اپنی اس خوشی کا احساس تک نہیں ہوا۔

''مجھے فرح آپی نے بھیجا تھا، کہہ رہی تھیں، مجھے آپ کے میاں کو کمپنی دینی چاہیے اور اگر کسی ہیلپ کی ضرورت ہو تو آپ سے پوچھنا چاہیے۔''

''نہیں نہیں، بہت شکریہ۔ یہ بتائیں چائے بنواؤں آپ کے لیے۔''

''آپ کے عدیل صاحب کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''وہ تو سو رہے ہیں، دو گھنٹے سے پہلے نہیں بے دار ہونے والے۔ ادھر ہی بیٹھ جائیں۔''

''شکر ہے آج دھوپ تو اچھی نکلی ہے۔''

''ارے، آپ لاہور والے تو دھوپ میں خود کفیل ہوتے ہیں پھر بھی آپ کو اتنی خوشی ہو رہی ہے۔''

تب ہی بتولاں نے کچن میں عدیل کی آواز سنی، وہ رعنا کو پکار رہا تھا۔ وہ جلدی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔

''رعنا کدھر ہے، میں کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔''

''وہ جی شہاب صاحب آئے ہیں، ان کے ساتھ لان میں بیٹھی ہیں۔''

''ان کی سسٹر بھی ساتھ ہیں؟''

''نہیں جی، اکیلے ہی آئے ہیں۔ آپ کو کچھ چاہیے تھا؟'' اور عدیل، شہاب کی آمد کی خبر سن کر بھول گیا تھا کہ اس نے رعنا کو کیوں آواز دی تھی۔

شام کو عدیل نے چائے پینے سے انکار کر دیا اور رات کو کھانا لے کر آئی، تب بھی کہہ دیا۔

''لے جاؤ، مجھے نہیں کھانا۔''

''او کے، مگر ایک گھنٹے تک کھا لینا، شام سے ہی بے حد ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ سردی بڑھ گئی ہے، بار بار کمرے سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔'' وہ برتن اٹھانے لگی۔

وہ ہمیشہ سے لڑکیوں کی توجہ کا عادی تھا اور اب لڑکی اور وہ بھی بیوی، اس کی یہ بے توجہی اسے اذیت میں مبتلا کر رہی تھی لیکن وہ اسے کچھ بھی کہہ نہیں پا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

موسم بدل رہا تھا، سرما رخصت چاہ رہا تھا اور دھوپ میں تیزی آ گئی تھی۔ عدیل اب ٹھیک تھا، وہ خود سے چل پھر سکتا تھا لیکن زیادہ نہیں۔ البتہ وہ آفس جانے لگا تھا۔ اس کے لیے ایک عدد ڈرائیور کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ وہ شام کو بہت دیر سے گھر آتا تھا۔ اکثر تو چائے کا ٹائم بھی نکل چکا ہوتا تھا، صرف کھانا کھاتا، وہ بھی بے حد خاموشی کے ساتھ۔ پھر اپنی فائلیں دیکھنے اور کچھ ٹائم ٹی وی کو دینے کے بعد وہ سو جاتا۔ رعنا نے اب مصروفیات ڈھونڈ لی تھیں، وہ کچن کا کام خود کرنے لگی تھی۔ نت نئے کھانے بناتی اور فرح کے ہاں دینے چلی جاتی۔

اس روز فرح کے ہاں سے واپس آئی تو عدیل گھر آ چکا تھا اور بتولاں اسے بتا چکی تھی کہ وہ فرح کے گھر گئی ہے۔ اس کے آنے پر عدیل نے کچھ نہیں پوچھا اور اس نے خود سے کچھ بتایا بھی نہیں۔

''صاحب! آپ سے ملنے کچھ بیبیاں تشریف لائی ہیں۔'' بتولاں نے آ کر اطلاع دی۔

''کون ہیں؟''

''میرا خیال ہے وہ پہلے بھی ادھر آ چکی ہیں۔''

''آؤ رعنا! دیکھیں کون ہے؟'' وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بتا تو رہی ہے، تمہاری ملنے والیاں ہیں۔ میرا بھلا کیا کام۔''

''آؤ تو سہی۔'' اور اسے آنا پڑا۔ واقعی بتولاں نے ٹھیک کہا تھا، یہ لڑکیاں پہلے بھی آئی تھیں جب عدیل کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا اور یہ دونوں بہت دیر تک بیٹھی تھیں۔

والہانہ انداز میں اس کی جانب بڑھیں جبکہ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔

''جب بھی فون کرو، اٹھاتے ہی نہیں ہو، اس لیے آج خود آئے ہیں۔''

''ہاں بیٹھو، چائے بنواؤں؟''

''تو اور کیا، گھر آئے مہمانوں کو ایسے ہی ٹرخانے کا ارادہ ہے کنجوس مکھی چوس۔'' عدیل نے وہیں سے آواز دے کر بتولاں سے چائے کے لیے کہا۔

''میں لے آتی ہوں۔'' وہ جانا چاہتی تھی لیکن عدیل نے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھا لیا اور اب یہ منظر دیکھ کر آنے والیوں کے پاس کرنے کو کوئی بات ہی نہیں رہی۔ چائے آنے سے پہلے ہی وہ ایک ضروری کام یاد آ جانے کا بہانا بنا کر چلی گئیں۔

عدیل نے رعنا کی طرف دیکھا، وہ یقیناً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن رعنا اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

''رعنا! موسم بدل رہا ہے، چلو مارکیٹ تک چلتے ہیں۔ تم کچھ کپڑے خرید لو اور ہم کھانا بھی باہر

لمائیں گے۔'' وہ خوش گوار موڈ میں پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔

''نہیں بھئی، مجھے تمہارے ساتھ کہیں نہیں جانا۔ پتا نہیں ان ہی اسٹور پر اپنی کس کس چہیتی کے ساتھ کتنی مرتبہ گئے ہوں گے۔ سیلز مین مجھے بھی ان میں سے ہی سمجھیں گے۔'' ایسے جواب کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

رعنا اس کی گھر آمد کے بعد جان بوجھ کر بہت مصروف ہو جایا کرتی تھی، اس کی کوشش یہی ہوتی تھی، جب وہ کمرے میں جائے تو عدیل سو رہا ہو اور آج تو اس نے بے مقصد کاموں میں بہت ہی دیر لگا دی لیکن جب کمرے میں گئی تو وہ جاگ رہا تھا۔ رعنا نے اپنا تکیہ اٹھا کر بالکل بیڈ کے آخری سرے پر رکھا اور اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

''تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں رعنا؟'' وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔

وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

''معافی؟ بڑا آسان ہے یہ کہنا مگر ان سے پوچھو جو ظلم سہہ سہہ کر اپنے وجود سے بے زار ہو چکے ہوتے ہیں، جنہیں اپنی ہستی پر ہی شرمندگی محسوس ہوتی ہے اور تب آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں تمہارے جسم اور تمہاری روح کو کچلنے کے بعد شرمندہ ہوں کہ مجھے معاف کر دو۔ بولو ایسے ہی کیا معافی دے دینی چاہیے، کیا معافی دی جا سکتی ہے۔'' وہ چیخ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ بولتے بولتے وہ رونے لگی اور وہ بہت قریب بیٹھا بھی اسے چھونے، اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کر سکا۔

عدیل نے مایوسی سے سوچا تھا۔ ''رعنا کیوں کر مجھے معاف کر سکتی ہے۔ میں جان گیا ہوں کیا حقیقت ہے میری۔ اللہ نے کچھ اس طرح مجھے سمجھایا ہے کہ رعنا تم میرے دل کو دیکھو، مارے شرمندگی کے پانی پانی ہو رہا ہے اور میں تمہارے سامنے خود کو کسی حقیر کیڑے کی طرح پاتا ہوں۔ عورت وہ نہیں جو میں سمجھتا تھا، عورت وہی ہے جس کی پہچان تم نے کروانے کی کوشش کی تھی۔ مرد ہر حال میں اس کا محتاج ہے، پیدائش سے لے کر موت تک وہی اس کی پرورش کرتی ہے اور کیسا بے فیض ہے اسی پر غرّاتا ہے۔ تم جتنا بھی دھتکارو رعنا! میں بددل نہیں ہوں گا۔''

❁ ❁ ❁

صبح بتولاں ناشتے میں اس کی مدد کروانے کے لیے آئی تو اس کے ساتھ دو بچیاں بھی تھیں، شرمائی شرمائی جھجکی سی۔

''یہ کون ہیں؟'' رعنا نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میری نواسیاں ہیں، رات میری بیٹی ادھر آئی ہے۔'' بتولاں کے لہجے میں خوشی کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔

''انہیں ناشتا تو کراؤ۔'' عدیل کہہ رہا تھا۔

''نہیں صاحب! روٹی تو کھا کر آئی ہیں۔'' لیکن جب عدیل نے انہیں ٹیبل پر آنے کو کہا تو وہ جھٹ سے آ گئیں۔ بتولاں منع کرنے لگی لیکن عدیل نے روک دیا۔

رعنا اور عدیل ناشتے کے دوران ان سے باتیں بھی کرتے رہے اور انہوں نے دھیان نہیں دیا،

بتولاں آج معمول سے کہیں زیادہ خاموش تھی۔

''چلو بھئی، آج ان بچیوں کی وجہ سے تمہارا دن بھی اچھا گزر جائے گا لیکن مانگے کی خوشیاں دو چار دن کی ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں اپنا بندوبست خود کر لینا چاہیے۔'' اس نے شرارت سے مسکرا کر کہا تھا، رعنا لب بھینچے بیٹھی رہی۔

اور واقعی اس کا دن اچھا گزرا۔ وہ بچیوں کے ساتھ لان میں کھیلتی رہی۔ اس موسم میں یہاں تتلیاں بہت آ گئی تھیں۔ چھوٹی لڑکی جس کی عمر چار سال تھی، ان کے پیچھے بھاگتی رہی اور رعنا اس کی بھاگ دوڑ کو انجوائے کرتی رہی۔

عدیل آج معمول سے کچھ جلدی گھر آ گیا، وہ اس وقت قیمہ بھون رہی تھی اور کٹی ہوئی موسمی سبزیاں اس کے قریب ہی رکھی تھیں۔

''جلدی سے کمرے میں آؤ۔'' وہ بڑے جوش سے کہہ کر کمرے کی جانب چل دیا۔

''کیا مصیبت ہے، جلدی سے آؤ۔ فارغ کھڑی ہوں نا میں۔'' بڑبڑاتی ہوئی وہ بھی بیڈ روم میں آ گئی۔

''یہ تمہارے لیے ہے، میں نے بہت شوق سے خریدا ہے۔'' اس نے ایک پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔

''کیا ہے یہ؟'' کسی جذبے کے بغیر اس نے تھام لیا۔

''کھول کر دیکھو کیسا ہے؟'' پتا نہیں وہ اتنا پرجوش کیوں ہو رہا تھا۔

رعنا نے پیکٹ کھولا۔ ایمبرائیڈری سے بھرا ریڈ کلر کا خوب صورت سوٹ تھا۔ ریڈ کلر جو شادی کی رات اتارا پھر کبھی پہنا ہی نہیں تھا۔

''کیسا ہے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ہوں، ایسی چیزوں کی شاپنگ کا تو تمہارا خاصا تجربہ ہے نا!'' اور عدیل کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ پیکٹ الماری میں رکھ کر وہ پھر کچن میں آ گئی۔

لنچ میں عدیل نے پھر بچیوں کو بلوا لیا۔

''ان کی ماں کدھر ہے ماسی! میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' رعنا نے پوچھا۔

''گھر میں پڑی ہے، دکھوں کی ماری۔'' بتولاں نے آہ بھری۔

''کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟''

''بس جی کیا بتاؤں، دو بیٹیاں یہ ہیں، تیسری ابھی چند روز کی ہے۔ گھر والا کہتا ہے مجھے بیٹیاں نہیں چاہئیں، تُو ہے کہ لائن لگائے چلی جا رہی ہے، اسی لیے تو ماں باپ کے در پر چھوڑ گیا ہے۔ بڑا ظلم کرتا ہے جی میری بیٹی پر۔ گھر بسانے کے لیے سب سہتی رہی ہے، لیکن ظالم نے چھت بھی چھین لی ہے۔''

بتولاں سسکنے لگی۔

''کدھر ہوتا ہے وہ؟'' عدیل نے پوچھا۔

''تھوڑی دور گاؤں ہے جی اس کا۔''

''میں ڈرائیور سے کہتا ہوں گاڑی نکالے۔ تم اللہ بخش کو ساتھ کر دو۔ اسے کہو اپنے داماد کو لے کر آئے۔''

موسم خاصا بدل گیا تھا، اسی لیے طبیعت میں سستی ہو رہی تھی، لنچ کے بعد وہ لیٹی اور سو گئی چونکہ دن میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ سوا ایک گھنٹے بعد آنکھ کھل گئی۔ وہ لیٹی نہیں، اٹھ کر کاریڈور میں آ گئی اور تب ہی اس نے عدیل کی آواز سنی۔

''شریف با کردار بیوی نعمت ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ عورت تو باکردار ہی ہوا کرتی ہے۔ اسے ورغلانے والا مرد ہے۔ اس کی ہوس عورت کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ قدر کرو اپنی بیوی کی، یہ بیٹیاں آزمائش نہیں، انعام ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا، ان سے محبت کرنا اور ان کی عزت کرنا تمہارا فرض ہے ولی محمد! مردانگی کے غرور میں تم جو کچھ کر رہے ہو، کیا یہ کسی مرد کو زیب دیتا ہے؟''

اس نے دیکھا، ولی محمد (بتولاں کا داماد) اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ اچھے کپڑوں میں ملبوس تھا اور کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

''یقین کرو میری بات کا، جب ایک شریف عورت تمہاری زندگی میں نہیں رہے گی تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ منا کر لے جاؤ اپنی بیوی کو اور پھر کبھی اسے ناراض مت کرنا۔''

''جی صاحب! ٹھیک ہے صاحب!'' ولی محمد نے کہا تھا اور رعنا واپس کمرے میں پلٹ آئی۔

کچھ دیر بعد عدیل کمرے میں آیا اور ٹھٹک گیا۔ وہ اس کا لایا ہوا ریڈ سوٹ پہنے آئینے کے سامنے کھڑی بہت دنوں بعد لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ اسے دیکھا تو مسکرائی اور بولی۔

''آج ہم رات کا کھانا باہر کھائیں گے اور مجھے کچھ شاپنگ بھی کرنا ہے۔''

مارے حیرت کے وہ کچھ بول نہیں سکا مگر اسے پوچھنا تو تھا کایا کیوں پلٹ گئی کہ نہیں جانتا تھا عورت کا دل پتھر کا نہیں، موم کا ہے۔ مرد کا کردار اس کی محبت، اس کی وفاداری، اسے کسی بھی وقت، کسی بھی روپ میں ڈھال دیتی ہے، جیسے عدیل کے بدلتے خیال نے اسے بھی بدل دیا تھا۔ پہلے صرف وجود اس کا تھا، اب دل اور روح بھی عدیل کی ہو گئی تھی۔

❀ ❀ ❀

ہم آوارگانِ شوق

ادھر نئی فلم ریلیز ہوتی، ادھر رحمت بیگم عرف نمی کسی سہیلی کے ساتھ سینما ہال پہنچ جاتی، اور واپسی پر ہمیشہ اپنے شوہر سے تگڑی مار کھاتی، مگر فلم بینی کا ایسا چسکا پڑا تھا کہ اترنے کا نام نہیں لیتا تھا، فلمیں دیکھ دیکھ کر اسے اداکاری کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا، مگر سننے میں یہی آتا تھا، فلمیں لاہور میں بنتی ہیں اور وہاں جانا اس کے لیے ولایت جانے سے کم مشکل تو نہیں تھا۔ ویسے اسے یقین تھا، وہ بھی کسی ہیروئن سے کم نہیں ہے، اس کے چہرے اور جسم کی ساخت میں بلا کی کشش ہے، اس بات کا اظہار آس پڑوس میں رہنے والیاں بھی کر جاتیں اور شادی سے پہلے وہ چاچے، مامے کے لڑکوں کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھ چکی تھی، پر اماں بڑی گھاگ عورت تھی، صرف پندرھواں لگا تھا کہ اماں نے سردار کے پلے باندھ دیا، ویسے اس وقت اسے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس نہیں تھا۔ دلہن بن کر خوش خوش سردار کے گھر چلی آئیں تھی، سردار عمر میں اس سے پندرہ سال بڑا تھا۔ مضبوط قد کاٹھ، بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی بے رحم سے آنکھیں، پکا رنگ، تیکھا سا ناک نقشہ، کم عمر رحمت تو دہل سی گئی اور یہ دہشت چار سال تک قائم رہی، پہلے موتیا، پھر صفدر کی پیدائش، رحمت لڑکی سے عورت بن گئی اور اسے یہ بھی احساس ہوا کہ سردار خاموش طبع، اپنے آپ میں مگن رہنے والا ہے، تھوڑا سا غصیلا ضرور ہے، مگر اتنا بھی نہیں کہ اس سے دب کر عمر گزار دی جائے۔

''آخر میرے بھی تو کچھ ارمان ہیں، کون سی دوبارہ زندگی ملنا ہے کہ یہ زندگی میں سردار کے اشاروں پر ناچتے گزار دوں۔'' بس یہ سوچ ذہن میں آنے کی دیر تھی کہ اس نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ ساتھ کے گھر میں انورا رہتی تھی، جسے رحمت، بھابھی انورا کہتی تھی، وہ بڑی فیشن ایبل عورت تھی، خوب شوخ رنگوں کے چست کپڑے پہنتی، ہر وقت بنی ٹھنی رہتی، میک اپ تو کبھی کسی شادی بیاہ میں شرکت کے لیے محلے کی عورتیں کرتی ہی تھیں، مگر انورا کا تو انداز بھی دوسرا تھا۔ ہونٹوں پر شوخ لب اسٹک

اور اس پر چمکیلی افشاں، آنکھوں میں سرمہ تو سب ہی لگاتی تھیں، مگر انورا جیسا دنبالے دار سرمہ کسی کو لگانا نہیں آتا تھا۔ ابرو موچنے سے فالتو بال نکال نکال کر باریک کیے گئے تھے اور بالوں کا جوڑا تو وہ ایسا بناتی کہ سب دیکھتی رہ جائیں۔ یہ رحمت کی قسمت کہ وہ ان کے پڑوس میں آ بسی تھی۔ بچہ وچہ کوئی نہیں تھا اور میاں اس کا اکثر بیمار رہتا تھا۔ اکثر عورتیں انورا سے اس سلسلے میں کافی ہمدردی رکھتی تھیں، مگر اس بات پر کسی نے بھی انورا کو دکھڑے روتے نہیں سنا تھا، اب جو رحمت کا اس کے گھر خاصا آنا جانا ہوا تو دل میں مچلتا سوال لبوں پر آ ہی گیا۔ انورا شیشے کے سامنے بیٹھی میک اپ مکمل کرنے کے بعد گال پر تل بنانے لگی تھی۔ ہاتھ روک کر بولی۔

''سردار تو خاصا خوش شکل اور بھرپور مرد ہے نا، پھر تجھے اس کی اچھی شکل سے کوئی فائدہ ہوا ہے؟''

رحمت سوچ میں پڑ گئی۔

انورا مسکرائی اور بولی۔ ''مرد جتنا بدصورت ہوتا ہے، اتنا ہی بیوی کے رعب میں رہتا ہے، میں کیا کرتی ہوں، کیسے رہتی ہوں، کیا کھاتی، پہنتی ہوں، کہاں کہاں گھومتی پھرتی ہوں، اس میں اتنی جرات نہیں کہ مجھ سے سوال و جواب کر سکے۔ ریلوے میں ملازم ہے، اچھی خاصی تنخواہ ہے، دوسری سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ جن سے فائدہ اٹھاتی ہوں صرف میں۔''

انورا نے بدصورت شوہر کے اتنے فوائد بتائے کہ رحمت نے بے اختیار سوچا، کاش سردار بھی ایک بدصورت، دبلا پتلا، ڈرپوک مرد ہوتا۔

''تم تو گھر میں بند رہتی ہو۔ کبھی چلو نا میرے ساتھ، مل کر فلم دیکھیں گے۔''

''فلم؟''

''ہاں، ایک دو بار امی اور خالہ کے ساتھ شادی سے پہلے میں فلم دیکھنے گئی تھی۔ میری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کیسی خوبصورت زندگی تھی، ان لوگوں کی اور وہ تھے بھی کتنے خوبصورت۔''

''اچھا، تجھے فلمیں دیکھنا اچھا لگتا ہے، یہ تو بڑی اچھی بات ہے، دو بجے کا شو ہمیں مناسب رہے گا، تم بچے سلا کر آ جانا، گھر میں تمہاری ساس تو ہوتی ہے، اگر کوئی بچہ جاگ بھی گیا تو وہ سنبھال لے گی۔''

''ہاں خالہ (ساس) تو بہت اچھی ہے، وہ مجھے کہیں آنے جانے سے نہیں روکتی، مگر فلم پر جانا شاید اسے اچھا نہ لگے۔''

''تو بھلا، بے وقوف! یہ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے، کہہ دینا انورا بھابھی نے بازار جانا ہے، مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہہ رہی ہے۔''

بس ایک بار انورا نے راہ دکھائی اور پھر وہ اسی راہ پر چل نکلی۔ سردار ٹھٹکا۔ اس کی ماں نے بہو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر فلم کا نشہ رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ اگلے تین سالوں میں وہ بالکل ہی بدل چکی تھی، بلکہ اب تو اسے اس نام سے بھی چڑ تھی، وہ نمی کہلاتی تھی۔ سردار کو اس کا نیا نام بالکل پسند نہیں تھا، وہ رحمت کہہ کر ہی بلاتا اور یوں آغاز میں ہی جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔

''ہزار بار کہا ہے، میرا نام اب نمی ہے۔ تم مجھے اس پرانے زمانے کے فضول نام سے مت پکارا کرو۔''

''انسان بن جا رحمتے! کسی دن مجھ سے ہڈی پسلی تڑوا لے گی۔''

مگر نمی جانتی تھی، وہ صرف دھمکی ہی دیتا ہے، ہاتھ کبھی نہیں اٹھائے گا۔ چھ برس اس کے پڑوس میں رہنے کے بعد انورا کسی دوسرے شہر چلی گئی، مگر اب نمی کو شہر کے ہر سینما ہاؤس کا راستہ یاد تھا، میک اپ کرنا، ہر نیا فیشن کرنا، سب سیکھ چکی تھی۔ اس لیے انورا کے جانے سے اسے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔

پھر جب موتیا آٹھ برس کی ہوئی، وہ بھی ساتھ جانے کی ضد کرنے لگی۔ نمی نے سوچا۔ حرج ہی کیا ہے، بچی بھی خوش ہو جائے گی۔ وہ موتیا کو بھی ساتھ لے جانے لگی۔ موتیا کے جوان ہونے کی اسے تو خبر نہ ہوئی، یہ احساس اسے سینما ہاؤس میں آنے والے بے فکرے شوخے لڑکوں نے دلایا، تب اس نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا، لڑکوں کے گروپ کی جانب سے اچھالے گئے بے ہودہ فقروں نے اس کا رنگ اڑا دیا تھا۔ وہ ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی اور نمی سوچ رہی تھی۔

''موتیا تو بہت خوبصورت ہے، بالکل کسی فلم کی ہیروئن کی طرح۔''

پھر یہ بات اس کے ذہن سے نکلی نہیں۔

''میری تو عمر اس خواہش میں ہی بیت گئی، کوئی راہ ہی نہیں ملی، ورنہ آج اس گندے محلے میں چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے مکان کے بجائے کسی شاندار بنگلے میں رہ رہی ہوتی۔ اب بیٹی کا مستقبل سردار جیسا کوئی مزدور آدمی نہیں ہونا چاہیے۔ اسے فلم کی ہیروئن بناؤں گی، پھر ہم سب ٹھاٹ سے رہیں گے۔ مگر کیسے؟ فلمیں تو لاہور میں بنتی ہیں، سنا ہے وہاں کچھ جگہیں ہیں جہاں اداکار اکٹھے ہوتے ہیں اور فلم بنتی ہے۔''

ایک دن اس نے موتیا سے پوچھا، تمہیں فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے، یہ تو میں جانتی ہوں، تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تم بھی فلم کی ہیروئن بن جاؤ۔''

''اماں! وہ۔۔۔'' موتیا ڈر رہی تھی، اگر اس نے بتا دیا، وہ دن رات خود کو ہیروئن تصور کر کے کسی نہ کسی ہیرو کے ساتھ خیالوں ہی خیالوں میں گیت گاتی رہتی ہے، تو اماں بہت مارے گی۔ بس اسی لیے ہچکچا رہی تھی، مگر نمی کا انداز کچھ ایسا تھا۔ موتیا اپنی خواہش کو زیادہ دیر چھپا نہیں سکی۔

''ہائے موتیا! اگر تم ہیروئن بن جاؤ! ہمارے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

''اماں۔۔۔ اماں! کیا ایسا ممکن ہے؟'' موتیا کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔

''میں ارادے کی بڑی پکی عورت ہوں۔ بس تیری مرضی پوچھنی تھی، تجھے بھی شوق ہے تو بس سمجھ لے، ہیروئن بن گئی۔''

''اماں! تم پڑھی لکھی نہیں ہو، میں نے پوری آٹھ جماعتیں پڑھی ہیں۔ تمہیں پتا نہیں ہے۔ فلمیں لاہور میں بنتی ہیں اور جہاں فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ اس جگہ کو اسٹوڈیو کہتے ہیں، وہاں ہر وقت چوکیدار کھڑا رہتا ہے، ہر کسی کو اسٹوڈیو میں داخلے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔''

''جو لوگ ایکٹر بن گئے ہیں، وہ بھی تو آخر کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہوئے ہی ہیں نا!'' نمی مایوس نہیں تھی۔

آنے والے دنوں میں وہ ماں، بیٹی کم سہیلیاں زیادہ بن گئیں۔ موتیا کو گھر کے کام کاج میں پہلے بھی زیادہ دلچسپی نہیں تھی، اب تو نمی اس سے بالکل ہی کام نہیں کرواتی تھی۔ برتن مانجھنے، کپڑے، برتن دھونے سے اس کے ہاتھ خراب ہو سکتے تھے۔ ہیروئن کے ہاتھ تو بہت خوب صورت، نازک نازک، صاف ستھرے ہوا کرتے ہیں۔

دادی دنیا سے گزر چکی تھی، ورنہ پوتی کے فیشن اور نخروں پر ضرور اعتراض کرتی۔

ماں، بیٹی فلم دیکھ کر آتیں، پھر ریڈیو پر فرمائشی پروگرام باقاعدگی سے سنتیں اور موتیا گانوں پر بالکل ویسا ہی ڈانس کرتی جیسا فلم میں ہیروئن نے کیا ہوتا تھا۔

''کاش انورا یہاں ہوتی، وہ ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتی۔'' نمی کو اب کئی بار انورا کا خیال آتا تھا۔

''اماں! وہ دن کب آئے گا جب میری بھی تصویریں اخباروں میں چھپیں گی؟'' دونوں اس وقت بازار کی مشہور دکان پر بیٹھی چاٹ کھا رہی تھیں۔ میز پر پڑے اخبار کے فلمی صفحے دیکھ کر موتیا کچھ اداسی، کچھ بے تابی سے سوال کر رہی تھی۔

''میں خود بھی زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہتی۔ سوچ رہی ہوں، لاہور کا چکر لگاؤں، مگر وہاں ہمارا کوئی رشتہ دار تو رہتا نہیں ہے۔ ہوٹل میں جا کر ٹھہرنا پڑے گا اور اس کے لیے پیسہ چاہیے۔ تجھے تو پتا ہے۔ تیرا کنجوس ابا گن کر پیسہ میرے ہاتھ پر رکھتا ہے۔''

''اگر پیسہ نہیں ہے، پھر ایسے منصوبے بناتی ہی کیوں ہو؟'' موتیا ناراضی سے بولی۔

''مایوس کیوں ہوتی ہے۔ تجھے ہیروئن بنانا میرا خواب ہے، اور میں اس خواب کو پورا کر کے دم لوں گی۔ چل اب جلدی جلدی کھا، تھوڑی خریداری رہ گئی ہے، پھر گھر چلیں۔''

''اب اور کیا لینا ہے؟'' موتیا نے قریب رکھے دو پھولے ہوئے شاپنگ بیگ دیکھ کر سوال کیا۔

''کپڑے لتے تو لے لیے ہیں، اب ان سے میچ کرتی نلکیاں، فیتے، بٹن بھی تو لینے ہیں کہ نہیں؟''

موتیا نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولی، درزن سے کہنا، جلدی سی دے۔ پچھلی مرتبہ اس نے بہت دن لگا دیے تھے اور دیکھو اماں! نیلے سوٹ کے لیے یہ ڈیزائن کتنا اچھا رہے گا۔'' اس نے اخبار کے صفحے پر مسکراتی ہیروئن کی تصویر پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں۔ اچھا ہے، یہی بنوا دوں گی۔ اخبار لپیٹ کر شاپر میں ڈال لے۔'' اور موتیا نے ایسا ہی کیا۔

❁ ❁ ❁

سردار کوئی ڈھیلا ڈھالا مرد نہیں تھا، اس نے کمانے کے ساتھ ساتھ گھر کے مسئلے مسائل پر بھی پوری نظر رکھی ہوئی تھی، بیٹی جوان ہے اور خوب صورت بھی، سونے پر سہاگہ تعلیم بھی حاصل کر رہی ہے، اسے بہت اچھے مال دار گھر میں بیاہنے کا اس نے فیصلہ کر رکھا تھا۔

اس سلسلے میں بیوی سے کوئی بات نہیں کی کہ وہ اسے بے وقوف اور گنوار عورت خیال کرتا تھا، جسے جوان بیٹی کی ماں ہونے کے باوجود فیشن کرنے کا بے انتہا شوق تھا اور سردار کو اس کی اس عادت سے سخت چڑ تھی۔

ماں، بیٹی گھر آئیں، دونوں لڑکے گلی میں دروازے کے سامنے کھیل رہے تھے۔ بڑے نے اطلاع دی کہ ابا گھر آ چکا ہے، ساتھ میں دو مہمان بھی ہیں۔

''تیرے ابا کو بھی چین نہیں۔ یہ بھلا گھر آنے کا وقت ہے اور ساتھ میں پتا نہیں کون سے مفت خورے اٹھا لایا ہے۔'' نمی نے بڑبڑاتے ہوئے برقعہ اتارا۔ موتیا کو کسی کے آنے جانے سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ تو گھر کے کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگاتی تھی۔ نمی کو اگر کام کی زیادتی کی وجہ سے مدد چاہیے ہوتی تو بیٹوں کو ہی پکارا کرتی تھی۔

''موتیا کی ماں! لاہور سے میرے مہمان آئے ہیں۔ امیر بندے ہیں، کھانا بہت اچھا سا ہونا چاہیے۔''

سردار نے بیٹھک سے آ کر بتایا تھا۔

''لاہور سے؟ وہاں تو بڑی فلمیں بنتی ہیں۔'' نمی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''او پاگل! یہ کوئی بھانڈ نہیں ہیں۔ اچھے خاصے کھاتے، پیتے شریف لوگ ہیں۔'' سردار نے دانت پیستے ہوئے مگر دھیمی آواز میں کہا تھا کہ گھر کوئی اتنا بڑا نہیں تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر بنی بیٹھک میں معزز مہمان بیٹھے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا، اس کی آواز وہاں تک پہنچے۔

''لاہور سے آئے ہیں۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔'' سردار کے جانے کے بعد اس نے موتیا کو بتایا۔

''ہمیں کیا فائدہ؟ یہ تو ابا کے جاننے والے ہیں۔''

''سوچنے سے راستے نکل آتے ہیں۔ تم ہر وقت مایوسی کی باتیں مت کیا کرو۔ اور سنو، یہ دونوں تھیلے ابھی تک یونہی رکھے ہیں، کچھ تو عقل کیا کرو، انہیں فوراً چھپاؤ۔ سردار کی نظر پڑ گئی تو اس فضول خرچی پر بڑا چلائے گا۔''

''اوہ ہاں۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' وہ برق رفتاری سے اٹھی۔ دونوں تھیلے اٹھا کر صندوق میں ڈال دیے۔

سردار کے ملنے والے آتے ہی رہتے تھے، مگر ماں، بیٹی کو بیٹھک میں آنے کو کبھی نہیں کہا تھا، لڑکے ہی کھانا اندر لے کر جایا کرتے تھے، مگر آج تو انہونی ہو گئی۔ سردار نے نمی سے کہا۔

''کھانا خود لے کر جاؤ اور موتیا کو بھی ساتھ لے لینا۔''

دونوں مرد معقول صورت، سردار کے ہم عمر اور لباس سے پیسے والے دکھائی دیتے تھے، جب سردار نے بتایا کہ یہ اس کی بیٹی موتیا ہے۔ بہت ہنرمند اور لائق ہے تو دونوں پر شفقت انداز میں مسکرائے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر پانچ، پانچ سو موتیا کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ سردار نہیں نہیں کرتا رہ گیا، مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی اور وہ دونوں بھی اس کے انکار کو اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ موتیا روپے ہاتھ میں پکڑے باپ کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھی، جونہی باپ کی جانب سے ''رکھ لو'' کا اشارہ ملا، وہ مٹھی بند کر کے بیٹھک سے باہر آ گئی اور جب نمی کمرے سے باہر آئی تو اس کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے تھے۔

''کیا ہوا اماں! اتنی چپ کیوں ہو۔ دیکھو تو کتنے روپے مل گئے، لگتا ہے ابا کے دوست بہت ہی

مال‌دار ہیں۔''

''ہاں ہوں گے، مگر موتیا! کوئی یونہی روپے ہاتھ پر نہیں رکھ دیا کرتا، مجھے تو یہ کچھ خاص معاملہ لگتا ہے۔''

''کیسا معاملہ؟'' وہ ماں کے قریب کھسک آئی۔

''ضرور سردار نے تیرا رشتہ پکّا کر دیا ہے۔''

''کک۔۔۔کیا، مگر مجھے تو شادی نہیں کرنی، میں تو ہیروئن بننا چاہتی ہوں۔''

''چپ شور نہ ڈال۔ ابھی میں مری نہیں، زندہ ہوں۔ اگر یہ شادی تیرے میرے مفاد میں ہوئی تب ہی ہوگی، نہیں تو ہنگامہ کھڑا کر دوں گی۔''

نمی کا شک غلط نہیں تھا، ان دو میں سے ایک نے موتیا کو اپنے بھتیجے کے لیے پسند کر لیا تھا۔ دراصل وہ لوگ آئے ہی اسی سلسلے میں تھے۔ سردار کی ان سے کب سے بات چیت چل رہی تھی، سردار لاہور جا کر لڑکا بھی دیکھ آیا تھا۔

موتیا کے جوڑ کا خوب صورت پڑھا لکھا جوان تھا۔ اس کے چچا، چچی نے ہی اس کی پرورش کی تھی۔ اب تو چچی بھی دنیا میں موجود نہیں تھی، بڑا سا گھر اور یہ دو مرد۔ سردار کا تو بس نہیں چلتا تھا، ابھی نکاح پڑھوا دے۔ سردار بہت خوش تھا، انہیں رخصت کر کے وہ اندر آیا، نمی آگ بگولہ سامنے برآمدے میں ہی موڑھے پر بیٹھی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' وہ صورت دیکھ کر ٹھٹکا۔

''سب کچھ کر کرا کے پوچھتے ہو مجھے کیا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے، بہت عقل ہے تمہارے پاس، مگر میں بھی نری گدھی نہیں ہوں اور پھر میں موتیا کی ماں ہوں، تم سے زیادہ اس کا اچھا برا سوچ سکتی ہوں، مگر تم نے تو مجھے ہوا تک نہیں لگنے دی۔ پتا نہیں کب سے بات چلائے ہوئے تھے جو آج وہ لوگ پیسے بھی رکھ گئے۔ جی تو چاہ رہا تھا، وہیں رولا ڈال دوں، مگر تیری عزت کے خیال سے چپ ہو گئی۔''

''بڑی مہربانی تیری اور تیری عقل کو بھی میں آج مان گیا ہوں مگر یہ تو بتا میں نے آج تک کچھ غلط کیا ہے۔ جواب کروں گا۔'' پھر اس نے نمی کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

''گھر میں کوئی عورت نہیں ہوگی دونوں مرد ذاتی کاروبار کرتے ہیں، صبح کے نکلے شام کو گھر آتے ہوں گے، لاہور شہر میں رہتے ہیں، یہ تو سب کچھ ان کے حق میں جا رہا تھا۔ نمی نے جب یہ سب سوچا تو خاموش ہو گئی، جب موتیا کو ساری بات سمجھائی تو وہ بھی خاموش ہو گئی۔

ویسے بھی وہ اپنی عقل سے کم ماں کی عقل سے زیادہ سوچتی تھی۔

مگر رشتہ پکّا ہو جانے کے بعد ایک تبدیلی اس میں آ رہی تھی، وہ طیب کے بارے میں بہت سوچنے لگی تھی۔ سردار نے نمی کو بتایا تھا، وہ بہت خوب صورت اور پڑھا لکھا ہے، یہ دونوں باتیں موتیا کو بڑی اچھی لگی تھیں۔ اور موتیا کی یہ تبدیلی نمی کو بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔

❁ ❁ ❁

سردار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، وہ دو دن بے ہوشی کی حالت میں اسپتال میں رہا، ڈاکٹر اس کی طرف

سے مایوس تھے۔ سر پر چوٹ آئی تھی، آپریشن کا کہا گیا۔

نمی نے لاہور طیب کے چچا کو تار بھجوا دیا، وہ بھی فوراً چلا آیا، سردار کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی، بس اس وقت کسی سیانے کی ضرورت تھی۔ طیب کے چچا علاؤالدین نے یہ ضرورت پوری کر دی۔

''کیوں روتی ہو موتیا! تمہارے ابا بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔'' وہ ستون کے ساتھ کھڑی سسک رہی تھی، جب علاؤالدین نے قریب آ کر تسلی دی تھی۔

''میرا دل گھبرا رہا ہے چچا!''

''نہیں، نہیں پریشان مت ہو۔ تمہارا ابا ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ باہر تازہ ہوا میں آ جاؤ۔'' وہ اسی طرح اسے سہارا دیے باہر اسپتال کے لان تک لے آیا، اس وقت سورج ڈوب رہا تھا، یہ وقت طبیعت پر اداسی کے اثرات چھوڑتا ہے اور یہ لڑکی جس کا رنگ بہت چمک لیے ہوئے صاف تھا۔ اور جس کے ہونٹوں کا کٹاؤ بہت واضح تھا۔ اس وقت اداسی کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہوئی تھی۔

وہ اس کی اداسی دور کرنے کو بے چین تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، پھر بوتل پلائی، سموسے منگوا کر دیے۔ اور جب وہ وارڈ کی طرف واپس آ رہے تھے موتیا پہلے کی نسبت کافی سنبھل چکی تھی۔

سردار کو ابھی بہت دن اسپتال میں رہنا تھا۔ علاؤالدین ذاتی کاروبار کرنے والا مصروف آدمی تھا۔ وہ دو چار دن رہنے کے ارادے سے آیا تھا، مگر اب اس نے طیب کو لکھ دیا تھا۔

''کاروبار تم سنبھالو، مجھے آنے میں دن لگ جائیں گے۔'' نمی اس کے اس ایثار پر بہت ممنون تھی اور وہ موتیا کے سامنے اٹھتے بیٹھتے اس کی تعریف کرتی تھی، ساتھ ہی یہ بھی کہا۔

''یہ تمہارا چچا سسر ہے، طیب کو اسی نے پالا ہے۔ اس لیے طیب اس سے پیار تو کرتا ہی ہوگا، اس کا احسان مند بھی ہوگا۔ اگر تم اس بڈھے کے دل میں جگہ بنا لو تب تمہیں اس گھر میں جا کر کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اور تم اپنی ہر بات آرام سے منوا سکو گی۔'' موتیا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور علاؤالدین کا بہت خیال رکھنے لگی۔

مگر تھوڑے دن بعد اس نے محسوس کیا، اسے موتیا کی یہ خدمت اتنی خوشی نہیں دیتی، وہ تو خود اس کے ناز اٹھا کر، اسے اس کی پسند کی چیزیں دلا کر خوش ہوتا ہے۔ اور یہ تو بہت ہی اچھی بات تھی۔ ان چند دنوں میں اس نے موتیا کو بہت مہنگے جوڑے دلا دیے۔ نہ صرف موتیا، بلکہ نمی کو بھی بہت کچھ لے کر دیا۔

وہ سردار کی بیماری سے پریشان تو تھی، مگر خوب صورت کپڑے تو اس کی کمزوری تھے۔ سردار گھر آ گیا، مگر معذوری کے ساتھ وہ ابھی کسی کو پہچانتا نہیں تھا۔ نہ ہی خود سے اٹھتا بیٹھتا تھا، مگر ڈاکٹر نے کہا تھا۔ علاج اور وقت کے ساتھ وہ سنبھل جائے گا۔

کاروبار بڑا لڑکا دیکھنے لگا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا، مگر یہ مشکل جو آ پڑی تھی۔

سردار کے گھر آتے ہی علاؤالدین دوبارہ جلد آنے کے وعدے کے ساتھ لاہور چلا گیا تھا، دس دن کے بعد لدا پھندا واپس آیا تو سردار کی وہی حالت اور کاروبار کی بگڑتی حالت سامنے تھی۔ نمی سے مشورہ کر کے اس نے لڑکے کے ساتھ اپنا بھروسے کا ایک ملازم بھی لاہور سے بلوا کر لگا دیا۔

''یہ علاؤالدین چاچا تو بڑے کھلے دل والا ہے۔ میں سوچتی ہوں اماں! پتا نہیں اس کا بھتیجا بھی

اتنا دل والا ہو گا یا نہیں۔'' موتیا ماں سے بے تکلف تھی۔ دونوں ہم عمر سہیلیوں کی طرح ہر بات کر لیا کرتی تھیں۔

''چھوڑ دفع کر، اس کے بھتیجے کو۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔'' ماں کی بات پر اس کے برابر چارپائی پر لیٹی موتیا اٹھ بیٹھی اور ٹکر ٹکر ماں کی صورت دیکھنے لگی، لیکن رات کے اس پہر زیرو کے بلب کی ملگجی روشنی میں وہ ماں کے چہرے کے تاثرات جاننے سے قاصر تھی۔

''ادھر آ میرے پاس۔ تجھے کچھ سمجھانا ہے میں نے اور میری بات سننے سے پہلے یہ یاد رکھ لینا کہ میں تیری دشمن نہیں، ماں ہوں اور میں نے آج تک کبھی تیرے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔'' نمی کا انداز ہی ایسا تھا کہ تجسس کی ماری موتیا جلدی سے بستر چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ لیکن جو کچھ ماں نے کہا، وہ سننے کے بعد بدک کر پیچھے ہٹی پھر خفگی سے اٹھنے لگی۔

نمی نے بازو پکڑ لیا ''تم بچی ہو، نا سمجھ ہو، لیکن میں نے ایک دنیا دیکھی ہے اور پھر اپنی بڑی بوڑھیوں سے بہت کچھ سن بھی رکھا ہے، ہمارا تجربہ یہی کہتا ہے جوان مرد کی نسبت بوڑھا خاوند بیوی کے بہت ناز نخرے اٹھاتا ہے، اس کی ہر بات مانتا ہے اور اس کی خواہش رد کرنے کی، اسے خفا کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔''

''پر اماں! نہیں، نہیں میرا دل نہیں مانتا۔'' موتیا نے پوری شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''بے وقوف پاگل کی پتر! وہ جو طیب ہے نا، تجھے گھر کی چار دیواری میں قید کر دے گا۔ دن رات خدمت کروائے گا، گھر کے کام کر کر کے تیرے ہاتھ کھردرے ہو جائیں گے، اور یہ جو چہرے پر گلاب کھلے رہتے ہیں نا، سرسوں پھولے گی پھر یہاں پر، جبکہ علاؤالدین سر آنکھوں پر بٹھائے گا، پیر دبانے کو کہے گی تو اس پر بھی تیار ہو جائے گا۔'' پھر مزید ہلکی آواز میں بولی۔ ''بڈھا آدمی ہے، دو چار سال میں لڑھک جائے گا، پھر ساری دولت تیری ہی ہو گی، جس سے چاہے شادی کر لینا اور اتنے پیسے سے اپنی ذاتی فلمیں بھی بنانے لگنا اور وہ طیب، علاؤالدین نے بتایا ہے۔ یتیم بھتیجا ہے اس کا۔ صرف کاروبار کی نگرانی کرتا ہے، ایک طرح کا منشی سمجھ لو اور وہ بھی تنخواہ کے بغیر، چاچے کا جب جی چاہتا ہے، خرچے کی کچھ رقم رکھ دیتا ہے اس کے ہاتھ پر۔''

پھر آنے والے دن نمی نے اسے قائل کرنے میں گزارے، ادھر علاؤالدین کی نوازشیں بڑھتی جا رہی تھی۔ دراصل یہ نمی کا کارنامہ تھا۔ ایک طرف بیٹی کو قائل کر رہی تھی، تو دوسری طرف علاؤالدین کی بھی ہمدردی، مشوروں پر مشورے دے کر خوب عیش کر رہی تھی اور آخر ایک دن موتیا نے ماں کی بات سمجھ لی۔

موتیا کا نکاح، علاؤالدین کے ساتھ پڑھوا دیا گیا۔ لڑکے پہلے تو حیران ہوئے، لیکن انہیں اعتراض کیونکر ہو سکتا تھا، آخر کو ابا کا یہ دوست اتنی مدد کر رہا تھا ان کی۔

نمی نے ابھی صرف نکاح ہی کیا تھا، رخصتی کے لیے ایک سال کا وقت مانگ لیا تھا، یہ شرط کڑی تھی، لیکن علاؤالدین کو فی الحال ماننا ہی پڑی تھی۔

ان دنوں دبئی کم ہی لوگ گئے تھے اور جو گئے تھے، ان کی حالت دنوں میں بدل گئی تھی۔ کوٹھڑیاں،

کوٹھیوں میں بدل گئی تھیں۔ نمی نے دیکھ لیا تھا، بڑے لڑکے سے بھی کام سنبھالا نہیں جا رہا تھا اور چھوٹا تو ابھی بالکل بچہ تھا۔ علاؤالدین سے اسے دبئی بھجوانے کی بات کی۔ اس نے جھٹ ہامی بھر لی، بڑے والے نے سنا تو وہ بھی خوش ہو گیا۔

علاؤالدین نے کاروبار سمیٹا اور نمی کی خواہش پر وہ سب لاہور آ گئے۔ آنے سے پہلے طیب کو تار دے دیا تھا، بتا دیا تھا۔ نکاح کر لیا ہے، کچھ لوگ ساتھ آ رہے ہیں۔ لیکن یہ نہیں لکھا تھا، تمہاری منگیتر پر ہی ہاتھ صاف کر لیا ہے۔

❁ ❁ ❁

طیب اسٹیشن پر انہیں لینے آیا تھا، جہاں وہ اتنی کم عمر چاچی کو دیکھ کر چونکا، وہاں موتیا کے دل میں بھی اسے دیکھ کر ملال سا اتر آیا۔

''یہ کیا کر دیا میں نے۔'' اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ طیب کی صورت دیکھنے کے بعد نمی سمجھ گئی تھی، موتیا کے دل کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔ اسی لیے ساتھ ساتھ تھی، جہاں وہ لڑکھڑائی، بڑھ کر تھام لیا۔ لیکن موتیا کی آنکھوں میں اتر آنے والی نمی اسے مسلسل پریشان بھی کر رہی تھی اور غصہ بھی دلا رہی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد ٹیکسی ایک پرانی سی کوٹھی کے باہر رکی، اچھا خاصا رقبہ تھا اور جھاڑ جھنکاڑ کے ساتھ ساتھ لان میں کئی پھل دار درخت بھی موجود تھے۔

''قیام پاکستان سے پہلے اس کوٹھی میں انگریز رہتے تھے اب یہ میرے نام ہے۔'' علاؤالدین نے فخر سے بتایا۔ ''سن رہی ہے نی موتیا! یہاں کبھی میم صاحبہ گھومتی تھیں اب تُو سر اٹھا کر پھرے گی۔''

''موتیا!'' طیب نے چونک کر سر اٹھایا، پھر سوالیہ نظروں سے چچا کی جانب دیکھا۔

''سامان اندر رکھو، ہم لوگ تھکے ہوئے آئے ہیں اور میرے سسر کی حالت تو تم دیکھ رہے ہو، بیمار آدمی ہے، جلدی سے اسے کمرے میں لٹاؤ۔ آج گرمی بھی کچھ زیادہ ہے۔'' اس کی نظروں کے سوال کو نظر انداز کر کے وہ تیز تیز بول رہا تھا۔

نمی نے تو آتے ہی سارے گھر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہاں کئی کمرے تھے۔ دھول، مٹی سے اٹا ہوا بہت سا سامان بھی موجود تھا، یہ سب دیکھ کر نمی تو مارے خوشی کے پاگل سی ہوئی جا رہی تھی۔

سردار اچھا کما رہا تھا، لیکن گھر بالکل چھوٹا سا تھا جہاں ضرورت کا تھوڑا سا سادہ فرنیچر ہی موجود تھا۔

''دیکھ ری، قسمت بدل گئی تیری۔'' موتیا کو ٹہوکا دیا، لیکن وہ بالکل ٹس تھی، اسے کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔

بے حد رنجور وہ باپ کی پٹی سے لگی چپ چاپ بیٹھی تھی۔

''نی ادھر آ۔'' نمی نے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور تقریباً گھسیٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں لائی۔

''اب بول۔ کچھ منہ سے پھوٹ، شکل کیوں اتری ہوئی ہے تیری۔''

''اماں! وہ طیب تو بڑا خوبرو جوان ہے، بالکل کسی فلم کے ہیرو کی طرح۔''

''دفع دور۔ نا پاگل ہے تُو۔ وہ ہیرو جیسا ضرور ہے، لیکن ہیرو نہیں ہے، کنگلا ہے۔ پھوٹی کوڑی نہیں ہے اس کی جیب میں، اگر خدانا خواستہ تیرا بیاہ اس سے ہو جاتا تو اس کوٹھی کے پچھواڑے کوئی ایک

آدھ کمرا ہی مقدر ٹھہرتا۔ پھر سارے خواب مٹی میں رُل جاتے، لیکن اب بس تُو دیکھتی جا، ہائے اب تو لگتا ہے۔ میرا خوب حقیقت بننے کے دن بہت ہی قریب آگئے ہیں۔"

"سچ کہتی ہو اماں! پتا ہے مجھے تو لگتا ہے، میں اس بڈھے کی بڑی سی کوٹھی میں کھو کر رہ جاؤں گی۔ میرے سارے خوب بس خواب ہی رہ جائیں گے۔"

"ماں پر اعتبار نہیں تجھے! ارے تیرے خوابوں کو حقیقت نہ بنا دیا تو نام بدل دینا میرا۔ اور ہاں سن، اس بڈھے سے ذرا بچ کے رہنا۔ تنہائی کا موقع مت دینا اسے۔ یہ مرد چاہے قبر میں پاؤں لٹکے ہوں، ہوتے بڑے خبیث مردود ہیں۔ میرے ساتھ ساتھ ہی رہیو۔"

"ٹھیک ہے اماں! مجھے کون سا اس کے منہ لگنے کی چاہ ہے۔" موتیا نے برا سا منہ بنایا۔

"اب یہ باسی روٹی جیسی شکلیں نہ بنا، اس کے سامنے بری بری شکلیں بنانے کی ضرورت نہیں، جب بھی بات کرنا، مسکرا کر شرما کر کرنا، یہ بڈھے مرد شکی مزاج اور خرانٹ بھی ہوتے ہیں۔"

"اماں! طیب سے دوستی تو کر سکتی ہوں۔"

"دفع۔ میں کیا بکواس کر رہی ہوں۔ کہاں گئی ہے تیری عقل۔ اری میری بچی! طیب کے تو سائے سے بھی بچ کر رہنا، یہ بڈھا سب سے زیادہ شک تو اسی کے حوالے سے کرے گا نا۔"

"اماں! ہم فلم اسٹوڈیو کب جا سکیں گے، ذرا جلدی بات کریں نا اس سے۔"

"کر لوں گی بات، پہلے تو میں سوچ رہی ہوں، کسی دن لاہور کے سینما گھر میں جا کر فلم دیکھیں، یہاں کے تو سینما گھر بھی بڑے خوب صورت، صاف ستھرے ہوں گے، وہ ہمارے شہر جیسے نہیں کہ ایک سیٹ پر ہم بیٹھے ہیں، فلم دیکھ رہے ہیں، مونگ پھلی کھا رہے ہیں، برابر میں یہ موٹا تازہ چوہا بیٹھا بھی یہی شغل فرما رہا ہے۔"

"ہاں اماں! مزا آئے گا۔" وہ بھی پُرجوش ہو گئی۔

۞ ۞ ۞

علاؤالدین کے پاس پیسہ تو تھا، گھر میں عورت نہیں تھی۔ عورت کے وجود کے بغیر سلیقے کا کیا تصور؟ یہاں تین ملازم تھے، ایک ڈرائیور، ایک ملازم صفائی کے لیے اور ایک سست الوجود بابا کھانا بنانے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔

علاؤالدین نے بھنا گوشت، کباب، چاول سب بنوائے تھے اور سب ایک سے بڑھ کر ایک بدمزا۔

"کل سے کھانا میں بناؤں گی۔" نمی نے اعلان کر دیا۔ فرشی دری پر کھانا لگایا تھا۔ موتیا، نمی چھوٹا لڑکا اور علاؤالدین بیٹھے تھے، سردار کی تو صحت ایسی نہیں تھی۔ اسے تو چھوٹے بچے کی طرح کھلانا پڑتا تھا اور طیب دسترخوان پر موجود نہیں تھا۔

"دیکھ لو۔ یہ اوقات ہے طیب کی۔" نمی نے موتیا کے کان میں سرگوشی کی جبکہ وہ سوچ رہی تھی شاید خفا ہوگا، چچا سے۔ اسی لیے نہیں آیا ہوگا۔

"سب سے پہلے تو سردار کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلیں۔" نمی نے کھانے کے بعد داماد

صاحب سے کہا تھا۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" وہ اس وقت میٹھی نظروں سے موتیا کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہڑبڑا کر سر ہلانے لگا۔

"اور اپنی موتیا کو فلم اسٹوڈیو دیکھنے کا بڑا شوق ہے، کسی روز وہاں کی بھی سیر کروائیں نا اسے۔"

"فلم اسٹوڈیو کی سیر کا شوق؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔ فلمیں دیکھنے کی بھی بڑی شوقین ہے اور ہے بھی تو کسی فلمی ہیروئن جیسی۔"

"ہاں، ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔" آنکھوں میں خمار بھر کر شوخی سے موتیا کو دیکھا اور یہ شوخی اسے زہر لگی، لیکن ماں کا حکم تھا۔ بےزاری کا اظہار نہیں ہونا چاہیے تو شرمانے کی اداکاری کرنے لگی۔

"ہائے کیسی پیاری لگے گی، فلم میں ہیرو کے ساتھ اسی طرح کی اداکاری کرتی ہوئی۔" نمی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹی کی بلائیں لے لیں۔

شام کو سیر کا پروگرام بن گیا علاؤالدین کے پاس ایک پرانی سی گاڑی اور اناڑی سا ڈرائیور تھا۔

"اپنی موتیا کو بڑا شوق ہے گاڑی میں سیر کرنے کا اور بڑا ارمان تھا اسے اپنی گاڑی کا۔ سچی آپ تو اس کے لیے بڑے ہی بھاگوان ثابت ہوئے ہیں۔ میری بیٹی نے تو جو چاہا پا لیا۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں خالہ! بس دیکھتی جاؤ، کیسے کیسے عیش کرواتا ہوں اپنی بیگم کو۔"

اور خالہ کہنے پر نمی کی تو آنکھیں ابل پڑیں۔ موتیا نے ہنسی چھپانے کو دوپٹا منہ کے آگے کر لیا، مگر وہ عمر میں نمی سے بڑا تھا۔ ٹھیک ہے رشتے کا تقاضا کچھ اور تھا، پھر بھی سیدھے سبھاؤ خالہ بول دینا نمی کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"ارے بولنا تھا تو بھابھی ہی کہہ دیتا۔ ننھا چوزا بنتا ہے کم بخت۔"

اور اگلے روز وہ کم بخت واقعی بال رنگوا کر شوخ سا کرتا شلوار پہنے جب گھر آیا تو نمی اور موتیا کمرے کی کھڑکی سے دیکھ کر ہی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

"ہائے ہائے اماں! کہاں پھنسا دیا، کیا لگے گا یہ پاگل کا پتّر میرے ساتھ چلتے ہوئے۔"

"نوکر لگے گا تیرا اور کیا لگے گا۔ اور پھر تُو کیوں چلنے لگی اس کے ساتھ، تیرے ساتھ ساتھ تو تیری فلموں کے ہیرو ہوں گے۔ آج ہی چلتے کہیں سیر کو، پر تیرے ابا کی طبیعت آج کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔"

دونوں بےتکلفی کے ماحول میں دوپٹے سائیڈ پر ڈالے کمرے میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ پتا ہی نہیں چلا کب لدا پھدا علاؤالدین کمرے میں چلا آیا۔

موتیا اور نمی نے جلدی سے دوپٹے اوڑھے۔

"کب آئے، پتا ہی نہیں چلا۔" نمی معصومیت سے بولی۔

"لو جی، میں کیا جی، ذرا ادھر تو دیکھو۔ ذرا بوجھو تو ہم تمہارے لیے کیا لائے ہیں۔ اور دیکھو جی، ہم نے آج جو حلیہ تبدیل کیا ہے۔" وہ پورے کا پورا موتیا کی جانب متوجہ تھا، جو گھونگھٹ میں منہ چھپائے کھڑی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"شرماتی ہے، بچی ہے نا ابھی۔" نمی نے پہلے بتایا، پھر جتایا۔

''او خالہ! عمر تو میری بھی زیادہ نہیں، پر تم جانو جب گھر میں خیال کرنے والی عورت نہ ہو تو پھر مرد کا کچھ نہیں رہتا۔ زمانے کی ٹھوکروں نے حلیہ ٹائیٹ کر دیا ہے میرا، بال بھی وقت سے پہلے سفید ہو گئے، کبھی رنگوانے کا خیال نہیں آیا، پر اب تو سارے خیال رکھنے پڑیں گے نا۔''

''بڈھا ضرورت سے زیادہ تیز جا رہا ہے، ہم اندھے ہیں، جھریوں سے بھرا چہرہ اور فرماتے ہیں عمر زیادہ نہیں، خبیث! پھر کیا منہ پر گرم استری لگ گئی ہے۔'' نمی جی ہی جی میں کوس رہی تھی، اور موتیا کا جی چاہتا تھا، دھکے مار کر اسے کمرے سے نکال دے۔

''وہ کیا خیال ہے جی، آج سیر شیر کو نا چلیں، دیکھو تو میں کیسے خوب صورت مہنگے مہنگے کپڑے لے کر آیا ہوں، لفافہ کھولو نا جی۔'' وہ موتیا کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

موتیا اس کے قریب سے ہٹ کر لفافے کھولنے لگی، کپڑے واقعی بہت قیمتی اور خوب صورت تھے، لیکن اس نے تعریف نہ کی۔ ہاں نمی اس کی پسند کو سراہتی رہی۔

''پھر بن گیا پروگرام، چلیں شام کو شالامار باغ دیکھنے؟''

''وہ جی علاؤ الدین بھائی! اصل میں سردار کی طبیعت بڑی خراب ہے، آج ہم کہاں نکل سکتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے، آپ سردار چاچا کے پاس رہنا، میں اور موتیا چلے چلتے ہیں۔'' آرام سے پروگرام بنا لیا۔

''نن۔۔نہیں۔ میرا مطلب تھا، سردار کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔''

''آہاں، ہاں، لیکن آج تو ڈاکٹر کی چھٹی ہے، اصل میں، میں سردار چاچا کو شہر کے سب سے اچھے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہوں نا۔'' جلدی سے وضاحت کی۔ اسی وقت دستک دے کر ملازم اندر آیا

''وہ جی طیب بھائی، آپ کے کمرے میں کھڑے ہیں، بلا رہے ہیں آپ کو۔''

''کنگلا فقیر، پیسے چاہییے ہوں گے، ہٹا کٹا ہے، لیکن کام کی عادت ہی نہیں، ابھی تک میرے ہی ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔'' وہ انہیں سنانے اور کچھ جتانے کو بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''شکر ہے گیا تو، میرا تو دم الجھتا ہے اماں!'' موتیا ہراساں سی تھی۔

''ایسے نہیں کہتے۔ ویسے سامان تو تیرے لیے بڑا اچھا لایا ہے۔'' وہ ایک، ایک چیز کو دوبارہ دیکھنے لگی۔

''دفع کرو اماں! ایک بار فلموں میں آ جاؤں، اس سے کہیں اچھا سب **کچھ خرید** لوں گی۔''

''اسٹوڈیو جانے کے لیے ایسے ہی قیمتی کپڑوں کی ضرورت تھی۔'' **نمی** نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

موتیا اکتا کر کمرے سے باہر نکل آئی، آج کھانا نمی نے بنایا تھا، بڑی **اچھی** خوشبو آ رہی تھی، وہ ادھر ہی آ گئی۔ اور دم لگے کھانوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر چیک کرنے لگی۔ اسے پتا نہیں لگا۔ کب طیب ادھر آ گیا، اس نے پانی کا گلاس اٹھایا، تب موتیا نے آہٹ پر مڑ کر دیکھا، اسے **دیکھ** کر گھبرا گئی۔

''وہ میں کھانا دیکھنے آئی تھی، دم پر لگایا ہے نا۔''

''مجھے کیا کہتی ہیں آپ بیگم صاحبہ ہیں۔ مالکن ہیں اس گھر کی۔'' اس کے لہجے میں کاٹ تھی، یقیناً وہ خفا تھا۔ یہاں آنے کے بعد موتیا پہلی مرتبہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس کی جانب سے ایسے جواب پر منہ بنایا اور بولی۔

''مجھے کیا جتاتے ہو، بیگم صاحبہ مجھے آپ کے چچا نے بنایا ہے، ورنہ مجھے ایسے کون سے چاؤ چڑھے تھے۔''

''آپ کو شاید یہی سب چاہیے تھا۔'' وہ شاید آج سارے گلے شکوے کر لینا چاہتا تھا۔

''تا یہ مجھ سے حساب کتاب کس سلسلے میں؟'' موتیا کا مزاج عود کر آیا، کمر پر ہاتھ ٹکا کر اکڑ کر بولی۔

''مجھے کیا حساب کتاب کرنے ہیں، تم لوگوں کو دیکھنے کے بعد احساس ہوا، اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ میں تو چچا کا شکر گزار ہی ہوں۔'' پانی گلاس میں انڈیل چکا تھا، لے کر باہر چلا۔ موتیا نے پوچھا بھی۔

''تا تو کیا مطلب ہے تمہارا، میں بدشکل ہوں، گنوار ہوں، کیا مجھے فیشن کا نہیں پتا؟'' طیب نے جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔

''ایں کیا سمجھتا ہے خود کو، آج علاؤ الدین سے کہوں تو وہ اسے گھر سے نکالنے میں دو منٹ نہ لگائے، پر کیا فائدہ۔ دفع کرو۔ ہا۔۔۔۔ ذلیل کیا بکواس کر گیا ہے۔ لگتا ہے غصے کی عینک لگا کر میری شکل دیکھی ہے۔ ہاں تو بے چارہ غصے سے تو بات کرے گا نا! ویسے ہوئی بڑی زیادتی ہے اس کے ساتھ۔ وچارا، خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔'' وہ ہانڈی میں سے بوٹیاں پلیٹ میں منتقل کرنے لگی۔ ارادہ یہیں بیٹھ کر دعوت اڑانے کا تھا۔

''ہوں آپا!! اکیلے اکیلے۔'' چھوٹا بھی آ گیا۔

''توبہ کبھی نہ مجھے آرام سے کچھ کھانے مرنے دینا، فوراً پہنچ جاتا ہے حصہ بٹانے۔ آ جا اب کھا لے تُو بھی۔'' پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

❁ ❁ ❁

''کیا خیال ہے، چلیں پھر آج کہیں گھومنے شومنے۔'' دوپہر کے کھانے کے بعد علاؤ الدین پھر سر پر سوار تھا۔

''لگتا ہے بڈھے کا دماغ گھوم گیا ہے، اماں نے بتایا بھی ہے، ابا کی طبیعت اچھی نہیں ہے، لیکن پھر وہی ایک ہی رٹ۔'' موتیا نے جل کر سوچا تھا۔

''وہ جو گلابی ساڑھی لایا ہوں، تمہیں میری قسم، وہی پہن کر چلو۔'' کیسا عاشقانہ اسٹائل تھا۔

''چھوٹے کو بھی ساتھ لے جانا، اسے بھی بڑا شوق ہے سیر کا اور ویسے بھی ابھی تمہاری رخصتی نہیں ہوئی، یوں اکیلے جانا مناسب نہیں۔'' نمی مخاطب تو موتیا سے تھی، لیکن سنا علاؤ الدین کو رہی تھی۔

خلاف توقع وہ چپ ہی رہا اور موتیا بھائی کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی، ڈرائیور کو چھٹی دے کر علاؤ الدین خود گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے بھی اپنے ساتھ بٹھایا تھا، چھوٹا پیچھے گردن اکڑائے سڑک پر پیدل چلتے لوگوں کو حقارت سے دیکھ رہا تھا۔

''کدھر چلیں؟'' بات کرتے کرتے ہاتھ موتیا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''فلم اسٹوڈیو۔'' جھٹ سے جواب دیا۔

''اس ادھر کیا ہے، اندر تو کوئی گھسنے بھی نہیں دیتا، بڑی سختی ہوتی ہے۔''

''کوئی واقفیت نہیں ہے آپ کی؟''

''لو میری بھانڈوں سے کیوں واقفیت ہونے لگی۔''

''آپ کو کیا پتا فنکار ہوتے ہیں یہ لوگ۔'' موتیا تو تڑپ اٹھی۔ یوں لگا تھا، یہ گالی براہِ راست اسے دی گئی ہے۔

''دفع کرو۔ ہم چڑیا گھر چلتے ہیں۔''

''ہاں تمہارے لیے وہی بہتر ہے۔'' موتیا نے جل کر سوچا۔

چڑیا گھر میں ایک کیمرے والے کو اجرت دے کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر تصویریں بھی بنوالیں۔ بندروں کو چنے کھلائے، چھوٹا بھی بڑی خوشی خوشی ہر جانور کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ علاؤالدین بار بار اس کے برابر اور بے حد قریب چلنے لگتا، اگر ماں نے موڈ ٹھیک رکھنے کی تاکید نہ کی ہوتی تو کب کی برداشت کھو بیٹھتی۔

کئی گھنٹے چڑیا گھر میں خراب کروا کر پھر ایک ہوٹل سے کھانا کھلایا۔ موتیا کو تو صرف مرچوں کا ذائقہ ہی محسوس ہوا، آنکھوں سے پانی، کانوں سے دھواں نکلنے لگا، جبکہ وہ مزے سے کھا رہا تھا اور بتا رہا تھا وہ اس ہوٹل کے سواد کو بے حد پسند کرتا ہے۔

''اسے ہوٹل تو نہ کہو۔'' موتیا نے در و دیوار اور فرنیچر پر نظر ڈالتے ہوئے احتجاج کیا۔

''او اچھا، اچھا خفا ہو۔ کسی بڑے ہوٹل کیوں نہیں لے کر گیا۔ خفا نہ ہو چلیں گے اُدھر بھی۔'' پھر آگے کو جھکا اور راز داری سے بولا۔ ''جس دن صرف ہم دونوں سیر کے لیے نکلیں گے تب چلیں گے اُدھر۔''

رات گئے جب واپسی ہوئی۔ طیب برآمدے میں کرسی ڈالے کچھ پڑھ رہا تھا، آنکھ اٹھا کر بھی ان لوگوں کی جانب نہیں دیکھا، جبکہ موتیا چپکے چپکے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''خفا ہے بے چارہ؟'' یہی اندازہ لگاتی اپنے کمرے میں آگئی۔

❁ ❁ ❁

صبح صبح نمی نے جگا دیا۔

''کیا ہے اماں! سو لینے دے۔'' اس نے پھر کروٹ بدل لی۔

''نی موتی! میں نے دیکھا ہے، ادھر کوٹھیوں میں رہنے والیاں صبح سویرے سڑک پر سیر کر رہی ہوتی ہیں، چل ہم بھی چلتے ہیں۔ اسی طرح جان پہچان بڑھے گی۔ دیکھ نا، یہ سب بڑے لوگ ہیں، خوب فیشنی سی ہیں ساری عورتیں، ہمیں ان سے ملنے ملانے سے فائدہ ہی ہوگا۔''

''اچھا جی اور جو کسی نے پوچھ لیا، اس کوٹھی کے مالک بابے سے تمہارا کیا رشتہ ہے تو کیا جواب دیں گے؟''

''کہہ دیں گے رشتے داری ہے، چل اب اٹھ نا۔''

اور فیشنی بیگمات سے ملنے کے شوق میں وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلدی سے صابن سے رگڑ کر منہ ہاتھ دھویا۔ میرون لپ اسٹک لگا کر ریشمی جوڑا اور ہیل والی جوتی پہنے وہ جانے کو تیار تھی۔ نمی ایک بار پھر کمرے میں آئی اس کی تیاری دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور دونوں باہر نکل آئیں۔ اس وقت آسمان پر سرخی تھی، سورج ابھی نکلا نہیں تھا، یہ اوائل اپریل تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی صبح کی ہوا بھلی لگ رہی تھی، قریب سے گزرنے والی ہر لڑکی اور خاتون نے کچھ حیرت اور دلچسپی سے انہیں اور ان کے حلیے کو دیکھا۔

''ستیاناس، کتنی فلموں میں ہیروئن کو صبح کی سیر کرتے دیکھ چکے ہیں، پھر بھی میں آج بھول گئی۔''

''نی موتی! کل سے یہ جوتے، یہ کپڑے نہیں چلیں گے، آج ہی ہم بابے کے ساتھ جا کر صبح کی سیر کے لیے جوتے اور کپڑے خرید لیں گے۔''

''ایک تو اماں! صبح صبح تمہیں بابا یاد آیا ہے۔ اب سارا دن فضول گزرے گا۔'' نمی نے ہنس کر دھپ رسید کردی، تب ہی دونوں کی نظر پڑی، سامنے سے طیب آرہا تھا۔ یقیناً وہ صبح کی سیر کا عادی تھا۔ موتیا نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھے گئی۔

''چل نا۔ کیا پاؤں میں موچ آگئی ہے؟'' نمی نے دانستہ اس کی محویت کو توڑا اور ساتھ کھینچ لیا۔

''اے بات تو سنیے۔'' کسی نے پکارا۔

دونوں نے مڑ کر دیکھا، ایک ادھیڑ عمر، لیکن اسمارٹ سی عورت ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ لیے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

''جی جی السلام علیکم! کیا حال ہے؟ صحت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟'' نمی نے اخلاق نبھایا۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ کا کیا حال ہے۔ پہلی بار دیکھ رہی ہوں تم دونوں کو۔ کسی دوسرے گھر کیسے آئی ہو۔ مہمان ہو؟'' اس کا لب و لہجہ ان ہی جیسا تھا۔

''نہیں نہیں جی۔ یہ والی کوٹھی اپنی ہے۔'' نمی نے بڑے فخر سے بتایا۔

''اچھا اچھا جہاں وہ خوب صورت سا نخریلا لڑکا رہتا ہے، طیب نام ہے نا، اس کا؟ کیا لگتا ہے وہ تمہارا؟'' انہیں پتا نہیں تھا، یہ کوٹھی خوب صورت لڑکے کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ حوالہ ان کے لیے کچھ خاص پسندیدہ بھی نہیں تھا۔ نمی اس کے سوالوں کو گول کر گئی اور بولی۔

''آپ کا گھر کون سا ہے؟ اتنی دبلی پتلی ہو کر آپ نے یہ صبح کی سیر کا کھڑاگ کیوں پال لیا ہے۔''

''بس جی الٹا دماغ ہے میرے میاں کا۔ فیشنی عورتیں پسند ہیں۔ میری جان کھائے رکھتا ہے۔ میں تو بڑی سیدھی سادھی معصوم سی عورت ہوں، پر میرا وہ بڑا تیز ہے اور جب سے فلم والوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے، چنک مٹک والی زنانیوں نے حواس ہی چھین لیے ہیں۔''

''ف۔۔۔ فلم والے؟'' دونوں ایک ساتھ بولی تھیں اور ایک سیکنڈ میں مارے جوش کے چہرے کے رنگ بدل گئے تھے۔

''آہو مصیبت، سیاپا، جان کا روگ۔'' جتنی یہ مشتاق، عورت اتنی بے زار تھی۔

''کیا کرتا ہے تمہارا میاں فلموں میں؟'' نمی نے ایک اہم سوال کیا۔

’’کھے تے سوا (راکھ اور مٹی) فلم والے سوائے پان کھانے، سگریٹ پینے اور باتیں بنانے کے اور کچھ نہیں کرتے، ہاں یاد آیا۔ وہ بھی خوب پیتے ہیں، شیطان کے بچے۔‘‘

’’نئیں تو تمہارا میاں کچھ تو آخر کرتا ہی ہوگا۔‘‘ نمی نے پھر اصرار کیا۔

’’کہتا ہے فلم بناؤں گا۔ بیڑا غرق۔ میں کہتی ہوں زنانیاں نچا کے کیوں پیسے کمانے ہیں۔ اس سے بہتر ہے تو ٹین ڈبے کا کارخانہ لگالے۔‘‘

’’اے میں نے کہا بیگم صاحبہ! بھابی جی، بہن میری۔ اپنے میاں سے ملواؤ نا۔ ہمیں فلمی دنیا کو قریب سے دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔‘‘ نمی کی کھگھیاہٹ کو خاتون نے کچھ یوں دیکھا، جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو اور جواب نہیں دیا۔

’’ہیں جی! پھر بتایا نہیں آپ نے کون سا گھر ہے آپ کا؟‘‘

’’میں تو تمہیں شریف عورتیں سمجھی تھی۔‘‘ وہ چل پڑی۔

’’ہم شریف ہیں بالکل، بلکہ گھریلو اور یہ میری بیٹی بڑی دکھی اسٹوری ہے اس کی، وہ جو بڈھا اس کوٹھی میں رہتا ہے نا، اس نے نکاح کرلیا ہے میری بیٹی سے۔‘‘ نمی اس کے پیچھے پیچھے چلتی تیز تیز بول رہی تھی۔

’’ہائے میں مرگئی۔‘‘ عورت ٹھٹکی۔ گھوم کر موتیا کو دوبارہ دیکھا اور سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

’’یہ ملوک سی لڑکی اور وہ بڈھا بدمعاش، نا ایسی کیا آفت آگئی تھی تم پہ؟‘‘

’’لمبی کہانی ہے بیگم صاحبہ! کبھی تمہارے گھر آؤں گی تو سناؤں گی۔‘‘

’’آج شام ہی آجاؤ۔ وہ جو سبز گیٹ والا گھر ہے نا جس میں جامن کا درخت بھی لگا ہوا ہے، وہی ہمارا ہے۔‘‘

’’ضرور ضرور آئیں گے۔‘‘ مقصد حاصل ہوگیا تھا، دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا، کس طرح خوشی کا اظہار کریں۔ گھر سے پہلے دن اکیلی نکلی تھیں، اور اتنی جلدی مراد بھی بر آئی۔ اب سب عورتیں گھروں کو جانے لگی تھیں کہ دن چڑھنے لگا تھا، وہ بھی واپس آگئیں۔

’’کدھر نکل گئی تھیں تم دونوں سویرے سویرے۔ یہ تم لوگوں کا چھوٹا سا شہر نہیں ہے، لہور ہے لہور۔ یہاں ہر طرح کے لوگ بستے ہیں، تمہیں اکیلے نکلنے میں احتیاط کرنا چاہیے۔‘‘ بڑھے ہوئے پیٹ کے ساتھ کمر پر دونوں جانب ہاتھ رکھے بڑی سنجیدگی چہرے پر طاری کیے وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔

’’ہم عورتیں ہیں بکریاں نہیں کہ کوئی ہانک کے لے جائے گا۔‘‘ آج پہلی بار نمی نے کچھ جتا کر کچھ بے زار صورت بنا کر بات کی تھی۔

’’او پاگلو! بکریاں ہوتیں تو مجھے اتنی فکر کس بات کی ہوتی۔ چلو بس کرو اب اندر چل کر ناشتے کا انتظام کرو۔‘‘ اس کا انداز آج واقعی گھر کے سربراہ کا تھا یا انہیں ہی محسوس ہوا تھا۔ دونوں کچن کی طرف چل دیں۔

’’اوئے کیا دیگیں چڑھانی ہیں، جو ایک عورت نہیں سنبھال سکتی۔ تم ادھر آؤ موتیا! میرا بٹوہ نہیں مل

رہا، صبح سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ اچھی خاصی رقم تھی اس میں۔ میری الماری میں اور کمرے میں ہر جگہ دیکھو اور ہاں کہیں تمہارے بھائی نے تو نہیں اٹھایا، بڑا شوق ہے اسے گلی سے گزرنے والے ہر ٹھیلے سے کچھ نہ کچھ لے کر کھانے کا، پوچھو اس سے بھی۔‘‘

’’نا جی۔ میرا بھائی کوئی چور ہے۔‘‘ وہ برا مان گئی۔

’’اوا چھا اچھا، چل کر پہلے کمرا دیکھ لے نہ ملا بٹوہ پھر کچھ سوچوں گا۔‘‘ وہ غصے سے پیر پٹختی اس کے کمرے میں آئی تھی۔ آتے ہی سیدھی الماری کی طرف بڑھی، پٹ کھولے اور تب کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا۔ پلٹ کر دیکھا علاؤالدین نے کمرے میں آنے کے بعد دروازہ بند کرکے چٹخنی چڑھادی تھی۔

’’یہ۔۔۔ یہ کک۔۔۔ کیا؟‘‘ ناز ادا سے بات کرنے والی موتیا گھگھیا رہی تھی۔

’’او سوہنیو!‘‘ وہ ہنستے ہوئے قریب آیا۔ بڑھ کر بازو سے تھام لیا۔ ’’نکاح میں ہو تم میرے، اور یہ تمہاری ماں چالاک لومڑی۔ پتا نہیں کیوں خوامخواہ کی پابندیاں لگاتی ہے۔‘‘

’’پر جی رخصتی نہیں ہوئی ابھی۔‘‘ اس نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔

’’ہوتی رہے گی رخصتی بھی۔‘‘ وہ اس پر جھکا۔

❁ ❁ ❁

ناشتے پر طیب، علاؤالدین اور چھوٹا موجود تھا۔ طیب کبھی ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا تھا، آج اس کے چچا علاؤالدین نے خود بلوایا تھا اسے، وہ کچھ بتانا، کچھ جتانا چاہتا تھا۔ طیب کا یہ خفا خفا، کٹا کٹا انداز بتاتا تھا وہ اب بھی موتیا کو اپنی منگیتر سمجھتا ہے، حالانکہ یہ صرف علاؤالدین کی اپنی سوچ تھی۔ اس کے اندر کے چور کی آواز بھی ہوسکتی تھی، طیب کبھی بھی اس کے بہت قریب نہیں رہا تھا، اس کی دلچسپیاں، اس کے شوق ہمیشہ سے الگ تھے، جب تک علاؤالدین کی پہلی بیوی زندگی رہی، طیب اپنی خالہ کے ہاں رہا تھا، اس کی خالہ غریب بیوہ تھی، طیب کا خرچ علاؤالدین ہی دیتا تھا کہ آخر اس جائیداد میں طیب کا حصہ تو تھا، پھر علاؤالدین کی بیوی کا انتقال ہوا، طیب ان دنوں میٹرک میں تھا، اب چچا تنہائی سے گھبرا کر اسے اپنے ہاں آکر رہنے کو کہتا تھا۔ پھر دو سال بعد جب طیب کی خالہ کا انتقال ہوگیا، تب اسے ادھر آنا پڑا۔ اس کے آنے سے چچا کو خاصا فائدہ بھی ہوا کہ وہ حساب کتاب میں تیز تھا اور سمجھ دار بھی تھا۔ ان دنوں میں اس نے اس حقیقت کو مان لیا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہے طیب کا ہی ہے کہ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ لیکن موتیا کے آجانے کے بعد وہ پھر سے جوانی کو بلانے کے جتن کر رہا تھا۔ پلنگ کے برابر رکھی میز طاقت کی دواؤں اور دیسی کشتوں سے بھر گئی تھی۔ اب اسے طیب کا وجود بھی کھلنے لگا تھا۔ وہ بھتیجا کم رقیب زیادہ لگنے لگا تھا۔ ہاں ایک بات اطمینان بخش تھی کہ طیب ادھر کم آتا تھا اور موتیا، نمی اسے بالکل اہمیت بھی نہیں دیتی تھیں۔ لیکن آج جی میں ایسی ترنگ تھی کہ اسے بلا بیٹھا، لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ وہ دونوں تو آئیں نہیں، کمرے میں نمی بڈھے کو کوسنے بددعائیں دینے میں لگی تھی اور موتیا کا رو، رو کر برا حال تھا۔

’’بس اب نہیں رہنا یہاں، آج ہی اس سبز گیٹ والی کے گھر جاکر اس کے میاں کو شیشے میں اتارنا ہے، بس اب جلدی فلموں میں کام شروع کرنا ہے۔‘‘ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔

’’اچھا اچھا۔ چپ کر، کچھ سوچنے دے مجھے۔‘‘

"سب سے پہلے تو یہ سوچ اس بڈھے بھیڑیے کو قتل کس طرح کرنا ہے۔"

"نی چپ کر، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" نمی نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"نہیں چھوڑوں گی میں اسے۔" اس نے ماں کا ہاتھ ہٹا کر دانت پیستے ہوئے کہا۔

"بس، بس۔ ہے تو تیرا میاں ہی، نکاح میں تو، تُو ہے نا اس کے، اور اس کو قتل کر کے ہم نے پھانسی تھوڑا چڑھنا ہے۔ دفع کر اسے، ہمیں کون سا یہاں رہنا ہے۔ دیکھنا منہ دیکھتا رہ جائے گا یہ۔"

"اب کیا فائدہ!" موتیا نے بے بسی سے سر ہلایا۔

"کچھ نہیں ہوا، بس اب چپ کر جا اور اس پر ظاہر بھی نہ کرنا کہ تجھے اتنا غصہ ہے اس بات کا۔"

تب ہی دروازے کے باہر کوئی کھنکارا، دونوں سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ علاؤالدین ان کے سامنے تھا۔ اکڑ کر سیدھا کھڑا، چہرے پر جیت کا غرور، ہونٹوں پر مسکراہٹ، موتیا نے نفرت سے نگاہ پھیر لی۔

"او میں نے کہا جی۔ آج ناشتے کا خیال نہیں ہے؟" نمی کو نظر انداز کیے وہ بڑے لاڈ سے مخاطب تھا۔

"آج حلوہ پوری کو جی چاہ رہا ہے اس کا، اگر ہو سکے تو لا دو۔" نمی کو بات تو سنبھالنا تھی۔

"او یہ تو گل ہی کوئی نہیں، سجنو! تسی کہہ کرتے دیکھو۔" وہ فرمائش پوری کرنے چلا گیا۔

"شکر ہے، دفع ہوا۔"

"چھوڑ اسے۔ یہ دیکھ اٹھ کے کہ شام کو کپڑے کون سے پہن کر جائے گی۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو ابھی ناشتے کے بعد بازار چلتے ہیں۔"

۞ ۞ ۞

لیکن شام کو سبز دروازوں والے گھر میں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

سردار کا انتقال ہو گیا۔ وہ نمی اور موتیا کے لیے بس ایک اچھی یاد بن گیا۔ وہ جیسا بھی تھا جتنا بیمار اور ناکارہ سہی، لیکن پھر بھی اس کے وجود سے ڈھارس تھی اور اب بہت دنوں تک دونوں بے حد اداس رہیں، چھوٹا چودہ پندرہ سالہ لاابالی سا لڑکا تھا۔ قدبت کچھ ایسا تھا کہ اپنی عمر سے بہت چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔ باپ کے جانے پر دکھ تو اسے بھی تھا، لیکن فطری طور پر وہ کچھ من موجی ٹائپ لڑکا تھا۔ سارا دن گلی کے لڑکوں کے ساتھ کھیل میں گزار دینا اسے اچھا لگتا تھا اور بڑے نے تو جانے کے بعد ایک خط کے بعد کوئی رابطہ ہی نہیں کیا، جب تک سردار زندہ تھا۔ یہ ساری باتیں اتنی محسوس نہیں ہوتی تھیں، لیکن اس کے جاتے ہی دونوں یہ سب بڑی شدت سے سوچنے لگی تھیں۔

سبز گیٹ والے گھر کی بیگم بھی افسوس کے لیے آئی تھی، ان آس پاس کے گھروں میں رہنے والیوں کو اس موقع پر ہی پتا چلا کہ کامنی سی موتیا اس بڈھے علاؤالدین کی بیوی ہے۔ ہر کسی نے افسوس کیا اور بڈھے پر لعنت بھیجی۔

سبز گیٹ والے گھر کی بیگم کا نام مختار بیگم تھا اور اب اس کی ہمدردی ان دو مظلوم عورتوں کے ساتھ تھی۔

"میں کہوں گی اپنے میاں سے۔ تم لوگوں کو فلم میں چانس دلوائیں۔ اپنا کمانے لگو گی تو پھر مڑ کر

تھوکنا بھی نہیں اس مکار لومڑ کے منہ پر۔"

"بس بیگم! اب تو اوپر خدا اور نیچے آپ ہیں۔ ہمیں آپ ہی کا سہارا ہے۔" نمی نے تو بس پیر پکڑنے کی ہی کسر چھوڑی۔

۞ ۞ ۞

پھر ایک روز مختار بیگم دوپہر کے وقت بڑی عجلت کے عالم میں آئی تھی۔

"تیار ہو جاؤ تم دونوں۔ شام کو میرے میاں نے فلم کے کچھ لوگوں کو چائے پر بلوایا ہے، آ جانا۔ میں ملوا دوں گی۔"

"تم نے اپنے میاں سے ذکر تو کیا ہو گا ہمارا؟"

"آہو! پر وہ ذرا دوسرے دماغ کا بندہ ہے، کہتا ہے نئے چہروں کو چانس ملنا آسان نہیں ہوتا۔ ایسے شوقیہ فنکار تو نہ جانے کتنے اسٹوڈیو کے گیٹ پر رُلتے ہیں۔ اسی لیے تو میں آج تمہیں کچھ بڑے لوگوں سے ملوا رہی ہوں، جن کا فلم انڈسٹری میں واقعی ایک نام ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ مختار باجی! ہیرو کون سا آ رہا ہے؟" مختار عمر میں نمی سے بھی بڑی تھی، لیکن اسے خوش کرنے کو موتیا اسے باجی ہی کہتی تھی۔

"ہیرو کو کیا کرنا ہے، ہیرو کوئی فلم تھوڑا ہی بناتا ہے۔" مختار نے اس کی معصومیت پر لتاڑا۔

"اسے بھلا کیا پتا، بس جی آپ نے کہہ دیا۔ حکم سر آنکھوں پر۔ ہم دوپہر کو ہی آ جائیں گے، کچھ کام شام میں ہاتھ بٹا دیں گے نا آپ کا، بلکہ جو کچھ بنانا ہے مجھے بتا دینا۔ آپ بس آرام کرنا۔" نمی کی بات پر مختار بے حد خوش ہوئی اور کہہ دیا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔ تم دوپہر کو ہی آ جانا۔"

۞ ۞ ۞

سجی سنوری موتیا کو دیکھ کر مختار کا میاں چونکا تھا۔

"واقعی بھئی، بیوی ٹھیک کہتی ہے، اس لڑکی میں ہیروئن والی بات تو ہے۔ چلو آج شام کو اتنے لوگ آ رہے ہیں۔ سامنے کر دوں گا اسے اور اس وعدے پر فلم دلواؤں گا۔ تین سال تک میری پابند رہے گی۔" اسے دیکھ کر وہ خیالی پلاؤ پکانے لگا۔

شام کو آنے والوں میں ایک فلم کا نامور موسیقار، ایک کیمرہ مین اور ایک مکالمہ نگار تھا۔ تینوں نے ہی موتیا کی خوب صورتی کو سراہا۔ کیمرہ مین نے اسے کیمرے کی نظر سے ہر زاویے پر گھما کر دیکھا، کبھی کہتا، مسکراؤ، کبھی رو کر دکھاؤ، کبھی شرماؤ اور آخر میں فیصلہ سنایا۔

"لڑکی بس ایک بار اسکرین پر آ جائے۔ ساری ہیروئنیں گھر بیٹھا دے گی۔ راج کرے گی فلم انڈسٹری پر۔"

"تو کیا خیال ہے، کل ہی اسے لے چلیں۔ سروش صاحب کے پاس۔" مختار کا میاں شوکی مسکرایا۔

"ہاں بالکل، دیر کیوں کریں۔"

"تو ایسا کرتے ہیں۔ ہم ایک گروپ بنا لیتے ہیں۔ جس نے موتیا کو ہیروئن سائن کرنا ہو گا۔ اسے

ہم سب کو بھی اس فلم کے ان شعبوں میں رکھنا ہوگا، جن میں ہم ماسٹر ہیں۔"

سب نے اثبات میں سر ہلا دیے، جبکہ یہ خیال بھی سب کو آیا تھا، بھلا شوکی صاحب کس چیز کے ماسٹر ہیں، اس کا اٹھنا بیٹھنا فلمی ہنرمندوں کے ساتھ ضرور تھا، لیکن اس شعبے سے متعلق کوئی بھی کام اسے نہیں آتا تھا۔

سروش صاحب فلمی دنیا کا بڑا نام تھا۔ فلم پروڈیوس بھی کرتے تھے، ڈائریکٹر بھی تھے۔ واپسی پر موتیا کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ اور نمی جیسے ہواؤں میں اڑتی ہوئی گھر تک پہنچی تھیں۔

"میں نہ کہتی تھی، تو ایک روز بڑی ہیروئن بنے گی اور میں، ہائے قسمت نے مجھے ایسا موقع نہیں دیا اور میری ماں بھی بدنصیبی سے تیری ماں جیسی نہیں تھی نا، مجھے میرے بچپن میں ہی بیاہ کر فارغ ہوئی، سارے ارمان مٹی میں مل گئے میرے، ورنہ جوانی میں، میں کیا کم قیامت ڈھاتی تھی۔"

وہ اپنے دُکھڑے لے کر بیٹھ گئی، لیکن موتیا ٹوکتی تو تب جو کچھ سن رہی ہوتی، وہ تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

ان کی خوش قسمتی کہ علاؤ الدین سویرے ہی کسی ضروری کام کا کہہ کر شہر سے باہر چلا گیا۔ واپسی کا دن یہ پوچھتی رہیں۔ نہیں بتایا۔ ہاں اس نے موتیا کو ساتھ لے کر جانے کی بات کی تھی۔ آج تو نمی نے اس بات پر وہ شور ڈالا کہ بچارا گھبرا گیا، یاد دلانے لگا، موتیا منکوحہ ہوتی ہے اس کی۔

"بچی ہے ابھی وہ۔ بخشو اس کی جان!" نمی نے دانت پیسے۔

"اچھا پھر اسے اپنی نظروں کے سامنے ہی رکھنا، دیکھو وہ امانت ہے میری، زمانہ بڑا خراب ہے اور، اور اس گھر میں رہنے والا میرا بھتیجا، وہ بھی بظاہر معصوم، بے ضرر دکھائی دیتا ہے، ہے پورا شیطان، خیال رکھنا۔ اسے تنہائی میں موتیا سے کوئی بات نہ کرنے دینا۔"

"اے نا تو سیٹھ علاؤ الدین صاحب!" نمی کمر پر ہاتھ ٹکا کر سامنے کھڑی ہوگئی۔ "اگر ایسی ہی بے اعتباری ہے میری بیٹی پر تو پہلے کیوں نکاح کر بیٹھے؟"

"نہیں، نہیں۔ توبہ توبہ۔ میرا ایسا کوئی مطلب ہرگز نہیں تھا۔"

"چلو پھر ربّ راکھا۔ نکلو اپنے کام سے صبح ہی صبح پتا نہیں کیسی کیسی باتیں لے بیٹھے ہو۔" آج نمی کا انداز بدلا ہوا تھا۔

وہ اسے اپنی بات کا ردِ عمل سمجھا اور شرمندہ سا چلا گیا۔

"چل موتیا رانی! اٹھ جا اب۔ ابٹن بنا کر رکھا ہے میں نے۔ اچھی طرح چہرے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیروں پر بھی لگا لے، پھر نہا کر بال کھلے چھوڑ دینا اور جوتی وہی ستاروں والی پہن کر جانا۔ تیرے پیروں میں بڑی اچھی لگتی ہے۔"

"نیلا سوٹ پہن جاؤں اماں؟" اس نے مشورہ چاہا۔

"کون سا نیلا، جس پر ریشمی دھاگے کا کام ہے نا۔ وہ نہیں ذرا چمک دمک والے کپڑوں میں جانا، میرا تو خیال ہے ہرا والا پہن لے، وہی جو لاہور کی بڑی مہنگی مارکیٹ سے خریدا تھا۔"

"چلو ٹھیک ہے، پھر وہی استری کر لیتی ہوں۔"

"تو ابٹن لگا، باقی کام مجھ پر چھوڑ دے۔" نمی نے روک دیا۔

دن کا ایک بج رہا تھا، جب وہ دونوں شوکی کی کوٹھی میں کھڑی تھیں۔ ٹیکسی آ چکی تھی، اب انہیں شوکی کے ساتھ اسٹوڈیو جانا تھا۔ گھر پر بیگم کی موجودگی میں تو شوکی صاحب بیبے بچے بنے رہے، ان کی عمر دیکھتے ہوئے تو موتیا انہیں چاچا جی کہنے کا ہی ارادہ کر رہی تھی، لیکن ادھر ٹیکسی چلی اُدھر ان کی زبان بھی چل پڑی، نمی کی موجودگی میں بھی وہ موتیا پر فدا ہوئے جاتے تھے۔ اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے نہیں تھکتے تھے۔

❁ ❁ ❁

اسٹوڈیو میں شوکی کے گھر آنے والے اس کے دوست بھی موجود تھے۔ موتیا کا سب نے بغور جائزہ لیا۔ کچھ تعریفی جملے بھی کہے، لیکن ان میں سے اکثر کی حالت وہی تھی جو موتیا کی تھی، اگر یہ رجیکٹ ہو گئی تو اس کے حوالے سے بنائے تمام منصوبے بھی خاک میں مل جائیں گے۔ روزی روٹی کے جو خواب اس کے حوالے سے دیکھے ہیں۔ وہ خواب ہی رہ جائیں گے۔

یہاں سب سے شاندار آفس سروش صاحب کا ہی تھا۔ وہ سوٹڈ بوٹڈ سلیقے سے بال بنائے بڑی سی میز کے پیچھے اونچی سی بیک والی کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ صورت تو بالکل بھی خاص نہیں تھی، لیکن شان دار آفس، اچھے لباس اور مہنگے پرفیوم نے بھرم رکھا ہوا تھا۔ جس وقت یہ لوگ ان کے کمرے میں داخل ہوئے، وہاں کچھ اور افراد بھی بیٹھے تھے، کچھ ہی دیر کے بعد وہ چلے گئے اور اب سروش صاحب ان کی جانب متوجہ تھے۔

"ایک چیز لائے ہیں جی آپ کے لیے، اسے آپ فلم انڈسٹری کے لیے تحفہ ہی سمجھیں۔ ہماری دریافت ہے جی، لیکن آپ یہ سہرا اپنے سر باندھیں گے تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔"

وہ سب بول رہے تھے اور سروش صاحب کی تولتی نظریں موتیا پر تھیں، جو نگاہیں جھکائے بڑی نروس سی بیٹھی تھی۔

"ادھر آؤ لڑکی! کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی صاحب! موتیا نام ہے جی اس کا۔" نمی نے تیزی سے کہا، صاحب نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر روکھے سے لہجے میں بولے۔

"جس سے پوچھ رہا ہوں، جواب بھی اسے ہی دینے دیں، ہاں بی بی! اگر تم بھی ہیروئن کا ٹیسٹ دینے آئی ہو تو دوسری بات ہے۔"

"نا، نا جی!" اس انداز پر نمی سہم کر چپ ہوگئی۔

"ادھر آؤ۔" پھر سے موتیا کو اشارہ ہوا، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور چلتی ہوئی اس کرسی پر جا بیٹھی، جس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ دائیں پیر کو ذرا اندر کی طرف موڑ کر چلتی ہے تو گویا بازارِ حسن سے نہیں وہاں پہلی توجہ چال پر دی جاتی ہے۔

"نام نہیں بتایا۔ کہاں سے آئی ہو، یہ بھی نہیں بتایا۔"

"موتیا نام ہے جی میرا اور گلبرگ میں گھر ہے ہمارا۔"

''گلبرگ میں!'' وہ چونکے۔

''ہاں جی۔ میرے گھر کے قریب ہی رہتی ہے۔'' شوکی صاحب نے بتایا۔

''کب سے؟'' سروش کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''کچھ دن سے۔ پہلے ہم چیچہ وطنی رہتے تھے۔''

''اوہ!'' اب سروش صاحب پُرسکون ہوئے۔ ورنہ اندازے کی غلطی نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ لڑکی نے دو لفظ بولے اور وہ سمجھ گئے، کم پڑھی لکھی اور کم پڑھے لکھے گھرانے کی ہے۔ اردو بھی مقامی بولی کے انداز میں بول رہی تھی اور اس کے چہرے پر بھی اسی کلاس کا عکس تھا، جس سے وہ تعلق رکھتی تھی۔ شکل وصورت کی اچھی تھی، لیکن ایک گھاگ ڈائریکٹر کی نظر اور بھی بہت کچھ دیکھتی ہے، چال کی خامی، لہجے کی خامی، آواز کا بھاری پن اور اس کا گول بھاری چہرہ اسکرین پر اور بھی نمایاں ہوگا۔

''یہ چہرہ اردو فلموں کے لیے نہیں پنجابی فلموں کے لیے موزوں ہوگا۔ آپ لوگ کسی پنجابی فلم کے ہدایت کار سے ملیں۔'' انہوں نے پانچ منٹ نہیں لگائے فیصلہ سنانے پر۔

''مگر سر جی! آپ ٹیسٹ تو لے لیتے۔ کچھ فوٹو ہی اتروا کر دیکھتے۔'' کیمرہ مین صاحب نے یاد دلایا۔

''ضرورت نہیں ہے، یہ چہرہ اردو فلموں کا ہے ہی نہیں۔ آپ اب جا سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر سگریٹ سلگایا اور کوئی فائل کھول لی۔ انہیں اٹھنا پڑا۔

''دفع دور۔ مغرور گھوڑا۔'' موتیا نے جل کر خطاب دیا کہ اس کے تو سارے خواب جلنے لگے تھے۔

''گھبراؤ نہیں، یہ سروش صاحب تو چیز ہی بڑی اونچی ہیں۔ ہمیں ان کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

وہ سب تسلی دیتے اسے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں لے آئے۔ یہاں جگہ جگہ مجمع لگے تھے، ایک ایسے ہی مجمع میں یہ بھی گھس گئے۔

''اوئے کیا ہے پھر کوئی شعر لکھ لیا تُو نے یا پھر شوکی نے فلم بنانے کے لیے پیسے اکٹھے کر لیے ہیں؟'' خالص لاہوری لہجہ، گرج دار آواز اور بھاری ڈیل ڈول، اب وہ اس شخص کے سامنے کھڑے تھے اور اسے موتیا کے بارے میں بتا رہے تھے۔

گہرے سانولے رنگ والے اس مرد نے اپنی موٹی موٹی گول آنکھوں سے موتیا کو دیکھا، پھر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرے کمرے میں آؤ۔ یہاں بھیڑ بھاڑ میں کیا بات ہو سکتی ہے۔''

اس کا کمرا بھی اس کی طرح بے ترتیب سا تھا۔ سروش صاحب کے آفس جیسی کوئی بات اس آفس میں نہیں تھی۔

''ہاں بھئی کڑیے، پہلے تعارف تو کرا اور یہ تمہیں کہاں سے مل گئی بھئی؟''

جواب میں شوکی نے بتایا کہ پڑوسن ہے میری، ساری بات سن کر اس نے نفی میں سر ہلایا بولا۔

''اس کا مطلب ہے، گھر سے اٹھ کر فلم میں کام کرنے آ گئی ہے۔ بازار سے تعلق نہیں۔ یعنی تربیت

کچھ بھی نہیں۔ یہ تو بڑا مسئلہ ہوگا۔'' اور نظریں جیسے موتیا کے وجود پر گڑ ہی گئی تھیں۔

''آپ جس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں نا جی، پھر کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ قسمت کی دیوی آپ ہی مہربان ہو جاتی ہے۔''

''او بھئی شوکی! وہ سب تو ٹھیک ہے پر سوچو نا ذرا، کڑی میں جھجک بھی ہوگی کہ گھر سے اٹھ کر آئی ہے۔ پھر بول چال، ادب آداب، سیاست سب سے ناواقف۔ ڈانس کے نام پر چند ٹھمکے ہی مار سکے گی اور بس۔''

''آپ اس کا چہرہ تو دیکھیں۔ ہے کہ نہیں بالکل شہزادیوں جیسا۔ میں تو کہتا ہوں، اسے ہیروئن بنائیں۔ کیمرہ مین مجھے رکھیں، اسے ایسے زاویے سے لوں گا کہ دھوم مچ جائے گی۔''

''او آہو۔ اوئے پتا ہے تُو بڑا قابل کیمرہ مین ہے۔'' طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا، پھر موتیا کے قریب آ کر کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ ذرا گھبرا گئی، مگر ناگواری کا اظہار نہیں کیا، پھر اس نے ٹھوڑی کے نیچے دو انگلیاں رکھ کر چہرہ اونچا کیا اور بولا۔

''خوب صورت چہروں کی کمی نہیں ہے یہاں، تم یہ بتاؤ محنت سے تو نہیں گھبراتیں؟''

''نہیں جی، جو کہیں گے میں کروں گی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''پہلے تمہیں ٹریننگ دیں گے، پھر ہی فلم میں رکھیں گے۔''

''میں تیار ہوں۔'' اس کے تو دل کی دھڑکن یہ سوچ کر ہی بڑھ گئی کہ وہ اس کے لیے تیار تھا۔

''سروش صاحب کہہ رہے تھے، یہ چہرہ اردو فلموں کے لیے نہیں ہے۔ پنجابی فلموں میں ہی چلے گا۔'' موسیقار نے بتایا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔

''دیکھ لینا۔ ہم ایک دن اسے اردو فلموں کی بھی ہیروئن بنائیں گے، کیوں بے بی بنو گی نا ہیروئن؟'' اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بھئی۔ یہ شرم وحیا اب صرف اسکرین پر دکھانے کے لیے ہی رکھ چھوڑو۔ یہاں اس کا کوئی کام نہیں۔''

اور موتیا نے اس پر بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ ڈوگر صاحب! اگر تصویریں بنا لی جائیں۔'' مشورہ دیا گیا۔

شفیق ڈوگر نے ماننے سے انکار کر دیا، بولا۔

''میں خود ساری تیاری کرواؤں گا بھئی، لو جی مبارک ہو۔ یہ چہرہ پسند آ گیا ہے مجھے۔ بس میری آنے والی فلم کی ہیروئن یہی ہوگی۔''

''مہربانی کر کے موسیقی کا کام مجھے دیں۔''

''اور کیمرہ مین مجھے رکھیں۔'' وہ سب اپنی اپنی کوالٹیز بتانے لگے تھے۔

''اوئے چپ او۔'' (ایک زبردست گالی) تھی اور موتیا تو اچھل ہی پڑیں۔

''بھئی میں کہہ رہا ہوں لڑکی بالکل کوری ہے۔ سارے سبق ہمیں ہی رٹوانے پڑیں گے۔ اس کے

لیے ٹائم بھی لگے گا۔ محنت بھی ہوگی۔ شوکی! یہ کام تیرے ذمے ہیں، تو ہر روز شام کے پانچ بجے لڑکی کو نہر والی میری کوٹھی پر لایا کرے گا۔ وہاں پر اس کی کلاسیں ہوں گی۔ اداکاری بھی سکھائیں گے اور ڈانس بھی''

''پر جی۔۔۔ میں کیوں لاؤں گا۔ میرا مطلب ہے کوئی وجہ بھی تو ہونا جی؟'' وہ خوشامدانہ انداز میں ہنسا۔

''گھبراتا کیوں ہے، شفیقے ڈوگر نے آج تک کسی سے مفت کام نہیں کروایا۔''

''بہت شکریہ جناب! اب اجازت۔ ہم چلتے ہیں۔'' شوکی نے اجازت چاہی، اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔

''تم سب باہر بیٹھو۔ میں ذرا کاکی کا انٹرویو تو کرلوں اور ہاں دو چائے کیک اور گرم رول بھجوا دینا میرے کمرے میں۔''

اور موتیا نے پہلی بار کسی غیر مرد کے ساتھ تنہا بیٹھ کر چائے پی، ہاں لیکن اس دوران وہ اس کی شرافت کی ضرور قائل ہوگئی۔ ایک بھی غلط بات کی نہ غلط نگاہ سے دیکھا اسے۔ بس تفصیل سے اس کے بارے میں پوچھتا رہا اور پہلے سے طے کیے گئے کے مطابق اس نے یہی بتایا۔ ''علاؤالدین اس کا دور کا رشتہ دار ہے اور باپ کی وفات کے بعد وہ اس کے گھر میں رہتی ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ یہ پریشانی چند روز کی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب تم اس علاقے میں اپنی کوٹھی کی مالک ہوگی۔'' وہ باتوں ہی باتوں میں اسے ہیروئن بناتا گیا۔

اور جب موتیا کمرے سے باہر آئی تو خوب صورت گردن تنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں اعتماد اور غرور تھا اور چال بھی بدلی بدلی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا اور اسے باہر انتظار میں بیٹھے سب لوگ کیڑے مکوڑے لگ رہے تھے، عام سے لوگ جو ایکٹرس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں دھوپ میں جل سکتے ہیں۔

''نئی گاڑی کی کیا قیمت ہوتی ہے بھلا؟'' شوکی کے ساتھ ان کی واپسی ہوئی تھی اور وہ راستے میں ٹیکسی کے سفر سے، اس کے بوسیدہ پن سے بور ہوکر پوچھ رہی تھی۔

شوکی نے جواب میں قہقہہ لگایا اور بولا۔

''فلم ہٹ ہونے کی دیر ہے، پھر گاڑی کیا، ہیلی کاپٹر خرید لینا۔''

''اچھا شوکی بھائی! وہ جو ڈوگر صاحب نے نہر والی کوٹھی آنے کو کہا ہے، وہ بھلا کتنی دور ہے ادھر سے؟'' نمی نے کسی سوچ سے ابھرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''بس جی۔ زیادہ دور نہیں ہے، یہی کوئی بیس پچیس منٹ کا راستہ ہے ٹیکسی سے۔''

''ٹیکسی نہیں گھر پر گاڑی تو ہے۔ کل سے ہم گاڑی پر ہی جائیں گے۔''

''کیسی بات کرتی ہو اماں؟'' موتیا نے ٹھوکا دیا۔

نمی نے سوالیہ انداز میں دیکھا تو بولی۔ ''وہ بھلا لانے دے گا ہمیں گاڑی سو سوال ہوں گے اس کے پہلے تو، اور میں بتائے دیتی ہوں، کسی کے سوالوں کے جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہوں اور وہ۔۔۔ ہونہہ! اس کی شکل دیکھنے سے بے زار ہوں۔''

''بس اب تو تھوڑے دن کی بات ہے، بڑا صبر کیا ہے میری بچی نے۔ بس تھوڑے دن اور۔'' نمی پچکار رہی تھی۔ موتیا منہ بنائے بیٹھی تھی۔

شوکی سے انہوں نے گاڑی گھر سے کچھ دور رکوانے کو ہی کہا تھا۔ گھر داخل ہوئیں، لان میں طیب کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں کتاب تھی، اس پر نظر ڈالی۔ یہ دیکھا کہ گیٹ سے کون گھر میں داخل ہوا ہے، پھر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''توبہ کیسا اجڑا ہوا لان ہے اور گھر بھی قبرستان کی طرح ہی لگتا ہے۔'' آج نمی کو بھی احساس ہوا تھا۔

''یہ طیب اپنی عمر گنوا رہا ہے، اسے چاہیے فلم میں ٹرائی کرے۔ آرام سے ہیرو بن سکتا ہے۔'' ہمیشہ کی طرح موتیا آج بھی اسے نظرانداز نہیں کر پائی تھی۔

''چل، چل۔ آرام کرلے، پھر کل کی تیاری بھی کرنا ہے۔''

''ہائے اللہ خوابوں کی تعبیر کتنی قریب ہے نی موتی! میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔''

''مجھے تو پہلے ہی یقین تھا اماں! آج ہی کامیاب لوٹوں گی۔''

''ہاں پر نی وہ اردو فلموں کا ہدایت کار تو بڑا ہی چول بڑا ہی کوجا نکلا۔''

''دفع کرو اماں! فلم انڈسٹری میں اردو فلموں کا ایک ہی ہدایت کار تھوڑی ہے۔ تم دیکھنا جلد ہی اردو فلمیں بھی کرنے لگوں گی، پھر جوتی پڑے گی اس کے منہ پر۔''

''ویسے اماں! یہ ڈوگر صاحب بڑا ہی اچھا آدمی ہے۔ اکیلے میں بھی بڑی عزت، بڑی ہی شرافت سے بات کی اس نے۔''

''اے مجھے تو صاف پتا چل رہا تھا، تیرے حسن سے بری طرح متاثر ہوگیا تھا بے چارہ اور آج تو ماں کو بھی داد دے، اگر میں نے تیری شادی طیب کے بجائے علاؤالدین سے نہ کروادی ہوتی تو بھلا تو پہنچ سکتی تھی یہاں تک۔''

پھر خود ہی نفی میں سر ہلا کر بولی۔

''کبھی نہیں، یہ جو منڈے ہوتے ہیں نا۔ بڑا گرم خون ہوتا ہے، بڑی غیرت ہوتی ہے ان میں۔ بیوی مرضی کے خلاف چلے تو قتل سے بھی گریز نہیں کرتے۔''

''چل چھوڑ اس بات کو اماں! تھک گئی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں۔'' وہ تیز قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

* * *

ان کا خیال تھا نہر کے کنارے بڑی عالی شان سی کوٹھی ہوگی، جہاں ڈوگر صاحب سجے سجائے ڈرائنگ روم میں ان کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔ لیکن نہر والی کوٹھی تو کسی اجڑے دیار کا منظر پیش کر رہی تھی۔ علاؤالدین کی کوٹھی سے کہیں زیادہ اجڑا ہوا لان تھا۔ گھاس اتنی لمبی کہ آدمی آرام سے چھپ جائے اور گھاس کا رنگ سبز نہیں خاکستری سا تھا۔ دھول مٹی میں اٹی برآمدے کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں اور برآمدے کے فرش پر بھی اتنی مٹی کہ پیر رکھو تو نشان چھوڑ جائے۔ ایک ہٹے کٹے ملازم نے ڈرائنگ روم تک

رہنمائی کی تھی۔

ہاں، ڈرائنگ روم کی حالت بہت بہتر تھی۔ صاف ستھرا، سجا سجایا، فرنیچر کوئی بہت اعلا نہیں تھا، لیکن اچھا تھا، قالین پرانا، لیکن صاف ستھرا بے داغ تھا، دروازوں، کھڑکیوں پر پردے نئے ڈالے گئے لگ رہے تھے۔ ڈوگر صاحب استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر اٹھے نہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہی استقبال کیا۔ موتیا کی تیاری کو بغور دیکھا اور اعلان کیا۔

''لڑکی کو ابھی پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہیں۔ یہ بھی سکھانا پڑے گا۔''

''کیا یہ صحیح نہیں ہے؟'' وہ گھبرائی۔

''بالکل بھی صحیح نہیں ہے۔ فکر نہ کرو، بلوایا ہے میں نے۔ کوکب عرف چھیما کو۔ ایک دم سے چالو کر دے گی تمہیں۔ ڈانس وانس، چٹک مٹک سب سکھا دے گی، فکر نہ کرو جند جان! ارے اب تم ڈوگر کی پارٹی بن گئی ہو۔ چند دنوں کی بات ہے، پھر دیکھ لینا ہر اخبار ہر فلم میگزین میں تمہارے ہی چرچے ہوں گے۔''

''او یار شوکی! ذرا دیکھنا ادھر باورچی خانے میں کوئی ملازم ہوگا، اسے چاء پانی کا تو بول دو۔''

''رہنے دو جی، ڈوگر صاحب! بھلا اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔'' نمی نے خوشامدانہ انداز میں کہا اور ڈوگر نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر کے بعد چھیما بھی پہنچ گئی۔

عمر ہوگی پینتالیس کے قریب تھوڑا فربہ بدن۔ چھدرے سے بال، لیکن ساری کسر لباس اور میک اپ نے پوری کر دی تھی۔ اتنی تہیں لگا رکھی تھیں چہرے پر کہ اصل صورت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اتنی چست قمیص پتا نہیں غریب سانس بھی کیسے لیتی ہے۔

ڈوگر سے بہت بے تکلف تھی۔ کبھی ہاتھ پر ہاتھ مار کر، تو کبھی اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بات کرتی تھی۔ قہقہے بھی مردانہ وار لگاتی تھی اور اکثر باتیں ایسی کہہ جاتی جو ان دونوں کے سر سے گزر جاتیں۔ ہاں شوکی صاحب کی سمجھ میں آجاتی تھیں، منہ نیچا کر کے ہنس پڑتے تو کبھی کھنکار کر کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے۔ موتیا انتظار میں ہی رہی۔ ابھی استانی جی آج کا سبق دے گی، لیکن وہ تو یوں نظر انداز کیے بیٹھی تھی جیسے یہاں ڈوگر کے علاوہ کوئی موجود ہی نہیں۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد ڈوگر نے ان تینوں کو جانے کی اجازت دے دی اور تاکید کی۔ ''کل پورے ٹائم پر آجانا۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کو ٹائم نہیں ہے لڑکی! ٹریننگ جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اور سنو جانی، موتی! پیاری! کل بال کھلے چھوڑ کر آنا۔ اچھے لگیں گے نا تم پر جانی!'' چھیما کو بالکل اچانک اس پر بے حد پیار آ گیا تھا۔

''جی، جی اچھا!'' پہلے وہ حیران ہوئی، پھر مسکرائی۔

''کل سے تمہارا پہلا سبق شروع ہو جائے گا۔ اچھی پیاری لڑکی ہو تم، اگر دل لگا کر کام کرو گی تو بہت ترقی کرو گی، یہ جو تین، چار لڑکیاں آج کل فلم انڈسٹری پر راج کر رہی ہیں نا، یہ سب میری ہی شاگرد رہ چکی ہیں۔'' اس نے ان ہیروئنوں کے نام بتائے اور انہیں متاثر کر دیا۔

اگلے روز اس کی تیاری کو چھیما اور ڈوگر نے پہلے سے بہتر قرار دیا۔ پھر ٹیپ چلائی گئی اور گیت کے بولوں پر اسے ڈانس کے لیے کہا، دو مردوں کی موجودگی میں وہ گھبرائی۔

''ایسے تو کام نہیں چلے گا، ارے اسٹوڈیو میں تو کئی ہوں گے اور ہیرو کے تو ساتھ لگی کھڑی ہو گی تم۔''

اس بے جا شرم پر سب ہی نے خفگی کا اظہار کیا، نمی نے بھی کہنی ماری تو اسے اٹھنا پڑا۔ وہ ناچتی رہی، سب ہی بڑی سنجیدگی سے دیکھتے رہے، پھر چھیما اٹھی اور اسے بتانے لگی۔ کہاں کہاں کس طرح کے اسٹیپ لینے چاہئیں۔

دو گھنٹے تک وہ اسے یہی سکھاتی رہی، موتیا تھک گئی، کچھ بے زار بھی ہوئی، اس نے کب سوچا تھا۔ ہیروئن بننے کے لیے یہ سب بھی کرنا ہوگا۔

پھر آنے والے دنوں میں وہ اکیلی آنے لگی، حالانکہ نمی ایسا نہیں چاہتی تھی، لیکن ہر روز موقع پاتے ہی ڈوگر اسے یہ بات سمجھانا نہیں بھولتا تھا۔ اسے بتاتا تھا ایک ہیروئن کو با اعتماد ہونا چاہیے، پھر تم یہاں اکیلی تھوڑا ہی ہوتی ہو، چھیما بھی موجود ہوتی ہے۔

پندرہ دن کے بعد وہ اور ڈوگر اکیلے تھے، ڈوگر نے بڑی بے تکلفی اور محبت سے بڑی سلجھی ہوئی باتیں کیں۔ موتیا کو ذرا بھی تو گھبراہٹ نہیں ہوئی اس تنہائی میں۔ آنے والے دنوں میں بے تکلفی بڑھی اس کی باتیں سنتے، اس کے ساتھ شہر کے اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے، اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا، اس کی ٹریننگ میں چھیما کے نہ آنے سے خلل آ رہا تھا۔

''بات یہ ہے رانی! کہ میں چاہتا ہوں اب تم کسی ایسی جگہ شفٹ ہو جاؤ جہاں سے آزادی سے ہر جگہ آ جا سکو، اصل میں کچھ اخبار والوں سے بھی ملوانا چاہتا ہوں تمہیں اور یہ سب اس گھر میں تو ممکن نہیں۔''

''پھر، پھر کیا کروں، ابھی تو میری کوئی انکم بھی نہیں ہے۔ میں گھر تو نہیں لے سکتی۔''

''او شہزادی! او رانی! کیسی بات کی ہے۔ آئے ہائے ہائے دل میں چھید ڈال دیا، او جی۔ ہماری کوٹھی کس لیے ہے۔ کیسی غیروں والی بات کی ہے، زندگی بھر گلہ ہی رہے گا۔''

''آ۔۔۔ آپ کی کوٹھی لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ شفٹ ہونے کی تیاری کرو، اور اپنی ماں کو بھی کچھ سمجھاؤ، مجھے تو لگتا ہے، اس کی یہ احتیاطیں، ہر کسی پر شک، ہر وقت عجیب چوکنا سا انداز ہوتا ہے، جیسے میں کوئی اٹھائی گیرا ہوں۔''

''نہیں نہیں۔ ماں کو تو خود بہت شوق ہے مجھے ہیروئن بنانے کا۔''

''بس پھر ٹھیک ہے۔ سمجھاؤ اسے۔ تم لوگوں کا اب اس گھر سے اٹھ آنا ہی بہتر ہے۔''

''لیکن وہ جی، وہ سر جی۔ کک۔۔۔۔ مشکل ہے۔'' اس کی آواز اصل بات بتاتے ہوئے پھنس رہی تھی، لیکن اب تو ڈوگر صاحب سے اچھا، سچا، سادہ دل پرخلوص کوئی لگتا ہی نہیں تھا۔ اٹک اٹک کر حقیقت بتا ہی دی۔

''او لو جی مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ کیوں گھبراتی ہو رانی! ویسے یہ سب سن کر مجھے تم سے بہت ہمدردی

ہو رہی ہے۔"

نہر والی کوٹھی میں آ جانے کے بعد حالات بڑی تیزی سے بدلے تھے، اب وہ آزاد تھی، ڈوگر کے ساتھ فلمی تقریبات میں شرکت کر سکتی تھی اور یہیں اسے دیگر لوگوں سے جان پہچان بنانے کا موقع ملا، اس نے دیکھا۔ فلمی اداکارائیں کس طرح شرکت کرتی ہیں، کیسے اٹھتی بیٹھتی ہیں اور اس کے علاوہ بہت سے دوسرے ہدایت کار، تقسیم کار، پروڈیوسر بھی ملے۔ وہ تیزی سے یہ سب سیکھ اور اپنا رہی تھی۔

ڈوگر نے نئی فلم بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ نہر والی کوٹھی پر ہر شام کہانی کار، موسیقار اور پنجابی فلمی دنیا کے ایک دو شاعر اکٹھے ہو جاتے، ڈوگر نے ایک مکار سی عورت بطور ملازمہ بھی رکھ چھوڑی تھی، جس کے ساتھ مل کر نمی نے سارا گھر چمکا دیا اور شام کو جو رونق لگتی، اف سب کی چائے اور خاطر تواضع کا انتظام بھی یہ دونوں مل کر کرتیں، موتیا تو بس ہار سنگھار کیے محفل میں بیٹھی رہتی، مردوں کی کھلی ڈلی باتیں۔ شیطانی قہقہے اور فقرے بازیاں۔ اب بھی کبھی کبھی اسے پریشان کر جاتے، لیکن بظاہر وہ بھی ہنسی میں ساتھ دیتی اور ان کی بے تکلفی کا برا نہیں مانتی تھی۔

مہمانوں کے چلے جانے کے بعد یہ چاروں نمی، موتیا، چھوٹا بھائی اصغر اور ڈوگر اکٹھے کھانا کھاتے، اس کے بعد ملازمہ انہیں دودھ کے گلاس لا کر دیتی، یہ دودھ پینے کے کچھ ہی دیر کے بعد اصغر اور نمی کو نیند آنے لگتی اور وہ معذرت کر کے اٹھتے۔ اپنے کمروں میں چلے جاتے، ڈوگر موتیا کا ہاتھ پکڑ کر بے تکلفی سے اپنے پاس بٹھا لیتا۔ وہ اس کے اشاروں پر چلنے پر مجبور تھی کہ وہی تو اسے خوابوں کی تعبیر دے سکتا تھا۔ رضامندی سے سب کچھ ہوتا اور ڈوگر کہتا۔

"جتنا مجھے خوش کرتی جاؤ گی، اتنی ہی ترقی پاؤ گی۔"

"میں ابھی تک علاؤ الدین کے نکاح میں ہوں۔ ڈر لگتا ہے۔ کہیں مجھے کھوجتا ہوا یہاں تک نہ آ جائے۔" ایک دن اس نے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تم ڈوگر کو نہیں جانتیں، ایک سے ایک چھٹا ہو بدمعاش اپنے قبضے میں ہے۔ کل ہی دباؤ ڈلواؤں گا طلاق کے لیے۔"

اور واقعی پندرہ دن کے بعد طلاق کے کاغذات اس کے سامنے تھے۔ "حق مہر نہیں دیا۔ اس بڈھے بدمعاش نے۔" نمی نے خالی کاغذ ہی دیکھے تو بولی۔

"دفع کرو، ہمیں اس کے پیسوں سے کیا لینا۔ بس چند دن کی بات ہے ہماری موتیا لاکھوں میں کھیلے گی۔"

"پر ابھی تو ضرورت ہے نا پیسوں کی۔" نمی نے اصرار کیا۔

"یہ بات ہے تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔" جھٹ سے جیب سے ہزار روپیہ نکال کر نمی کے ہاتھ میں دے دیا، اس فرخ دلی پر دونوں داد نہ دیتیں تو کیا کرتیں اور۔

ڈوگر نے حق مہر میں ملنے والی رقم کے ساٹھ ہزار لا کر اپنی الماری کے لاکر میں رکھ دیے، کچھ سوچ کر لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ ذرا کی ذرا ابھری، پھر معدوم ہو گئی۔

پورے تین ماہ بعد جب فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہونے کو تھا۔ نمی کی طبیعت عجیب گری گری سی رہتی۔ اب ملازمہ اسے کوئی سگریٹ دینے لگی تھی اور دن بھر وہ اس کے سوٹے لگایا کرتی تھی، چھوٹا اصغر یہاں کے ماحول میں سیٹ نہیں ہو سکا تھا۔ ایک دن موتیا گھر آئی تو اس کے کمرے میں میز پر اصغر کا خط رکھا تھا اس نے لکھا تھا۔

"میں طیب بھائی کے پاس جا رہا ہوں، مجھے ناچ گانا نہیں سیکھنا۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں اور یہاں آنے کے بعد بھی طیب بھائی سے ملتا رہا ہوں۔ اب آپ لوگ میرا انتظار نہ کرنا۔ میں واپس نہیں آؤں گا۔"

موتیا نے اس کے جانے کا نوٹس نہیں لیا اور نمی کو تو اب ویسے بھی ہوش کہاں رہتا تھا۔

پہلی فلم میں اسے ہیروئن نہیں بلکہ ہیروئن کی سہیلی کا رول دیا گیا، جس پر اس نے خفگی کا کھل کر اظہار بھی کیا۔

"جانی! تم ابھی کچی ہو، بس ایک بار تمہارا چہرہ اسکرین پر آ کر پسندیدگی کی سند حاصل کر لے۔ سمجھو، آنے والی ساری فلمیں تمہاری۔"

اسے پختہ کار عورت بنا کر بھی وہ بات کہہ رہا تھا، موتیا کے پاس سوائے اقرار کے کوئی چارہ نہیں تھا، لیکن وہ ایک دم بددل سی ہوئی تھی۔

شوٹنگ کے لیے اسٹوڈیو آنے کے بعد پہلا کام اس نے مختلف پارٹیوں میں ملنے والے چہروں سے جان پہچان بڑھانے کا کیا، وہ اب ڈوگر سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ کچھ دن کی کوشش کے بعد اسے ایک فلم میں سائیڈ ہیروئن کا رول مل گیا، یہاں فلم پروڈیوسر اس پر مہربان ہوا تھا۔ ڈوگر کہاں اسے ہاتھ سے جانے دیتا، لیکن سامنے کا بندہ اس سے زیادہ زور آور تھا، پھر یہاں کمی تھوڑا تھی۔ ایک موتیا گئی، دوسری آ جاتی تھی، نہر والی کوٹھی آباد ہی رہتی تھی۔

ادھر موتیا یہ نہیں جانتی تھی کہ رفیق صاحب کی فلم میں جو سائیڈ ہیروئن کا رول اسے دیا گیا ہے، یہ بہت ہی کم ہے۔ پوری فلم میں اس کے صرف چند گنتی کے سین ہوں گے۔

وہ خوب صورت تھی، لیکن اس کا چہرہ کیمرے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ دوسرا نقص اس کی چال میں تھا۔ وہ ایک پاؤں اندر کی سائیڈ پر تھوڑا ٹیڑھا رکھ کر چلتی تھی اور کیمرے کی آنکھ سے یہ نقص بہت واضح ہو جاتا تھا۔ پھر اس کی آواز بھی ڈائیلاگ کی ادائیگی میں موزوں نہیں تھی، لیکن فلم اور کیمرے سے باہر کی حقیقی دنیا میں وہ خوب صورت اور بھرپور لڑکی تھی، پھر کیوں نہ اسے لارے لگا کر فائدہ اٹھایا جاتا۔ رفیق نے بھی ایک فلیٹ اسے دلا دیا تھا، کام کے لیے ملازمہ کا بندوبست بھی ہو گیا تھا۔

یہاں آ کر بھی نمی کی وہی حالت تھی اور رفیق نے اس کے لیے نشے والے سگریٹ کا انتظام کر دیا تھا۔ رفیق صاحب نے ڈوگر کی طرح دیر نہیں کی، اسے فوراً فلم میں لیا اور کام شروع ہو گیا، صرف چند سین اور ایک گانے کا کچھ حصہ اس پر پکچرائز ہوا اور وہ لڑکی جس کے بارے میں فلم کے کرتا دھرتا، یہ فیصلہ سنا چکے تھے۔ یہ چہرہ کیمرے کے لیے موزوں نہیں ہے، اسی گانے سے ہٹ ہو گئی۔ ڈانس کرتے ہوئے وہ

بے حد اچھی لگی۔ اخبارات کے فلمی صفحات پر اس کے ڈانس کی تعریف ہوئی، اور آئندہ کئی فلموں میں وہ صرف ڈانس کے لیے بک کی گئی۔

''مجھے تو ہیروئن بننا ہے جی!'' ایک روز جب رفیق بہت موڈ میں اسے قریب بٹھائے اس کے کھلے ریشمی بالوں سے کھیل رہا تھا، اس نے یاد دلایا تھا۔

''صبر، صبر۔ دیکھو۔ میری ایک فلم نے تمھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، تم جلد ہی ہیروئن بھی بن جاؤ گی۔ بے صبری مت بنو۔''

''سب کہتے ہیں میری ڈائیلاگ ڈلیوری ٹھیک نہیں ہے۔ میں کوئی استاد رکھنا چاہتی ہوں۔ میں سیکھنا چاہتی ہوں اور میں نے بات بھی کر لی ہے۔''

''کمال ہے، مجھ سے پوچھے بغیر۔'' رفیق کو اچھا نہیں لگا۔

''ہاں ایڈوانس ملا ہے مجھے۔ رقم ہے میرے پاس۔ استاد کو فیس میں خود ہی ادا کروں گی۔''

رفیق کچھ نہیں بولا، ہاں ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا، اس نے پروا نہیں کی، وہ یہاں ہیروئن بننے آئی تھی۔ ان بدصورت کالے بھیڑیوں کے ناز اٹھانے کے لیے نہیں۔

وہ اب زیادہ سے زیادہ وقت فلم اسٹوڈیو میں گزارتی لوگوں سے ملتی اور فلمی اخبار کے رپورٹروں سے بھی تعلقات بڑھانے کی کوشش میں رہتی۔ رفیق سے دوستی رکھتے ہوئے اس کے فلیٹ میں رہتے ہوئے بھی اس نے کئی مضبوط پارٹیوں کے سربراہوں سے دوستی گانٹھ لی، جس پر رفیق نے غصہ دکھایا، اسے اب غصے کو ٹھنڈا کرنے اور اپنی چلانے کے گُر آ گئے تھے۔ سو اب بھی رہتی اسی کے فلیٹ میں تھی، لیکن آنا جانا لگا رہتا تھا۔ دو سال کتنی جلدی بیت گئے۔ وہ بائیس سال کی ہو گئی۔ فلموں میں اس کا چہرہ نظر آنے لگا، لیکن صرف ڈانسر کے طور پر، ابھی اسے بہت جدوجہد کرنا تھی۔ وہ استاد رکھ چکی تھی، تلفظ صحیح کرواتی، مکالمے بولتی، آواز کو بہتر بنانے کی پریکٹس کرتی اور ہاں سب سے زیادہ محنت ڈانس پر کرتی کہ وہ ایک ڈانسر کے طور پر تو جانی جاتی تھی نا!

وہ فلمی دنیا کے عروج کے دن تھے، فلمیں ہر طبقہ دیکھتا تھا، صرف ڈانسر ہو کر بھی وہ کئی نظروں میں تھی اور سیاست دانوں کے ہاں ہونے والی بڑی بڑی تقریبات میں اسی حوالے سے بلائی جانے لگی تھی۔

''چلو اچھا ہے جان پہچان بڑھے گی۔ وہ بڑی تیاری کے ساتھ جاتی، لیکن ان پارٹیوں پر اصل قبضہ فلم کی کچھ دوسری بڑی اداکاراؤں کا تھا۔ وہ اس کے راستے کی ہر جگہ ہی رکاوٹ بن جاتیں۔ دو سال مزید بیت گئے اسے پتا ہی نہیں چلا، اب وہ رفیق کے فلیٹ پر نہیں تھی۔ یہ جگہ جہاں اب وہ رہتی تھی ایک بڑے صنعت کار کی ملکیت تھی۔ یہاں اس کے پاس ایک نہیں دو، دو ملازم تھے، گاڑی بھی اسی صنعت کار کی دلائی ہوئی تھی اور اس نے وعدہ کیا تھا میں تمہارے لیے فلم بناؤں گا۔

اس کے لب و لہجے میں خاصی بہتری آئی تھی اور جان پہچان بھی بڑھ گئی تھی۔ آخر کار کوشش رنگ لائیں اور اسے ایک پنجابی فلم میں سائید ہیروئن کا رول مل گیا، پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ بس نہیں چلتا تھا فلم جلدی سے مکمل ہو اور سینما گھر کی زینت بن کر مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دے، لیکن فلم کے ہیرو، ہیروئن کی وجہ سے کام رک رک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ دونوں مصروف تھے، سیٹ پر لیٹ آتے اور زیادہ

وقت بھی نہیں دیتے تھے۔ اسٹوڈیو آتے جاتے گیٹ سے باہر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتی جو اس دور کے مشہور و مقبول ہیرو، ہیروئن کے اسٹائل اپنائے صرف ایک چانس کی خاطر گیٹ کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ اس نے کبھی غور نہیں کیا، لڑکیوں کی صورتیں بدلتی رہتی تھیں، ایک دن جو دکھائی دیتی۔ وہ اگلے دو، تین روز کے بعد وہاں نہیں ہوتی تھی، لیکن لڑکے وہی تھے، اس نے کبھی نہیں سوچا، لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں، کیا وہ اتنی جلدی مایوس ہو کر واپسی کی ٹھان لیتی ہیں، اس نے کبھی بھی کسی نہر والی کوٹھی، کبھی کسی رفیق کے فلیٹ میں نہیں جھانکا۔

۞ ۞ ۞

فلم مکمل ہونے اور اسکرین تک آنے میں پورا ایک سال لگا، وہ مسلسل دو راتیں سو نہیں پائی اور چہرے پر نقاب لگا کر فلم کا پہلا شو دیکھنے آئی تھی۔ فلم بری طرح فلاپ ہوئی۔ ہیرو، ہیروئن کو تو فرق نہیں پڑا، لیکن اس کے تو آرزو کے محل زمین بوس ہو گئے۔ کتنے ہی روز وہ بستر پر پڑی رہی، چاہنے والوں نے تسلی دی، کچھ نے تحفے تحائف دے کر موڈ بحال کیا اور وہ ایک بار پھر اسی دنیا میں لوٹ آئی۔ انہیں ہنگاموں کا حصہ بن گئی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا، اب وہ خود فلم بنائے گی اور ہیروئن بھی وہ خود ہو گی، لوگ اس کی صلاحیتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔ ''اب مجھے خود ہی قدم اٹھانا چاہیے۔'' یہ بات سوچی اور پھر ذہن میں جڑ ہی پکڑ گئی۔

سوتے جاگتے وہ فلم بنانے کے خواب دیکھنے لگی، ہیرو کس کو لوں گی، ایک رات بستر پر لیٹ کر جب وہ اسی بارے میں سوچ رہی تھی تو یہ خیال ذہن میں آیا وہ فلم کے مختلف ہیروز کو ذہن میں لانے لگی اور ایک چہرہ جوان سب کے درمیان بڑی تیزی سے ابھرا، اسے دیکھ کر وہ چونک گئی، یہ چہرہ طیب کا تھا۔

طیب بھلا کیسا ہو گا، وہ اب اور کہاں ہو گا، اس نے حساب لگایا، آٹھ سال ہو رہے تھے طیب کو دیکھے ہوئے، علاؤالدین تو شاید مر کھپ چکا ہو گا اور طیب پتا نہیں اب بھی وہیں رہتا ہے یا کہیں چلا گیا ہو گا، اصغر بھی تو طیب کے پاس ہے اور پتا نہیں طیب نے شادی کر لی ہے یا نہیں کر ہی لی ہو گی، اب اتنے سال تک وہ کنوارا تھوڑی بیٹھا ہو گا، اس کا دل چاہا وہ طیب سے ملے دیکھے تو سہی اتنے سال کے بعد اب وہ کیسا لگتا ہے۔ میری فلمیں دیکھتا تو ہو گا، میں تو پہلے سے بھی خوب صورت ہو گئی ہوں۔ سوچا ہو گا، کاش میری شادی موتیا سے ہو جاتی، کیا پتا علاؤالدین سے میری طلاق ہونے کے بعد وہ پھر سے میرے خواب دیکھنے لگا ہو، فلم میں میرا چہرہ دیکھ کر سوچتا تو ہو گا، کبھی یہ خوب صورت لڑکی میری منگیتر تھی، وہ تو میرا پتا نہیں جانتا، لیکن میں تو جانتی ہوں نا! مجھے اس سے ملنا چاہیے۔ میں کل ہی کسی وقت اس کی کوٹھی پر جاؤں گی۔

''اے اے موتی! میرا سگریٹ لائی ہے؟'' نمی کو بس اب ایک ہی چیز سے غرض تھی، وہ رات کو طلب سے بے چین ہوئی تو اس کا دروازہ پیٹنے لگی۔

پھر موتیا نے ملازم کی آواز سنی۔ وہ نمی کو زبردستی اس کے دروازے سے ہٹا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد نمی کی آواز دور ہو گئی، اس نے مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں۔

سوچ کا سفر جو فلم بنانے سے شروع ہوا تھا، اب وہاں صرف طیب ہی طیب تھا، وہ اسی کو سوچ رہی

تھی۔

❁ ❁ ❁

صبح اطلاع ملی ملک کے مشہور و معروف اور بہت دیالو سیاست دان اس شہر تشریف لائے ہیں، خیر سے پانچویں بار دولہا بنے ہیں، رات اسی خوشی میں ان کے دولت کدے پر جشن ہے۔ موتیا کی شرکت بھی ضروری ہے، پھر دن بھر اسی تیاری میں لگی رہی، ایسا صرف اسی روز نہیں ہوا۔ آنے والے بہت سے دن وہ مصروف رہی کہ اسے فلم بنانی تھی، ہر طرف سے پیسہ پیسہ اکٹھا کرنا تھا۔

فلموں کی ایک سائیڈ کی اداکارہ، ڈانسر، لیکن بہت سے صاحبِ حیثیت لوگوں کی منظورِ نظر ڈیڑھ سال کے عرصہ میں اس نے کافی سرمایہ اکٹھا کرلیا، دن رات کی محنت نے اسے بیمار کرڈالا، وہ بہت تھکن محسوس کرنے لگی تھی، زیادہ تر فلمیں گھریلو موضوعات یا پھر محبت پر بنتیں جبکہ یہ دنیا اس کے بالکل الٹ تھی۔ وہ یہ فلمیں دیکھتی تو، اسے لگتا اندر دراڑیں پڑنے لگی ہیں۔ دن اسٹوڈیو میں، رات کبھی کسی بنگلے، کبھی کسی حویلی تو کبھی کوٹھی میں۔

''کیا ہے یہ اور کیوں ہے، میں کس کے لیے یہ سب کررہی ہوں؟ کوئی تو ہو جسے میری محبت کا دعوا ہو، جو میری کامیابی پر خوش ہو، جو صرف طلب کی خاطر میرے پاس نہ آئے، میری باتیں بھی سنے، اپنے دل کی بھی سنائے۔''

فلم کا اعلان کردیا گیا، مشہور ہیرو بھی کاسٹ کرلیا اور ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ وہ پھر سے مصروف ہوگئی، لیکن اب ایک سوچ اور بھی تھی، فلم کے کامیاب ہونے کے بعد ایک ساتھی کی تلاش جو میرا سچا دوست ہو، میرا ہمدرد اور خیر خواہ ہو۔

محنت نے اسے بیمار کرڈالا، فلمی صنعت سے وابستہ لوگ منہ پر تو کچھ نہیں کہتے تھے۔ ہاں پیچھے سے مذاق اڑاتے۔ تھکے ہوئے جسم اور بیمار سے چہرے والی ہیروئن۔ یہ فلم ضرور فلاپ ہوگی۔

اور ایسا ہی ہوا فلم واقعی فلاپ ہوگئی اور اس خبر کو سن کر اتنی بیمار ہوگئی کہ دنوں بستر پر پڑی رہی، جو کچھ تھا، سب تو فلم پر لگا دیا۔ اب تو کچھ بھی نہیں، ایک بار پھر وہی محنت۔ سخت محنت۔

اک جنون، اک شوق، جو ماں نے گھٹی میں دیا تھا۔ اسے لگا۔ آج تمام ہوگیا ہے، وہ بے حد تھک گئی ہے۔ اب پھر سے وہی دن رات ہوں گے، ہیرو، ہیروئن کے انتظار میں گھنٹوں سیٹ پر بیٹھنا ہوگا اور زندگی کی گاڑی کو اچھے طریقے سے کھینچنے کے لیے شام پارٹیوں میں ڈانس کرتے اور رات تھکے جسم کے ساتھ کسی اور کی تسکین کا سامان بنتے، پھر ہاتھ میں کیا ہوگا، کک۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ گھر بھی ایک کرم فرما کا دیا ہوا ہے۔ گاڑی بھی اپنی ملکیت نہیں، تو پھر وہ ان کو انکار کیسے کرسکتی ہے۔

❁ ❁ ❁

فلم کیا فلاپ ہوئی، وہ فلمی نگری میں ایک مذاق بن کررہ گئی۔

''ڈرائیور آج مجھے شاہدرہ لے چلو، نور جہاں کے مقبرے پر۔''

''آج وہاں کوئی شوٹنگ ہے جی؟'' ڈرائیور نے اس کے کہنے پر یونہی سوال کردیا تھا، حالانکہ وہ اس کے پہلے ڈرائیور کے مقابلے میں خاصا کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والا نوجوان تھا۔

''نہیں۔ کوئی شوٹنگ نہیں۔ بس تھک گئی ہوں، وہاں بھی ایسی ہی ویرانی ہوا کرتی ہے، جو میرے اندر ہے۔''

''ایک بات کہوں جی؟'' نادر نے جھجک کر کہا تھا۔

''ہاں کہو۔'' وہ بھی اب تیوری چڑھا کر بات کرنا بھول گئی تھی کہ اب تک یہی سوچ تھی سے ایک روز نامور ہیروئن بننا ہے، لیکن فلم نے فلاپ ہوکر اسے بتا دیا تھا۔ یہ صرف خواب ہے، ورنہ اخباروں نے اسے عمر رسیدہ عورت لکھا ہے، حالانکہ وہ صرف تینتیس سال کی تھی، لیکن شاید یہی سچائی ہے، اس کا چہرہ واقعی کیمرے کے لیے موزوں نہیں۔

''میں پوچھنا چاہتا تھا۔ کیا نظر آتا ہے آپ کو اس جھوٹ فریب کی دنیا میں؟''

''اس کا جواب میرے پاس نہیں۔ تم بتاؤ، کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے اکثر تمہیں اخبار پڑھتے دیکھا ہے، اس کا مطلب ہے پڑھے لکھے بھی ہو۔''

''جی میرا تعلق لائل پور (آج کا فیصل آباد) سے ہے۔ میں ایف اے تک پڑھا ہوں۔ اب بھی پرائیویٹ بی اے کی تیاری کررہا ہوں۔''

اس روز نور جہاں کے مقبرے پر انہوں نے ڈھیروں باتیں کیں، موتیا کو لگا اس کی ذات پر جتنے بوجھ تھے، سب جھڑنے لگے ہیں۔ آج وہ جتنی خوش ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔

اب اسٹوڈیو میں اس کی مصروفیات بہت کم تھیں اور شاموں کو اکثر وہ خود گھر سے غائب رہ کر فارغ بنا لیتی، کبھی جہانگیر کے مقبرے، کبھی شالا مار کی روشوں پر، تو کبھی شملہ پہاڑی کے سبزے میں، وہ نادر سے بہت سی باتیں کرتی۔ اسے بتاتی۔ وہ کتنی مظلوم اور تنہا عورت ہے اور ایسے ہی ایک روز اس نے نادر کو بتایا تمہاری شکل طیب سے ملتی ہے۔

''طیب!'' اس نے فلمی اداکاروں کو سوچا، اس نام کا تو کوئی نہیں تھا۔

''طیب جو میرا کچھ بھی نہیں تھا، لیکن میں اسے کبھی بھلا نہیں پائی۔ میری بدنصیبی وہ میرا نہیں ہوسکا۔''

اتنے سال فلمی دنیا میں گزار کر وہ سمجھ گئی تھی، مرد کو مظلوم، بے چاری عورت بڑی اچھی لگتی ہے۔''

''آؤ کہیں باہر کھانا کھانے چلتے ہیں۔''

''لیکن بی بی! وہ اصل میں مجھے یوں آپ کے پیسوں سے کھانا، تحفے لینا اچھا نہیں لگتا۔''

''کیا مطلب، کیا میرا اور تمہارا الگ الگ ہے؟'' اس کی بات پر نادر کچھ چونکا، پھر چپ کا چپ رہ گیا۔

''چلو جلدی سے تیار ہوکر آؤ۔ وہی سوٹ پہننا جو میں کل تمہارے لیے لائی تھی۔'' نادر نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ گاڑی میں اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی۔ اس کی تعریف کرتی رہی، اسے بتاتی رہی کہ وہ اس سوٹ میں کتنا جچ رہا ہے۔

''میں تمہیں کیسی لگتی ہوں نادر؟''

''آپ اچھی ہو بیگم صاحبہ!''

"اوں ہوں۔ بیگم صاحبہ نہیں۔ میرا نام لیا کرو۔"

"کدھر کو چلیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"آج شاہی قلعے چلتے ہیں۔" اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھ سے شادی کرو گے نادر؟" یہیں روشوں پر اس کے برابر چلتے موتیا نے سوال کیا تھا، اور نادر کے بڑھتے قدم رک گئے۔

"حیران ہو رہے ہو، توقع نہیں تھی تمہیں اس سوال کی؟ ارے میں امیر غریب، چھوٹے بڑے کے فرق کو نہیں مانتی، تم بھی اس بات کو بھول جاؤ کہ میرے ڈرائیور ہو۔"

"بی بی! آج شاید شوٹنگ تھی آپ کی؟"

"آ، ہاں تھی تو چلو پھر چلتے ہیں۔"

اسے خیال آیا تھا۔ نادر کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ رقم کی ضرورت تو ہوگی، اسے پھر محنت کرنی چاہیے۔ چھوٹے موٹے جو بھی کردار ملیں، لے لینا چاہئیں۔

❁ ❁ ❁

اگلے روز نادر صبح ہی صبح گاؤں چلا گیا، وہ تو سو رہی تھی، ملازمہ نے ہی اسے کا پیغام دیا۔

"کمال ہے، ایسی کیا جلدی پڑ گئی تھی۔"

"وہ جی یہ خط بھی دے کر گئے ہیں آپ کے نام۔"

ملازمہ نے تہ شدہ کاغذ اس کی جانب بڑھایا، جسے اس نے بے تابی سے تھام لیا اور کمرے میں جا کر کھولنے لگی، لکھا تھا۔

موتیا بی بی!

آداب۔

میں یہ ملازمت چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں، امید ہے آپ پریشان نہیں ہوں گی، اپنی دنیا میں جلدی بہل جائیں گی۔ ہاں غصہ ضرور آئے گا، ایک ادنیٰ ملازم کی جرأت یہ۔ لیکن بات یہ ہے بی بی کہ میں غریب ضرور ہوں پر شریف ماں باپ کا غیرت مند بیٹا ہوں۔ کل جو بات آپ نے مجھ سے کہی یہی خیال ستاتا ہے۔ ایسا ہوا بھی کیوں آپ نے کیا سمجھا مجھے۔ یقین مانیں یہ تحفے تحائف میں نے صرف اس لیے قبول کیے کہ آپ پریشان تھیں اور میں سمجھ رہا تھا، آپ اپنا دل بہلانے کو ایسا کر رہی ہیں۔ سب یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں ایسا ہرگز نہیں جیسا آپ نے سمجھا۔ ہم لوگ اپنی عورتوں کو عزت دیتے ہیں اور وہ ہماری عزت کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ آپ جیسی عورت سے شادی۔ ایسا تو مر کر بھی نہیں سوچ سکتا۔ امید ہے جلد ہی آپ کو نیا ڈرائیور مل جائے گا۔

نادر

خط تھا یا دہکتا ہوا انگارہ، جس نے موتیا کے انگ انگ کو جلا ڈالا۔ الفاظ اس کے آس پاس ناچتے

رہے اور وہ بے دم سی فرش پر بیٹھی رہی۔

تین دن بخار میں پھنکنے کے بعد آخر اپنا آپ سنبھالا اور اس نے غور کیا۔ ان تین دنوں میں اس کے فون کی گھنٹی ایک بار بھی نہیں بجی، تو اب کسی پارٹی میں اس کی ضرورت نہیں رہی اور اب شاید وہ فلم کے پردے پر ناچتی بھی پہلے جتنی اچھی نہیں لگتی۔

تیسرے دن کی شام وہ ہمت کر کے اٹھی۔ نہا کر تیار ہوئی اور فلم اسٹوڈیو کی راہ لی، گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی اور ذہن بہت بوجھل تھا۔

پرس میں چند ہزار باقی ہیں اور خرچے بہت زیادہ ہیں۔ اسی سوچ میں گم وہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھی۔ ہوش آیا تو اسپتال میں تھی، باقی جسم تو محفوظ ہی تھا، لیکن ٹانگ بری طرح کچلی گئی تھی۔ اخبار میں خبر آئی، صرف چند کرم فرما ہی خیریت پوچھنے آئے اور اس نے اپنی غربت کی داستان سنا کر مدد کی درخواست کی۔

پھر وہ چال میں ہلکا سا لنگ لے کر صحت یاب ہوگئی اور بہت روئی، اللہ سے بہت شکوے بھی کیے اس نے۔ اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ مکان خالی کرنے کے تقاضے ہونے لگے تھے۔ گاڑی تو کبھی کی واپس لے لی گئی تھی۔ ملازم جا چکے تھے۔ وہ التجا کرتی تھی، ایک کمرا میرے پاس رہنے دیں۔ جو بی بی یہاں اب آکر رہے گی۔ اس کی خدمت کے لیے ہی رکھ لیں۔ لیکن اس بی بی کو بھی صحت مند، دوڑ دوڑ کر کام کرنے والی ملازمہ کی ضرورت تھی، پھر بھلا اسے کیوں رکھا جاتا۔

"میں کہاں جاؤں، میرا تو کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔"

"ہمیں نہیں معلوم۔ ہم نے کوئی ساری عمر کا ٹھیکہ تو نہیں اٹھا رکھا۔"

"بہت خدمت کی ہے میں نے آپ کی حضور!" کبھی جو ناز و ادا دکھا دکھا کر فرمائشیں کیا کرتی تھی، آج منت سماجت پر اتری ہوئی تھی۔

"مفت تھوڑا ہی کی ہے۔ بدلے میں یہ آسائشیں بھی تو لیتی رہی ہو۔" گالی دے کر جتایا گیا تھا۔

پھر وہ کس کس کے پاس نہیں گئی۔ کیا، کیا فریاد نہیں کی۔ لیکن خدا کو بھولے ہوئے پیسے کے پجاریوں کی یہ دنیا یہاں چمکتے دمکتے چہرے اور لچک دار جسم ہی ڈیمانڈ ہے، اگر یہ ہے تو فرمائش کرو۔ نہیں تو ایک وقت کی روٹی کے پیسے بھی ہاتھ پر نہیں رکھیں گے، جاؤ اپنا راستہ ناپو۔

ان ہی بے حد پریشان دنوں میں ممی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس نے ماں کو کئی سال سے نظرانداز کر رکھا تھا۔ وہ چاہتی تو علاج کروا کر نشے کی عادت ختم کروا سکتی تھی، لیکن کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور اب جبکہ اسے ماں یاد آئی تھی۔ ماں ساتھ چھوڑ گئی۔ محلے والوں نے چندہ کر کے اس کو دفن کرنے کا انتظام کیا اور موتیا چند چیزیں سمیٹ کر ایک چھوٹے بیگ میں ڈال کر ایک بڑی سی چادر میں کسی شریف زادی کی طرح اپنا وجود چھپائے لنگڑی ٹانگ گھسیٹتی اس گھر سے ہی نہیں اس شیشے کی بنی دنیا سے بھی باہر آگئی۔

وہ کہاں جا رہی ہے۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔

ہاں جب قدم رکے تو اس نے دیکھا۔ وہ تو علاؤالدین کی کوٹھی کا گیٹ تھا، لیکن روغن نیا تھا، یہاں کھڑے درخت ہرے بھرے تھے اور لان پھولوں سے سجا تھا، وہ یہیں رک گئی اور لان میں بیٹھے میاں، بیوی اور دو پیارے بچوں کو دیکھنے لگی۔

''اے کون ہوتم؟'' پہلے بچہ متوجہ ہوا، پھر طیب اٹھ کر ادھر آیا۔

''تم!'' اس نے پہچان لیا اور موتیا کی آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی دھند چھا گئی۔

''کون ہے یہ، تم جانتے ہو طیب اس کو؟'' یہ عورت کی آواز تھی۔

''یہ فلمی ڈانسر وہی ہے موتیا، تم نے پہچانا نہیں، میرے چچا کی سابقہ بیوی۔''

ہاں یہی تعارف تو تھا اس کا، طیب نے یہ تو بتانا تھا، لیکن وہ کون سا حوالہ سننا چاہتی تھی۔ اسے جھٹکا کیوں لگا، وہ شدّت سے کیوں رونے لگی تھی۔

''کیا ہوا؟ ادھر کیوں آئی ہو تم؟'' طیب بڑی سنجیدگی اور اجنبیت سے پوچھ رہا تھا۔

''میری مدد کرو۔ میں بڑی مجبور ہوں۔ بے کس ہوں۔''

''ہم سے کیا چاہتی ہو؟'' طیب کی بیوی پوچھ رہی تھی۔ گھر کی مالکن، ان بچوں کی ماں اس کا انداز بتاتا تھا۔ اسے موتیا کو روتے دھوتے دیکھ کر بھی ہمدردی ہرگز نہیں ہوئی۔

''ملازم رکھ لیں مجھے؟ میرا کوئی ٹھکانا نہیں، دعائیں دوں گی۔ آسرا دے دیں۔''

''نہیں، نہیں طیب! اس کریکٹر کی عورت کو میں تو کبھی اپنے گھر نہیں رکھ سکتی۔ ہمارے ملنے والے کیا کہیں گے اور پھر میں بھی بیٹی کی ماں ہوں، ایسی عورت کے تو سائے سے بھی بچنا چاہیے۔''

اور اب کہنے کو کچھ نہ رہا، ہاں طیب نے کچھ رقم اس کے ہاتھ پر ضرور رکھ دی، جو اس نے گنے بغیر بیگ میں ڈال لی۔

یہاں سے نکل کر اس نے پھر سے سفر شروع کیا۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ اسٹیشن تک آ گئی، تب اسے خیال آیا۔ اس نے طیب سے اصغر کا پتا نہیں پوچھا۔ شاید اچھا ہی کیا، کیا اب وہ کسی بھائی کی بہن کہلا سکتی ہے۔

یہاں بیٹھ کر محسوس ہوا۔ وہ بھوکی ہے۔ یاد آیا۔ طیب نے کچھ رقم دی تھی، بیگ کھول کر دیکھا۔ یہ تو ایک ہزار روپے تھے، روٹی لے کر کھائی اور ٹکٹ لینے کے لیے کھڑی ہوئی۔

''کہاں جانا ہے بی بی؟'' وہ پوچھنے لگا اور اس نے چیچہ وطنی کہتے لمحے کی دیر نہیں لگائی۔

❁ ❁ ❁

چھوٹا سا اسٹیشن جہاں کوئی قلی نہیں ہے، کوئی کینٹین نہیں ہے، لیکن کتنا اچھا، کتنا آباد ہے، جی چاہتا ہے اس شہر کے در و دیوار کو چوم لوں، یہ وہی تو شہر ہے جہاں وہ باعصمت تھی۔ ایک شریف باپ کی بیٹی تھی۔ دو بھائیوں کی بہن اور ماں کی لاڈلی بیٹی، تب زمانے نے اس کو کھلونے کی طرح استعمال نہیں کیا تھا، اس شہر کی ہوا اب بھی اس کی اپنی تھی، اسے یوں لگا ہوا اس کی بربادی پر بین کر رہی ہے۔ دکھ کے بوجھ سے کچھ دیر کے لیے وہ بھی اسٹیشن کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی اور پھر اٹھ کر چل پڑی۔ اسے یاد تھا۔ اس کا گھر اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا، لیکن معذوری اسے تیز چلنے نہیں دیتی تھی، جب وہ اپنے محلے اور پھر اپنی گلی میں پہنچی تو اسے لگا۔ اس کا بچپن گیا نہیں تھا۔ یہیں چھپ کر بیٹھا تھا کہ گلی میں آج بھی لڑکیاں کیکلی ڈال رہی تھیں۔

لک چھپ جانا مکئی کا دانہ۔

راجے کی بیٹی آئی جے۔

راجے کی بیٹی، ہاں ہر بیٹی باپ کے گھر میں شہزادی ہوا کرتی ہے۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے قریب ہی گندی نالی بہہ رہی تھی، لیکن وہ کہاں کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسکول سے آتی موتیا، گلی میں کھیلتے اس کے دونوں بھائی اور سائیکل پر سوار سامنے سے آتا اس کا باپ۔

''ارے بھین (بہن) کون ہو تم؟ کیوں روتی ہو؟'' عورتیں اس کے گرد اکٹھی ہو گئی تھیں، کسی نے کاندھا ہلا کر پوچھا تھا۔

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ چہرہ بھیگا ہوا تھا، ہاں واقعی وہ تو رو رہی تھی، یقیناً بہت اونچی آواز میں رو رہی تھی، جب ہی تو ہر کوئی سوال کر رہا تھا۔

''مم، میں موتیا ہوں۔ سردار کی بیٹی!''

''ارے اصغر اور اشرف کی بہن، پر ہم نے تو یہ سنا تھا۔ تم لاہور جا کر فلموں میں کام کرنے لگی ہو، لڑکے بتاتے تھے، ناچتی گاتی ہو، اخباروں میں بھی تمہارے فوٹو چھپتے رہے ہیں، پر یہ تمہارا حلیہ؟'' عورتیں حیران تھیں۔

''بے سہارا ہوں، کوئی ٹھکانہ دے دو۔''

''ناپر واپس کیوں آ گئی اس گناہ کی دلدل سے؟'' کسی نے پوچھا۔

''بھئی۔ دیکھ نہیں رہے لنگڑی ہو گئی ہے۔ اب وہاں کون پوچھتا۔''

کسی نے طنزاً کہا۔ وہ تو بس روتی ہی رہی، سر اٹھا کر کسی کی جانب نہیں دیکھا۔

''مجھے پہچانا۔ میں تمہاری پڑوسن رجو ہوں۔'' اس کی ہم عمر ایک عورت پانچ، چھ برس کے بچے کی انگلی تھامے کھڑی تھی، ہاں اسے یاد تھا وہ رجو تھی۔

''اشرف بھائی اور اصغر بھائی تین، چار برس پہلے بھی آئے تھے، پچھلے برس بھی ہو کر گئے ہیں۔ تمہارا مکان انہوں نے ایک بے سہارا بیوہ کو دے دیا ہے، آؤ بات کرتے ہیں، اس سے۔ اسے کہتے ہیں، ایک کمرا تمہیں دے دے، آخر تم بھی مالکن ہو اس گھر کی۔''

''ارے یہ تو اس نے نہیں سوچا تھا۔''

اسے واقعی اپنے گھر کی بیٹھک مل گئی، طیب کے دیے پیسوں سے اس نے کچھ دال دلیا، کچھ بسکٹ، ماچس کے پیکٹ اور ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں ڈال کر دکان داری کا آغاز کیا۔

شروع، شروع لوگ متجسس رہے، اس کے پاس آتے، بڑے شوق سے فلمی دنیا کی باتیں پوچھتے، فلاں ہیروئن دیکھنے میں کیسی لگتی ہے اور کون سا ہیرو حقیقت میں سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ پھر ان باتوں سے اس کی بےزاری دیکھ کر آہستہ آہستہ لوگ کم ہی پوچھنے لگے۔

ہاں ایک بات تھی، عورتیں اس سے سودا لینے اس کی دکان پر تو آتی تھیں۔ کھڑی کھڑی اس سے لمبی باتیں بھی کر لیتی تھیں، لیکن کبھی کسی نے اپنے ہاں آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ یہاں تک کہ محلے میں ہونے والی کسی شادی پر بھی اسے مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ دنوں منہ نہیں دھوتی تھی، بالوں میں کنگھی کیے تو ہفتوں مہینوں گزر جاتے، بالوں میں اترتی چاندی اس کے اطمینان میں اضافہ کرتی۔

پھر آہستہ آہستہ لوگوں کا گریز کم ہونے لگا۔ زمانہ بھی تیزی سے بدلنے لگا۔ فلم انڈسٹری زبوں حالی کا شکار ہوئی، لوگ ٹی وی ڈرامے شوق سے دیکھنے اور پسند کرنے لگے، فیشن انڈسٹری بن گیا اور اس چھوٹے سے شہر کی لڑکیاں بھی فیشن کرنا سیکھ گئی۔

''موتی خالہ! ایک بات تو بتاؤ، ماڈلنگ کی دنیا میں بڑا نام ہے، بڑا پیسہ ہے۔ بس سمجھ میں نہیں آتا وہاں تک پہنچا کس طرح جائے، کیا تم کوئی راستہ بتا سکتی ہو؟''

شوبز کی چکا چوند سے متاثر ہو کر بہت سی لڑکیاں ایسی خواہش دل میں لیے اس کے پاس آتی ہیں، تب وہ کانپ جاتی ہے۔ ان سے کہتی ہے۔

''اس راستے پر قدم نہ رکھنا کہ جب تم اس اندھیرے غار میں اتر جاؤ گی تو پھر چپکے سے ایک بھاری پتھر سے اس کا منہ بند کر دیا جائے گا۔ اندھیرے میں ڈوبتی چلی جاؤ گی، اور جب تم آگے، بہت آگے اندھیروں میں چلتی اس دنیا کی باسی ہو جاؤ گی تو پھر ایک روز پتھر ہٹا کر تمھیں غار سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ لیکن تب تک تمہاری آنکھیں اندھی ہو چکی ہوں گی۔ تم اندھیرے میں رہ، رہ کر اس رنگ کی ہو چکی ہو گی اور اجلے لوگ تمہاری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گے۔

یہ گلیمر کی دنیا، یہ روشنیاں، یہ مسکراہٹیں، سب دھوکا ہے۔ مت جاؤ اس راستے پر، ادھر کبھی پیر نہ رکھنا۔''

وہ ہر اس لڑکی سے جو چاہ رکھتی ہے۔ یہی سب کہتی ہے، کوئی کان دھر لے تو یہ اس کی خوش قسمتی اور جو نہ سنے تو پھر اس کے ہاتھ میں پچھتاوؤں کے ٹوٹے پر رہ جاتے ہیں، آس کے خوب صورت پرندے پھڑ پھڑا کر ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ اور شام آ ٹھہرتی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

❀ ❀ ❀

لاؤ اپنے حسن کی ناؤ

صبح جب امی ناشتا بنا رہی تھیں۔ سخت گرمی اور حبس تھا۔ ایک تو موسم کی شدت اس پر تینوں بچوں کا یہیں ان کے قریب کھڑے ہو کر پہلی روٹی کے لیے جھگڑنا۔ دادی کی کرخت آواز اور بھوک بھوک کا شور، ابا کو آفس جانے کی جلدی، ایسے میں مدد کے لیے پکار سکتی تھیں تو صرف جہانگیر کو۔

ویسے جہانگیر فارغ نہیں بیٹھا تھا۔ وہ اپنے کمزور ہاتھوں سے ابا کے جوتے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے دادی کو ایک گلاس انرجائل بنا کر دیا تھا۔ چھوٹے بھائی کو گود میں لیے بھی وہی بیٹھا رہا تھا۔ اسے یہ سب بتانا نہیں پڑتا تھا کہ یہ اس کے روزانہ کے معمولات میں شامل تھا۔

صبح اسکول جانے سے پہلے ہی اس کے کمزور وجود سے اتنی مشقت لی جاتی تھی کہ وہ تھک کر چور ہو جاتا تھا۔ اور اسکول جا کر وہ سست اور کند ذہن دکھائی دیتا۔ شروع کے پیریڈ میں تو اسے بالکل سمجھ میں نہ آتا کہ ٹیچر کیا پڑھا رہی ہے۔ کیوں کہ اس کی کمزور ٹانگوں میں بہت درد ہو رہا ہوتا پھر آہستہ آہستہ اس کی ٹانگوں کا درد کم ہونے لگتا۔ آخر میں جب ٹیچر اردو، سائنس اور ڈرائنگ کے پیریڈ لیتی تو وہ بہت ذہین اور لائق بچہ بن جاتا اور چونکہ صبح کے پیریڈ بھی یہی ٹیچر لیتی تھی تو سمجھ سکتی تھی کہ یہ بچہ لاپروا اور نالائق نہیں ہے۔ شاید صبح بہت دور سے پیدل چل کر آتا ہے اس لیے تھکن کے باعث توجہ نہیں دے پاتا۔

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا گھر یہاں سے دور نہیں ہے۔ سڑک پار جو چوڑی سڑک ہے اس کے بائیں ہاتھ پر ایک تنگ گلی ہے اور اسی گلی میں پانچواں گھر اس کمزور گہرے سانولے رنگ والے بے کشش سے بچے کا ہے۔

وہ دور سے آنے کی وجہ سے نہیں تھکتا، اسے تو اسکول آنے سے پہلے والی مشقت تھکا دیتی ہے۔

آج سے آٹھ سال پہلے جب وہ اس دنیا میں آیا تھا تب بھی بے حد کمزور اور بدصورت تھا۔ اسے دوسرے بہت سے بچوں کی طرح پورے نو ماہ بعد آنا چاہیے تھا۔ مگر وہ ساتویں مہینے ہی آ گیا۔ ڈاکٹر اس کی زندگی کی طرف سے ناامید تھے اور اس کے لیے صرف دعا کرنے کو کہتے تھے۔

اگر وہ لڑکی ہوتی تو شاید کوئی ایسے بدصورت بچے کے لیے دعا بھی نہیں کرتا اس کے بارے میں ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اس کی ایک ٹانگ دوسری سے کچھ چھوٹی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کمزور ٹانگیں اسے

کبھی بھی چلنے میں مدد نہ دے سکیں۔ وہ لڑکا تھا جیسا بھی تھا وارث تو تھا، اور پھر ماں تو ماں ہوتی ہے۔ پتا نہیں کس نے بہت دل سے دعا کی تھی کہ وہ بچ گیا۔ دوسرا معجزہ تب ہوا جب اس نے ڈھائی سال کی عمر میں ان کمزور ٹانگوں پر کھڑا ہونا شروع کر دیا اور تین سال کی عمر میں پہلا قدم بھی اٹھالیا۔ مگر تب تک اس کے جڑواں بہن بھائی ہمایوں اور حنا دنیا میں آچکے تھے۔ ہر دم ساس نندوں میں الجھی رہنے والی ماں کے پاس دو بچوں کے بعد اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ پانچ سال کا تھا تب ایک اور بہن آگئی اور اب امی ننھی بہن کو اس کی گود میں دے کر گھر کے کام کاج نبٹانے لگیں۔ وہ کمزور تھا، اس لیے یہ ننھا سا وجود بھی اس کو تھکا دیتا مگر پتا نہیں کیوں وہ احتجاج نہیں کرتا تھا۔ تھکن کے باوجود اسے گود میں لیے بیٹھا رہتا۔

شمع کے بعد اب جبکہ وہ آٹھ سال کا تھا تو اب پھر اس کی گود میں تنہا بھائی تھا۔ اب تو جہانگیر اسکول بھی جانے لگا تھا مگر پھر بھی بہن بھائیوں کو سنبھالنا اس کی ڈیوٹی تھی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے بھی اسے چھوٹے ببلو کو دیکھنا ہوتا تھا۔ واپس آکر تو بہت سے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا کہ امی بھی تو اکیلی تھیں۔ دادی کے مزاج میں بہت سختی تھی۔ وہ بہت جلد مشتعل ہو جایا کرتیں اور ابا سے امی کی شکایت لگا دیتی تھیں۔

تینوں پھوپھیاں اسی شہر میں رہتی تھیں۔ ایک آتی تو فون کر کے باقی دونوں کو بلوا لیتی پھر وہ تینوں دادی کے کمرے میں بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کیا کرتیں اور امی کچن میں ان کے لیے کھانے پکاتی رہتیں۔ بچے روتے تو امی مزید جھلا جاتیں۔ سارا غصہ جہانگیر پر نکلتا کہ وہ آخر چھوٹے بہن بھائیوں کو کیوں نہیں سنبھالتا۔ جب امی اس پر چیختی چلاتیں تو وہ بہت اداس ہو جاتا مگر آنکھوں میں آئی نمی کو کبھی کسی پر ظاہر نہ کرتا۔ پلکیں جھپک جھپک کر اس نمی کو آنکھوں کے اندر ہی جذب کر لیتا مگر اس کا دل بہت دیر تک روتا رہتا اور اس کی ٹانگوں کی تھکن بڑھ جاتی۔ درد آہستہ آہستہ سارے وجود میں پھیلنے لگتا۔

امی کے پاس تو کسی بچے کے لیے بھی زیادہ وقت نہیں تھا مگر پتا نہیں وہ اتنا حساس کیوں تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے بہت کم عمری میں ہی بڑا سمجھ لیا گیا تھا ابھی اس میں اتنی سمجھ تو نہیں آئی تھی جتنا سمجھ دار اسے تصور کیا جاتا تھا۔

''تم دھیان سے کام کیوں نہیں کرتے۔ دیکھو گلاس کو کس طرح اوپر سے ہاتھ ڈال کر پکڑ رکھا ہے۔ بے وقوف، اب بھلا اس میں کسی کا دل چاہے گا پانی پینے کو۔ جاؤ اسے دھو کر لاؤ، صابن سے دھونا۔''

''لو دیکھو، سارا صابن اسی طرح لگا ہوا ہے۔''

''بھائی کو ٹھیک طرح سے پکڑ، سر کے نیچے ہاتھ رکھ، کتنی بار سمجھایا ہے چھوٹے بچے کو اس طرح نہیں پکڑتے مگر دھیان سے سنے تب نا۔''

امی اور دادی سارا دن اس کی لاپروائی کا رونا روتی رہتی تھیں پتا نہیں ایسا کہتے ہوئے انہیں اس کی عمر اور جسمانی کمزوری کا خیال کیوں نہیں آتا تھا۔

آہستہ روی سے چلنے والا، تھوڑا اٹک کر بولنے والا، گہرے سانولے رنگ کا وہ بے کشش بچہ، جس کی اپنے بہن بھائیوں سے بھی دوستی نہیں ہو سکتی تھی جو تیز دوڑتے، روانی سے باتیں کرتے اور اس کی

طرح ڈرے سہمے بھی نہیں رہتے تھے۔ کبھی امی اس سے چھوٹے والے کو کسی کام کے لیے پکارتیں وہ اَن سنی کر جاتا کام کرنے سے صاف انکار کر دیتا تب اس کے حصے کا کام بھی اسے کرنا پڑتا۔

بس اس نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ وہ بھی انکار کر سکتا ہے۔ دادی کی آواز پر جتنا تیز چل سکتا تھا چل کر پہنچ جاتا۔ ابا بلاتے، وہ حاضر ہو جاتا۔ امی کے تو بہت سے کام اس کے سپرد تھے کہ امی کے پاس کاموں کی بہتات بھی تو تھی۔ وہ صبح بستر چھوڑتیں اور رات کو جب سب سو رہے ہوتے تھے تب ان کے کام ختم ہوتے مگر نہیں ختم کہاں ہوتے تھے۔ بہت سے اگلے روز کے لیے باقی رہ جاتے جن میں سے ایک برتنوں کا ڈھیر بھی ہوتا تھا جسے امی صبح کے لیے رکھ چھوڑتی تھیں۔ پھر صبح بھی وقت نہیں ملتا تھا کہ سارے برتن دھو سکیں جس برتن کی ضرورت پڑتی فوراً جہانگیر کو آواز دیتیں۔

''جہانگیر کیا کر رہا ہے ذرا یہ گلاس تو دھو کر دے۔''

''یہ کپ جلدی سے پکڑا مجھے۔''

''تیرے ابا کو انڈا فرائی کر کے دینا ہے، ایک پلیٹ نکال کر جلدی سے دھو کر پکڑا۔''

اور جن دنوں کوئی پھپھو یا دادی کا کوئی قریبی عزیز آجاتا۔ تب تو گھر گھر نہیں رہتا تھا بلکہ اس پر کسی نچلے درجے کے ہوٹل کا گمان ہوتا۔ جہاں امی تو مصروف رہتی ہی تھیں ساتھ میں اس کی جان بھی عذاب میں آجاتی۔ بس اسی لیے مہمانوں کی آمد اسے بہت بری لگا کرتی تھی۔ مگر اس کے اچھا برا لگنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ ہفتہ دس دن میں ضرور ہی کسی نہ کسی کی آمد ہو جاتی تھی۔

مہمانوں کے آتے ہی وہ جو اپنے گھر میں اجنبی تھا مزید اجنبی ہو جایا کرتا۔ لوگوں کی نظریں اسے بہت چھوٹی عمر میں ہی چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ مذاق اڑاتی، بے رحم نظریں۔ یہ لوگ اسے اپنے ہی گھر میں کونوں کھدروں میں چھپنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ پھر اس کی تینوں پھپھیوں کی گفتگو، اسے دیکھ کر وہ بھائی سے ہمدردی جتاتیں اور ان کی تمام پریشانیوں کی وجہ اسے ثابت کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس کا جی چاہتا وہ ان تینوں کو سبق سکھا دے مگر کیسے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اسکول کی ٹیچر مہربان لڑکی تھی۔ وہ اس کے کمزور اور سہمے وجود سے ہمدردی رکھتی تھی۔ وہ اسے سزا کے طور پر کھڑا نہیں کرتی تھی اور اس سے بہت نرم لہجے میں بات کرتی۔ اسی لیے اسے اسکول جانا اچھا لگتا تھا۔ وہ پڑھائی میں بہت اچھا نہیں تھا کیونکہ اسے پڑھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا مگر جب بھی تھوڑی دیر کے لیے فراغت ہوتی۔ وہ کتاب کھول کر بیٹھ جاتا۔

''لو اس نے پڑھ لکھ کر پتا نہیں کہاں کا گورنر لگ جانا ہے۔''

دادی کو تو اس وقت بھی اعتراض ہوا تھا جب اس کو اسکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ ان کے خیال میں یہ بہو کی فضول کی ضد تھی۔ یہ فضول خرچ عورت ان کے بیٹے کی محنت کی کمائی کو برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ یہ خیال نہیں اس وقت نہیں آتا تھا جب ان کی تینوں بیٹیاں مہینے میں ایک ہفتہ تو یہاں گزارتی تھیں اور دادی نے ابا کو تاکید کر رکھی تھی جب بہنیں چند دن یہاں ٹھہر کر اپنے گھر جائیں تو ان کے ہاتھ پر ضرور کچھ نہ کچھ رکھ کر رخصت کرنا ہے۔

ابا کوئی بڑے افسر تھے نہ بزنس مین۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اتنی تنخواہ پر ملازم تھے کہ گزارا اچھی

طرح ہوسکتا تھا مگر بہت سے فضول اخراجات کی وجہ سے وہ ہر مہینے کے آخر میں اپنا بلڈ پریشر بڑھا لیتے ہیں اور نتیجے میں اسی کی شامت آتی تھی۔ بیٹے کو اسکول داخل کروانا ضروری تھا مگر دادی نے سخت مخالفت کی تھی، ان کا کہنا تھا۔

''یہ بچہ کند ذہن ہے کبھی نہیں پڑھ پائے گا۔ اس کی کمزور ٹانگیں جو خود اس کا بوجھ نہیں سہار سکتیں۔ کسی اور کو کیا سہارا دیں گی؟''

مگر امی رو پڑی تھیں اور ابا سے وعدہ لیا تھا کہ وہ جہانگیر کو اسکول سے نہیں ہٹائیں گے اور اسے اس روز امی پر بہت پیار آیا تھا۔ جی چاہا تھا امی کے گلے میں بانہیں ڈال دے اور بہت روئے۔ مگر وہ ایسا کچھ نہیں کرسکا۔ ہاں جب رات کو سونے کے لیے لیٹا تب اس کے یہ سارے آنسو تکیے میں جذب ہوئے تھے۔

۞ ۞ ۞

بڑی پھپھو کی بیٹی بینا کی سالگرہ تھی۔ دادی کو بڑی پھپھو کے بچے بہت عزیز تھے کہ وہ ان سب بچوں میں بڑے تھے۔ دادی کے پہلے نواسا نواسی تھے۔ انہوں نے پھپھو کو فون کر کے کہا تھا۔

''رضیہ! تم لوگ اِدھر ہی آجانا۔ ہم بینا کی سالگرہ دھوم دھام سے منائیں گے۔'' امی نے سنا اور گہری سانس بھرتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

''بہو! سب لوگ آئیں گے۔ انتظام کر لینا۔''

فون کرنے کے بعد دادی، امی سے کہہ رہی تھیں، امی نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔

مگر دادی کو ان سے جواب میں کچھ سننا بھی نہیں تھا کہ امی کو تو ہر حال میں ان کا فیصلہ ماننا ہی تھا۔

شام کو ابا گھر آئے۔ دادی نے انہیں اپنے کمرے میں ہی بلوا لیا۔ جب آدھا گھنٹہ دادی کی ہدایت سننے کے بعد ابا، دادی کے کمرے سے باہر نکلے تو پہلے سے زیادہ تھکے ہوئے تھے۔

امی نے چائے بنائی۔ لا کر ان کے سامنے رکھی۔ پتا نہیں امی چینی ڈالنا بھول گئی تھیں یا ابا کو ہر شے بے رنگ اور پھیکی لگ رہی تھی۔ انہوں نے کپ اٹھا کر دیوار پر دے مارا اور امی کی اس نااہلی پر گرجنے برسنے لگے۔ امی بھی خاموش نہیں رہیں اور گھر میں ایسی آوازیں گونجنے لگیں جنہیں سن کر بچے سہم جاتے تھے۔ دادی نے اپنے کمرے سے جھانکا پھر کمر پر ہاتھ رکھے سست روی سے چلتی مگر زبان سے آگ کے گولے برساتی امی کے سر پر پہنچ گئیں۔

''پتا تھا، مجھے پتا تھا میری خوشی میں یہ خوش نہیں ہوسکتی۔ اسے میری بچیوں کا اس گھر میں آنا پسند ہی نہیں۔ اسے یہ خیال نہیں آیا کہ شوہر تھکا ماندہ گھر آیا ہے۔ آتے ہی شروع ہوگئی ہے۔''

دادی نے اس لڑائی کا ایک ہی سبب سمجھا تھا بس پھر ان کے آگے کوئی نہیں بول سکا، ابا بھی خاموش ہوگئے۔ امی کچھ دیر خاموشی سے دادی کی زہر اگلتی زبان کے وار سہتی رہیں پھر رونے لگیں اور ان کے ساتھ جہانگیر بھی رونے لگا۔ ابا نے اپنا تکیہ اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بنے کمرے میں جا لیٹے۔

اگلے دن گھر کی فضا بے حد کشیدہ رہی۔ جہانگیر سے مختلف کاموں میں مدد لیتے ہوئے امی نے اسے کئی بار بلا وجہ ہی ڈانٹا۔ دادی نے امی سے بول چال بند رکھی تھی۔ اس لیے ہر چھوٹے بڑے کام کے

لیے اسے پکارتی رہیں اور اسے دادی کی ہر آواز کوفت میں مبتلا کرتی رہی مگر وہ ان کی حکم عدولی بھی تو نہیں کرسکتا تھا ورنہ پھر دادی ابا سے شکایت لگا دیتیں اور ابا کا ہاتھ بہت بھاری تھا۔ مارتے ہوئے وہ اس کے وجود کی کمزوری کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

سالگرہ کے روز بڑی پھپھو اور ان کی فیملی کو دوپہر میں آنا تھا۔ جبکہ باقی سب کو شام ہی میں پہنچنا تھا۔ آج اگر دادی، امی سے بول چال بند رکھتیں تو اپنا ہی نقصان کرتیں۔ اس لیے صبح انہوں نے بات چیت کا آغاز ذرا روٹھے ہوئے اندازِ میں شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے امی سے گھر کی صفائی ستھرائی بہت دھیان سے کرنے کو کہا تھا۔ پردوں کی دھلائی کی ہدایت بھی کی گئی تھی۔ پھوپھی کو دوپہر میں آجانا تھا۔ اس لیے ان کی فیملی کے لیے دوپہر کا کھانا بھی تیار ہونا تھا اور شام کو سالگرہ کے لیے تو اہتمام ہونا ہی تھا۔

امی صبح سے کاموں میں لگی تھیں اور وہ ساتھ ساتھ تھا۔ امی فرش دھو رہی تھیں، وہ وائپر لگا رہا تھا۔ امی چاول چن رہی تھیں، وہ مٹر چھیل رہا تھا۔ امی کپڑے پریس کر رہی تھیں، وہ سلیقے سے رکھ رہا تھا۔ امی برتن نکال رہی تھیں، وہ کپڑے سے صاف کر رہا تھا اور جب امی مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں لگا رہی تھیں تو وہ جھاڑن لیے انہیں صاف کر رہا تھا۔

کچن میں بھی اس کی مصروفیات ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ چھوٹے بہن بھائی تیار ہو کر کھیل کود میں مصروف تھے مگر وہ ان کے کھیل میں شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ مہمان بچوں کی تمسخرانہ نگاہوں اور باتوں سے بھی خوف زدہ تھا۔ وہ دادی کی بار بار کی آوازوں پر لپک کر ان کے کمرے میں بھی نہیں جانا چاہتا تھا جہاں اس کی پھوپھیاں اور دوسرے عزیز رشتہ دار موجود تھے۔

''تھک گیا ہوگا میرا بیٹا!'' امی نے اسے مسلسل اپنے ساتھ لگے دیکھ کر کئی بار کہا تھا مگر وہ اکیلی یہ سب کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ اتنے کاموں کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے بچوں کو بھی دیکھنا تھا۔ چھوٹا تو ابھی صرف دو سال کا تھا اور وہ بار بار ماں کے لیے روتا تھا۔

اب تو اس سے چھوٹے دونوں جڑواں بہن بھائی بھی آٹھ سال کے ہو رہے تھے مگر وہ دونوں سب کی نظر میں ابھی بچے تھے۔ جب وہ اس عمر کا تھا تو گھر کی کئی ذمہ داریاں اپنے سر لے چکا تھا مگر ان دونوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ وہ صرف لاڈ اٹھواتے تھے اور امی کے بہت لاڈلے تھے۔ دونوں بے حد چلبلے اور چالاک تھے۔ جہانگیر سارا دن ان کے مذاق کا نشانہ بنتا۔ پہلے پہل امی سے شکایت بھی کرتا مگر اب کسی سے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ جواب میں اسے ہمیشہ ایک ہی فقرہ سننے کو ملتا تھا۔

''تم بڑے ہو تمہیں برداشت سے کام لینا چاہیے۔''

۞ ۞ ۞

''پھول کتنے خوب صورت ہیں۔ تارے، چاند، چمک دار روشن سورج اس کی طرف تو دیکھا بھی نہیں جاتا، اس کی چمک کی تو نظریں تاب ہی نہیں لا پاتیں۔ بارش کا موسم، خوب صورت ٹھنڈی ہوا دونوں سکون بخشتی ہوئی اور سب سے بڑھ کر دلکش نقوش والے لوگ بااعتماد، سر اٹھا کر چلنے والے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے۔ میرے اللہ! میرے مالک، مجھے بناتے ہوئے تُو نے میرے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا؟ مجھ پر دنیا کی ہر رنگینی کا دروازہ بند کر دیا، مجھے دنیا کے لیے تماشا بنا دیا۔ میرے پاس

دل ہے، انہی جیسا دماغ بھی رکھتا ہوں مگر جسمانی طور پر ادھورا ہوں اور میرا چہرہ جب میں آئینہ دیکھتا ہوں تو یہ چہرہ مجھے بھی اچھا نہیں لگتا تو پھر میں دوسرے لوگوں کو کس طرح اچھا لگ سکتا ہوں۔''

میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد وہ کالج میں آ گیا تھا اور کالج میں آ کر وہ اپنی زندگی سے اور بھی بے زار ہو گیا۔ اس کے لیے تو کہیں بھی کچھ نہیں۔ وہ اکثر سوچتا۔

زندگی زندہ دلی سے عبارت ہے۔ زندہ دل وہی ہے جو قدرت کی ان رعنائیوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر اپنے حصے کی خوشی چھین سکتا ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا، اپنی سست چال اور کمزور صحت، بے کشش شخصیت کے ساتھ وہ ہنستے مسکراتے لوگوں کے ہجوم میں راستہ بنائے تو کس طرح؟

وہ کبھی سیڑھیوں میں بیٹھ کر ان امنگوں بھرے نوجوانوں کو تکا کرتا، کبھی لائبریری میں بیٹھ کر کتابوں کے ورق پلٹتا رہتا۔ یہاں اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور خود اس میں اتنا اعتماد نہیں تھا کہ وہ کسی کو دوستی کی آفر کر سکتا۔ اس کا پانچ فٹ چار انچ قد، دبلا پتلا جسم، مدقوق چہرہ اسے قدم بڑھانے ہی نہیں دیتا تھا۔

کالج آ کر وہ پہلے سے کہیں زیادہ ہکلانے لگا تھا۔ لیکچر کے دوران اگر اس سے سوال کر لیا جاتا تو وہ پسینے پسینے ہو جاتا۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگتا اور جب وہ بہت ہمت سے کام لے کر کھڑا ہو جاتا تب بولتے ہوئے لفظ کچھ کے کچھ ہو کر اس کے ہونٹوں سے ادا ہوتے۔ کلاس میں قہقہے گونجنے لگتے اور اس کا بایاں گال گھبراہٹ میں بے اختیار کپکپانے لگتا اور بہت دیر تک ایسا ہوتا رہتا۔ وہ گال پر ہاتھ رکھ لیتا اگر جو کسی نے یہ دیکھ لیا تو پھر نیا مذاق ہاتھ آ جائے گا۔ وہ مذاق بننے سے بہت ڈرتا تھا اسی لیے تنہائی اسے اچھی لگنے لگی تھی۔

کالج میں اسے اسکول کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل کا سامنا تھا، مگر وہ تعلیم کو خیر باد بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ جوں جوں انسانوں سے خوف بڑھتا گیا۔ اس نے کتابوں میں پناہ لینا شروع کر دی تھی۔ وہ بہت پڑھتا تھا مگر اس کا ذہن جو مسلسل سوچوں میں گھرا رہتا تھا وہاں اِن پڑھے ہوئے لفظوں کو محفوظ کر لینے کی شاید جگہ باقی نہیں رہی تھی یا پھر اس کا یہ یقین کہ میں کبھی زندگی کے کسی میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتا، اسے کبھی اچھے نمبروں سے کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ محض پاس ہی ہوا کرتا تھا۔

اس کے بہن بھائی اس سے کہیں کم وقت پڑھائی کو دینے کے باوجود اچھے نمبر لیتے تھے۔ امی، ابا کو ہمایوں سے بہت امیدیں تھیں۔ وہ ہمیشہ اسے آگے بڑھنے، محنت کرنے کی تلقین کرتے اور امی تو اس کے کھانے پینے کا بھی بے حد خیال رکھنے لگی تھیں وہ اب قد میں جہانگیر سے اونچا ہو رہا تھا۔ اس کا بھرا بھرا جسم صحت مند خوب صورت چہرہ دیکھنے والوں کو بہت اچھا لگتا تھا اور جہانگیر تو کالج کے لڑکوں کی طرح اب اس سے بھی جھجکنے لگا تھا اور ہمایوں تھا بھی کچھ مغرور سا۔ اس نے کبھی جہانگیر کو اپنا بڑا بھائی سمجھا ہی نہیں اور کسی نے اسے سمجھایا بھی نہیں۔ گھر میں بڑے بھائی کا درجہ ہمایوں کو ہی حاصل تھا۔ بہن بھائی ہر مشورے کے لیے اس کے پاس دوڑے جاتے، اسی کے حکم پر چلتے۔ ہاں جب کسی کو کوئی کام ہوتا تب جہانگیر کی یاد آتی۔ حنا اور شمع کو سہیلیوں کے ہاں جانا ہوتا یا بازار سے کچھ منگوانا ہوتا تو جہانگیر بھائی کو پکارتیں۔

امی بھی ہر کام میں مدد کے لیے اسے آواز دیتیں۔ اب بیٹیاں سمجھ دار تھیں مگر شاید انہیں جہانگیر کو

آواز دینے کی عادت ہو چکی تھی۔ ہمایوں منہ پھٹ تھا، مغرور تھا، سب سے بڑھ کر لائق فائق بیٹا تھا اور امی کا فخر و مان تھا۔ وہی تو تھا جو دادی کو ان کی امی کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا احساس دلاتا تھا جو پھپھیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور جس نے ابا کو یہ احساس دلایا تھا کہ ان کی ماں بہنیں امی سے ہمیشہ زیادتی کرتی اور ان کے بچوں کا حق مارتی آئی ہیں۔

ہمایوں کی اس دلیری کی وجہ سے اب گھر پر دادی کی نہیں بلکہ امی کی حکمرانی تھی۔ پھوپھیاں اب بھی آتی تو تھیں مگر ہر ہفتے نہیں بلکہ کبھی مہینے دو مہینے بعد اور ان کی آمد پر امی کے لیے ضروری نہیں رہا تھا کہ صبح سے شام تک کچن میں ہی گزار دیں۔

جہانگیر، ہمایوں کی ان خوبیوں کا معترف تھا اور اس کی خود پسندی اور خود سری سے خائف بھی تھا۔ وہ بھی اکثر باتوں باتوں میں بڑے بھائی کو مذاق کا نشانہ بنا جاتا تھا اور افرادِ خانہ ہنس پڑتے تھے۔ ایسے میں جہانگیر کی سانولی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگتے اور اس کا دل اس زور سے دھڑکتا کہ اس کی دھمک دیر تک کانوں میں گونجتی رہتی۔

❁ ❁ ❁

''اے جہانگیر! جہانگیر بچے! ذرا بات تو سن۔''

وہ ابھی ابھی کالج سے لوٹا تھا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں ہی طرح کی تھکن سے چور۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ کمزوری کا احساس سب پر حاوی تھا۔ دادی اب پرانے انداز بھول چکی تھیں اور نرم آواز میں پکارا کرتی تھیں۔ وہ فوراً کچن میں جانا چاہتا تھا مگر ان کی آواز پر پلٹ کر ان کے کمرے میں آ گیا۔

''بچے! مجھے صبح سے بخار ہے، دوا لا دے۔'' وہ درخواست کر رہی تھیں اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کتابیں برآمدے میں رکھی میز پر چھوڑ کر وہ کچن میں چلا آیا۔ اسے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی اور ساتھ میں وہ سلائس بھی لینا چاہتا تھا۔ چولہے کے پاس کھڑی حنا چائے بنا رہی تھی۔

''حنا! ایک کپ مجھے بھی دے دو۔''

''نہیں، بس اتنا ہی دودھ تھا۔ میں ہمایوں بھائی کے لیے بنا رہی ہوں۔'' حنا نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھا اور ایک ایک پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھنے لگا۔

''امی پڑوس والی آنٹی کی طرف گئی ہیں۔ ابھی کچھ بھی نہیں پکا۔''

''حنا! امی کہہ رہی تھیں، جہانگیر بھائی آ جائیں تو۔۔۔'' شمع یہ کہتی ہوئی کچن کے دروازے تک آئی پھر اسے موجود دیکھ کر بولی۔

''اچھا آپ آ گئے ہیں۔ امی کہہ کر گئی ہیں کہ انہیں آنے میں دیر ہو جائے گی۔ جہانگیر سے کہنا، قیمہ بھون لے اور روٹی بازار سے لے آئے۔ اب آپ جلدی کر لیں جہانگیر بھائی! ہمایوں بھیا کو بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔''

آلو قیمہ بنا کر بازار سے دادی کی دوا اور روٹی لانے کے بعد جب وہ فارغ ہوا تو تھکن سے نڈھال تھا۔ اس کا کمزور وجود صرف اور صرف آرام چاہتا تھا، اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ کرسی پر بیٹھ کر

کھانا کھا سکے اس نے روٹی کو ہاتھ میں پکڑا اور بستر پر آلیٹا۔ ابھی آدھی روٹی ہی کھائی تھی کہ نیند نے آلیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ نامانوس شور سے کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا اور ٹٹول کر لائٹ آن کر دی اس کے دائیں ہاتھ میں اب بھی آدھی روٹی موجود تھی اس نے روٹی کو میز پر رکھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ کچھ ہی فاصلے پر سیڑھیوں کے قریب بلی بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے صحن کی ٹیوب لائٹ جلا کر دیکھا بلی کا ایک پاؤں زخمی تھا۔

پتا نہیں تکلیف زیادہ تھی یا وہ بھوک کی وجہ سے رو رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور واپس کمرے میں چلا آیا۔ میز پر رکھی ہوئی روٹی اٹھائی اور بلی کے آگے ڈال دی۔ بلی کا رونا بند ہو گیا اور وہ بے تابی سے روٹی کھانے لگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے روٹی ختم کر لی اور اب وہ پھر جہانگیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اس کی بھوک ابھی باقی تھی۔ وہ کچن میں چلا آیا۔ یہاں میز پر ایک ٹرے ڈھانپ کر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے کپڑا ہٹا کر دیکھا ایک پیالی میں قیمے کا سالن جو دوپہر کو اس نے بنایا تھا اور دسترخوان میں روٹی، یقیناً امی نے یہ کھانا اسی کے لیے رکھا ہوگا کہ وہ رات کا کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا تھا۔

اس نے اس روٹی کو آدھا کیا اور اس پر کچھ قیمہ رکھا اور بلی کے آگے ڈال دیا۔ پھر وہ خود بھی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر برآمدے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ کھانا کھا کر اس نے پانی پیا تب بلی کا خیال آیا، وہ بھی اب پانی پینا چاہتی ہوگی پھر سنک کے نیچے پڑے ایک ٹوٹے کپ میں پانی ڈال کر اس نے بلی کے آگے رکھ دیا۔ پانی پی کر وہ لنگڑاتی ہوئی اٹھی بڑے نرم انداز میں غرغر کرنے کے بعد ایک ایک کر کے سیڑھیاں چڑھتی چھت پر غائب ہو گئی۔ وہ بھی دوبارہ کمرے میں آ کر سو گیا۔

''رات بلی نے بڑا تنگ کیا۔ میں تو ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔'' صبح ناشتے پر ہمایوں منہ بنا کر کہہ رہا تھا۔

''زخمی تھی اور بھوکی بھی تھی بے چاری، میں نے روٹی ڈالی تو کھا کر لنگڑاتی ہوئی چلی گئی۔'' جہانگیر نے بتایا۔

''روٹی کہاں سے آئی؟ میں نے تو صرف تمہارا کھانا رکھا تھا۔'' امی نے پوچھا۔

''اسی میں سے کچھ اس کو ڈال دیا تھا۔''

''محبت بھی کی تو کس سے۔ بلی سے۔'' ہمایوں کے کہنے کی دیر تھی سب ہنسنے لگے۔

''صرف بلی ہی نہیں لنگڑی بلی۔'' یہ اضافہ حنا نے کیا۔

''میرا خیال ہے بلی کی اسی خوبی نے متاثر کیا ہوگا۔''

ہمایوں پھر بولا اور اس مرتبہ اس کے الفاظ جہانگیر کے دل پر تیر کی طرح لگے گئے اس کے اپنے ہی گھر کے لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے اور وہ ان کے درمیان گویا اجنبی بنا بیٹھا تھا۔

''چلو بچو! ہنسی مذاق چھوڑو۔ دیر ہو رہی ہے تم لوگوں کو۔'' امی سب سے کہہ رہی تھیں۔

''یہ ہنسی مذاق ہے؟ کسی کی ذات کی دھجیاں بکھیر دینا ہنسی مذاق کیسے ہو سکتا ہے؟ کاش، کاش میں تم لوگوں کو بد دعا دے سکتا مگر میں ایسا کروں تو کس دل کے ساتھ، میں جہانگیر ہوں ہمایوں نہیں۔'' وہ

ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ناشتے کی افراتفری میں کسی نے اس کا یوں چپ چاپ اٹھ جانا محسوس ہی نہیں کیا۔

''مجھے جی کر کیا کرنا ہے، میرے لیے اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔'' روڈ پر رواں دواں ٹریفک دیکھ رک اس کی سوچ بھٹکنے لگی۔ وہ کسی گاڑی کے سامنے آ جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر وہ ایسا کر نہیں سکا۔ وہ کبھی کبھار نماز پڑھ لیتا تھا۔ ناظرہ قرآن بھی اس نے پڑھا تھا اور مذہب کے بارے میں باقی جو معلومات تھیں وہ کورس کی کتابوں کی حد تک تھیں اور اس نے پڑھا تھا کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ خودکشی کرنے والے کے لیے اگلے جہان میں بھی اذیت ہی اذیت ہے، بس وہ ایک اور اذیت بھری زندگی قبول نہیں کر سکا اور منفی و مثبت سوچوں میں الجھا آخر کار کالج پہنچ گیا۔

فرح پہلے بھی ان کے ہاں آتی تھی۔ وہ اس کی پھپھو کی بیٹی تھی۔ جب تک دادی کی حکمرانی رہی یہ لوگ اس گھر میں عیش کرتے رہے مگر جب بچے خاص کر ہمایوں بڑا ہوا تو امی کی حیثیت بھی بدل گئی۔ تب سے اس گھر میں ان لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔ مگر دادی سے ملنے گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے پھپھیوں میں سے کوئی آ ہی جاتی اور فرح بھی اپنی امی کے ساتھ آ جایا کرتی تھی۔

اب تو ہمایوں، حنا، شمع اور چھوٹے قیصر کے ساتھ اس کی کافی دوستی ہو چکی تھی۔ دادی کے کہنے پر اس مرتبہ فرح کچھ دن رہنے کے ارادے سے آئی تھی۔

وہ کالج سے گھر لوٹا تو فرح موجود تھی۔ نہ اس نے اس کی آمد کا نوٹس لیا نہ ہی فرح نے ایک نظر بھی اس پر ڈالنے کی ضرورت سمجھی۔ وہ اور حنا چائے کے ساتھ چپس اور نمکین مونگ پھلیاں کھانے میں مصروف تھیں۔ اسے بھی بھوک لگ رہی تھی اس کا جی چاہا تھوڑے چپس اور مونگ پھلیاں کھا لے وہ چند لمحے رکا بھی مگر پھر آگے بڑھ گیا۔

کچھ دیر کے بعد باہر سے ہمایوں اور شمع کی بھی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کپڑے تبدیل کر چکا تھا اور کچن سے اپنے حصے کا کھانا بھی نکال لایا تھا۔ نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ ٹرے اٹھا کر باہر آ گیا اور ان سب کے درمیان آ بیٹھا۔

''لیجیے ان کی کسر باقی تھی۔'' پتا نہیں فرح نے کس رنگ میں کہا تھا مگر اس کا احساسِ کمتری میں ڈوبا وجود ایسے مذاق کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ گھبرا کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔

''کیا ہے، نظر لگائیں گے؟'' فرح کے انداز سے پتا نہیں چل رہا تھا وہ سیریس ہے یا مذاق کر رہی ہے۔

''ان کی نظر میں اتنا اثر نہیں۔'' حنا نے کہا۔

''آنکھیں بھی تو بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔'' یہ اطلاع ہمایوں نے دی۔

وہ جھٹکے سے اٹھا کھانے کی ٹرے الٹ گئی۔ وہ رکا نہیں اپنے کمرے میں آ کر ہی دم لیا۔ ابھی خود کو سنبھال بھی نہیں پایا تھا کہ کھانے کی ٹرے اٹھائے امی چلی آئیں۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے جہانگیر! تم چھوٹے بہن بھائیوں سے ہمیشہ الگ تھلگ تو رہے ہو مگر اب تو

بدمزاجی بھی دکھانے لگے ہو۔ وہ تمہارے چھوٹے بہن بھائی ہیں کوئی غیر نہیں ہیں کہ ان کی ذراسی بات کا تم نے اتنا غصہ کیا کہ کھانے کے برتن ہی الٹ دیے۔ مجھے ایسی باتیں سخت ناپسند ہیں اور تم نے فرح کی موجودگی کا بھی خیال نہیں کیا۔ جیسی ماں، ویسی بیٹی ہے۔ دیکھنا یہ بات سب کو بتائے گی۔ ہر کسی سے کہے گی۔ یہ بہن بھائی آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔''

''امی! ہمایوں نے بدتمیزی کی تھی۔''

''جہانگیر! برداشت کی عادت ڈالو، تمہارے رویوں نے مجھے پہلے ہی پریشان کر رکھا ہے، یہ لو کھانا کھاؤ اور میں پھر کہہ رہی ہوں۔ چھوٹے بہن بھائیوں سے محبت کا سلوک کیا کرو۔''

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ ساتھ چھوڑ گئے تھے، بھوک کے باوجود اس نے کچھ نہیں کھایا۔ وہ بستر پر چت لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ شام گہری ہو کر رات میں ڈھل گئی اس نے لائٹ جلائی نہ ہی سردی لگنے کے باوجود اٹھ کر کمبل سیدھا کیا۔ وہ دوسروں کے کیے کی سزا خود کو دینے پر تلا ہوا تھا۔

رات کے دس بجے کے قریب امی کمرے میں آئیں۔ لائٹ آن کی اسے یوں بغیر کمبل کے لیٹے دیکھا پھر کھانے کو جوں کا توں پڑے دیکھ کر انہیں غصہ آ گیا۔

''کیا سمجھا کر گئی تھی میں تمہیں۔ اتنی سی بات کا اس قدر غصہ۔ بہن بھائی آپس میں مذاق کرتے ہی رہتے ہیں، اس میں اس قدر برا ماننے کی کیا بات ہے؟''

''کب ہیں وہ میرے بہن بھائی؟''

''جہانگیر!'' امی چلائیں، پھر ان کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ وہ ایسی بات کہنے پر سخت خفا تھیں اور اسے یہ سب سن کر صرف اور صرف امی پر غصہ آ رہا تھا۔

''کہتے ہیں والدین کی محبت ساری اولاد کے لیے ہوتی ہے۔ غلط ہے یہ، بالکل غلط ہے۔ امی کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے۔ انہیں میرا وجود ناکارہ لگتا ہے میں ان کے لیے شرمندگی کا باعث ہوں۔'' رات کو کتنی مرتبہ اس کی آنکھیں بھیگی تھیں اور اس نے اپنے مرنے کی دعا کی تھی۔

آنے والے دنوں میں اس نے بہن بھائیوں سے بالکل بات نہیں کی۔ یقیناً انہیں بھی اس سے کوئی کام نہیں پڑا تھا۔ اس لیے کسی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ ان سے خفا ہے اور بول چال بند کیے بیٹھا ہے۔

فرح یہیں تھی۔ ضرورت سے زیادہ شوخ اور خوش باش لڑکی اس کی ہنسی اور تیز تیز باتیں کرنے کا انداز جہانگیر کو تو برا لگتا ہی تھا، امی کی طبیعت پر بھی گراں گزرتا۔ وہ چاہتی تھیں کہ فرح جلد از جلد واپس چلی جائے مگر اس لڑکی کا ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور ہمایوں اب کالج سے واپسی کے بعد کم ہی باہر نکلتا اب اس کا زیادہ تر وقت گھر میں فرح کے ساتھ ہی گزرتا۔

ویسے تو امی کا بڑا ہمدرد بنتا ہے مگر فرح کے آگے پیچھے پھرتے اسے کبھی خیال نہیں آیا کہ ان لوگوں نے امی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

وہ ان لوگوں کو ایک ساتھ دیکھ کر سوچتا ''یہی تو وہ لوگ تھے جنہوں نے مجھے اور امی کو ایک دوسرے سے دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ امی کے پاس کبھی میرے لیے وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ وہ ہمیشہ گھر

کے کاموں میں الجھی رہتی تھیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو شاید امی تھوڑی بہت توجہ مجھ پر بھی دے لیتیں۔''

''جہانگیر! او جہانگیر!'' دادی کی آواز وہ سن رہا تھا مگر آج اس کے دل میں پہلی بار یہ خیال آیا تھا کہ آخر اسے ان سب کی آواز سنتے ہی بھاگ کر خدمت میں حاضر ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

مگر جب دادی کی شکایت پر اسے ابا کے سامنے حاضر ہونا پڑا اور ابا نے اسے اس کی گستاخیوں پر سخت سست کہا تب اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اسے لگا تھا وہ ابھی گر پڑے گا۔ بچپن سے جو ابا کا خوف اس کے ذہن میں بیٹھا تھا وقت کے ساتھ ساتھ وہ بڑھتا ہی چلا گیا تھا۔ جب ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ابا نے اسے شکل گم کرنے کا حکم دیا تو ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ اسے لگا اس کے بہن بھائی چپکے چپکے ہنس رہے ہیں اور یہ اس کا وہم نہیں تھا یقیناً ایسا ہی تھا۔

''زندگی بدصورت ہے بہت بدصورت۔ زندگی کٹھن ہے۔ اف میں اسے کیسے بتاؤں؟ مگر جو لوگ خوب صورت ہیں با اعتماد ہیں ان کے لیے تو رنگ ہی رنگ ہیں۔ اگر میں بھی خوب صورت ہوتا اگر میں بہادر ہوتا، تو پھر۔۔۔ پھر یہ زندگی کس قدر خوب صورت ہوتی۔''

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تصور میں خود کو ایک ہیرو کا چہرہ دے دیا۔ جسم کو کسی ماڈل کی طرح بہترین لباس سے سجا لیا اور پھر خیالوں ہی خیالوں میں اس نے ایک نئی دنیا کی سیر کر لی۔ وہ جاگتی آنکھوں دیکھے جانے والے اس خواب میں ایسا ڈوبا کہ پھر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ پھر وہ روزانہ رات کو بستر پر لیٹ کر ایک گیٹ اپ اختیار کرنے لگا۔ وہ اس نشے کا عادی ہوتا چلا گیا۔ اس نے دنیا سے فرار کا ایک خطرناک راستہ اپنا لیا۔ پہلے یہ خواب صورت رات کو سونے سے پہلے دیکھتا تھا پھر وہ دن میں بھی الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ کر آنکھیں موندنے لگا۔

کس کے پاس فرصت کہ وہ اس کی خبر لیتا۔ اس کے پاس سب اپنے ہی تو تھے مگر ان کے دلوں میں اس کے لیے وہ اپنائیت نہیں تھی جو اس رشتے کا تقاضا تھی۔ جب بھی اس کی بہنیں گھر میں اپنی دوستوں کو گھر پر بلایا کرتیں تو اسے پہلے سے کہہ دیا جاتا تھا۔

''جہانگیر بھائی! یہ سودے کی لسٹ ہے یہ سب بازار سے لے کر آنا ہے اور پھر اپنے کمرے میں ہی رہیے گا ایسے ہی کسی کی نظر پڑ گئی تو پھر پوچھے گی ضرور۔''

اور ہمایوں گھر پہ ہوتا تو اسے ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے جاتیں اور سہیلیوں سے ملواتیں۔ ہمایوں دیکھنے میں خوب صورت اور باتیں بنانے میں بھی اسی قدر ماہر تھا۔ ذرا سی دیر میں ڈرائنگ روم قہقہوں سے بھر جاتا۔

گھرانہ کچھ ایسا خوش حال بھی نہیں تھا۔ بس کھینچ کھانچ کر مہینہ پورا کیا جاتا تھا مگر پتا نہیں ہمایوں کے ہاتھ میں کیسا ہنر تھا۔ جیب میں پیسے بھی رہتے اور وہ گھر سے نکلتے ہوئے ہمیشہ بہت اچھے کپڑوں میں بھی دکھائی دیا کرتا تھا۔ ابا تو گھر پر کم ہی ہوتے تھے، امی نے بھی کبھی نہیں پوچھا کہ تم اتنے قیمتی کپڑے کہاں سے لیتے ہو؟ نہ ہی کبھی بہنوں کو خیال آیا اور تو اور ہر کسی کی ٹوہ میں رہنے والی دادی بھی ہمایوں کے معاملے میں خاموش تھیں۔ ویسے بھی وہ ہمایوں سے کم ہی بات کرتی تھیں۔ وہ موڈی تھا اور بدلحاظ ہونے میں بھی دیر نہیں لگاتا تھا۔

''دادی! بڑے دن ہوگئے آپ کی نواسیوں نے چکر نہیں لگایا؟'' سرما کی ایک دوپہر جب دادی صحن میں پھیلی دھوپ میں بیٹھی تھیں اور ہمایوں بھی دن کے ایک بجے یہیں میز کرسی لگائے ناشتا کر رہا تھا۔ یہ سوال کر کے وہیں موجود گھر کے افراد کو کچھ حیران کر گیا۔

''تمہاری اماں کو ان کا یہاں آنا پسند ہی کب ہے؟'' دادی نے امی پر کڑوی سی نظر ڈال کر شکایتی انداز میں کہا۔

''لیکن ہمیں تو پسند ہے نا، مگر صرف نواسیوں کی آمد۔'' وہ اپنے مذاق پر خود ہی دل کھول کر ہنس دیا۔ اور جہانگیر کو سخت ناگوار محسوس ہوا۔ کچھ بھی تھا مگر وہ اسی خاندان کی بیٹیاں تو تھیں نا۔

ہمایوں کی ہنسی میں دونوں بہنیں بھی شریک ہوگئیں۔ دادی کو یقیناً برا تو لگا ہوگا مگر پتا نہیں آج انہیں کیا ہوا کہ خاموش ہی رہیں اور دوسری جانب امی بھی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

جونہی ہمایوں نے ناشتا ختم کیا، امی نے اسے اپنے ساتھ کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا اور جب کچھ دیر کے بعد جہانگیر سودا لانے کے لیے پیسے لینے کمرے کے دروازے پر آیا تو ہمایوں بڑے غصے میں بول رہا تھا اور امی کا انداز بھی آج اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے خاصا مختلف تھا۔

''اس گھر میں مذاق سے کچھ کہنا بھی مصیبت ہو جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پکڑی جاتی ہے۔'' ہمایوں بگڑا ہوا تھا۔

''یہ ذرا سی بات نہیں ہے احمق لڑکے! تم جیسے ہی لڑکیوں کے جال میں آجاتے ہیں۔ کیا میں فرح اور بینا کے کچھن نہیں جانتی۔ یہاں آکر جس طرح تمہارے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہیں اور تم بھی ان کے ساتھ گھل مل جاتے ہو، یہ مجھ سے پوشیدہ تھوڑی ہے مگر مجھے دوسری ماؤں کی طرح بات بات پر ٹوکنے کی عادت نہیں ہے۔ میرا خیال تھا بچہ عقل والا ہے۔ ان لڑکیوں کے بارے میں چند منٹ سوچنے کی بھی حماقت نہیں کرے گا۔''

''ہاں تو کب کی ہے میں نے ایسی حماقت؟'' ہمایوں زچ ہوا۔

''ابھی تو دادی سے کہہ رہا تھا، مجھے بے وقوف نہ بنا۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ ان ہی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے جنہیں سوچا جاتا ہے۔''

''اف توبہ امی! میں کیسے سمجھاؤں آپ کو یہ لڑکیاں میرا معیار ہرگز نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے مان لیتی ہوں مگر آئندہ تمہیں ان سے بات بھی کرتے نہ دیکھوں۔''

ہمایوں مزید کچھ کہے بغیر اس تیزی سے کمرے سے نکلا کہ باہر کھڑے جہانگیر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''تم کیا یہاں کھڑے ٹوہ لے رہے تھے۔ بہت خوشی ہو رہی ہے، مجھے ماں سے ڈانٹ پڑی ہے۔'' وہ اس پر چلانے لگا۔ جہانگیر کو غصہ آیا تو اس کا دایاں گال پھڑکنے لگا جسے اس نے چھپانے کے لیے فوراً گال پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ جواب میں ہمایوں کو ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔

''بری بات ہے، تمہیں باہر کھڑے ہو کر یہ سب نہیں سننا چاہیے تھا۔'' امی اسے سمجھا رہی تھیں۔

''وہ۔۔۔ میں تو یہاں پیسے لینے آیا تھا۔'' اس نے آستین سے وہ پسینہ پونچھا جو اتنی ٹھنڈک میں بھی پھوٹ نکلا تھا۔

''ہونہہ بہانے بکواس!'' ہمایوں پیر پٹختا چلا گیا۔

''سبزی لانا تھی۔'' جہانگیر نے پھر ماں کے سامنے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ امی نے بے زاری کے عالم میں پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ پر رکھ دیا۔

اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن اور کسی نے محسوس کیا یا نہیں مگر جہانگیر نے دیکھا، دادی ہمایوں پر بہت مہربان ہونے لگی تھیں اب وہ اس کے کاٹ دار جملوں پر غصے میں بھی نہیں آتی تھیں الٹا انہیں اس کے کھانے پینے کی بھی فکر رہتی۔

ہمایوں کو محبتیں سمیٹنے کی عادت تھی اس لیے اس نے دادی کی اس بڑھتی محبت پر غور ہی نہیں کیا۔

اور جب چھٹی والے روز ابو گھر پر تھے، ہمایوں کسی میچ کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا تب پھپھو چلی آئیں۔ دادی کے کمرے میں ہی ڈیرہ ڈالا۔ کچھ دیر بعد ابو کو بھی وہیں بلوا لیا، جب جہانگیر امی کے کہنے پر چائے لے کر کمرے میں گیا اس وقت وہ ابو سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ اس گھر کے سربراہ ہیں بھائی جان! جو فیصلہ کرنا ہے آپ کو کرنا ہے۔ بھابی جان سے مشورے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟''

''تم بھول رہی ہو رقیہ! وہ میری بیوی اور بچوں کی ماں ہے۔ جس طرح تمہاری اپنے گھر میں ایک حیثیت ہے۔ تم شوہر کو ساتھ لائے بغیر ایک فیصلہ کر سکتی ہو تو پھر اسے کیوں نظر انداز کرتی ہو؟''

بہت سال تک بہنوں پر بے دریغ محبت لٹانے والے ابو اب اکثر اس بات پر بیوی بچوں کے سامنے شرمندہ رہا کرتے تھے کہ کبھی انہوں نے ان بچوں اور بیوی کو نظر انداز کیا تھا اور آج وہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔ پھپھو چونکیں مگر خاموش رہیں۔ پھر انہوں نے جہانگیر سے کہا۔

''اپنی امی کو بلاؤ۔''

وہ چائے رکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نکل آیا۔ امی میتھی اور پالک کا ڈھیر لیے بیٹھی تھیں، پیغام ملا تو بولیں۔

''تم بیٹھ کر یہ سبزی بناؤ۔ میں ان کی بات سن کر آتی ہوں۔'' اور جہانگیر نے ان کی جگہ سنبھال لی۔ حنا بھی کتاب لے کر اس سے کچھ فاصلے پر سیڑھیوں پہ آبیٹھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جب امی واپس آئیں تو سخت غصے میں تھیں۔ حنا اور جہانگیر دونوں ان کے انداز پر ٹھٹھک گئے۔

''ساری عمر یہ لوگ میرے سینے پر مونگ دلتے رہے ہیں، میری خوشی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ اسی لیے ایک مستقل دردِ سر پیدا کرنا چاہتے ہیں اس گھر میں۔'' امی نے چھری اس کے ہاتھ سے لے کر فرش پر پٹخ دی۔

''کیا کہہ رہی ہیں پھپھو بیگم؟'' حنا نے منہ بنا کر دادی کے کمرے کی طرف دیکھا۔

''ہمایوں کو مانگ رہی ہیں فرح کے لیے۔ تمہیں کیا بتاؤں حنا! میرا تو جی چاہا خون کر دوں اس عورت کا جس عورت کی میں شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔ اس کی لڑکی کو تو میں چند دن اس گھر میں نہیں دیکھ

سکتی اور وہ مستقل اسے یہاں بسانے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ میرے چاند سے بیٹے، میرے جگر کے ٹکڑے کے ساتھ اس کا بندھن باندھنا چاہتی ہے۔ میں تو خون کر ڈالوں گی اس سانپ کی بچی کا۔''

''پھر آپ نے کیا کہا امی؟'' حنا نے پریشان ہو کر بے صبری سے پوچھا۔

''کچھ دیر کے لیے تو میرے حواس ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی اپنی اس ٹھگنی کے لیے اتنے آرام سے وہ ہمایوں جیسے شہزادے کا نام لے گی۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا، میں نے کہہ دیا۔ ہمایوں سے بڑا جہانگیر ہے۔ میں پہلے اس کا بیاہ کروں گی۔ اگر فرح جہانگیر کے لیے دیتی ہو تو ٹھیک ہے۔''

''پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟'' حنا مسکرانے لگی۔ ''جو کیفیت کچھ دیر پہلے میری تھی۔ یہ سن کر وہی رقیہ کی تھی اور تمہارے ابو بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔''

''آپ نے تو کمال کر دیا امی! بس اب اس بات کو دہراتی رہیے گا، ہم بھی جہانگیر بھائی کا نام لے کر فرح کو چھیڑیں گے۔ دیکھ لیجیے گا بہت جلدی یہ ماں بیٹی اس گھر کا راستہ ہی بھول جائیں گی۔''

جہانگیر سر جھکائے ناکردہ گناہ کے احساس سے چورادھ موا سا بیٹھا تھا۔ امی ابھی تک پھپھو کو کوس رہی تھیں۔

''ہونہہ! کس قدر چالاک ہیں پھپھو! ہمارا ہیرو جیسا بھائی پھانسنا چاہتی ہیں۔ آپ نے بھی غبارے سے ہوا نکال دی امی! بہت اچھا کیا۔''

جہانگیر نے محسوس کیا اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے ہیں۔ پالک کے پتے چننے میں اسے دقّت کا سامنا ہے اور اسے تو ان سب کے سامنے بیٹھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

پھر اس نے محسوس کیا اسے میتھی اور پالک صاف دکھائی نہیں دے رہے، اس کی آنکھوں میں پانی جو جمع ہو رہا تھا اگر کسی نے دیکھ لیا تو، تو پھر سب کہیں گے جہانگیر اتنا بڑا ہو کر روتا ہے مگر کسی نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔

اور ایسا کئی مرتبہ ہوا، وہ تو یونہی دیکھ لیے جانے کے خیال سے خوف زدہ تھا۔ کسی نے بھی تو اس کی جانب نہیں دیکھا اس نے کتنی کامیابی سے ہر مرتبہ خود ہی آنسو سمیٹ لیے۔

اور جب امی نے فون پر خالہ کو پھپھو کی چالاکی اور اپنی ذہانت سے اس وار کو خالی کرنے کا قصہ سنایا تب بھی وہ قریب ہی بیٹھا دھوبی کے لائے ہوئے کپڑے گن رہا تھا۔ جب پڑوس سے آئی نجمہ بھابھی کو یہ واقعہ تفصیلاً امی اور حنا نے سنایا تب وہ ٹی وی کا پلگ تبدیل کر رہا تھا۔

''تمہاری نند کی تو رنگت ہی اڑ گئی ہو گی آپا! بہت ہی اچھا کیا تم نے۔ ایسے لوگوں کو اسی طرح کے جواب ملنے چاہئیں۔'' نجمہ بھابھی، امی کو شاباش دے رہی تھیں۔

''اپنے ہمایوں بھائی کے لیے تو ہم چاند سی دلہن لے کر آئیں گے۔'' حنا نے ہمایوں کا نام بڑے فخر سے لیا۔

''تو اور کیا میرا بچہ شہزادہ ہے شہزادہ، تم ہی کہو نجمہ! پورے محلے میں ہے کوئی میرے ہمایوں جیسا گبھرو جوان۔''

''آج کل کر کیا رہا ہے؟'' نجمہ نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

''پڑھائی کر رہا ہے اور کیا کرنا ہے۔'' امی اس بات کا تفصیلی جواب نہیں دے سکیں۔

''امی! ہمایوں بھائی کی شادی ہم بہت امیر گھرانے میں کریں گے۔'' حنا نے دوسری خواہش کا اظہار کیا۔

''ہاں کیوں نہیں اور کسی ایسے ویسے گھرانے کو وہ نازک مزاج گھاس بھی کہاں ڈالے گا۔'' امی ہنس پڑی تھیں۔

''ہے کوئی فیملی نظر میں؟'' نجمہ بھابھی نے کریدا۔

''اے نہیں بھئی، ابھی سے کہاں جب وقت آئے گا تو گھر اور لڑکی بھی دیکھ لیں گے۔''

''اچھا میں تو اس لیے کہہ رہی تھی، ایک دو بہت اچھے گھرانے ہیں میری نظر میں۔ اگر آپ لوگوں کا ارادہ ہوتا تو بات چلا سکتی تھی۔''

'ہم نے اپنے بھائی کی شادی یونہی تھوڑی کر دینی ہے۔ بہت سے گھروں کو دیکھیں گے، بھالیں گے تب کہیں جا کر یہ فیصلہ ہو گا۔''

''اچھا آپا! میں چلتی ہوں۔ بچے اسکول سے آنے والے ہیں جا کر روٹی ڈال لوں۔'' نجمہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تو یہ، میرے بھائی پر تو ہر کسی کی نظر ہے۔ اب یہ نجمہ بھابھی۔۔۔ یقیناً پہلے سے بھائی پر نظر ہے، اب موقع ملا تو جھٹ کہہ گئیں۔'' حنا نے تیوری چڑھائی۔

''ہاں ٹھیک کہتی ہو تم۔ یقیناً اپنی کسی بھانجی، بھتیجی کے لیے چاہ رہی ہو گی مگر میں نے سوچ لیا ہے، نا تو رشتے داروں میں سے لاؤں گی اور نہ ہی ان محلے والوں میں سے۔ اے جہانگیر! یاد آیا، ہمایوں کی الماری میں اس کی دو شرٹیں رکھی ہیں۔ ایک تو نیلے رنگ کی ہے۔ دوسری ہلکے سے سبز رنگ کی ہے۔ کہہ رہا تھا اب دل بھر گیا ہے نہیں پہننی، وہ تم لے لو۔''

اس نے ہاں یا نا میں کچھ نہیں کہا۔ انہیں اس کے جواب کا انتظار بھی نہیں تھا۔ جانتی تھیں وہ انکار تو کر ہی نہیں سکتا۔

❁ ❁ ❁

بہت دنوں کے بعد دھوپ نکلی تھی اور آج ویک اینڈ بھی تھا۔ ہمایوں کے سوا سب ہی بچے گھر پر تھے اور صحن میں رونق سی لگی ہوئی تھی۔ ابا اخبار دیکھ رہے تھے ان کی کرسی کے قریب ہی امی اور جہانگیر بیٹھے گاجریں کش کر رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں مٹر کے دانے نکالنے میں مصروف تھیں۔ چھوٹا ہوم ورک لے کر بیٹھا تھا اور دادی منہ پر دوپٹا ڈالے بستر پر لیٹی سرما کی نرم گرم دھوپ کا مزا لے رہی تھیں۔

''جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ جہانگیر! میں چاہ رہی ہوں آدھ گھنٹے تک یہ گاجریں چولہے پر چڑھا دوں۔ ہمایوں گاجر کے حلوے کی فرمائش کر کے گیا ہے۔''

''اللہ کرے ہمایوں بھائی میچ جیت کر آئیں۔'' شمع نے کہا تو حنا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی

''نا صرف جیت کر آئیں بلکہ مین آف دی میچ بھی وہی بنیں۔''

''یہ ہمایوں کی توجہ کھیلوں کی جانب کچھ زیادہ ہی نہیں ہوگئی۔'' ابا کے کہنے پر جہانگیر کے اندر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا مگر اس سے پہلے امی بول پڑیں۔

''یہی تو عمر ہے، پھر ذمہ داریاں ہی اٹھانا ہے۔''

''یہ عمر کھیل کود کی نہیں ہے بیگم! محنت کرنے کی ہے، آج پڑھائی کو سنجیدگی سے لے گا تو کل کچھ بن پائے گا۔ بہت پریشان رہنے لگا ہوں میں۔ عمر ابھی بہت چھوٹا ہے، یہ بڑا تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ ساری امیدیں ہمایوں سے ہی وابستہ ہیں۔''

''دھیان سے جہانگیر! لو کٹوا بیٹھے اپنا ہاتھ، اب کون میرے ساتھ گاجریں کش کرے گا۔ چلو، جا کر ہاتھ پر پانی ڈالو۔ اتنا خون بہہ رہا ہے اور میری الماری سے دوا بھی لگا لینا۔ ابھی ڈھیر باقی ہے۔ جتنی مجھے جلدی تھی۔ اتنی ہی دیر ہوگئی۔ پتا نہیں یہ جہانگیر بھی کہاں گم رہتا ہے؟ کوئی کام ایسا نہیں جو یہ ڈھنگ سے کر سکے۔''

''جانتی تو ہو معذور ہے پھر اس سے عام انسانوں والی امید کیوں رکھتی ہو۔'' ابا نے سمجھایا تو امی سر جھٹک کر گاجریں چھیلنے لگیں۔

جہانگیر دوا لگا کر کمرے سے باہر نکلا۔ اسی وقت کال بیل بجنے لگی۔ کسی کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ کھولنا، بند کرنا اسی کا کام تھا۔

دروازے پر جو عورت کھڑی تھی وہ اس کی صورت اور نام سے بہ خوبی واقف تھا مگر کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ یہ عام سی شکل وصورت والی خاتون جو سر پر شٹل کاک برقعہ اعزازی نشان کی طرح جمائے سارے محلے میں ہر گھر میں بلا تکلف گھوما کرتی تھی۔ خالہ صغریٰ کہلاتی تھی۔

''یہ ہاتھ پر کیا ہوا پتر؟'' وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

''چوٹ لگ گئی ہے۔''

''ہاں ہاں، وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں پر ہوا کیا؟''

''گاجریں کش کر رہا تھا۔ ہاتھ پر زخم آ گیا۔''

''آئے ہائے پتر! دھیان سے کرنا تھا نا خون تو ابھی بھی بہہ رہا ہے۔''

''نہیں بس، دوا تو لگا لی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ لاپروائی سے کہہ رہا تھا گر اس کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

''اپنا خیال رکھا کر۔'' خالہ صغریٰ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور امی کی طرف چل پڑی۔

ابا اخبار تہہ کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ خالہ صغریٰ نے سلام کیا تو امی نے پرجوش انداز میں جواب دیا۔ دادی نے دوپٹا چہرے سے ہٹا کر اسے دیکھا اور پھر دوبارہ اسی انداز میں لیٹ گئیں۔

''جہانگیر! آپا صغریٰ کے لیے چائے بنا لاؤ۔''

''رہنے دو، دیکھو تو ہاتھ پر کیسی چوٹ آئی ہے۔'' صغریٰ نے منع کیا۔

''میں تو بھول ہی گئی کہ جہانگیر ہاتھ کٹوا بیٹھا ہے۔'' پھر دونوں نے حنا کو اشارہ کیا۔

''صرف ہاتھ ہی نہیں تم تو بیٹا بھی بھول بیٹھی ہو۔''

''اللہ معافی، یہ بھلا کرنے کی بات ہے۔ کوئی ماں اپنی اولاد کو نظر انداز کر سکتی ہے۔ تم بتاؤ میرے کام کا کیا بنا؟''

''ہاں تمہارے لیے کوئی خبر ہے جب ہی تو ادھر آئی ہوں ورنہ تمہیں پتا ہے خواہ مخواہ میں گھر گھر چکر نہیں لگایا کرتی۔ اتنی ساری گاجریں لے کر بیٹھی ہو۔ حلوہ بناؤ گی کیا؟ اگر حلوہ بنایا تو میرے لیے ضرور رکھنا کل ان لوگوں کو لے کر آ رہی ہوں تب کھا لوں گی۔''

''کون لوگ ہیں پہلے کچھ تفصیل تو بتاؤ؟''

''ہاں ہاں بتا رہی ہوں، پہلے چائے تو پی لوں۔ بچے کو دوکان پر بھیج کر دو چار سموسے ہی منگوا لو صبح کی بھوکی پیاسی صرف تمہارے کام کے لیے گھر سے نکلی ہوں۔''

''صغریٰ! کام ہو نہ ہو۔ تم ہر گھر سے اسی طرح پیسے خوب وصول لیتی ہو۔''

''اب اپنے منہ سے بدفال تو نہ نکالو، میں تو پورے یقین سے آئی ہوں کہ رشتہ ضرور ہو جائے گا۔''

''ہاں اللہ کرے ایسا ہی ہو، میں تو چاہتی ہوں دونوں لڑکیاں جلد ہی اپنے گھر کی ہو جائیں۔''

''سارے ماں باپ یہی چاہتے ہیں بی بی!'' صغریٰ نے جیسے مکھی اڑائی اور ایک لال رسیلی سی گاجر اٹھا کر کھانے لگی۔

''خاندان میں کتنے ہی رشتے ہیں مگر ہماری بہو بیگم کے دماغ ہی بڑے اونچے ہیں۔'' دادی نے دوپٹا منہ سے ہٹائے بغیر اطلاع دی۔

''مجھے اپنی بیٹیاں اتنی بھاری نہیں کہ جانتے بوجھتے انہیں جہنم میں دھکیل دوں۔ جن لوگوں نے اتنے برس مجھے جلتے توے پر کھڑا رکھا ہے، اب اپنی پھول سی بچیاں کیسے ان کے حوالے کر دوں کہ لو اب باقی کی کسر ان کے ساتھ پوری کر لو۔''

''بھلی مانس ساس ملی ہے نا۔ اسی لیے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی ہو۔ میری جگہ ہوتی نا کوئی تمہاری اماں یا خالاؤں جیسی ساس تو ایسی بات کہنے کی جرأت نہ ہوتی تمہیں۔ کبھی کبھار جو میرا کوئی بچہ میری محبت میں ادھر چلا آتا ہے وہ بھی اس کی برداشت سے باہر ہے، میں پوچھتی ہوں کمائی میرے بیٹے کی، تو کون ہوتی ہے روکنے والی۔''

امی اور دادی میں گرما گرمی کا جو آغاز ہوا، صغریٰ نے کانوں میں جیسے تیل ڈالا اور چائے بسکٹ سے لطف اندوز ہونے لگی۔ وہ چائے کا کپ، بسکٹوں کی پلیٹ صاف کر چکی مگر امی اور دادی کی بحث بدستور جاری تھی۔ فارغ ہو کہ اس نے امی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کل پانچ بجے انہیں لے کر آؤں گی۔'' اور سر پر رکھا برقعہ دوبارہ سے جما کر باہر نکل گئی۔

''کل پھر بار بار بازار کے چکر لگیں گے اور گھر کے کاموں میں بھی امی کا ہاتھ بٹانا ہوگا۔'' یہ سوچ کر ہی اسے تھکن محسوس ہونے لگی پھر وہ سب کے درمیان بیٹھنے کے بجائے ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھتا چھت پر آ گیا۔

زندگی جیسے بھی تھی رواں تو تھی، حالات بہت اچھے نہیں تو بہت برے بھی نہیں تھے۔ ہمایوں اور حنا ے وا باقی سب گھر آنے والی آمدن سے مطمئن ہی تھے مگر اچانک ابا کے ایکسیڈنٹ نے سب کچھ ہلا کر رکھ دیا۔ ابا کو بہت چوٹیں آئی تھیں۔ دائیں بازو میں فریکچر ہو گیا تھا مگر سر کی چوٹ سب سے زیادہ پریشان کن تھی۔

ہاسپٹل میں قریبی رشتہ دار تو موجود تھے ہی ہمایوں کے بہت سے دوست بھی اس کے ابا کو پیش آنے والے حادثے کی اطلاع پا کر آ گئے تھے۔ جب ڈاکٹروں نے خون کے لیے کہا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوا۔ ہمایوں اور اس کے ایک دوست کا خون ابا کے خون سے میچ کر گیا اور علاج کے لیے رقم جس کے لیے سب بھائی بہن پریشان تھے، امی نے یہ کہہ کر لا تھمائی کہ "یہ ان ہی کی محنت کی کمائی تھی جسے میں جمع کرتی رہی، اگر ان کی زندگی بچانے کے کام آ جائے اس سے بڑھ کر ہمارے لیے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔"

جب ابا کو ہوش آیا تو اس وقت جہانگیر رات بھر یہاں ٹھہرنے کے بعد ناشتا اور کپڑے تبدیل کرنے گھر گیا تھا۔ ہوش آنے پر انہوں نے ہمایوں اور امی کو اپنے قریب پایا۔

ابا کو ابھی بہت دن ہسپتال میں رہنا تھا۔ امی بھی ان کے پاس ہی رہتیں کہ گھر پر ہوتیں تو دھیان ابا کی طرف ہی رہتا تھا۔ گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ تایا ابو اور پھپھو کی فیملی اب ادھر ہی آ گئی تھی۔

حنا نے پریشان ہو کر ہمایوں کو فون کیا۔

وہ اسپتال میں تھا جبکہ جہانگیر اسی وقت گھر آیا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ہمایوں بھی پہنچ گیا۔ لڑکیاں اور لڑکے ٹولیاں بنائے خوش گپیوں میں مصروف اور ان کے والدین ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے خاندانی سیاستوں پر تبصرے میں غرق۔

"آخر یہ سب یہاں کیوں آئے ہیں؟ ابا تو اسپتال میں ہیں اور کافی دن وہیں رہیں گے؟" ہمایوں نے جھنجلاتے ہوئے حنا سے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا، بس گھر خالی دیکھا سوچا ہو گا سب مل کر بیٹھیں، گپ شپ لڑائیں۔" حنا جل کر بولی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے خاطر مدارت کی، جہانگیر میں گھر پر ہوں دیکھ لوں گا ان سب کو، ایسا کرو تم اسپتال چلے جاؤ۔"

وہ رات بھر ابا کے پاس رہ کر کچھ دیر پہلے ہی گھر آیا تھا مگر ہمایوں کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی کہ گھر پر رک کر جو کام ہمایوں کر سکتا تھا۔ وہ اس کے بس کا تو بالکل نہیں تھا۔

"ابا چائے مانگ رہے ہیں۔" تایا کی صاحب زادی نے آ کر حنا سے کہا۔

"تمہیں پتا ہے ابو بیمار ہیں ہمارے، بہت پریشان ہیں ہم ان کے لیے۔ ہم سے کام کہنے کے بجائے تم لوگ خود کچن سنبھالو۔"

ہمایوں نے سنجیدگی اور قدرے بے گانگی سے کہا۔

عمرانہ کو برا تو لگا مگر خاموشی سے چولہے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"اب یہ تو بتا دو، چینی، پتی، دودھ ہے کہاں؟"

"لو ہمیں اتنا ہوش ہی کہاں ہے کہ کچھ منگوا کر رکھیں، سب ختم ہے۔" ہمایوں پھر بولا۔

"تو میں چائے کیسے بناؤں؟" وہ چڑ گئی۔

"قریب ہی تو بازار ہے۔ کسی کو بھیج کر منگوا لو۔"

"جہانگیر بھائی! ذرا جانا۔ یہ سودا تو لے آنا مگر ذرا جلدی کرنا تمہیں تو پتا ہے ابا کو ذرا سی دیر میں غصہ آ جاتا ہے۔"

"جہانگیر اسپتال جا رہا ہے۔ باہر جو اتنے سارے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہیں کسی سے بھی کہہ دو۔"

عمرانہ واپس چلی گئی تو ہمایوں، حنا اور جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"جلدی سے سارا سامان الماری میں رکھو اور تالا لگا دو۔ جس نے جو کھانا پینا ہے اپنے پلے سے کھائے۔ ہمارے پہلے کم خرچے ہو رہے ہیں جو یہ چلے آئے اور ہاں فریج میں جو گوشت رکھا ہے، اسے کوئی ہاتھ نہ لگانے پائے، کہہ دینا وہ ابا کے سوپ کے لیے ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ کسی نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ ابا کے علاج کے لیے رقم کہاں سے آ رہی ہے۔ اگر ضرورت ہے تو ہم مدد کریں۔ بس محفل جمانے آ پہنچے۔" حنا بڑی سرعت سے ساری اشیاء کے جار الماری میں منتقل کر رہی تھی۔

فارغ ہو کر وہ تینوں کمرے میں آئے اور بزرگوں کو سلام کیا، وہ سب ابا کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگے۔

"اب تو بہت بہتر ہیں۔"

"شکر ہے اللہ کا، میں تو بھائی جان کی طرف سے بہت پریشان تھی۔ تم بھائیوں میں سے جو بھی جائے۔ مجھے ضرور ساتھ لے لینا۔"

"اب کچھ دیر میں جہانگیر جائے گا۔ آپ اس کے ساتھ چلی جایئے گا۔"

"ہاں دوپہر کا کھانا کھا لوں پھر نکلیں گے، کیا بنایا ہے حنا؟" وہ پوچھنے لگیں۔

"کمال کرتی ہیں پھپھو! ہمیں بھلا کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں ہے؟" ہمایوں منہ بناتے ہوئے بولا۔

"اے بچے! یہ سب تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کھانے پینے سے تو منہ نہیں موڑا جاتا۔ ہمت سے کام لو حنا بٹی! خود کو سنبھالو۔"

"ایسا کرو رقیہ! عذرا کو بھی ساتھ لگا لو۔ اور خود ہی پکا لو۔"

بڑے تایا نے مشورہ دیا۔

وہ دونوں کچن کی طرف بڑھ گئیں مگر فوراً ہی واپسی بھی عمل میں آ گئی۔

"بیٹا! کچن میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا پکائیں؟"

"بتایا تو ہے ہمیں ہوش ہی کہاں ہے۔ اس مہینے سودا ڈلوایا ہی نہیں۔" حنا کرسی پر بیٹھتے ہوئے

بولی۔ وہ مطمئن تھی انہیں ڈھونڈنے سے بھی کچھ نہیں مل سکتا۔ وہ گوشت بھی پڑوسیوں کے فریج میں رکھوا چکی تھی۔

''پھر ہم لوگ کھانا کیسے کھائیں؟'' وہ سوالیہ انداز میں ہمایوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

''ہمیں تو بے چارے پڑوسی ہی کچھ نہ کچھ بنا کر بھیج دیتے ہیں۔''

جس وقت ہمایوں یہ سب کہہ رہا تھا۔ دادی اسے کڑی نظروں سے گھور رہی تھیں مگر خاموش رہنے میں ہی مصلحت تھی۔ تب تک جب تک بیٹا گھر نہ آ جاتا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ ہمایوں اور حنا کی شکایت ضرور لگائیں گی۔

۞ ۞ ۞

ابا پورے دس روز کے بعد گھر واپس آئے مگر وہ اس قابل نہیں تھے کہ ان سے کوئی شکایت کی جاسکتی۔ سر کی چوٹ نے انہیں کافی عرصے کے لیے مکمل صحت مند انسانوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔

''اب اس گھر کا کیا ہوگا؟''

امی کو ایک ہی سوال پریشان کر رہا تھا۔

ابا کی صحت نے جواب دیا تو رشتہ دار بے آہستہ آہستہ ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔ امی، ابا کے علاج کے سلسلے میں تمام جمع پونجی خرچ کر چکی تھیں اب تو سامنے یہی سوال تھا کہ اتنے خرچے کہاں سے پورے ہوں گے؟ کیسے وہ سب جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھ سکیں گے۔ ان ہی دنوں خالہ صغریٰ پھر کوئی رشتہ لے کر چلی آئی۔

''میرے پلّے کچھ نہیں ہے اب تو میں بیٹی بیاہنے کا صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہوں۔''

''اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو، دو جوان بیٹوں کی ماں ہو، ان سے کہو، مشکل گھڑی ہے۔ گھر کا بوجھ اٹھائیں۔''

''کیسے اٹھائیں، بڑا تو اپنی ہی زندگی کی گاڑی گھسیٹ گھسیٹ کر چلانے والوں میں سے ہے اور ہمایوں، ہائے بے چارے کی عمر ہی کیا ہے، میں نے تو ہمیشہ اس کے لیے ایک ہی خواب دیکھا ہے کہ وہ بڑا افسر بنے گا اور عیش و آرام میں زندگی بسر کرے گا میں کس طرح اپنے لعل کو ہمیشہ کے لیے اچھی زندگی سے محروم کر دوں۔ تم نہیں جانتیں آپا! تعلیم کتنی ضروری ہے۔''

''اے لو میں نہیں جانتی؟'' آپا صغریٰ نے ٹھٹھا لگایا پھر بولی۔

''جب فیس کے لیے پیسے ہی نہیں ہوں گے تو کہاں سے اعلا تعلیم حاصل ہوگی۔''

یہ سننا تھا کہ امی پھپھک کر رونے لگیں۔ آپا صغریٰ نے دیکھا کچھ ہی فاصلے پہ کھڑا جہانگیر ماں کو اس طرح روتے دیکھ کر بہت بے چین ہو رہا تھا اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

''اگر تم کہو تو میں تمہارے لیے نوکری کا بندوبست کروں؟''

''کہاں بندوبست کرو گی۔ اس کی بھی تو تعلیم ادھوری ہے۔'' امی آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

''پتا ہے مجھے اور میں کون سا کہیں لاٹ صاحب لگوانے کی بات کر رہی ہوں۔ تمہیں پتا تو ہے

کتنے ہی گھروں میں آنا جانا ہے میرا۔ ایسے ہی ایک مرزا صاحب بھی ہیں کبھی بڑے افسر رہے ہیں۔ اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔ حساب کتاب کے لیے کسی ایماندار لڑکے کی ضرورت ہے انہیں، اب جو تمہاری مشکل دیکھی تو مجھے خیال آ گیا۔''

''خالہ! آپ میرے لیے بات کر لینا میں تیار ہوں۔'' امی کے کچھ کہنے سے پہلے جہانگیر نے کہا اور امی نے سکون کی سانس لی۔

خالہ صغریٰ اگلے دن آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ امی ہانڈی چولہے کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ شاید امی کچھ کہیں، اسے بتائیں کہ ہمایوں کی طرح انہوں نے اس کے لیے بھی کچھ خواب دیکھ رکھے تھے۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ جانے پر بھی انہیں بہت دکھ ہوگا مگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔

اور جب پورے ایک ماہ کے بعد اس نے اپنی محنت کی پہلی کمائی کانپتے ہاتھوں سے امی کے ہاتھ پر لا کر رکھی تھی تب اس کمرے میں امی ابا اور سب بہن بھائی موجود تھے۔ آج امی نے اسے دعا دی تھی۔ ابا نے اس پر فخر محسوس کیا تھا اور سب بہن بھائی مسکرائے تھے۔ اتنے برسوں میں پہلی بار وہ اہم ہو گیا تھا اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج جبکہ سب کی اپنائیت بھری نظریں اس پر ہیں تو اسے کیا کرنا چاہیے۔

''جب میں کمانے لگوں گا تو تم لوگوں کے سارے خواب پورے کر دوں گا۔ اس گھر کا نقشہ ہی بدل ڈالوں گا۔'' ہمایوں کو شاید یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔

''ہاں بیٹا! اللہ تمہارا یہ خواب پورا کرے۔ مگر اس وقت تو ہمارے لیے یہی چند ہزار کسی خزانے سے کم نہیں۔'' ابا نے یہ کہہ کر اس کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بہت محنت کرے گا اور جو اپنائیت آج اس کے حصے میں آئی ہے اسے کبھی گم ہونے نہیں دے گا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ ہمایوں کیا سوچ رہا ہے۔

صرف تین روز کے بعد جب سب لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے ہمایوں نے گھر آ کر بتایا تھا کہ اس نے جاب کر لی ہے۔

''مگر بیٹا! یوں اچانک۔ تمہارے تو کچھ خواب تھے؟''

''بس امی! گھر کے حالات دیکھتے ہوئے مجھے یہ سب کرنا پڑا۔ تعلیم ادھوری چھوڑنے کا مجھے بہت دکھ ہے۔'' حالانکہ وہ کبھی بھی اچھا اسٹوڈنٹ نہیں رہا تھا۔ اسے پڑھنے سے زیادہ کھیلوں میں دلچسپی تھی۔ وہ کالج میں ایک اچھے کھلاڑی کی حیثیت سے مشہور تھا اور اسی بنیاد پر اسے پڑھائی میں خاصی رعایت مل جاتی تھی۔ وہ بغیر فیل ہوئے اسکول سے کالج تک آ گیا تھا۔

''میرا لعل!'' امی ہمایوں کو سینے سے لگائے رونے لگیں۔

''میری جاب کافی اچھی ہے، میں اپنے دوست احسن کے ماموں کے شوروم میں کام کر رہا ہوں۔''

وہ تفصیل بتانے لگا۔ سب خاموشی سے سنتے رہے اور بڑی عقیدت سے ہمایوں کو دیکھنے لگے کہ ان کا ہیرو جیسا بھائی اور بیٹے نے صرف ان لوگوں کی خاطر اپنے خواب مٹی کر ڈالے تھے۔

۞ ۞ ۞

دونوں بیٹے کمانے لگے تو گھر کے حالات بھی سدھرنے لگے۔امی نے خالہ صغریٰ سے ایک بار پھر حنا کے رشتے کے لیے کہا۔

وہ آئی تو شام ہورہی تھی۔ یہ آتی گرمیوں کے دن تھے۔ جہانگیر ابھی ابھی آفس سے لوٹا تھا اور اس نے بڑی اپنائیت سے خالہ صغریٰ کو سلام کیا تھا۔کمزور سا نوالا سا عام سے نقوش والا تھوڑا لنگڑا کر چلنے والا لڑکا جس کے کپڑے صاف ستھرے مگر بدرنگ تھے اور اس کے جوتے بھی پتا نہیں کب خریدے گئے تھے۔ پھر دو منٹ نہیں گزرے تھے کہ ہمایوں بھی چلا آیا۔قیمتی لباس اور اس سے بڑھ کر شخصیت۔

''کیا سوچ رہی ہو صغریٰ؟'' امی نے ٹھوکا دیا۔

''وہ میں سوچ رہی تھی، تم جہانگیر کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں۔''

''کیا۔۔۔ جہانگیر کی شادی؟'' امی کو ہنسی آگئی۔ ''تم بھی کمال کرتی ہو صغریٰ؟''

''نا اس میں مذاق کی بھلا کیا بات ہے۔ اچھا بچہ ہے۔ سیدھا اور بھلا مانس۔ اسے کوئی ایسی ہی لڑکی ملنی چاہیے۔''

''اچھا تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے، کرلو کوشش اور حنا کے لیے اس روز جو عورتیں آئی تھیں، راضی ہیں؟''

''ہاں ہاں، بالکل راضی ہیں۔ دیکھو نا، لڑکے کی ماں تو ہے نہیں۔ دونوں بہنیں جو حنا کو دیکھنے آئی تھیں، بیاہی ہوئی ہیں، اپنے اپنے گھربار والی۔ انہیں کوئی حور پری نہیں چاہیے۔لڑکی شریف اور سمجھ دار ہو جوان کے بھائی کا گھر بسا سکے۔''

''چلو پھر ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے۔ میں اس کے ابا سے بات کرتی ہوں، تم تیار رہنا، کسی روز چلیں گے ان کے گھر۔'' امی خوش ہو گئیں۔

صغریٰ جانے سے پہلے کچن میں آ گئی۔ جہاں جہانگیر کھڑا چائے بنا رہا تھا۔ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ وہ پرانی سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ اسے دیکھا تو مسکرا دیا اور بولا۔

''چائے پیو گی خالہ؟''

''نہیں پتر! چلتی ہوں، میں تو تجھے یہ بتانے آئی تھی کہ میں تیرے لیے لڑکی ڈھونڈنے لگی ہوں۔ بہت جلد سہرا سج جائے گا تیرے سر پر۔'' اور وہ کسی لڑکی کی طرح شرما گیا۔

''جوڑا لوں گی اور ہزار روپیہ بھی۔''

''مگر خالہ! مجھ سے بھلا کون شادی کرے گا۔'' بہت جلد وہ خوابوں کی وادی سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔

''لے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھلا کیا کمی ہے تجھ میں۔ شریف ہو، نیک اور باکردار ہو پھر اپنا کماتے ہو۔ شریف لوگوں کو اپنی بیٹیوں کے لیے یہی سب تو دیکھنا ہوتا ہے۔ تم دیکھنا تھوڑے ہی دنوں میں کتنے رشتے آ جائیں گے تمہارے لیے پھر میرے پتر کو اپنے لیے نہ خود چائے بنانی پڑے گی، نہ اپنے کپڑے دھونے پڑیں گے۔'' خالہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلی گئی۔

وہ دونوں کپوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ ایک کپ اس کا تھا، دوسرا ہمایوں کے لیے، جو ابھی ابھی آفس سے لوٹا تھا۔

پھر امی نے یہ کیا کہ گھر بھر میں خالہ صغریٰ کی کہی بات پھیلا دی۔ اب اس کے اپنے ہی بہن بھائی اس پر ہنس رہے تھے۔ شاید ان کے انداز میں طنز نہ ہو، وہ تو بس مذاق میں حیرت کا اظہار کرتے اور ہنستے تھے مگر جہانگیر کے لیے یہ برداشت کرنا آسان تو نہیں تھا۔

''کاش میں کہیں چھپ سکتا۔ اس گھر میں رہتے ہوئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا۔'' وہ ان میں سے کسی کے سامنے آنے سے گھبرانے لگا۔ اسے دیکھتے ہی انہیں خالہ صغریٰ کی کہی بات یاد آنے لگتی تھی۔ ابھی تو اس حوالے سے خواب بھی نہیں دیکھے تھے کہ انہوں نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ خواب دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہے اور یقیناً انہوں نے سچ ہی کہا تھا۔ گھر گھر پھرنے والی سالوں کا تجربہ رکھنے والی صغریٰ پتا نہیں کیوں دھوکا کھا گئی یا پھر اسے بھی جہانگیر کی بے بسی کا مذاق اڑانا ہی مقصود تھا۔

❁ ❁ ❁

خالہ صغریٰ نے جہاں جہاں بھی اس کے رشتے کی بات کی، جواب میں لوگوں کی ناراضی برداشت کی۔ ہاں کچھ ایسے ضرور تھے جو اسے دیکھنے گھر تک چلے آئے تھے اور اسے دیکھنے کے بعد خالہ صغریٰ کی طبیعت صاف کی تھی۔

''دنیا میں شرافت کی قدر ہی نہیں رہی، کیبل نے ہر لڑکی کا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' وہ امی کے پاس آکر بڑے دکھ سے کہتی اور جہانگیر جو ہر بار اس کی آمد پر پُر امید ہو جاتا، سر کو جھکا لیتا۔

''بڑی باتیں سنائیں جی انہوں نے مجھے۔''

اور جہانگیر کو شرمندگی سے پسینہ آ جاتا پھر جو اس پر نظر پڑتی تو خالہ صغریٰ مزید کہتے کہتے رک جاتی۔

''چھوڑیں جی، وہ لڑکی بھی کوئی لڑکی ہے۔ اپنے جہانگیر کے لیے تو میں ایسی لڑکی لاؤں گی جو اس کی زندگی کو بدل ڈالے گی۔ اس کی ساری تھکن اپنے نام کر لے گی بس تم دیکھتی جاؤ۔'' وہ خالہ صغریٰ سے کہنا چاہتا تھا۔ ''بس کرو، خدا کے لیے مجھے گھر گھر تماشا نہ بناؤ۔'' مگر اسے خالہ صغریٰ کے اخلاص پر شک نہیں تھا۔ وہ عورت جو گھر گھر رشتہ کروانے کے لیے جھوٹ سچ ملاتی تھی، پیسے پیسے کے لیے بحث کرتی تھی مگر اس کے لیے کتنی ہمدردی رکھتی تھی۔ سچ ہے دلوں کے بھید ہم نہیں جان سکتے۔ اپنے تو اس کے دکھ اس کی تنہائی کو نہ سمجھ سکے مگر یہ راز صغریٰ نے پا لیا تھا۔

ہمایوں نے نئی بائیک لی تو سمجھو یوں لگا جیسے آج سے پہلے تو دنیا میں کسی نے ایسا کچھ خریدا ہی نہیں تھا اور وہ سوچتا رہا۔

''میری تنخواہ تو ہمایوں سے زیادہ ہے مگر میں نئی تو کیا سیکنڈ ہینڈ لینے کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ امی تو کہتی ہیں، ہمایوں جو کماتا ہے، سب کا سب میرے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے پھر یہ بائیک، یہ نئے نئے کپڑے، یہ ٹھاٹ باٹ کہاں سے؟'' مگر اسے جواب نہیں مل سکا۔

''بہت جلد میں گاڑی لے لوں گا۔''

''ہائے بھائی پھر تو مزا ہی آجائے گا۔ کب تک لو گے بھائی؟''

''پیچھے ہٹو، تھکا ہوا آیا ہے میرا بیٹا! آرام کرنے دو۔''

"ارے رہنے دیں امی! میں کوئی کام وام تھوڑا ہی کرتا ہوں، بس ٹھاٹ سے سارا دن کرسی پر بیٹھا قلم چلاتا رہتا ہوں۔ بس بندے کے پاس عقل اور اچھی پرسنالٹی ہونی چاہیے، سب کچھ مٹھی میں آتا چلا جاتا ہے۔"

ہمایوں اس کے قریب سے گزر کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"جہانگیر! تم ذرا میری بات سنو۔" امی نے بڑی سنجیدگی اور کچھ خفگی سے کہتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

وہ فوراً ان کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا۔

"جی امی!" وہ مؤدب کھڑا تھا۔

"تمہیں پتا ہے، ہمایوں نے اپنی محنت کی کمائی سے بائیک خریدی ہے؟"

"جی ہاں، میں بھی سب کے قریب کھڑا تھا۔"

"تم دونوں سگے بھائی ہو۔ ایک ہی گھر میں ایک ہی ماں باپ کے سائے میں پروان چڑھے ہو لیکن میں نے بہت مرتبہ یہ دیکھا ہے کہ تم ہمایوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔"

"ایسا نہیں ہے امی!" وہ صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے لیے اسے رک کر الفاظ جمع کرنے کی ضرورت تھی مگر امی اس کی صفائی سننے کے موڈ میں ہی نہیں تھیں۔

"تمہارے سامنے سارے بہن بھائی کتنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے مگر تم بالکل اجنبی، سارے ماحول سے لاتعلق بنے ایک طرف کھڑے تھے۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا تمہارے اس رویے سے ہمایوں کے دل پر کیا گزری ہوگی؟"

"امی! میں چائے بنا رہی ہوں، مٹھائی بھی منگوا لیں نا۔" حنا کمرے میں جھانکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"دیکھا، یہ ہوتے ہیں بہن بھائی، ایک دوسرے پر جان نثار کرنے والے۔ ایک دوسرے کی خوشی میں خوش۔"

"کیا ہوا امی؟" حنا پوچھنے لگی۔

"سمجھا رہی ہوں اسے، بہن بھائیوں کی خوشی میں خوش ہونا سیکھے۔"

"چھوڑیے امی! خوشی کا موقع ہے۔ آپ کیوں اپنا موڈ خراب کر رہی ہیں۔ میں چائے بنانے لگی ہوں۔ جلدی سے مٹھائی منگوا لیں۔" وہ اتنا کہہ کر واپس چلی گئی۔ اور امی نے اسی خفگی کے ساتھ پیسے اس کی جانب بڑھا دیے۔

❁ ❁ ❁

اور پھر ہمایوں کے ٹھاٹ باٹھ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یقیناً اب وہ اپنی تنخواہ کا زیادہ تر حصہ اپنی ذات پر خرچ کرنے لگا تھا مگر اس نے کسی کو بھی ہمایوں سے اس موضوع پر بات کرتے نہیں دیکھا۔

خالہ صغریٰ پھر آئی تھیں، ہمیشہ کی طرح پرجوش اور پرامید۔

"کیا بتاؤں کتنے اچھے لوگ ہیں۔ شریف، ملن سار، نیک اور سادہ۔"

"اچھا اچھا، آؤ بیٹھو تو۔" امی نے اپنے برابر والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے، وہ آفس سے آنے کے بعد بیٹھا کھانا کھا رہا تھا دونوں بہنیں اور چھوٹا بھائی بھی ٹی وی پر کوئی فلم دیکھنے اور زور و شور سے تبصرے کرنے میں مصروف تھے مگر خالہ صغریٰ کے جوشیلے انداز نے سب کی توجہ فلم سے ہٹا دی تھی۔ خاص کر حنا آنکھوں میں شوق کا ایک جہان لیے پوری طرح ادھر متوجہ ہو چکی تھی۔

"میں تو کہتی ہوں، اگر یہ رشتہ ہو جائے تو بڑی ہی خوش نصیبی ہوگی۔"

"تعریفیں ہی کیے جاؤ گی، کچھ تفصیل بھی بتاؤ۔ کون لوگ ہیں، کہاں رہتے ہیں اور لڑکا کتنا پڑھا لکھا ہے، جاب کرتا ہے یا اپنا بزنس ہے۔ تم نے ہمارے گھر کے حالات تو بتا دیے ہیں نا۔ وہ پہلے والا رشتہ جس کے بارے میں تم نے پورے یقین سے کہا تھا کہ وہ لوگ راضی ہیں۔ حنا انہیں پسند آگئی ہے مگر لڑکا ہی ایسا لالچی نکلا کہ اللہ کی پناہ۔"

"بس بی بی! آج کل زمانہ ہی بڑا خراب ہے۔ لوگ نقاب چڑھا کر ملتے ہیں مگر یہ لوگ تو بہت ہی شریف ہیں۔ میں پوری چھان بین کرنے کے بعد آئی ہوں اور انہیں بھی سب بتا دیا ہے کہ کہیں بعد میں اعتراض کرتے پھریں مگر مجھے امید ہے جو ایک بار اپنے جہانگیر کو قریب سے دیکھ لے گا، وہ کبھی انکار نہیں کر سکے گا۔"

"جہانگیر۔۔۔! کیا مطلب، تم کس کا رشتہ لے کر آئی ہو؟" امی چونکیں۔ حنا کے چہرے کا زاویہ بگڑ گیا اور وہ ایک بار پھر سب کے سامنے شرمندہ ہونے، تماشا بننے کی تیاری کرنے لگا۔

"جہانگیر کے لیے بھئی اور کس کے لیے۔" صغریٰ کے جوش میں کمی نہیں آئی۔

"پتا بھی ہے جو بھی انہیں دیکھنے آتا ہے، ہمیں کیسی کیسی سنا کر جاتا ہے۔" حنا نے کچھ تیز لہجے میں کہا۔

"تم چپ کرو، بچیوں کو ہر معاملے میں نہیں بولنا چاہیے۔" صغریٰ نے حنا کو ڈپٹا۔

حنا کہاں کسی کی سنتی تھی مگر مجبوری تھی، آج کل صغریٰ سے بگاڑ کسی طرح بھی مفاد میں نہیں تھا۔

"سچ ہی تو کہہ رہی ہے حنا توبہ، جہانگیر کو دیکھنے کے بعد تو لوگ ایسی ایسی باتیں کر گئے ہیں کہ سوچ کر جی خراب ہوتا ہے۔ میں نے تو ایسی امید ہی چھوڑ دی ہے۔ میں تو کہتی ہوں تم بھی اب ہماری مٹی پلید نہ کرو۔ جب اس کی قسمت میں ہوگا تو دلہن بھی آجائے گی مگر فی الحال تم اس موضوع کو نہ چھیڑو۔"

"چلو تمہاری مرضی مگر یہ لوگ تو ضرور آئیں گے۔ میں انہیں پکا کر کے آئی ہوں۔ اب نا کرتی اچھی لگوں گی کیا؟"

"صغریٰ! تم بھی اپنی ہی چلاتی ہو، پہلے ہم سے پوچھ تو لیتیں۔ خود سے ہی سارے پروگرام بنا کر آگئی ہو۔"

"میں نے کہا تو ہے بڑے اچھے لوگ ہیں، میں یہ رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔"

"ہوں گے اچھے مگر رونا تو ہمارے اپنے لڑکے کا ہے۔"

"ایسے نہ کہا کرو، تم نہیں جانتیں مگر صغریٰ کی آنکھ اس ہیرے کو خوب پہچان گئی ہے۔ وہ لوگ یہاں

سے زیادہ دور نہیں رہتے۔ چھ بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ لڑکے چھوٹے ہیں۔ پہلے یہ بیٹیاں ہیں۔ بڑی دونوں پڑھنے کے بعد نوکری کر رہی ہیں۔ باپ بھی ادھر محلے میں ہی سبزی کی دکان لگاتا ہے۔''

''سبزی کی دکان۔۔۔لو اب ہم ایسے ایسوں سے رشتہ جوڑیں گے۔ ہمایوں بھائی سنیں گے تو سن کر بے ہوش ہی ہو جائیں گے۔'' حنا اور شمع نے ناک بھوں چڑھایا۔

''میں تو کہتی ہوں اگر وہ لوگ راضی ہو گئے تو ہمارے جہانگیر کے لیے بہت ہی اچھا ہوگا۔ لڑکی بھی کماتی ہے، دونوں ہی محنت کریں گے تو زندگی کی گاڑی اچھے طریقے سے چل جائے گی۔''

صغریٰ کی یہ بات امی کے دل کو لگی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

''بات تو ساری یہی ہے نا کہ وہ بھی راضی ہوں۔''

''اللہ پر چھوڑ دو بی بی! بس اپنے بچے کے لیے دعا کرو۔''

''کرتی کیا ہے لڑکی؟'' امی کچھ کچھ آمادہ لگ رہی تھیں۔

''سلائی کڑھائی کے کسی اسکول میں استانی ہے۔''

''چلو پھر کپڑے تو اسی سے سلوایا کریں گے۔'' حنا اور شمع ہنسنے لگیں۔

''کب آ رہے ہیں وہ لوگ؟'' امی نے بیٹیوں کی ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''کل شام پانچ بجے کا کہا ہے میں نے۔ اس وقت تک جہانگیر بھی دفتر سے آ جاتا ہے نا۔''

''جہانگیر بھائی تو کل اس خوشی میں دفتر جائیں گے ہی نہیں۔'' حنا پھر بولی۔

صغریٰ نے توجہ نہ دی اور کل ان لوگوں کے ساتھ آنے کا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے سے پہلے سر جھکا کر بیٹھے جہانگیر کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ ''بیٹھو، چائے تو پی کر جانا۔'' مگر کہہ نہیں سکا۔

''امی! میں کہے دیتی ہوں میں ان لوگوں سے بالکل نہیں ملوں گی۔ ایویں خوامخواہ کا تماشا۔'' حنا خالہ صغریٰ کے جاتے ہی فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''اور امی! مجھے بھی نہ بلوایئے گا۔ جو چائے پانی لے کر جانا ہے، جہانگیر بھائی خود ہی لے جائیں گے۔'' یہ شمع تھی۔

''ٹھیک ہے نہ آنا تم لوگ۔ میں خود ہی چائے لے جاؤں گی۔'' امی نے آرام سے کہہ دیا۔

اب تو آنے والوں کا سن کر جہانگیر کو بھی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ بھی بے چینی سی محسوس کرنے لگتا تھا اور گھر والوں کے سامنے جو سبکی ہوا کرتی، اسے برداشت کرنا بھی تو کٹھن مرحلہ تھا۔ مگر صغریٰ ہر مرتبہ اتنی پرامید ہوا کرتی تھی کہ وہ بھی پرامید ہونے لگتا۔ اس مرتبہ بھی ہزار خدشوں کے باوجود اس نے آفس سے آتے ہی نہا کر استری شدہ شلوار قمیص نکال کر پہنی اور گھر والوں کی نظروں سے بچنے کے لیے وہ باہر گلی میں آ کھڑا ہوا۔

وہ لوگ وقت پر آ گئے تھے۔ ایک کالا بھجنگ چھوٹے قد کا مرد اور ایسی ہی عورت۔ وہ لوگ کہیں سے بھی ان لوگوں کی فیملی سے میل کھاتے نہیں لگ رہے تھے۔ صغریٰ ساتھ تھی۔ امی سے ابا کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ کمرے میں ہیں، ایکسیڈنٹ کے بعد ابا کی صحت تو بہتر ہو گئی تھی مگر ذہنی مشقت وہ اب بھی زیادہ نہیں کر سکتے تھے اور اب مایوس بھی بہت رہنے لگے تھے، اس لیے گھر کے

معاملات میں کم ہی دلچسپی لیتے مگر آج خالہ صغریٰ ان کے کمرے میں گئی اور پورے دس منٹ انہیں کچھ سمجھا بجھا کر ادھر لے آئی۔ جہاں مہمان اور امی کے علاوہ جہانگیر بھی موجود تھا۔

صغریٰ نے جا کر پہلے مہمانوں کے تاثرات جاننے کے لیے ان ہی کا جائزہ لیا اور شکر کیا کہ وہ اچھے موڈ میں تھے اور جہانگیر اور امی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے مگر امی کا موڈ کوئی زیادہ اچھا نہیں تھا۔ لیکن ابا نے صغریٰ کی باتوں کو سمجھ لیا تھا اور جا کر ان لوگوں سے بہت بشاشت سے باتیں کرنے لگے تھے۔ وہ لوگ بھی خوش گفتار تھے۔ محفل دیر تک جمی۔ امی نے چائے، بسکٹ اور نمکو ہی منگوائے تھے مگر ابا نے چھوٹے کو پیسے دے کر سموسے اور کیک بھی منگوالیا۔ جاتے ہوئے وہ لوگ جہانگیر سے بہت محبت سے ملے اور امی ابا کو اپنے یاں آنے کی دعوت دے کر چلے گئے۔

صغریٰ رک گئی تھی اور اس نے امی کے موڈ سے اندازہ لگا لیا تھا کہ انہیں وہ لوگ پسند نہیں آئے مگر پھر بھی کہنے لگی۔

''بس بی بی! سمجھو اپنے جہانگیر بچے کا تو معاملہ حل ہوا۔ اب میں تسلی سے دونوں لڑکیوں کے لیے کام کروں گی۔''

''کہاں حل ہوا، بھلا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ہم جیسے پڑھے لکھے، رکھ رکھاؤ والے لوگ ان سے رشتہ جوڑ سکیں۔''

''ایسے مت کہو بیگم! ہمیں لڑکی کو دیکھ لینا چاہیے اور پھر اس سے پہلے جو بھی آیا، جہانگیر کو ناپسند کر کے ہی گیا۔ میں تو سمجھتا ہوں وہ کھلے دل و دماغ کے لوگ ہیں جنہوں نے جہانگیر کو پسند کیا ہے۔ ہمیں بھی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔''

''لڑکیاں اور ہمایوں تو کبھی ایسے لوگوں سے رشتہ جوڑنے پر تیار نہیں ہوں گے۔'' امی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کمال کرتی ہو بی بی! ایسے معاملات میں بچوں کا کیا دخل اور پھر جہانگیر کی سسرال سے بھلا ان کا کیا واسطہ۔ سال چھ مہینے تک حنا اپنے گھر کی ہو جائے گی، اس کے بعد شمع بھی چلی جائے گی اور ہمایوں کا اپنا گھر بس جائے گا تو پھر بچوں کی بات پر کان دھرنے کا کیا مطلب؟''

''صغریٰ ٹھیک کہتی ہے، مجھے لڑکی کو دیکھے بغیر رشتے سے انکار مناسب نہیں لگتا اور پھر صغریٰ بھی اس گھر کی تعریف کر رہی ہے۔ ہم لوگ اسی اتوار کو ان کے گھر چلیں گے۔ صغریٰ! تم ان لوگوں کو پیغام دے دینا۔''

''ٹھیک ہے صاحب! اللہ تعالیٰ، جہانگیر کو گھر کا ہر سکھ دے، اسے کبھی کوئی غم نہ آئے۔'' وہ دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئی۔

ابا نے جو کہا وہ اپنی جگہ مگر امی کے خدشے ہرگز غلط نہیں تھے۔

جہانگیر کا رشتہ جاہل گھرانے میں ہو اور وہ سب باراتی بن کر وہاں جائیں۔ بہن بھائیوں کو گوارہ نہیں تھا۔

''رشتہ دار ہنسی اڑائیں گے۔ یہ لوگ پھر بار بار ہمارے گھر کے چکر لگایا کریں گے اور وہ لڑکی جو اسی ماحول میں پلی بڑھی ہے، وہ تو مستقل ہمارے گھر میں ہوگی۔ محلے والوں کو تماشا مل جائے گا۔ ہماری

فیملی بہت دولت مند نہ سہی مگر ہم سب پڑھے لکھے مہذب اور اچھا فیملی بیک گراؤنڈ رکھنے والے لوگ ہیں۔'' ہمایوں نے تو پوری تقریر کی تھی مگر ابا نے اسے خاموش کروا دیا۔ ابا خاموش تھے، ان سب کی سن رہے تھے مگر خود کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

اتوار کو وہ لوگ ان کے ہاں گئے۔ ڈھائی مرلے کا تنگ و تاریک پرانا مکان جس کے دروازے اور دیواریں رنگ و روغن کو ترس رہی تھیں۔ ان کے ابا سبزی کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ بچی ہوئی سبزیاں اور تھوک میں اکٹھے خرید کر رکھے گئے لہسن، پیاز، آلو کے ڈھیر۔ ذرا سی جگہ اور چھ جوان واجبی شکل و صورت والی بدرنگ کپڑوں میں پھرتی لڑکیاں۔

ان میں سے ایک ہی نسبتاً صاف اور نیا جوڑا پہنے بیٹھی تھی اور یقیناً یہی وہ شاہکار تھی جو صغریٰ انہیں دکھانے کو بے چین تھی۔

''آؤ جی آؤ، بسم اللہ۔'' عورت کا تو بس نہیں چل رہا تھا ان کی راہوں میں پلکیں بچھا دے۔ جس کمرے میں لا کر بٹھایا، وہاں پرانے صوفے جنہیں کڑھائی والے غلاف چڑھا کر سجانے کی کوشش کی گئی تھی۔ انہی صوفوں کا ہم عمر پلنگ بچھا تھا۔ الماری میں سجے گل دان اور ان میں سجے کاغذ کے پھول، کمرے کی چھت بہت نیچی تھی، اتنی کہ لگتا تھا اگر کمرے کے درمیان میں کھڑے ہوں تو چھت کا پنکھا سر کو چھونے لگے گا۔

''اور بہن جی! کیا حال ہے، کسی بیٹی کو ہی ساتھ لے آتیں۔''

امی نے مسکرانے کی کوشش بھی نہیں کی، البتہ ابا نے یہ کہہ کر ان لوگوں کا حوصلہ ضرور بڑھایا کہ ''اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا بہن جی! ان شاء اللہ جلد ہی بیٹیاں بھی چکر لگائیں گی۔''

ذرا دیر کے بعد چائے آ گئی اور پُرتکلّف اہتمام دیکھ کر ابا اس تکلف پر انہیں ٹوکنے لگے۔

''یہ ثروت ہے۔ میٹرک پاس ہے۔ سلائی کڑھائی میں ماہر ہے، استانی ہے دستکاری کے اسکول میں۔''

صغریٰ نے تعارف کروایا۔ گہرے سبز رنگ کے سوٹ میں ملبوس دبلی پتلی مگر بے ڈھنگی سی لڑکی، ہاتھ پاؤں کسی نرمی اور خوب صورتی سے خالی، گہرا سانولا رنگ، رخساروں کی نمایاں ہڈیاں اور ان ہڈیوں کے نمایاں ہونے کی وجہ سے کچھ اندر کو دھنسی آنکھیں۔ اس نے بال کچھ اونچے کر کے بنا رکھے تھے۔

''میری حنا اور شمع اتنی گوری اور خوب صورت، پڑھی لکھی اور پہننے اوڑھنے کے فن سے واقف۔ کیا یہ کسی طرح بھی ان سے میل کھاتی ہے۔ کیا یہ میرے گھر کی بہو بننے کے لائق ہے۔''

امی کا دل برا ہونے لگا۔ انہوں نے چائے کے ساتھ کچھ نہیں لیا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے اٹھ جانا چاہ رہی تھیں مگر ابا بڑے مزے سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ثروت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دعاؤں سے نوازا۔ گھر کے باقی بچوں کو بلا کر بھی تعارف حاصل کیا۔ ثروت کا باپ بڑے فخر سے بتا رہا تھا۔ ان کی فیملی میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہے، صرف اسی کے بچے پڑھ لکھ گئے ہیں۔ ''بڑی تینوں لڑکیوں کو میں نے دس جماعتوں تک تعلیم دلوائی ہے، چھوٹے بچے بھی پڑھ رہے ہیں۔''

صغریٰ برابر ثروت اور اس کے ماں باپ کی شرافت کے گن گا رہی تھی۔ اور امی پکّا فیصلہ کیے بیٹھی

تھیں۔ بھلے جہانگیر کنوارہ رہ جائے مگر ایسے لوگوں میں اس کا رشتہ ہرگز نہیں کریں گی مگر آتے ہوئے جب ابا نے کسی مشورے کے بغیر ہی ثروت کے ہاتھ پر ہزار روپیہ رکھ کر یہ کہا۔

''ہماری طرف سے ہاں ہے۔ آپ لوگ بھی بے شک کل ہی آ کر اسی طرح سادگی سے رسم کر جائیں۔'' تو امی چکرا کر رہ گئیں۔

واپسی پر وہ سارا راستہ خاموش رہیں مگر گھر آتے ہی پھپھک کر رو پڑیں۔

شمع سر دبانے لگی، حنا پانی لینے دوڑی، جہانگیر گھبراہٹ میں ٹکر ٹکر سب کی صورت دیکھنے لگا۔

''ابا! کچھ بتائیں تو ہوا کیا؟ کیا ان لوگوں نے انکار کر دیا یا بہت باتیں سنائیں آپ لوگوں کو۔'' حنا یہی سمجھی۔

''نہیں بیٹا! وہ لوگ بہت عزت سے پیش آئے۔ میں نے لڑکی کے ہاتھ پر ہزار روپیہ رکھ کر بات بھی پکی کر دی۔ بس یہی بات تمہاری امی کو پسند نہیں آئی۔''

''آپ نے کبھی میری بات سنی، کبھی میری رائے کو اہمیت دی، کبھی مجھے اہم جانا؟ ساری زندگی آپ پر آپ کی ماں بہنیں حاوی رہی ہیں۔ اب تو میری اولاد کا معاملہ ہے، اس میں بولنے کا، اپنی رائے دینے کا مجھے پورا حق ہے۔''

''مگر میں یہ کس طرح دیکھوں اور چپ رہوں کہ تم میری اولاد کے ساتھ غلط کر رہی ہو۔''

''کیا غلط کیا ہے میں نے؟'' امی اب رونا بھول کر چلانے لگیں پھر لڑکیوں کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''ارے وہ لڑکی کسی طرح بھی اس گھر کے قابل نہیں ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ بیٹھی تم لوگوں کی ملازمہ لگے گی۔ رشتہ دار ہنسیں گے مجھ پر۔ پہلی بہو ہی کہاں نیچ ذاتوں سے اٹھا لائی ہے۔ جو کوئی بھی اس گھر میں تم لوگوں کا رشتہ لینے آئے گا، اسے دیکھ کر پلٹ جائے گا اور میرے لیے تو اسے چند منٹ کے لیے برداشت کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے لا کر میرے سر پر بٹھا دیا۔ کالا رنگ، کھردرے ہاتھ پاؤں، بے ڈھنگی چال۔ اف میرے خدا کیا کیا بتاؤں۔ اس شخص نے تباہ کر دیا ہے ہمیں۔''

وہ پھر رونے لگیں۔ دونوں لڑکیوں کے چہروں پر بھی ابا کے لیے خفگی آ گئی اور جہانگیر نے محسوس کیا ان سب کے یوں اداس ہونے میں کہیں نہ کہیں کچھ قصور یقیناً اس کا بھی ہے، اس لیے خود کو مجرم گردانتے ہوئے اس نے چہرہ جھکا لیا۔

''جہانگیر! تم میرے ساتھ آؤ۔'' ابا اس سے کہتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ وہ بھی یونہی سر کو جھکائے ان کے پیچھے چلا آیا۔

''تم بددل نہ ہونا، لڑکی بہت سمجھ دار ہے۔ کچھ پڑھی لکھی بھی ہے اور ملازمت بھی کرتی ہے۔ بیٹا! دونوں مل کر چلو گے تو بہت جلد اپنی دنیا بنا لو گے۔ وہ بااعتماد بھی ہے اور بہادر بھی اور میرا خیال ہے تمہارے لیے ایسی ہی لڑکی بہتر رہے گی۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہاں یا ناں میں کچھ کہنا چاہیے یا خاموشی ہی بہتر ہے۔ بہرحال وہ خاموش رہا کہ الفاظ ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

''بات پکی ہو گئی ہے۔ تین روز بعد وہ بھی رسم کر جائیں گے۔ تم ماں بہنوں کی باتوں پر نہ جاؤ،

PAKISTANIPOINT
ایک رابطہ اپنوں سے
پاکستانی پوائنٹ

میں نے تمہارے لیے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"
اسے یہ سب سن کر خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوش ہو ہی نہیں سکا تھا۔

❀ ❀ ❀

تیسرے دن وہ لوگ رسم کرنے آئے۔ ثروت کے والدین اور ساتھ میں ثروت سے چھوٹی دو بہنیں رفعت اور عفت۔ بے چاری اپنی طرف سے تو اچھے کپڑے پہن کر مگر اچھا ہی تیار ہو کر آئی تھیں اور ان کے لبوں پر مستقل مسکراہٹ بھی کھل رہی تھی مگر یہاں کے حالات بالکل مختلف تھے۔ حنا اور شمع نے انہیں بالکل لفٹ نہیں کرائی۔ اگر ابا کا اصرار نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی کمرے میں ہی نہ آتا۔

حنا اور شمع کو دیکھ کر دونوں لڑکیاں بڑے جوش سے ملنے کے لیے اٹھی تھیں۔ ان کی سرد مہری دیکھی تو تھم سی گئیں۔ وہ شرمندہ نہیں تھیں، نہ ہی ان کے کسی انداز میں اس لیے گھبراہٹ تھی کہ وہ کم تعلیم یافتہ یا کم صورت تھیں۔ دونوں جہانگیر کے دائیں بائیں آ بیٹھیں اور بڑی اپنائیت سے اس سے باتیں کرنے لگیں۔ جہانگیر ان کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ امی نے جو نقشہ کھینچا تھا، غلط نہیں تھا۔ یقیناً وہ بھی ان دونوں جیسی ہی ہوگی۔ ہمایوں گھر پر ہی تھا مگر ابا کے کہنے کے باوجود اس نے کمرے میں جھانکا تک نہیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد حنا اور شمع نقل اتار کر سب کو ہنساتی رہیں اور اس بات کا رونا بھی روتی رہیں کہ اب ان جیسے لوگ ہمارے رشتہ داروں میں شامل ہونے جا رہے ہیں۔

"سچ بھائی! وہ لڑکیاں تھیں کہ شتر مرغ، لمبی پتلی سی گردنیں، افلاس کے مارے چھوٹے پتلے چہرے، چھدرے سے بال اور دبلے ہونے کے باوجود نزاکت کی تعریف سے کوسوں دور ان کے قد و قامت اور لباس، اللہ! بس کیا کہیں۔ امیر ہم بھی نہیں ہیں۔ ابا کی بیماری میں بڑا برا وقت دیکھا ہے، مگر اب اندازہ ہوا کہ خاندانی وجاہت، حسب نسب، تعلیم اور رکھ رکھاؤ کتنی اہمیت رکھتا ہے۔"

"واقعی یہ سب تو بہت اہم ہوا کرتا ہے، تم دل چھوٹا مت کرو۔ جب میری دلہن ڈھونڈنے نکلو گی تو پھر یہ ساری خوبیاں دیکھ کر پسند کرنا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر مسئلہ تو اب کا ہے سمجھ میں نہیں آرہا کیا کریں۔ یہ لوگ تو جہانگیر بھائی کے رشتہ دار ہونے کے ناتے اب چکر لگاتے ہی رہیں گے۔"

"تم لوگ لفٹ نہیں کرواؤ گے تو خود ہی سمجھ جائیں گے اور خود کو جہانگیر تک ہی محدود کرلیں گے۔"

"میں نے تو امی سے کہہ دیا ہے، ہم تو بری بنانے کے لیے بازاروں کے چکر نہیں لگا سکتے۔ انہیں ہی پیسے دے دیں خود ہی اپنے ذوق کے مطابق بناتے رہیں گے۔"

ایسی بہت سی باتیں جہانگیر کے سامنے بھی ہوتی رہی تھیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس کی بات جوڑتے ہوگئی ہے تو یہ اس کے لیے اچھا ہوا ہے یا برا۔

امی نے حنا کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شاید واقعی بری کے لیے رقم ان ہی لوگوں کو دے دی تھی۔ جب ہی تو کوئی گہما گہمی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اگر کوئی ہنگامہ جاگتا تھا تو اس کے سسرال والوں کی آمد کے بعد۔ وہ لوگ بہت زیادہ تو نہیں آتے تھے، مگر جب بھی آتے گھر کے افراد کے ہاتھ ایک موضوع

آجاتا اور کتنے دن وہ ان ہی پہ باتیں بنا کر ہنستے رہتے۔

ابا نے چار ماہ بعد کی تاریخ دے ڈالی تھی اور جہانگیر کو بلا کر کہا۔

"اب تمہارا بیاہ ہونے والا ہے۔ تم اپنی تنخواہ میں سے کچھ اپنے پاس رکھ لیا کرو۔ مجھے نہیں لگتا تمہاری ماں اس موقع پر تمہاری ضروریات کا خیال کرتے ہوئے خود سے تمہیں کچھ رقم دے گی۔"

اس نے کہنے کو تو بڑی فرماں برداری سے "جی اچھا ابا!" کہہ دیا تھا، مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ وہ ایسا کر کے یہ نہیں سن سکتا تھا کہ ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور جہانگیر بدل گیا ہے۔ اس نے گھر میں رقم دینا کم کردی ہے۔

اور شادی سے ایک ماہ پہلے تو امی نے اسے صاف کہہ دیا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو میرے ہاتھ میں وہی کچھ ہے جو تم دونوں بھائی رکھتے ہو اور یہ رقم کتنی ہوتی ہے، یہ بھی تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اب شادی کا موقع ہے تو اخراجات بہت ہوں گے۔ اس کے لیے کچھ کرو۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں امی!" اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔

"اب میں کس سے کہوں جہانگیر! دیکھو نا بیٹا! شادی بھی تو تمہاری ہے۔ اب ہمایوں بے چارہ کافی دنوں سے اپنے کمرے کا فرنیچر بدلنا چاہ رہا تھا۔ اس نے تو آرڈر بھی دے دیا ہے۔ اسے تو نہیں کہہ سکتی۔"

بہت سوچ کر اس نے خالہ صغریٰ سے ہی بات کرنے کا سوچا۔

"تم فکر نہ کرو، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے پتا ہے آپ کے حالات کچھ اچھے تو نہیں مگر میں کس سے کہوں؟"

"تم میری فکر نہ کرو۔ تمہارا یہ کام میں کسی نہ کسی طرح کروا ہی دوں گی۔ مگر پتر! خیال کرنا، شوشا دکھاوے میں پیسہ برباد نہ ہو کہ آخر میں یہ قرض تمہیں ہی اتارنا ہے۔"

"جی خالہ! اسی لیے میں کوئی بہت بڑی رقم چاہتا بھی نہیں ہوں۔ بس اتنی ہی ہو کہ سادگی سے سب کام نبٹ جائے۔"

اور جب وہ گھر واپس آیا تو برآمدے میں بہت خوب صورت نیا فرنیچر رکھا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ابھی تو بہت دن باقی ہیں۔ ابھی سے سب بھیج دیا۔ وہ تو جب چھوٹے نے کہا۔

"بھائی! دیکھو تو ہمایوں بھائی کتنا اچھا فرنیچر لائے ہیں۔" تب بات سمجھ میں آئی۔

"ہاں دیکھ لو، میں یقین سے کہتا ہوں۔ اتنا قیمتی اور بہت سا فرنیچر تمہاری بیوی جہیز میں نہیں لائے گی۔ میرا کمرا پھر بھی تم سے بہتر بلکہ بہت بہتر رہے گا۔"

"اوہ تو ہمایوں صرف اس لیے یہ سب لایا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میرا کمرا اس سے بہتر نظر آئے۔" اسے ہمایوں کی ذہنیت پر افسوس ہوا۔

"ٹی وی تو تم ایسے ہی اٹھا لائے پہلے ہم سب ایک جگہ بیٹھ کر پروگرام دیکھتے تھے، اب تم اپنے کمرے میں بند رہو گے۔" امی کے کہنے پر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"امی! یہ سب میں نے ایک دوست سے قرض لے کر خریدا ہے۔ اب ہر ماہ تقریباً آدھی تنخواہ

قرض چکانے میں دینا ہوگی۔"

"آدھی۔۔۔مگر ہمایوں! پھر گھر کے اتنے خرچے۔۔۔" امی پریشان ہوگئیں۔

"مجھے نہیں پتا، اب سب کے خرچے اٹھاتے اٹھاتے اپنی خواہشات سے تو منہ نہیں موڑ سکتا۔" وہ کہتے ہوئے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر فرنیچر کمرے میں رکھنے لگا۔

❁ ❁ ❁

اس کی شادی کے دن قریب آرہے تھے اور گھر میں شادی بیاہ والی گہما گہمی نام کو نہیں تھی۔ ابا کے ایکسیڈنٹ پر رشتہ داروں نے جس طرح کا رویہ اپنایا تھا۔ اس کی وجہ سے ان سب سے تعلقات کشیدہ چلے آرہے تھے۔ ننھیال اور ددھیال دونوں نے بے مروتی کا مظاہرہ کیا تھا، مگر یہ بھی نہیں تھا کہ آنا جانا بالکل ہی ختم تھا۔ بس پہلے والی محفلیں اب نہیں جمتی تھیں۔ دادی بھی تایا کے ہاں منتقل ہوگئی تھیں۔ مگر پھر انہیں اندازہ ہوا اس گھر میں ان کا گزارہ یہاں کے مقابلے میں کہیں مشکل ہے تو کبھی بڑی، کبھی چھوٹی پھپھو سب کو آزما کر آخر کار دو ماہ ہوئے یہیں واپس آگئی تھیں۔ ان سے ملنے تایا اور دونوں پھپھیاں بھی کم ہی آتی تھیں۔ اسی لیے رشتہ داروں کو ابھی تک رشتہ طے ہوجانے کی خبر نہ ہوسکی تھی۔ اور ان بہن بھائیوں نے تو صاف کہہ دیا تھا۔

"پہلے سے اطلاع کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بس شادی سے پہلے کارڈ بھیج دیں گے۔ اچھا ہے وہ لوگ نہ ہی آئیں۔ خوامخواہ میں ہم تماشا بنیں گے۔"

شادی سے دو روز پہلے فرنیچر آگیا۔ جہانگیر کے لیے تو یہ سب غنیمت تھا، مگر ہمایوں نے ہر چیز کا موازنہ اپنے بیڈ روم میں رکھی چیزوں سے کیا اور گھر والوں نے بھی خاصی ناک بھوں چڑھائی اور پھر وہ بے چارہ بھی خوش نہ ہوسکا۔

❁ ❁ ❁

پھر وہ گھڑی بھی آگئی جس کا سوچ کر وہ عجیب سی کیفیت کا بہت دنوں سے شکار ہورہا تھا۔ وہ جو اس کی بہنوں کو صورت ہی سے افلاس کی ماری لگتی تھی۔ ان کے مطابق اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہیں تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا تھا وہ کچھ بھی پہن لے۔ اس پر جچے گا تھوڑا ہی۔ جس کے ہاتھ پاؤں کی نسیں ابھری ہوئی ہیں۔ ہاتھ کالے مگر کھردرے تھے۔ دلہن بن کر وہ بھلا کیا لگ سکتی تھی۔ اسے لاکر کمرے میں بٹھانے والوں میں، خاطر داری میں صغریٰ ہی پیش پیش تھی اور اسی نے جہانگیر سے کہا تھا۔

"پتر! اب تم اکیلے نہیں رہے۔ دکھ سکھ کی ساتھی آگئی ہے۔" اور اس کا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

وہ جیسی بھی تھی مگر جہانگیر جب اس سے ملا تو اسے کچھ بھی پتا نہیں چلا، اگر کوئی احساس حاوی تھا تو بس یہ کہ وہ اس کی ہے۔ اس کی شریکِ حیات۔

شریکِ حیات کتنا خوب صورت لفظ ہے اور یہ رشتہ تو اس سے بھی بڑھ کر حسین ہے۔ جہانگیر بہت گھبرایا ہوا تھا۔ مگر وہ بہت بااعتماد تھی۔

رات اتنی جلدی بیت گئی اور اس نے اس ایک ہی رات میں اتنی باتیں کرلیں جتنی کہ اب تک بیتنے

والی عمر میں نہیں کی ہوں گی۔

"تمہارے لیے چائے لاؤں؟" صبح کے چھ بجے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ کیوں؟ میں لے کر آتی ہوں۔" وہ بیڈ سے اترنے لگی۔

"تم ایک رات کی دلہن۔"

"تو کیا ہوا، یہ میرا گھر ہے۔ اور پھر ابھی تو سب سورہے ہوں گے۔ کسی کو کیا پتا چلے کہ دلہن کام کررہی ہے۔" وہ ہنس دی۔ اس کی طرح اس کی ہنسی بھی بے لوچ تھی، مگر جہانگیر کو لگا اس کے ہنستے ہی ساری کائنات بھی ہنس پڑی ہے۔ اس نے پیر بستر سے نیچے اتارے اور سنہری سینڈلوں میں ڈالے، کالے کالے ابھری نسوں والے پاؤں، مگر جہانگیر کو اس کا سنہری سینڈل پہن کر چلنا بڑا ہی بھلا معلوم ہوا۔

دونوں کچن میں آئے، مل کر چائے بنائی۔ کچھ توس گرم کیے۔ انڈوں کا آملیٹ بنایا اور پھر سے ہنستے مسکراتے اپنے کمرے میں آگئے۔ جو جہانگیر کی محدود سی دنیا تھی، مگر ثروت نے اس پورے گھر کو ابھی کچھ دیر پہلے پورے اعتماد سے اپنا کہہ دیا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں سوگئے اور دن چڑھے تک سوتے رہے۔

آنکھ کھلی تو کوئی بری طرح دروازہ بجا رہا تھا۔ جہانگیر نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"اف، گیارہ بج رہے ہیں۔ مارے گئے۔" وہ جلدی سے بیڈ سے اترا اور دروازہ کھول دیا۔

"توبہ، کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ اتنا سوئے، کب سے پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹ رہی ہوں۔" حنا نئی دلہن کا لحاظ کیے بغیر اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھی۔ جہانگیر سر جھکائے شرمندہ سا کھڑا تھا۔ جب کہ ثروت بیڈ پر نیم دراز بڑے سکون سے یہ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔

"آپ لوگ تو ابھی جاگے ہیں۔ تیار ہونے میں پتا نہیں کتنا وقت لگادیں گے۔ میں بس ناشتا بھیج رہی ہوں، مرضی ہے ابھی کرلیں یا بعد میں۔"

جہانگیر کا کب کوئی کام انہوں نے کیا تھا۔ آج اس کے اور کالی چڑیل کے ناز اٹھاتے وہ بہت بے زاری محسوس کررہی تھی۔

"آپ تکلیف نہ کرو، ہم نے جب ناشتا کرنا ہوگا، خود ہی کرلیں گے۔" ثروت نے بے نیازی سے کہنے کے بعد تکیہ درست کیا تھا۔ شاید ابھی مزید آرام کا موڈ تھا۔

"پہلے دن کی دلہن ہو۔" حنا کو اس کا یوں کہنا بھی پسند نہیں آیا۔

"تو کیا ہوا، یہ میرا گھر ہے۔"

اس کا اتنے اعتماد سے یوں کہنا حنا کو چونکا گیا تھا۔ اس کا لہجہ عام نہیں تھا۔

❁ ❁ ❁

مگر جو اس دن واضح طور پر سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ آنے والے دنوں میں سامنے آگیا۔ وہ بے کشش تو بلا کی بااعتماد تھی۔ اور جو بات سب کو چبھتی تھی وہ یہ کہ اسے کسی کی پروا بھی نہیں تھی۔ شروع میں ہمایوں نے تمسخرانہ رنگ آنکھوں میں بھر کر اسے اس میں موجود بہت سی کمزوریوں کا احساس دلانا چاہا تو وہ اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھ کر ہنس پڑی اور بڑے مزے سے بولی۔

''پتا ہے ہمایوں بھائی! خوشبوؤں میں بسا، گھر سے نکلنے سے پہلے کریمیں، لوشن لگانے والا گھنٹہ لگا کر تیار ہونے والا مرد مجھے تو بس نام کا ہی مرد لگتا ہے۔ اللہ کرے تمہاری گھر والی کی یہ سوچ نہ ہو، ورنہ بے چاری اپنے نصیبوں کو رونے کے علاوہ کیا کر سکے گی۔'' حنا اور شمع کو تو وہ یوں سنتی تھی جیسے کوئی عاقل کسی ننھے بچے کی احمقانہ باتیں سنا کرتا ہے۔ گھر میں اس نے کسی سے بھی مشورہ کیے بغیر کئی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ برآمدے کے ہر پلر کے ساتھ پھولوں کے گملے رکھوائے۔ کچن میں ترتیب بدلی، لاؤنج کو بدل ڈالا۔ حنا کو یہ سب اچھا نہیں لگا تو ہنگامہ کر ڈالا۔ امی نے بھی بیٹی کا ساتھ دیا تو وہ ہنس کر بولی۔

''اب تم اس گھر کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ اپنے گھر جانے کی تیاری کرو، اور امی جی! کیا مجھے اپنے گھر کو اپنی مرضی سے رکھنے کا کوئی حق نہیں؟''

''یہ گھر صرف تمہارا نہیں، ہم سب کا ہے۔''

''پھر آپ لوگوں نے اب تک اس پر توجہ کیوں نہیں دی۔ دیکھیں نا۔ میں تو اب چند دن چھٹی گزار کر نوکری پر جانے لگوں گی۔ جہانگیر بھی چند دن ہی گھر پر ہیں۔ اس کے بعد یہ سب آپ کو ہی دیکھنا ہے۔ ہم دونوں اس گھر کے لیے کمائیں گے تو لازمی سی بات ہے۔ اسے اپنی مرضی کے مطابق دیکھنا بھی پسند کریں گے۔'' اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ سب خاموش ہو گئے۔ مگر امی زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکیں۔

''اپنی کمائی کا رعب کسی اور کو دینا۔ ہم تمہارے پیسے کے بھوکے نہیں ہیں اور جہاں تک جہانگیر کی بات ہے، وہ میرا بیٹا ہے اس کی ہر چیز پر میرا حق ہے۔''

اس نے جیسے سنا ہی نہیں، کچن میں جا کر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

امی نے جہانگیر سے اس کی شکایت کر ڈالی اور یہ سب سن کر اسے مسکراتے دیکھا تو وہ چونکا لگا۔

''کیا ہوا، تم ہنس کس بات پر رہے ہو؟''

''ہاں، نہیں، نہیں تو امی!'' وہ اپنے اصل تاثرات چہرے پر آ جانے سے گھبرا گیا۔ امی اسے برا بھلا کہتی کمرے سے چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر کے بعد حنا اور شمع آ گئیں۔ وہ بھی اسے یہی سب بتا رہی تھیں۔ اور وہ تو ثروت کا منتظر تھا جو کہہ رہی تھی کہ چائے بنا کر لاتی ہوں۔

''وہ آئی کیوں نہیں۔ آج میں اس کی بانہوں میں کچھ دیر کے لیے سو جانا چاہتا ہوں۔ اس سے کہنا چاہتا ہوں، شکریہ میری محسن! تم نے آج مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ آج میں بھی اس گھر کے لوگوں کے لیے اہم ہو گیا۔ تم جو میری ہو، ان پر حاوی ہو اور مجھے لگ رہا ہے کہ میں حاوی ہو رہا ہوں۔ تمام دکھ، تمام ملال چھٹ رہے ہیں۔ اندھیرے روشنی میں بدل رہے ہیں۔ میرا سویا نصیب جاگ رہا ہے۔ تم میرے لیے اس دنیا کی سب سے خوب صورت عورت ہو اور تمہارے حسن کی ناؤ مجھے بھی کنارے پر لا رہی ہے۔

آج ان سب کی باتیں سن کر مجھے لگا یہ کمرا نہیں۔ یہ گھر بھی میرا ہے۔ اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہے، آج مجھے پتا چلا کہ میری محنت کی کمائی اتنی بے وقعت نہیں جتنا آج سے پہلے مجھے بتایا جاتا رہا ہے۔ اس کا سہرا صرف تمہارے سر ہے۔ تم جو میری ہو، صرف میری۔ اے میری شریکِ حیات! میرے دل نے کہا ہے کہ تم دنیا کی سب سے خوب صورت عورت ہو۔''

۞ ۞ ۞

گھر تتلی کا پر

شادی کی ڈیٹ فکس ہوتے ہی اس نے سب سے پہلا فون انجی کو کیا تھا۔

''بہت مبارک ہو بھئی۔ اب تو تم بھی میرے شہر آ جاؤ گی اور مزے کی بات یہ ہے کہ تم جو ہر ٹاؤن میں اور میں ٹاؤن شپ میں یعنی بالکل قریب قریب ورنہ لاہور جیسا شہر اتنا پھیلا ہوا جیسے شیطان کی آنت ایک شہر میں رہنے کے باوجود ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''یہ ہماری سچی لگن تھی انجی! جو ہمیں ایک بار پھر قریب لے آئی ہے۔'' شفق نے اک جذب کے عالم میں کہا تھا۔

''تو اور کیا ایک سال ہونے والا ہے، ہمیں ملے ہوئے ورنہ کہاں وہ وقت تھا ہم دن میں دو تین بار ملا کرتے تھے۔'' انجی نے بھی آہ بھر کر گزرے وقت کو یاد کیا۔

''انجی! میں سوچتی ہوں، کہیں مجھے بھی شادی کے بعد تمہارے جیسی سسرال اور شوہر نہ مل جائیں جو میکے آنے ہی نہ دیں اب دیکھو نا، شادی کا تمہارا یہ تیسرا سال ہے۔ پہلے دو سال تو میکے آتی رہیں مگر اب وہ اپنا اصل روپ دکھانے لگے ہیں تمہیں میکے بھیجتے ہی نہیں۔''

''بس شوہر تو ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن میرے ساتھ اس سال کچھ مجبوریاں بھی رہیں۔ پہلے ساس بہت بیمار رہیں پھر ان کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے اظہر بہت اَپ سیٹ رہے، بچے بھی دادی کی کمی محسوس کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے دوبارہ سے سب معمول پر آیا۔ اب تو میری حالت ہی دوسری ہے۔ ڈاکٹر نے سفر سے منع کر رکھا ہے۔''

''کیا؟'' وہ زور سے چلائی۔ ''ڈاکٹر نے تمہیں سفر سے منع کر رکھا ہے یعنی تم میری شادی پر نہیں آ سکو گی؟''

''نہیں شفق! مگر تم اداس نہ ہو، میں ادھر لاہور میں تو تمہارے ولیمہ کے فنکشن کو اٹینڈ کر لوں گی۔''

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تمہارے ساتھ ایسی پرابلم تھی تو میں ڈیٹ آگے بڑھوا لیتی، خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم مجھے بتاؤ۔ کب تک فارغ ہو جاؤ گی۔ میں امی سے بات کرتی ہوں۔ تم میری شادی میں شریک نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے انجی!''

''پاگل مت بنو شفق! آنٹی اتنی سی بات پر کبھی ڈیٹ تبدیل نہیں کریں گی۔''

''میں ضد کروں گی۔ بھلا تمہارے بغیر خاک مزا آئے گا۔ انجی، میری سب سے بہترین دوست ہی شادی میں شریک نہ ہوا ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''میں تمہاری محبت کو سمجھتی ہوں شفق! مگر تم بہت بھولی ہو، اصل میں ابھی عملی زندگی میں قدم نہیں رکھا۔ اس لیے ایسی نزاکتوں کو نہیں سمجھ رہیں مجھے بھی تمہاری شادی اٹینڈ نہ کر سکنے کا افسوس ہے مگر کہہ تو رہ ہوں۔ ولیمہ کے فنکشن میں بھرپور شرکت کروں گی۔''

''ولیمہ کے فنکشن میں بھرپور شرکت کا بھلا کیا سوال! نہ مایوں، نہ مہندی، نہ ہی بارات۔ ساری رونق تو انہی دنوں میں ہوتی ہے اور وہ آخری دن تو بس سب کھانا کھاتے ہیں اور اپنی اپنی راہ لیتے ہیں، بس میں کچھ نہیں جانتی امی سے بات تو ضرور کروں گی۔''

جس وقت وہ اپنی والدہ کے کمرے میں آئی۔ بھابھی بھی یہیں موجود تھیں اور امی سے کسی بات پر مشورہ چاہ رہی تھیں۔

''امی! پہلے میری بات تو سن لیں۔''

''کتنی بار کہا ہے شفق! جب بڑے بات کر رہے ہوں۔ درمیان میں مت بولا کرو۔ اب تو تمہاری شادی ہونے والی ہے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خود خیال کیا کرو۔'' امی نے اچھا خاصا ڈانٹ دیا۔

''یہی تو میں کہنے والی ہوں۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنا۔ آپ ڈیٹ آگے بڑھا دیں۔''

''ہیں ہائیں! دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔'' امی تو اپنی جگہ سے اچھل ہی پڑیں۔ مارے حیرت کے بھابھی کا منہ بھی کھل گیا۔

''وہ ابھی میں نے انجی کو فون کیا تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر نے اسے سفر سے منع کیا ہے۔ وہ شریک نہیں ہو سکے گی۔ میری اتنی پیاری اکلوتی دوست اس کے بغیر میں شادی کر والوں۔ ایسی بے وفا نہیں ہوں۔''

''دیکھو ذرا اس لڑکی کو۔ پتا نہیں کب اسے عقل آئے گی۔ ارے یہ کہاں لکھا ہے کہ سہیلی شامل نہ ہو تو نکاح نہیں ہو سکتا۔''

''بس امی! میں نے کہہ دیا ہے۔ جب تک انجی کو سفر کی اجازت نہیں مل جاتی۔ میں شادی نہیں کروں گی۔'' بڑے آرام سے فیصلہ سنایا تھا۔

''یہ بات کرو ذرا اپنے ابا اور بھائی کے سامنے، اچھی طرح بتائیں گے وہ تمہیں۔ غضب خدا کا، سارے خاندان میں بات پھیل چکی ادھر لڑکے کے بھائی نے شادی میں شرکت کے لیے دوبئی اپنے آفس میں چھٹی کی درخواست بھی دے دی اور ادھر دلہن صاحبہ اس لیے ڈیٹ تبدیل کروانا چاہ رہی ہیں کہ وہ انجی صاحبہ تشریف نہیں لا سکتیں۔''

''آپ کو تو شروع سے ہی میری دوست سخت ناپسند ہے۔''

''اس میں پسند کرنے والی بات ہی کون سی ہے؟'' بھابھی نے ناک چڑھا کر اپنی ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا۔

''ہاں آپ کی اور امی کی رائے ہمیشہ اس کے لیے ایسی ہی رہی ہے اور کیوں نہ ہو، آخر آپ امی کی بھتیجی جو ہوئیں اور وہ باجی وہ بھی آپ دونوں کی ہی سنتی ہیں۔ اکلوتی بہن کو کبھی کسی قابل نہیں سمجھا۔''

وہ روہانسی ہو رہی تھی اور اس کی باتیں امی کا پارہ مزید چڑھا رہی تھیں۔

''سنو، سنو ذرا اس کی باتیں۔ کل کو شادی ہونا ہے اس کی اور بجائے اپنی غلطی ماننے کے یہ ہم سب کو غلط قرار دے رہی ہے۔ بتاؤ مجھے، تمہاری ساس سے کیا کہوں۔ ہم شادی کی ڈیٹ کس لیے آگے بڑھوا رہے ہیں۔ تمہارے ابا اور بھائی سے کیا کہوں۔ رشتہ داروں سے کون سا بہانا بناؤں اور انجی کم بخت! شکر کیا تھا چار سال پہلے جب اس کی شادی ہوئی تھی کہ چلو اب تمہارے سر سے اس کا بھوت اتر جائے گا۔ کیا معلوم تھا تمہارا بیاہ بھی اسی شہر ہو جائے گا۔''

''آپ لوگوں کو ہمیشہ اس بے چاری سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے حالانکہ وہ میرے ساتھ کتنی مخلص ہے اور بھیا کی شادی پر اس نے ہم سب کا کتنا ساتھ دیا تھا۔ کیسی رونق لگائی تھی۔ باجی کو تو ان دنوں بخار آ رہا تھا۔ بستر سے اٹھنا تک محال تھا۔ یہ انجی ہی تھی جو میرے ساتھ ساتھ تھی۔''

اس کی بات پر بھابھی کو بھی وہ سب یاد آ رہا تھا جو وہ بھولی نہیں تھیں۔ انجی کے قہقہے، ہنسی مذاق، وہاب سے حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی اور خود دلہن بنی بھابھی پر بظاہر بے ضرر سے اعتراضات۔ بھابھی کو شادی کے دوسرے روز ہی اس لڑکی سے بے زاری ہونے لگی تھی جو سننے میں آ رہا تھا ایک ہفتے سے ادھر ڈیرا ڈالے ہوئے تھی اور اس کی چھوٹی نند شفق کی تو گویا اس میں جان تھی۔ ہاں اپنی پھپھو یعنی ساس اور بڑی نند کی آنکھوں میں انہیں انجی کے لیے محبت یا اپنائیت کا کوئی رنگ دکھائی نہیں دیا۔ بڑی نند تو شادی کے چوتھے روز اپنے گھر اسلام آباد چلی گئی اب گھر میں شفق، پھپھو اور پھپھا جان ہوتے تھے یا پھر یہ دونوں نئے نویلے دولہا دلہن تھے اور وہ دیکھ رہی تھی انجی صرف شفق کی ہی دوست نہیں اس کے میاں وہاب سے بھی بہت بے تکلف ہے اور وہاب بھی اس کے رکھ رکھاؤ اور ذہانت کے معترف ہیں وہ اکثر ارم کو مشورہ دیتی۔

''ارے بھابھی! آپ نے اس سوٹ کے ساتھ وہ پرل کا سیٹ پہننا تھا نا، بچی اتنا خوب صورت لگتا۔'' یا پھر

''آپ یہ نہیں وہ والی ساڑھی پہنیے، دیکھیے گا میاں جی کتنی تعریف کریں گے پھر آپ میرا شکریہ ادا کرنا نہ بھولیے گا۔''

اور یہ سارے مشورے وہاب کی موجودگی میں دیتی اور ارم کو غصہ اس پر آتا کہ وہاب بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے۔

ارم نے محسوس کیا کہ اسے خود کو نمایاں کرنے اور دوسروں کو کمتر ثابت کرنے میں مزا آتا ہے، شادی پر شفق نے جتنے بھی کپڑے بنائے تھے، وہ سب انجی کے مشوروں اور اس کی پسند سے بنوائے گئے تھے، بری میں بھی مرضی اس کی چلتی جو ارم کی بڑی نند اور دوست صائقہ ساری تیاری پنڈی اسلام آباد سے نہ کر لیتیں۔ صائقہ اور ارم ہم عمر تھیں پھر آپس میں رشتہ داری بھی تھی تو ایک دوسرے کے ہاں پہلے سے آنے جانے کی وجہ سے وہ ارم کی پسند سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسی لیے بری اس نے بنوائی تھی۔

انجی، شفق سے پورے چھ سال بڑی تقریباً ارم ہی کی ہم عمر تھی اور ارم کو ان دونوں کی دوستی پر حیرت تھی اور اس کا اظہار اس نے پھپھو کے سامنے بھی کر دیا تھا۔

"اے یہ شفق ہے ہی بے وقوف۔ تمہیں پتا ہی ہے۔ صائقہ کی شادی ہم نے بہت جلدی کر دی تھی۔ شفق چھوٹی تھی۔ بہن کی کمی بہت محسوس کرتی تھی یہ انجی لوگ انہی دنوں ہمارے محلے میں شفٹ ہوئے تھے۔ بھائی کوئی نہیں۔ یہ پانچ بہنیں ہیں۔ شفق پہلے تو اس کی سب سے چھوٹی بہن کی دوست بنی تھی۔ وہ شفق کے ہی اسکول میں پڑھتی تھی۔ اسی کے لیے یہ ان لوگوں کے گھر جاتی تھی اور پتا نہیں پھر کس طرح اس کی دوستی انجی سے ہوگئی اور یہ دوستی اتنی بڑھی کہ اب تو مجھے اس کی فضول کی محبت پر بے زاری ہونے لگتی ہے میں تو اس لیے ان کے ہاں جانے سے منع نہیں کرتی تھی کہ گھر میں کوئی لڑکا تو ہے نہیں۔ لڑکیوں والا ہی گھر ہے، ادھر گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تو ادھر چلی جاتی مگر یہ پتا نہیں تھا یہ تو انجی کو جان کا روگ بنا لے گی۔ دن میں کئی کئی چکر اس کے گھر کے لگتے ہیں اور وہ بھی نہ دن دیکھتی ہے نہ رات، جب جی چاہتا ہے منہ اٹھائے چلی آتی ہے، اب وہاب سے کہہ کر شفق پر تو میں نے کچھ سختی کروائی ہے کہ ان کے گھر کا ماحول اب پہلے کا سا نہیں رہا۔ بڑی بہن نے پی آئی اے میں ایئر ہوسٹس کی جاب کرلی ہے۔ دوسری کسی آفس میں لگ گئی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بہت ماڈرن دکھائی دینے لگی ہیں۔ یہ انجی پہلے بالکل سادہ سی ہوتی تھی مگر بہنوں کی دیکھا دیکھی اس کے بھی رنگ ڈھنگ بدل رہے ہیں اور شفق اس کا بہت اثر لیتی ہے بس اسی لیے اب میں کچھ ڈر سی گئی ہوں۔"

اور آنے والے دنوں میں ارم نے دیکھا۔ پھپھو کا ڈر بے جا نہیں، انجی واقعی بڑی آزاد سی لڑکی تھی اور شفق کو اپنے ساتھ ساتھ لگائے رکھتی تھی۔ ہاں ارم نے جو رویہ اس کے ساتھ اپنایا اس کے بعد اس نے ارم کے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔

ارم کی شادی کے دو ماہ بعد ہی انجی کی دوسرے نمبر والی بہن کی بھی اچانک شادی ٹھہر گئی اور شفق سے گھر کے کام تو کروائے بازاروں کے بھی اس کے ساتھ خوب چکر لگائے یہاں تک کہ مہندی کے روز اسے تھکن سے بخار ہو گیا مگر انجی پھر بھی اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی رہی۔

پھر ارم کی شادی کے ایک سال بعد جب انجی کی بات لاہور ٹھہر گئی تو ارم اور پھپھو دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب تو شفق کی عقل بالکل سلب ہو چکی تھی، وہ صرف انجی کے اشاروں پر ہی چلا کرتی تھی۔ شادی میں شفق نے کام بھی خوب کیا اور بار بار اس کے گلے لگ کے روئی بھی بہت اور جب انجی کے دولہا کو شادی کے روز دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ کتنا سنجیدہ سا ہے۔ انجی بے چاری کیسے گزارہ کرے گی؟ سب لوگ اس کے دولہا کو سراہ رہے تھے۔ کچھ تو زبان دبی میں کہہ رہے تھے۔

"انجی ایسے اچھے لڑکے کے قابل نہیں۔" لیکن شفق دوسرے انداز میں سوچتی اور دکھی ہوتی رہی۔

اور شادی کے تیسرے روز جب شفق اس کی جدائی میں رو رو کر پاگل ہو رہی تھی وہ ہنستی مسکراتی خوشبوؤں میں بسی اپنے دولہا کے ساتھ میکے آئی تھی۔ شفق کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو اڑ کر اس کے گھر پہنچی اور بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی۔

"ہائے شفو! کیا حال بنا لیا ہے میرے بغیر۔" انجی ہنسی پھر اپنے میاں سے بولی۔

"یہی وہ شفق ہے جس کے بارے میں میں نے بتایا تھا نا میری محبت میں پاگل ہے۔"

"اچھا اچھا!" اس کے میاں نے دلچسپی سے دیکھا اور پھر بولا۔

"یہ بہت چھوٹی سی معصوم سی لڑکی ہے۔"

پتا نہیں کیوں انجی کو پیاری سہیلی کے بارے میں میاں کی رائے کچھ پسند نہیں آئی، بولی۔

"نہیں اتنی بھی چھوٹی نہیں۔ بس قد میں مجھ سے چھوٹی ہے اور کچھ ہے یہ احمق سی لڑکی، اسی لیے ایسی لگتی ہے۔"

شفق نے انجی کی بات پر کچھ زیادہ غور نہیں کیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ جادو کے زور سے اس کے میاں کو تو کہیں غائب کر دے پھر وہ ہو اور انجی ہو اور وہ اسے بتائے کہ اس کے بغیر یہ تین دن شفق نے کیسے گزارے ہیں۔ مگر انجی کہہ رہی تھی۔

"شفق! اس وقت تم اپنے گھر جاؤ۔ میں خود تم سے ملنے آجاؤں گی۔"

"ہاں ابھی یہ دونوں ذرا گھومنے پھرنے جا رہے تھے۔ انجی، اظہر بھائی کو اپنا شہر بھی دکھانا چاہتی ہے نا!" انجی کی چھوٹی بہن نے بتایا۔

"میں بھی چلوں؟" وہ پُرجوش ہوئی کہ انجی اس کے بغیر کہاں جایا کرتی تھی۔

"نہیں۔ وہ میں اظہر کے ساتھ جا رہی ہوں نا۔ سمجھا کرو۔" اس نے میاں کو دیکھا پھر شفق کے کان کے قریب جھک کر بولی۔

"میں آؤں گی تمہاری طرف بہت سی باتیں بتانا ہیں، بے چین ہوں تم سے ملنے کو۔ ابھی تم جاؤ۔"

اس کے انداز پر شفق مسکرائی، اک فخر سا محسوس ہوا، اکلوتی سہیلی پر، بات مجھ سے ہی تو شیئر کرے گی اور گھر آگئی۔

"بڑی جلدی واپسی ہوگئی؟" ارم سامنے ہی بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی، اتنی جلدی اس کی واپسی پر حیرت ہوئی۔

"انجی اپنے میاں کے ساتھ کہیں جا رہی تھی کہہ رہی تھی شام کو آؤں گی تمہاری طرف، بہت سی باتیں بھی تو بتانی ہیں۔" شفق نے انجی کے انداز میں ہی بھابھی کے سامنے دُہرا کر انہیں چونکا دیا۔ شفق ان دنوں تھرڈ ایئر میں تھی۔ معصوم سادہ سی لڑکی جو انجی کی آنکھوں سے دیکھتی، اس کے دماغ سے سوچتی آئی تھی مگر اب انجی بیاہتا تھی نئی نئی دلہن جس نے اپنے تجربات مزے لے لے کر کسی سے بیان کرنے تھے۔

"نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" ارم نے سوچا اور ایک لمحے میں فیصلہ بھی کر لیا۔

پھر جب انجی ان کے ہاں آئی تو اس نے دونوں کو اکیلے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس پر دونوں ہی جز بز ہو رہی تھیں یہاں تک کہ جب انجی نے شفق سے کہا۔

"آؤ تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" تب بھی ارم ان کے ساتھ کمرے میں چلی آئی، بدمزا سی ہو کر انجی جلد ہی اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "کھانے پر روک لیتیں۔" اس کے جانے کے بعد پھپھو نے کہا تھا۔

تب اس نے آہستہ آہستہ سب کچھ پھپھو کے سامنے کہہ ڈالا۔ واقعی انجی سے ایسی نزاکتوں کے احساس کا خیال ہی فضول تھا۔ ارم نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔

''اب وہ آئے گی تو آپ اسے صاف لفظوں میں سمجھا دیجیے گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! میں ضرور اس سے بات کرلوں گی۔''

پھر دوبارہ انجی ان کے ہاں تب آئی جب شفق کے بے حد اصرار پر امی کو اسے اور اس کے میاں کو کھانے پر بلانا پڑا۔ میاں کے سامنے وہ پٹر پٹر سب سے بولنے والی بڑھ بڑھ کر مشورے دینے والی انجی خاصی سنبھل کر بیٹھی رہی۔ اگلے روز ہی ان کی واپسی ہوگئی اور شفق نے ایک بار پھر اسے آنسوؤں کی دھند میں رخصت کیا۔

اس کے بعد انجی شادی کے تین ماہ بعد آئی۔ وہ دوسرے جی سے تھی اور حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس کا کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ان دنوں صائقہ کا چھوٹو بیمار ہوا تو اس نے شفق کو اپنے پاس اسلام آباد بلوالیا کہ چھوٹے سے بیمار بچے کے ساتھ گھر بار دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

گزرے تین سالوں میں وہ بہت کم رابطے میں رہیں مگر شفق ان لوگوں میں سے تھی جو محبت کرتے ہیں تو آخری سانس تک نبھاتے ہیں۔ وہ کبھی بھی انجی کو بھلا نہیں سکی اور شہر یار کا رشتہ آنے پر جب اسے پتا چلا یہ لوگ لاہور سے آئے ہیں تو وہ چونک گئی اور پھر اس نے اس رشتے کے حق میں کتنی ہی دعائیں کر ڈالیں صرف اس لیے کہ یہ رشتہ سہیلی کے شہر سے آیا تھا وہ اسی شہر چلی جاتی تو ایک بار پھر ملنے کی امید پیدا ہو جاتی۔

امی، ابا، بھیا، ارم بھابھی سب ہی کو یہ رشتہ پسند آیا تھا۔ مختصر فیملی تھی۔ شہر یار اس کی والدہ اور بڑا بھائی جو سعودیہ میں مقیم تھا پھر شہر یار کی جاب بھی اچھی تھی اور بھیا بتاتے تھے وہ ہنس مکھ اور خوش اخلاق لڑکا ہے۔

''ہماری شفق ابھی لاابالی مزاج کی مالک ہے۔ اس کے لیے ایسا ہی شوہر مناسب رہے گا جو خوش مزاج اور باتوں کو نظر انداز کر دینے والے مزاج کا مالک ہو۔''

''مجھے تو شہر یار کی والدہ بہت اچھی لگی ہیں۔ نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ پڑھی لکھی اور روشن خیال ہیں۔'' یہ رائے ارم نے دی تھی۔

''ہاں واقعی بے حد معقول خاتون ہیں۔'' امی بہو کے خیالات سے متفق تھیں وہ چپ چاپ سب سنے جاتی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے، رشتے کے لیے ہاں کر دی گئی۔ اس نے سب سے پہلے انجی کو فون کیا اور آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ فون اظہر نے اٹھایا۔

''مجھے انجی سے بات کرنا ہے۔'' سلام دعا کے بعد اس نے کہا تھا۔

''انجی، آپ کا مطلب انجم صاحبہ!'' بڑی سنجیدگی سے وضاحت چاہی گئی۔

''اف کتنی روکھی پھیکی بات کرتا ہے یہ شخص۔ حالانکہ میں نے بتایا بھی ہے شفق بات کر رہی ہوں۔ یقیناً جانتا ہے شفق ان کی بیگم انجم صاحبہ کی قریبی دوست ہے مگر مجال ہے جو حال احوال ہی پوچھ لیں۔'' انجی لائن پر آچکی تھی۔ اس نے جوش کے عالم میں تازہ خبر سنائی ساتھ ہی اس کے میاں کی شکایت بھی لگا دی۔

''ارے یہ شوہر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب تو تم خود خیر سے بیگم بننے جا رہی ہو لگ پتا جائے گا۔''

''اللہ نہ کرے جو وہ ایسے روکھے سڑے مزاج کے مالک ہوں۔''

''بس شفو! یہ تو مقدروں کے کھیل ہیں ورنہ تمہیں پتا ہے میں کتنی زندہ دل، ہنسوڑ، سیر سپاٹے کی شوقین ہوا کرتی تھی جب تک سارے بازار کا راؤنڈ نہ لگالوں، بالوں کا کلپ تک نہیں خریدتی تھی اب یہ حال ہے ایک اسٹور پر لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور آرڈر ہوتا ہے۔ آدھے گھنٹے میں شاپنگ مکمل کر کے آؤ۔ میں ادھر بچے کے پاس گاڑی میں بیٹھا ہوں۔''

''ہائے پھر تم کیا کرتی ہو؟'' اسے بھی انجی کی عادت کا پتا تھا۔ اس ظلم پر پریشان ہو کر چلا اٹھی۔

''ماننا ہی پڑتی ہے۔'' انجی نے آہ بھری۔

''اتنی فرماں بردار ہوگئی ہو؟''

''ارے نہیں بھئی۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ان کے ساتھ تو مہینے میں ایک بار ہی جانا ہوتا ہے۔ ویسے اکیلی تو میں ہفتے میں دس چکر بازار کے لگالیتی ہوں۔'' انجی نے قہقہہ لگایا اس کی بھی جان میں جان آئی۔

''انجم! میں چائے کا انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ اظہر کی آواز سیل پر باخوبی سن رہی تھی۔

''چائے ہی ہے نا کوئی دوا تو نہیں کہ ٹائم آگے پیچھے ہوگیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ بنا دیتی ہوں۔'' انجی نے زمانے بھر کی بے زاری لہجے میں سمو کر میاں جی کو جواب دیا پھر بولی۔

''اچھا شفو! جی تو نہیں چاہ رہا مگر یہ ازدواجی زندگی کے مسئلے۔ جب تک چائے نہیں حلق سے اترے گی انہیں سکون کہاں آئے گا۔ بند کرتی ہوں پھر فرصت سے بات کریں گے۔''

''بے چاری انجی یہ اظہر تو پہلے دن سے ہی سب کو کچھ اکھڑ اور خشک مزاج لگا تھا۔ شکر ہے بھابھی بتا رہی ہیں شہر یار بہت خوش اخلاق ہے۔'' مگر شہر یار کے بااخلاق ہونے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنا اظہر کی بداخلاقی پر رنج تھا۔ وہ رات جب تک سو نہیں گئی۔ انجی کی ویران ناکام ازدواجی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔

❁ ❁ ❁

اس کی بات پکی ہوئی تو کچھ ہی دنوں کے بعد شادی کی ڈیٹ کا تقاضا بھی ہونے لگا۔ اصل میں شہر یار کی والدہ کو اپنے بڑے بیٹے کے پاس جانا تھا۔ ان کا ارادہ تقریباً چھ ماہ وہیں رہنے کا تھا اور جانے سے پہلے وہ شہر یار کا گھر بسا دینا چاہتی تھیں۔

امی ابا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس روز وہ بھابھی اور امی سے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے کرتی رہیں۔ انہوں نے بھابھی کو شہر یار کی پسند ناپسند کے بارے میں بتایا اور بری کے لیے شفق کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

''آنٹی! آپ جو بھی بنائیں گی۔ ہمیں پسند ہوگا۔'' ارم نے کہہ دیا کہ وہ جانتی تھی شفق کو ان باتوں کا کچھ اتنا سینس نہیں۔ پہلے انجی کی رائے چلتی تھی۔ اب وہ بھابھی کے ساتھ جا کر انہی کے مشورے سے

''اب وہ آئے گی تو آپ اسے صاف لفظوں میں سمجھا دیجیے گا۔''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! میں ضرور اس سے بات کرلوں گی۔''
پھر دوبارہ انجی ان کے ہاں تب آئی جب شفق کے بے حد اصرار پر امی کو اسے اور اس کے میاں کو کھانے پر بلانا پڑا۔ میاں کے سامنے وہ پٹر پٹر سب سے بولنے والی بڑھ بڑھ کر مشورے دینے والی انجی خاصی سنبھل کر بیٹھی رہی۔ اگلے روز ہی ان کی واپسی ہوگئی اور شفق نے ایک بار پھر اسے آنسوؤں کی دھند میں رخصت کیا۔
اس کے بعد انجی شادی کے تین ماہ بعد آئی۔ وہ دوسرے جی سے تھی اور حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس کا کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ان دنوں صائقہ کا چھوٹو بیمار ہوا تو اس نے شفق کو اپنے پاس اسلام آباد بلوالیا کہ چھوٹے سے بیمار بچے کے ساتھ گھر بار دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔
گزرے تین سالوں میں وہ بہت کم رابطے میں رہیں مگر شفق ان لوگوں میں سے تھی جو محبت کرتے ہیں تو آخری سانس تک نبھاتے ہیں۔ وہ کبھی بھی انجی کو بھلا نہیں سکی اور شہر یار کا رشتہ آنے پر جب اسے پتا چلا یہ لوگ لاہور سے آئے ہیں تو وہ چونک گئی اور پھر اس نے اس رشتے کے حق میں کتنی ہی دعائیں کر ڈالیں صرف اس لیے کہ یہ رشتہ سہیلی کے شہر سے آیا تھا وہ اسی شہر چلی جاتی تو ایک بار پھر ملنے کی امید پیدا ہو جاتی۔
امی، ابا، بھیا، ارم بھابھی سب ہی کو یہ رشتہ پسند آیا تھا۔ مختصر فیملی تھی۔ شہر یار اس کی والدہ اور بڑا بھائی جو سعودیہ میں مقیم تھا پھر شہر یار کی جاب بھی اچھی تھی اور بھیا بتاتے تھے وہ ہنس مکھ اور خوش اخلاق لڑکا ہے۔
''ہماری شفق ابھی لاابالی مزاج کی مالک ہے۔ اس کے لیے ایسا ہی شوہر مناسب رہے گا جو خوش مزاج اور باتوں کو نظر انداز کردینے والے مزاج کا مالک ہو۔''
''مجھے تو شہر یار کی والدہ بہت اچھی لگی ہیں۔ نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ پڑھی لکھی اور روشن خیال ہیں۔'' یہ رائے ارم نے دی تھی۔
''ہاں واقعی بے حد معقول خاتون ہیں۔'' امی بہو کے خیالات سے متفق تھیں وہ چپ چاپ سب سنے جاتی۔
پھر زیادہ دن نہیں گزرے، رشتے کے لیے ہاں کردی گئی۔ اس نے سب سے پہلے انجی کو فون کیا اور آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ فون اظہر نے اٹھایا۔
''مجھے انجی سے بات کرنا ہے۔'' سلام دعا کے بعد اس نے کہا تھا۔
''انجی، آپ کا مطلب انجم صاحبہ!'' بڑی سنجیدگی سے وضاحت چاہی گئی۔
''اف کتنی روکھی پھیکی بات کرتا ہے یہ شخص۔ حالانکہ میں نے بتایا بھی ہے شفق بات کر رہی ہوں۔ یقیناً جانتا ہے شفق ان کی بیگم انجم صاحبہ کی قریبی دوست ہے مگر مجال ہے جو حال احوال ہی پوچھ لیں۔'' انجی لائن پر آچکی تھی۔ اس نے جوش کے عالم میں تازہ خبر سنائی ساتھ ہی اس کے میاں کی شکایت بھی لگا دی۔

''ارے یہ شوہر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب تو تم خود خیر سے بیگم بننے جا رہی ہو لگ پتا جائے گا۔''
''اللہ نہ کرے جو وہ ایسے روکھے سڑے مزاج کے مالک ہوں۔''
''بس شفو! یہ تو مقدروں کے کھیل ہیں ورنہ تمھیں پتا ہے میں کتنی زندہ دل، ہنسوڑ، سیر سپاٹے کی شوقین ہوا کرتی تھی جب تک سارے بازار کا راؤنڈ نہ لگالوں، بالوں کا کلپ تک نہیں خریدتی تھی اب یہ حال ہے ایک اسٹور پر لے جا کر کھڑا کردیتے ہیں اور آرڈر ہوتا ہے۔ آدھے گھنٹے میں شاپنگ مکمل کر کے آؤ۔ میں ادھر بچے کے پاس گاڑی میں بیٹھا ہوں۔''
''ہائے پھر تم کیا کرتی ہو؟'' اسے بھی انجی کی عادت کا پتا تھا۔ اس ظلم پر پریشان ہوکر چلا اٹھی۔
''ماننا ہی پڑتی ہے۔'' انجی نے آہ بھری۔
''اتنی فرماں بردار ہوگئی ہو؟''
''ارے نہیں بھئی۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ان کے ساتھ تو مہینے میں ایک بار ہی جانا ہوتا ہے۔ ویسے اکیلی تو میں ہفتے میں دس چکر بازار کے لگالیتی ہوں۔'' انجی نے قہقہہ لگایا اس کی بھی جان میں جان آئی۔
''انجم! میں چائے کا انتظار کررہا ہوں۔'' وہ اظہر کی آواز سیل پر باخوبی سن رہی تھی۔
''چائے ہی ہے نا کوئی دوا تو نہیں کہ ٹائم آگے پیچھے ہوگیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ بنا دیتی ہوں۔'' انجی نے زمانے بھر کی بے زاری لہجے میں سمو کر میاں جی کو جواب دیا پھر بولی۔
''اچھا شفو! جی تو نہیں چاہ رہا مگر یہ ازدواجی زندگی کے مسئلے۔ جب تک چائے نہیں حلق سے اترے گی انھیں سکون کہاں آئے گا۔ بند کرتی ہوں پھر فرصت سے بات کریں گے۔''
''بے چاری انجی یہ اظہر تو پہلے دن سے ہی سب کو کچھا کھڑا اور خشک مزاج لگا تھا۔ شکر ہے بھابھی بتا رہی ہیں شہر یار بہت خوش اخلاق ہے۔'' مگر شہر یار کے بااخلاق ہونے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنا اظہر کی بداخلاقی پر رنج تھا۔ وہ رات جب تک سو نہیں گئی۔ انجی کی ویران ناکام ازدواجی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔

❁ ❁ ❁

اس کی بات پکی ہوئی تو کچھ ہی دنوں کے بعد شادی کی ڈیٹ کا تقاضا بھی ہونے لگا۔ اصل میں شہر یار کی والدہ کو اپنے بڑے بیٹے کے پاس جانا تھا۔ ان کا ارادہ تقریباً چھ ماہ وہیں رہنے کا تھا اور جانے سے پہلے وہ شہر یار کا گھر بسا دینا چاہتی تھیں۔
امی ابا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس روز وہ بھابھی اور امی سے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے کرتی رہیں۔ انہوں نے بھابھی کو شہر یار کی پسند ناپسند کے بارے میں بتایا اور بری کے لیے شفق کی رائے معلوم کرنا چاہی۔
''آنٹی! آپ جو بھی بنائیں گی۔ ہمیں پسند ہوگا۔'' ارم نے کہہ دیا کہ وہ جانتی تھی شفق کو ان باتوں کا کچھ اتنا سینس نہیں۔ پہلے انجی کی رائے چلتی تھی۔ اب وہ بھابھی کے ساتھ جا کر انہی کے مشورے سے

خریداری کیا کرتی تھی۔

''اتنی بھی کیا جلدی ہے۔'' ان کے جانے کے بعد شفق نے اعتراض کیا۔

''تمہیں اپنے گھر جانا ہے بیٹا! جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔''

''اچھا تو پھر میں ریڈ کلر کا غرارہ بنواؤں گی۔'' جھٹ ضد چھوڑ کر فرمائش کر دی۔

''ریڈ کلر شہریار کو پسند نہیں ہے ابھی ابھی آنٹی بتا کر گئی ہیں۔'' ارم نے بتایا۔

''میں ریڈ غرارہ ان کے لیے نہیں اپنے لیے بنوا رہی ہوں۔'' انداز اطلاع دینے کا سا تھا، ارم کو ہنسی آ گئی جبکہ امی کچھ جز بز سی ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں پھر بھابھی سے بولیں۔

''سمجھاؤ اسے اور یہ بات اچھی طرح اس کے دماغ میں ڈال دو۔ جو کچھ شہریار کو پسند نہیں، وہ جہیز میں شامل نہیں ہوگا۔''

''اچھا اور جو وہ صاحب فرما دیں مجھے شفق پسند نہیں تو کیا مجھے بھی کٹ کر دیا جائے گا۔''

''اوہو! احمق لڑکی! اب اس گھر میں تھوڑے دن کی مہمان ہو۔ میں تمہیں سخت سست سنانا نہیں چاہتی مگر تم ہو کہ برابر میرا بلڈ پریشر ہائی کر رہی ہو۔ عقل کے ناخن لو۔ اب تمہیں ایک گھر سنبھالنا ہے۔''

''ہاں تو سنبھال لوں گی۔ یہ کوئی مشکل تھوڑا ہی ہے۔ کون سا گھر سر پر اٹھا کر رکھنا ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔ امی سر جھٹک کر کچن میں چلی گئیں۔

''پلیز بھابھی! آپ کو پتا ہے مجھے ریڈ کلر اچھا لگتا ہے اور دلہن تو سجتی ہی ریڈ کلر میں ہے بس آپ امی کو سمجھائیں۔ بنوا دیں مجھے ریڈ غرارہ۔''

''شفق! دلہن اپنے دولہا کے لیے ہی سجتی سنورتی ہے نا۔ تو اگر دو کو ہی روپ نہ بھائے تو کیا فائدہ۔''

''کیوں نہ بھائے، دیکھیے گا کتنا اچھا لگے گا مجھ پر یہ کلر۔''

''مگر اسے یہ کلر پسند ہی نہیں ہے۔ پہلی ہی اسٹیج پر اس کی بات رد کرو گی تو وہ کیا سوچے گا۔''

''ہاں بس آپ تو چاہتی ہیں میں ساری عمر اس کے اشاروں پر ناچتی رہوں مگر یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آخر میں بھی انسان ہوں میری اپنی بھی تو کوئی سوچ ہے۔ یوں ذرا ذرا سی بات پر پابندی نہیں نہیں۔ مجھے انجی نہیں بننا۔''

''یہ انجی کا ذکر کہاں سے آ گیا اور کیا ہوا ہے تمہاری انجی کے ساتھ۔ میں نے تو اسے شادی کے بعد خوش باش ہی دیکھا ہے۔''

''ہونہہ خوش باش، اس سڑیل بدمزاج کے ساتھ۔ یہ تو حوصلہ ہے میری پیاری انجی کا، جو ماں باپ کی عزت کی خاطر سب کچھ چپ چاپ سہے جا رہی ہے۔'' اس نے آہ بھری۔

''اچھا، اچھا اگر انجی جیسی لڑکی خود کو بدل سکتی ہے اپنے گھر کو بچانے کے لیے شوہر کی مرضی کے مطابق ڈھل سکتی ہے تو پھر تم کیوں انکاری ہو رہی ہو؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا! انجی جیسی لڑکی! میری دوست کوئی ایسی ویسی نہیں ہے۔''

''ہاں ہاں سرخاب کے پَر لگے ہیں اس کی دوستی میں۔ تم بھی کس کے ساتھ سر کھپا رہی ہو ارم!

ساری دنیا میں خرابی ہو سکتی ہے مگر انجی میں نہیں۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ ایک شہر میں رہنے کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ تم وقت بے وقت انجی کے گھر میں گھسی رہو یا اسے اپنے ہاں آنے کی دعوتیں دیتی رہو۔ اگر شہریار یا اس کی والدہ نے مجھ سے اس سلسلے میں شکایت کی تو یاد رکھنا۔ میں بالکل لحاظ نہیں کروں گی تمہارا اکھل کر ان کا ساتھ دوں گی۔''

''آپ نا بھی کہیں تب بھی مجھے پتا ہے ساری دنیا کی مائیں بیٹیوں کی سائیڈ لیتی ہیں اور آپ۔۔۔'' وہ سر جھٹک کر بسورنے لگی۔

''ارم! تمہیں اس کے ساتھ سر کھپانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ بس جہیز کے کپڑوں میں ایک بھی ریڈ کلر کا جوڑا نہیں بنے گا۔ ہاں بعد میں میاں کو راضی کر کے چاہے بیسیوں بناتی رہے۔''

امی ہدایات جاری کر کے پھر کچن میں چلی گئیں۔ وہ پیر پٹختی اپنے کمرے میں آ گئی۔ ایک دو روز اس بات کا سوگ بنایا پھر عادت کے مطابق بھول گئی۔

❁ ❁ ❁

اور جب شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ سب سے پہلا فون انجی کو کیا۔ اس کا جواب سن کر سخت مایوسی ہوئی۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا آج کل اس حالت میں ہو۔''

''پہلے کوئی سیریس بات نہیں تھی۔ یہ تو ابھی ڈاکٹر نے سفر سے منع کیا ہے۔''

''ہائے میرے اللہ! کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟'' وہ تو دہل گئی۔

''یہ نو مہینے خطرے کے ہی تو ہوتے ہیں۔ اب تم خود شادی شدہ ہونے جا رہی ہو۔ جب اس کنڈیشن سے گزرو گی تب پتا چلے گا۔''

''انجی میں نے تو سوچا تھا تمہیں پہلے ہی آنے کا کہوں گی۔ شادی کی ساری شاپنگ تمہاری پسند سے کروں گی مگر ہائے قسمت!''

''تو اور کیا مجھے بھی تمہاری شادی کا بڑا انتظار تھا مگر سب کچھ اپنے اختیار میں کب ہوا کرتا ہے۔'' انجی نے بھی آہ بھری۔

پھر اس کے جہیز کی ساری تیاری امی اور بھابھی نے کی، درمیان میں صائقہ نے بھی اسلام آباد سے ایک دو چکر لگائے اور ان کی مدد کی۔ شفق کی رائے ان تینوں میں سے کسی کے لیے کچھ خاص معتبر نہ تھی اور یوں بھی وہ لباس کے معاملے میں ہمیشہ دوسروں کی پسند پر ہی انحصار کرتی آئی تھی۔

شادی کی تقریب انجی کے بغیر کس قدر پھیکی اور ادھوری تھی۔ یہ بس شفق ہی جانتی تھی۔ مہندی کی شام بھی انجی کا فون آیا اور جب وہ دلہن بنی میرج ہال کے خوب صورت ماحول میں بیٹھی تھی تب بھی انجی نے اسے یاد کیا مگر امی نے خود ہی کال ریسیو کی اور اسے بات بھی نہیں کرنے دی۔

بارات میں زیادہ لوگ نہیں تھے اور جب وہ لاہور اپنے گھر میں آئی تو یہاں بھی سکون کا احساس تھا۔ اس کا کمرا بڑی سادگی کے ساتھ سیٹ کیا گیا تھا۔

''لو بھلا لگتا ہے یہ نئی دلہن کا کمرا ہے۔ کچھ تو چمک دمک، کوئی ہار پھول مگر کچھ بھی نہیں سجایا۔''

اسے بھاری پردے، دبیز قالین، قیمتی شوپس متاثر نہیں کر سکے وہ اپنے محلے میں ہر لڑکے کی شادی پر جو اس کی دلہن کے لیے کاغذی پھولوں چمک دمک والی پنیوں سے جو مسہری تیار کی جاتی تھی، وہ اسے بہت اچھی لگتی تھی وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی جب وہ دلہن بن کر سسرال میں اترے گی تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

''ٹی پنک غرارہ سیٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔'' یہ سب نے کہا تھا مگر دل سے ریڈ غرارہ نہ پہن سکنے کا دکھ کم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو امی کی وجہ سے میں ضد نہیں کر سکی مگر اب پوچھوں گی شہریار صاحب سے وہ دل میں تہیہ کر کے آئی تھی۔ مگر شہریار اتنی پیاری نیچر والا اور اتنا اچھا ہوگا یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ بات پکی ہونے کے بعد ایک دو بار فون پر بات تو ہوئی تھی مگر تب اس نے حال احوال پوچھا اور بس مگر یہ جورو برو تھا اس نے منٹوں میں شفق کو اسیر کر لیا تھا۔

صبح وہ موتیوں کا کام والا نیلا سوٹ پہنے بڑی مطمئن اور مسرور بیٹھی چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔

''ناشتا بھی تو کرو نا! یہ اتنا کچھ تمہارے اعزاز میں ہی سجایا ہے ورنہ میں تو ناشتے میں ایک گلاس دودھ، سلائس اور فرائی ایگ لینے کا عادی ہوں۔''

''کیا، آپ ایسا سڑا ہوا ناشتا کرتے ہیں اور پلیز اب مجھے مجبور نہ کیجیے گا کہ میں بھی ایسا ناشتا کروں۔''

''نہیں بھئی میں بیگم صاحبہ کو بھلا کس طرح مجبور کر سکتا ہوں۔ آپ کا جو جی چاہے ناشتے میں لیں۔ حکم کریں گی تو ایک دن بازار سے حلوہ پوری، دوسرے دن نان چھولے، تیسرے دن نہاری پراٹھا، چوتھے دن سری پائے، پانچویں دن۔۔۔''

''بس بس، رہنے دیں۔ یہ آپ شوہر حضرات صرف باتیں ہی کرتے ہیں ورنہ اپنی مرضی کے بغیر بیوی کا سانس بھی لینا پسند نہیں کرتے۔''

''اوہ میرے خدا! کس قدر غلط فہمیاں پال رکھی ہیں دل میں۔ کس قسم کے شوہر حضرات کو دیکھتی رہی ہو اور کہاں ملیں ایسی بیویاں جن کی سانسوں کی آمد و رفت پر بھی پابندی تھی۔''

''اب آپ اپنی مثال ہی لیجیے۔'' تیکھی نظروں سے شہریار کو دیکھا وہ تو اچھل پڑا۔

میری مثال۔۔۔ ایک رات کی دلہن اور یہ کیا کہہ رہی ہے۔

''مجھے کتنا شوق تھا شادی کے روز ریڈ غرارہ پہنوں مگر آپ نے پابندی لگا دی۔''

''اوہ!'' اس نے ہونٹ سکیڑے۔

''بہت زور دیا میں نے مگر امی اور بھابھی نہیں مانیں۔ کہنے لگیں جب شہریار کو ہی یہ کلر پسند نہیں تو پھر تم کیوں پہنو گی یعنی کہ یہی مطلب ہوا نا کہ اب میری پسند ناپسند ختم ہو چکی ہے جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔''

''اوہو باخدا مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ ریڈ آپ کا فیورٹ کلر ہے۔ اصل میں بچپن میں چاچیوں، مامیوں کو اسی کلر کو پہنے عجیب سا میک اپ کیے دلہن بنے خوف ناک صورتِ حال میں دیکھا ہے۔ وہ صورتیں میرے ذہن پر نقش ہو چکی ہیں، نہیں چاہتا تھا کہ میری بیوی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی بن

جائے۔ یار! دنیا میں اتنے خوب صورت کلر ہیں پھر یہ چیختا چلاتا کلر ہی کیوں؟ اب کل تم ٹی پنک پہنے اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں کہ نظریں ہٹانا مشکل تھا۔ ہر بندہ تمہیں سراہ رہا تھا اور میں خود کو خوش نصیب تصور کر رہا تھا کہ تم میری شریکِ حیات جو بن گئی تھیں۔'' شہریار نے کچھ یوں سراہا کہ وہ اپنا گلہ اور دکھ بھول ہی گئی۔

''مجھے لگتا ہے ابھی تک بچپنا بہت ہے تم میں۔'' جب وہ اس موضوع کو بھول کر اورنج جوس لینے کی تیاری کر رہی تھی شہریار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''ہاں تو اماں کے آنگن سے اٹھ کر ادھر آئی ہوں۔ بی اے کے پیپر دے کر ابھی کمر سیدھی کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ رشتہ طے ہو گیا۔ اپنے گھر کی سب سے چھوٹی بیٹی، پہلے لاڈ اٹھانے کو امی اور باجی تھیں پھر بھابھی بھی آ گئیں تو میں کہاں سے سوبر ہوتی اور ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔''

''اچھا اس کا مطلب ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چانسز ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرا کر بولا۔

''اچھا میں ذرا انجی کو فون کر لوں۔''

''انجی۔۔۔ یہ کیا نام ہے اور پتا بھی نہیں چل رہا محترمہ ہیں کہ محترم۔''

''انجم نام ہے۔'' انجی کا مذاق اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا سنجیدگی سے وضاحت کی۔

''چلو نام بتا کر تو معاملہ اور بھی گمبھیر کر دیا ہے۔''

''اوہو دوست ہے میری، اسی شہر میں بیاہی ہوئی ہے۔''

''اچھا کمال ہے اس شہر میں۔'' اس نے آنکھیں پٹپٹا کر حیرت کا اظہار کیا کہ اسے شفق کا ایک دم سے خفا ہو جانا مزا دے گیا تھا۔

اس نے شہریار کے انداز کو دیکھا ضرور مگر اس وقت انجی یاد آ رہی تھی دوسری کوئی بات کیے بغیر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی، آنے والی ملازمہ تھی اور شہریار کی والدہ کا پیغام لائی تھی وہ ان دونوں کو بلا رہی تھیں۔

''کچھ مہمان آئے ہیں جی۔ اصل میں اسی لیے بلایا ہے۔'' وہ وضاحت کر رہی تھی۔ شہریار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے کر چل پڑا۔

''انجی کو فون'' وہ بس سوچ کر رہ گئی۔ پارلر جاتے ہوئے اس کی جٹھانی نے ہی ضروری سامان ساتھ رکھا اور اس میں اس کا سیل فون نہیں تھا۔

تیار ہو کر وہ میرج ہال پہنچی۔ اس کے میکے سے ارم بھابھی، بھیا اور باجی کچھ ہی دیر پہلے فیصل آباد سے سیدھے ادھر ہی پہنچے تھے۔ اس کی ساس نے انہیں فریش ہونے کو کہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ انجی کیوں نہیں آئی؟ اسے تو اب تک ضرور پہنچ جانا چاہیے کہتی تو یہی تھی ٹاؤن شپ، جو ہر ٹاؤن کے بالکل برابر میں ہے پھر اتنی دیر، ابھی بھابھی یا باجی ادھر آتی ہیں تو کہتی ہوں انجی سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ شہریار آ کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''تمہیں پتا ہے تم کتنی خوب صورت لگ رہی ہو اور ساتھ ہی کسی گہری سوچ میں گم، یقیناً میرے

بارے میں ہی سوچ رہی تھیں نا!''

''نہیں وہ انجی ابھی تک نہیں آئی۔''

''اوہو! کون ہیں یہ محترمہ جو میرے حق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں۔ یاد رکھو پرنسس! اب تمہاری سوچوں پر صرف ہمارا قبضہ ہونا چاہیے۔''

''مگر اس وقت مجھے انجی کی فکر ہو رہی ہے اس کی طبیعت بھی اچھی نہیں ہے نا۔''

شہریار کے کچھ کہنے سے پہلے مہمان اسٹیج کی طرف آنے اور ان دونوں سے ملنے لگے۔ اس کی نگاہیں ساری تقریب میں انجی کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نہیں آئی اور اسے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خدا خیر کرے۔ اس کے ساتھ کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گیا۔

میرج ہال سے گھر آتے اسے رات کے دو بج گئے۔ میکے والے وہیں سے رخصت ہوئے۔ شہریار سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ دونوں کل فیصل آباد آئیں گے۔

''صبح پہلے میں انجی کی طرف جاؤں گی۔ اس نے اپنا ایڈریس تو لکھوایا تھا اگر ایڈریس اِدھر اُدھر بھی ہو گیا ہے تو فون کر کے دوبارہ پوچھ لوں گی۔''

وہ یہ ارادہ کر کے لیٹی تھی مگر ابھی صبح کے سات ہی بجے تھے کہ اس کی ساس نے دروازہ بجا کر جگا دیا۔

''بیٹا! تمہاری امی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے کل لاہور نہیں آسکیں، ان کی وجہ سے تمہارے ابا کو بھی فیصل آباد رکنا پڑا۔ وہ منتظر ہوں گے۔ آپ دونوں جلدی سے ناشتا کر کے نکلنے کی تیاری کرو۔''

اور اسے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ کیا سوچے گی انجی! وہ نہیں آئی اور میں نے اس کے نہ آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ وہ سیل تلاش کرنے لگی۔ مجھے کم از کم اسے فون تو کر لینا چاہیے۔ سیل پتا نہیں کدھر تھا اس نے پی ٹی سی ایل کو استعمال میں لاتے ہوئے سوچا مگر بیل ہوتی رہی۔ کسی نے اٹھایا نہیں، ابھی شاید وہ سو رہے ہوں گے۔ مایوس ہو کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

❁ ❁ ❁

فیصل آباد وہ ایک دن ہی ٹھہرے کہ شہریار کے بھائی اور بھابھی کو واپس سعودیہ جانا تھا۔ شہریار نے ابا سے وعدہ کیا۔ ہم جلدی ہی دوبارہ آئیں گے اور پھر بہت سے دن رکیں گے۔

''میں اتنے ڈھیر سارے کپڑے لے کر آئی تھی۔ آپ نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ ہمیں ایک ہی روز ٹھہر کر واپس آجانا ہے۔''

''تم نے اس بارے میں مجھ سے پوچھا ہی کب تھا۔''

''مگر بتانا تو آپ کا فرض تھا ویسے بھی یہ پروگرام آپ نے اور آپ کی امی نے بنایا تھا، مجھے تو بس یہی کہا گیا تیار ہو جاؤ اور میں تیار ہو گئی۔ اتنے شوق سے میں یہ سارے کپڑے لے کر آئی تھی۔''

''یہ سب وہاں بھی تو پہنا جا سکتا ہے۔'' اب کہ شہریار خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔

''وہاں پہن کر کسے دکھاؤں گی۔ یہاں تو میری اتنی ساری سہیلیاں ہیں۔ باجی بھی ابھی یہیں موجود ہیں بھابھی اور امی ہیں۔''

شہریار نے گہری سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ پھر باقی کا جو ایک گھنٹہ وہ یہاں ٹھہرے، خاموش ہی رہا اور راستے میں بھی اس نے کوئی بات نہیں کی۔ شفق بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کو محسوس نہیں کیا کچھ ہی دیر بعد سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر سو گئی۔ آنکھ جب ہی کھلی جب وہ گھر کے پورچ میں گاڑی لانے کے بعد اس کا شانہ ہلا رہا تھا۔

''اوفوہ! اتنی جلدی لاہور آ بھی گیا۔''

''جی اب باقی کی نیند بستر پر پوری کر لیجیے گا۔''

وہ دروازہ کھولے منتظر تھا اسے اترنا پڑا، اسی طرح نیند میں جھومتی جھامتی اپنے کمرے تک آئی اور شہریار کی آمد سے پہلے ہی بستر پر گر کر پھر سونے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ بیگ لے کر اندر آیا اسے بیڈ پر دراز پا کر ٹھٹکا۔

''شفق! امی اپنے کمرے میں ہماری منتظر ہیں۔ انہیں سلام تو کر لو۔''

''اوہ!'' اسے جھٹکا لگا۔

''ہائے وہ کنوارپنے کا زمانہ۔ اپنی مرضی کے دن اور راتیں۔۔۔'' بڑے برے موڈ کے ساتھ وہ اٹھ بیٹھی۔

امی واقعی منتظر تھیں اور ظاہر ہے، سلام کر کے فوراً تو اپنے کمرے کو روانہ نہیں ہوا جا سکتا تھا، انہیں وہاں کچھ دیر بیٹھنا بھی تھا۔

❁ ❁ ❁

صبح ناشتے کے بعد اس نے ایک بار پھر انجی سے رابطہ کیا تھا اور اس کا یہ کہنا میں اس وقت فیصل آباد میں ہوں، اس کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہیں تھا۔

''کب گئیں تم فیصل آباد؟''

''میں تو رات ہی وہاں سے آ رہی ہوں اور آج صبح پانچ بجے پہنچی ہوں۔''

''مگر کیوں، انجی! میں نے ولیمہ کے روز بھی تمہارا اتنا انتظار کیا پھر بعد میں بھی تمہیں فون کرتی رہی۔ تمہارا کوئی جواب مجھے موصول نہیں ہوا۔ آخر بات کیا ہے؟''

''کیا بتاؤں شفق! بہت پریشان ہوں، ڈاکٹر نے سیزیرین کا کہا ہے۔ امی کو پتا چلا تو فیصل آباد لے آئیں کہ لاہور میں پھر میری دیکھ بھال کون کرتا۔ بس دعا کرنا میرے لیے۔''

''اللہ تمہیں صحت دے انجی! میرے حصے کی خوشیاں بھی تمہیں مل جائیں۔''

اس نے پورے خلوص سے کہا۔ بظاہر اخبار دیکھتے شہریار نے اس دعا پر سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر سر جھٹک کر دوبارہ اخبار دیکھنے لگا۔

''تم ادھر لاہور ہی میں رہتیں میں جو آ گئی ہوں۔ میں تمہاری خدمت کرتی۔''

''ارے نہیں شہریار بھلا کیوں منع کرتے وہ ایسے تنگ دل نہیں ہیں۔''

''بالکل میں ان دو تین روز میں ہی ان کو جان گئی ہوں۔'' شہریار کو ہنسی آ گئی جسے چھپانے کو اخبار چہرے کے آگے کر لیا۔

انجی پتا نہیں کیا کیا بتاتی رہی فکرمندی سے اس کے چہرے کے زاویے بنتے اور بگڑتے رہے۔

''بس کرو اب، ورنہ تمہارا چہرہ بالکل ہی بگڑ جائے گا۔'' اس نے احساس دلایا تو وہ گھور کر رہ گئی۔

''انجی فیصل آباد چلی گئی ہے۔'' رابطہ منقطع کر کے اس نے اپنی جانب سے بڑی اہم اطلاع دی تھی۔

''تو کوئی بات نہیں۔ فیصل آباد کوئی یورپ میں تھوڑا ہی ہے۔ جب تمہارا جی چاہے گا جا کر مل لینا۔''

''پتا نہیں کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں۔ میں فیصل آباد تھی تو وہ لاہور۔ میں لاہور آئی ہوں تو وہ اُدھر۔۔۔''

''اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو کہیں آؤٹنگ کا پروگرام بنایا جائے۔''

''پلیز اس وقت جی نہیں چاہ رہا۔'' مگر جب یہی بات شہریار کی والدہ نے بھی ان دونوں سے کہی تو اسے تیار ہونا پڑا۔

❁ ❁ ❁

ہنی مون پیریڈ پھر شہریار کی والدہ کی سعودیہ روانگی جب وہ انجی سے ملی تب اس کی شادی کو پورے دو ماہ ہو رہے تھے اور انجی کا دوسرا بچہ بھی دو ہی ماہ کا ہو رہا تھا۔ شفق نے اس ننھی گڑیا کے لیے خوب شاپنگ کی تھی۔

انجی کے ہاں جانے کے لیے وہ دل سے تیار ہو رہی تھی اور خوشی اس کے ہر انداز سے چھلک رہی تھی۔

''بہت بچپنا ہے تم میں۔'' یہ بات اکثر شہریار کہتا تھا اور آج بھی کہہ رہا تھا۔

''اس میں بچپنے والی کیا بات ہے؟'' اس نے شانے اچکائے۔

''تو اور کیا بات ہے بھئی۔ کبھی تم میرے لیے تو اس طرح تیار نہیں ہوئیں۔''

''آپ کا اور میرا ساتھ دو ماہ کا ہے، جبکہ انجی کی اور میری دوستی بہت پرانی ہے۔''

''یعنی جب میرا اور تمہارا ساتھ بھی اتنا ہی پرانا ہو جائے گا تب تم میرے لیے بھی یونہی تیار ہوا کرو گی۔''

''یہ تو اس وقت کے تعلقات پر منحصر ہوگا۔'' وہ ہنسی۔

''ویسے تب کتنا عجیب سا لگے گا نا جوان بچوں کی اماں اور ایسی تیاری۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ وہ جھینپ کر رہ گئی۔ سر جھٹک کر گجرے پہننے لگی۔

''ویسے یار! مجھے میک اپ میں لت پت، شوخ شوخ رنگوں میں لپٹی خواتین کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتیں اور تمہیں تو ان چیزوں کی حاجت بھی نہیں۔ سادہ ہی بہت پیاری لگتی ہو۔''

''مگر مجھے میک اپ کرنا کھلے کھلے شوخ رنگ پہننا بہت بہت اچھا لگتا ہے۔''

''اوہ خدایا! شفق کم از کم گولڈ کا یہ اتنا بھاری سیٹ پہن کر تو مت جاؤ۔''

''تو کیا میں نے یہ لاکر میں رکھنے کے لیے بنوائے ہیں۔ یہ پہننے کے لیے ہی ہوتے ہیں

جناب!''

وہ بس گہری سانس لے کر رہ گیا کہ جانتا تھا یہ وہ معاملات ہیں جن میں شفق اس کی بالکل نہیں چلنے دے گی۔

انجی کی رہائش ان کے گھر سے دور نہیں تھی، ایڈریس بھی مشکل نہیں تھا۔ جب وہ دونوں اس کے ہاں پہنچے۔ وہ چھوٹی بچی کو سلانے کے بعد اب بڑے والے بیٹے کو تیار کر کے فارغ ہوئی تھی۔ اسمارٹ، سانولی سلونی، بڑی بڑی کالی آنکھوں والی انجی جس کے سیاہ چمک دار بال بے حد لمبے تھے۔ وہ یقیناً کچھ دیر پہلے نہائی تھی۔ بالوں کو ڈھیلی سی چوٹی کی صورت دے کر کمر پر گرایا گیا تھا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک شاید آنکھوں میں کاجل ڈالا تھا یا اس کی آنکھیں ویسے ہی اتنی کالی تھیں، اس نے ایپل گرین سوٹ پہن رکھا تھا جس پر ہم رنگ موتیوں اور دھاگے کا انتہائی نفیس کام تھا۔ گلے میں ہلکا سا گولڈ کا لاکٹ، کانوں میں خوب صورت ڈیزائن کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس، بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ایک انگوٹھی اور بازو میں نازک سی چار چوڑیاں۔

وہ تو انجی کی گردان سے اس سے ملے بغیر ہی اکتا گیا تھا مگر اسے دیکھ کر خوش گوار حیرت کا احساس ہوا وہ بالکل یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ شفق جیسی کچھ کچھ بے وقوف اور جذباتی سی لڑکی کی دوست اس سے بالکل ہی مختلف اور اتنی پروقار شخصیت کی مالک ہوگی۔ شفق جاتے ہی خوشی سے چیخ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔ اس نے مسکرا کر شفق کے گال پر بوسہ دیا اور شادی کی مبارک باد دی تھی۔

''ہائے انجی! تم کتنی کمزور ہو رہی ہو۔ مجھے لگتا ہے کسی نے بھی تمہاری ٹھیک طرح سے کیئر نہیں کی۔ تم خوامخواہ ہی ادھر چلی گئیں یہاں میں جو تھی تمہاری دن رات خدمت کرتی۔''

شفق بولتی رہی اس کے بیٹے کو گود میں بٹھا کر بار بار اس کا منہ چومتی رہی جبکہ انجی شاید شہریار کی وجہ سے جھجک رہی تھی۔

''تمہارے وہ سڑیل میاں دکھائی نہیں دے رہے۔''

شفق نے آگے کو جھک کر کچھ دھیمے لہجے میں پوچھا۔

شہریار کو اس کا یوں کہنا اچھا نہیں لگا مگر فی الحال وہ ٹوکنا نہیں چاہتا تھا۔

''تمہیں پتا ہے۔ بزنس مین ہیں اور بزنس مین کو اپنے بزنس کے آگے کچھ بھی عزیز نہیں ہوتا۔ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''اوہ تم نے بتایا نہیں۔ میں تمہاری عزیز ترین سہیلی شادی کے بعد پہلی بار اپنے میاں کے ساتھ آ رہی ہوں۔''

''بتایا تھا شفو! مگر میں ان پر دباؤ تو نہیں ڈال سکتی نا!'' اس نے رسان سے کہا۔

''واہ کیوں نہیں ڈال سکتیں اب تم میرے گھر آ رہی ہو اور یہ میرے صاحب آفس جانے کا موڈ بنائے بیٹھے ہوں، میں تو قیامت اٹھا دوں کبھی نہ جانے دوں کیوں شہریار؟''

''واہ رائے بھی لی تو کس بات پر۔'' شہریار نے انجی کی طرف دیکھا اس نے بھی نگاہ اٹھائی۔ دونوں ہی مسکرا دیے یقیناً شفق کے بچپنے پر یا اس کی سادگی پر۔

''اپنی گڑیا تو دکھاؤ۔ میں تو اس کے لیے اتنی ساری شاپنگ کر کے آئی ہوں سچی جب پتا چلا کہ تمہارے ہاں بیٹی ہوئی ہے انجی! تو میں بتا نہیں سکتی مجھے کتنی خوشی ہوئی، یہ بتاؤ بچی ہے کس پر تم جیسی ہے یا تمہارے سڑے ہوئے میاں جیسی۔''

انجی نے پھر شہریار کی جانب دیکھا اور اسے متوجہ پا کر شرمندہ ہوگئی۔

''آؤ تمہیں اس کے پاس لے چلتی ہوں۔ سو رہی ہے نا ابھی۔'' اس نے دھیرے سے کہا اور شفق کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ٹھہرو نا یہ سب تو اٹھا لوں، آخر بے بی کے لیے ہی لائی ہوں۔'' ہاتھ چھڑا کر وہ پیکٹس سمیٹنے لگی۔

ڈرائنگ روم سے دونوں بیڈ روم میں آ گئیں۔ لگتا تھا آج انجی کی کام والی ماسی نہیں آئی تھی۔ ڈرائنگ روم تو صاف تھا مگر کمرے کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

خیر اس نے توجہ نہیں دی جا کر بچی کے کاٹ پر جھک گئی۔ ''آرام سے اسے جگا نہ دینا۔ جاگتی ہے تو بہت شور مچاتی ہے اور مجھے یہ بتاؤ کیسا ہے تمہارا میاں؟ دیکھنے میں تو بہت اچھا لگ رہا ہے تم نے بتایا تھا اسے سنجیدہ مزاج، ذمے دار خاموش طبع لڑکیاں اچھی لگتی ہیں حالانکہ اس کے اپنے مزاج میں تو مجھے اظہر والی سنجیدگی محسوس نہیں ہوتی۔''

''شکر ہے خدا کا اظہر بھائی سے بالکل مختلف مزاج ہے۔ اب میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ کتنی شوخ، کیسی زندہ دل ہوا کرتی تھی اور اب کیسی سنجیدہ سی دکھائی دے رہی ہو، نہ وہ زیور نہ لباس کا کلر نہ میک اپ، اب مجھے دیکھو شہریار کو یہ سب پسند نہیں مگر مجھے منع بھی نہیں کرتے۔ دیکھ لو کتنی تیاری سے آئی ہوں۔'' اس نے اپنے شاکنگ پنک کلر کے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''تمہارا یہ سوٹ مجھے بہت اچھا لگا بنوایا ہے یا خریدا ہے؟''

''باجی اسلام آباد سے لائی تھیں۔ تمہیں پسند آیا۔ تم لے لو۔''

''ہاں میرے سسرال میں ایک شادی ہے، اظہر کو تو تم جانتی ہو۔ کنجوس مکھی چوس جتنی قیمت کا یہ سوٹ لگ رہا ہے خریدنا تو دور کی بات وہ تو قیمت سن کر ہی بے ہوش ہو جائیں گے پھر یہ کلر بھی انہیں پسند نہیں آئے گا بس میں تم سے لے کر پہن لوں گی پھر واپس کر دوں گی۔''

''میرے جہیز اور بری میں ایک سے بڑھ کر ایک جوڑے ہیں تم میری طرف آؤ گی تو سب دکھاؤں گی بس پھر جو بھی پسند آئے لے لینا۔''

''چلو یہ ٹھیک رہے گا اور یہ بتاؤ میاں کو زیادہ سر تو نہیں چڑھا لیا میری طرح۔''

''ارے انجی! شہریار تو خود ہی اتنی سویٹ نیچر کے مالک ہیں کبھی رعب ڈال کر بات کرتے ہی نہیں اور میری ہر بات ماننا تو جیسے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔''

''زیادہ خوش ہونے کی بات نہیں بے وقوف شادی کے شروع دنوں میں اسی فیصد مرد ایسے ہی ہوا کرتے ہیں مگر سال گزرتا نہیں اپنا اصلی روپ دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔''

''میرا نہیں خیال شہریار ایسے ہو سکتے ہیں۔''

ان میں باتیں ہو رہی تھیں کہ انجی کے کام والی ماسی آ گئی۔

''رکھی! تم صفائی رہنے دو ویسے بھی فرش تو صاف ہی ہے۔ بس آج کچن کا کام سمیٹ دو۔''

''ٹھیک ہے بی بی! جیسے آپ کی مرضی۔'' اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا ویسے بھی کچن کا کام کرنے کی صورت میں اسے بھی کچھ نہ کچھ حصہ ملنے کی امید تھی۔

''میں نے بازار سے حلیم، چکن کڑاہی اور بریانی منگوالی ہے۔ کھیر بھی لا کر فریج میں رکھ دی ہے۔ تم سلاد اور رائتہ بنا لو۔ اس کے بعد بنٹی کو بھی دیکھ لینا۔ بہت تنگ کرتا ہے۔ ضد پر آتا ہے تو بہلانا مشکل ہو جاتا ہے اسے یہاں قریبی دوکان سے چاکلیٹس اور ٹافیاں دلوا دو۔ آرام سے بیٹھ جائے گا۔ میں اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کر لوں۔'' انجی نے بیڈ روم کی بکھری چیزوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ لپ اسٹک دوبارہ لگائی پھر مڑ کر رکھی سے بولی۔

''پہلے کولڈ ڈرنک اور پھر چائے تو ڈرائنگ روم میں رکھ جاؤ۔ لو باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ ہائے شفو! کیا سوچتا ہوگا تمہارا میاں۔''

وہ جلدی سے رکھی کو ایک بار پھر ہدایت کر کے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھی اندر کا منظر کچھ زیادہ خوش گوار نہیں تھا۔ ان لوگوں کا لایا فروٹ کمرے میں بکھرا ہوا تھا اور اس کا بیٹا موسمی اور سیب ہوا میں اچھال کر کھیل رہا تھا۔

''اوہ بنٹی!'' اس کی آواز بہت اونچی ہونے لگی تھی پھر شہریار کا بروقت خیال آنے پر دبا لی۔

''میں نے تو آپ کے صاحب زادے کو بہت منع کیا ہے مگر یہ مانتا ہی نہیں۔'' شہریار اس کی سرگرمیوں کو یقیناً انجوائے نہیں کر رہا تھا۔

اتنی دیر میں سیب ایک شو پیس پر لگا اور وہ گر کر کرچیوں میں تبدیل ہو گیا۔ انجی نے بند ہونٹوں سے بچے کو بہت کچھ کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر دھکیلنے لگی۔ بچے نے پوری آواز سے رونا اور چلانا شروع کر دیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مار کر چلا رہا تھا اور انجی کے قابو سے باہر ہو رہا تھا خیر اس نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ اسے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔

کھانا کچھ زیادہ پُر لطف نہیں تھا مگر انجی کی باتیں اور اس کی توجہ اس کمی کو پورا کر رہی تھیں۔ وہ کتنی محبت سے ایک ایک ڈش پیش کر رہی تھی اور پھر اس کی باتیں۔۔۔ شہریار بار بار چونک جاتا تھا۔ آج کے دور میں شوہر کے رنگ میں رنگ جانے والی، اس کی آنکھ کے اشارے سے مزاج کا اندازہ لگانے والی عورتیں کہاں تھیں۔

''تمہاری دوست سے مل کر مجھے بہت حیرت ہوئی ہے۔'' واپسی پر وہ کہہ کر شفق کو حیران کر رہا تھا۔

''کیوں؟ حیرت کیوں ہوئی ہے؟ اتنی اچھی تو ہے بے چاری چھوٹے بچوں کی وجہ سے زیادہ اہتمام نہیں کر سکی مگر وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ آج بے چاری کی کام والی بھی اتنی دیر سے آئی۔ پتا نہیں اس نے یہ سب کس طرح کیا ہوگا۔''

''اوہو! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ طبیعت میں، عادات میں تم سے بالکل مختلف ہے، بہت ذمہ دار اور سمجھ دار محسوس ہوتی ہے مجھے۔''

''ہائے سچ! مجھے تو پہلے ہی پتا تھا۔ انجی سے مل کر آپ بھی اس کے گرویدہ ہو جائیں گے۔''

''بچے نے بے چاری کو اچھا خاصا شرمندہ کر دیا، میں تو کب سے اسے منع کر رہا تھا مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔''

''چھوڑیں، بچے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انجی بتا رہی تھی باپ کا بہت لاڈلا ہے۔ بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ خود اسے کسی بات پر ٹوکتے ہیں نہ انجی کو زیادہ روک ٹوک کرنے دیتے ہیں۔''

''یہ رویہ تو بہت غلط ہے۔'' وہ دونوں انجی کی باتیں کرتے ہی گھر تک آئے اور گھر آ کر بھی کئی روز تک ان کے درمیان انجی کا ذکر رہا۔

''تم بھی انجی کی طرح لائٹ کلر پہنا کرو اور جیولری بھی ویسی ہی خرید لو۔'' ایک روز شہریار نے کہا تو اسے انجی کی بات یاد آ گئی۔ شوہر کی ہر بات مان کر اسے سر پر نہ چڑھا لینا۔ جب یہ بات یاد آئی تو اس نے جھٹ نفی میں سر ہلا دیا اور بولی۔

''ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے اور پھر یہ لائٹ سے کلر یہ سادہ سا روپ، یہ انجی کی اپنی پسند تھوڑی ہے۔ یہ تو اس کے میاں کی ضد ہے۔''

''ضد تو تم کہہ رہی ہو نا انجی نے تو اپنی ازدواجی زندگی کے سکھ کی خاطر اسے خوشی سے اپنا لیا ہے۔''

''ہونہہ خوشی! اپنا دل مار کر بھی کبھی کسی کو خوشی ملی ہے۔'' اس نے لپ اسٹک ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخی۔ شہریار خاموش ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

انہوں نے انجی کو اپنے ہاں انوائٹ کیا۔ ''کھانا ہم کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جا کر کھائیں گے۔'' شہریار نے رائے دی۔

''لو یہ کیا بات ہوئی گھر بلائیں پھر یہاں سے کھانا کھلانے کسی دوسری جگہ لے جائیں۔ میں خود سب کچھ گھر میں بناؤں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے پھر مجھے لسٹ بنا کر دے دو۔ ابھی جا کر سب لے آتا ہوں۔''

''آپ اکیلے کیوں میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔''

''تم جا کر کیا کرو گی اتنے سیر سپاٹوں کے بعد بھی تمہارا جی نہیں بھرا۔''

''نہیں مجھے اچھا لگتا ہے بس میں کسی اچھے سے اسٹور سے خود یہ سب خریدوں گی۔''

''اچھا بابا! چلی چلو لیکن اب کوئی کام والا سوٹ پہن کر شوخ سی لپ اسٹک مت لگا لینا۔''

''توبہ ہے۔ آپ کو بھی نا ہر بات پر اعتراض کی عادت ہوتی جا رہی ہے۔ اب میری نئی نئی شادی ہے کپڑے تو میرے پاس ایسے ہی ہوں گے نا، کچھ ہلکے کام والے کچھ بھاری کام والے۔''

''پھر تم نئے لے لو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کسی روز انجی کے ساتھ جا کر شاپنگ کر لوں گی۔'' اس بات پر شہریار نے اطمینان سے سر ہلایا کہ یقیناً انجی اس کی بہت بہتر راہنمائی کر سکتی تھی۔

تین گھنٹے میں سامان خرید کر باہر سے کھانا کھا کر وہ دونوں گھر آئے تو شہریار سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا جبکہ وہ سیل لے کر لاؤنج میں بیٹھ گئی اور انجی سے باتیں کرنے لگی۔ اپنے اور شہریار

کے درمیان کپڑوں پر ہونے والی باتیں بھی بتائیں اور یہ بھی کہ اب وہ انجی کے ساتھ بازار جا کر کچھ سادہ سے کپڑے خریدنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

''تم نے خوامخواہ گھر پر سب ارینج کر لیا کہیں باہر ہی کھانا کھا لیتے اب تم تو پکانے میں ہی لگی رہو گی۔''

''تم بھی میرے پاس کچن میں ہی آ جانا اور یہ دونوں میاں صاحبان اور بچے لاؤنج میں بیٹھیں گے۔''

''ہاں مگر تم پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتیں۔''

''اچھا چلو اب تو میں سب کچھ لے آئی ہوں۔''

''کیا کیا لائی ہو؟'' انجی نے پوچھا۔

''فش، چکن، بیف، نوڈلز، رائس۔'' وہ ایک ایک کر کے سب گنوانے لگی۔

''اتنا کچھ تم کیسے پکاؤ گی؟''

''ارے انجی! میری جان! تم میری فکر نہ کرو۔ تم تو چار سال پہلے بیاہ کر چلی گئی تھیں۔ تمہیں نہیں پتا اس عرصے میں، میں تو کھانا بنانے میں ماہر ہو چکی ہوں۔ میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ تم کھاؤ گی تو داد دو گی۔ ہاں بس ایک بات کا دکھ ہے۔ شہریار کو ہوٹلنگ کا بہت شوق ہے۔ وہ گھر کے کھانے کچھ خاص رغبت سے نہیں کھاتے حالانکہ میرے پکائے کھانوں کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔''

''اس روز میرے گھر کا کھانا تو انہیں اچھا لگا تھا نا؟'' انجی کو وہ سب بتا تو چکی تھی پھر بھی وہ دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

''ہاں ہاں تیز مرچ مسالے انہیں پسند ہیں۔''

اور انجی نے سوچا اسے کہتے ہیں قسمت۔ مجھے گھومنے پھرنے کا باہر کھانا کھانے کا کتنا شوق ہے مگر میرے میاں کے نزدیک گھر کی پُرسکون لائف چھوڑ کر باہر کے ہنگاموں میں پناہ لینا وقت اور پیسے دونوں کا ضیاع ہیں۔

''شادی کے شروع دنوں میں کبھی کھانا باہر کھایا تھا اب تو ترس ہی گئی ہوں۔ اب موقع مل رہا تھا تو اس شفق کی بچی نے مجھ سے پوچھے بغیر فیصلہ کر کے ضائع کر دیا۔ آج ایک چکر پارلر کا لگا لینا چاہیے۔ اسکن کچھ رف ہو رہی ہے۔ نئے جوتے بھی لینے چاہیے ساتھ میچنگ بیگ اور نیل پالش کا لائٹ مگر خوب صورت سا کلر اور جاتے ہوئے پھولوں کا خوب صورت سا بکے لے جاؤں گی۔ باقاعدہ گفٹ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یوں بھی ان کی شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ سب کچھ تو ہو گا ان کے پاس۔''

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ ڈور بیل بجنے لگی۔

''اوہو! کون آ گیا؟'' دروازہ کھولا تو برابر میں رہنے والے احسان صاحب کھڑے تھے۔

''السلام علیکم بھابھی!'' چہرے پر مسکراہٹ، انداز میں بے تکلفی تھی۔

''ارے احسان بھائی! کیسے ہیں آپ؟'' بڑے دنوں کے بعد شکل دکھائی۔

''آئیے نا! باہر ہی کیوں کھڑے ہیں۔ پلیز اندر آ جائیں۔''

"وہ بھابھی! آپ کو تو پتا ہے میری بیوی کا۔" وہ کھسیا کر ہنسے اور انجی کے چہرے پر ایک دم سے ہمدردی کا تاثر لودینے لگا۔

"میں دراصل یہ پوچھنے آیا تھا۔ دو انڈے ہوں گے۔ وہ آج بیگم نے جو کچھ بنایا ہے نا حلق سے اترنا مشکل ہو رہا ہے۔"

"اوہ!" انجی نے افسوس میں ہونٹ سکیڑے پھر بولی۔

"خوش نصیب ہیں روحانہ بھابھی کہ شوہر کو پسند کا کھانا نہ ملا تو پڑوس سے انڈا لینے چلے آئے۔ سچی اگر میرے میاں جیسے ہوں نا۔" سر جھٹکا ایک بار پھر افسوس میں اوہ کیا اور بات ادھوری چھوڑ کچن میں چلی گئی واپس آئی تو انڈے ہاتھ میں تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔

"آیئے نا احسان بھائی! میں آپ کو کھانا بنا دیتی ہوں"

"جی تو چاہتا ہے بھابھی مگر میری بیگم!" عجیب بے چارگی کا احساس دلاتا لہجہ کسی ناپسندیدہ ہستی کا ذکر اور مظلومیت کی انتہا۔

"چلیے ادھار رہا۔ ویسے مجھے بہت ترس آرہا ہے آپ پر، آپ اس وقت بھی آملیٹ لیں گے۔ اتفاق سے آج میں نے سالن نہیں بنایا ورنہ آپ کو ضرور دیتی۔"

احسان مشکور سا چلا گیا یہ سوچتا ہوا کس قدر خوش نصیب ہے اس عورت کا شوہر۔ یہ خیال نہیں آیا پوچھ ہی لے۔ شوہر گھر آنے والا ہوگا۔ ابھی تک سالن نہیں بنایا اسے کیا خالی روٹی پیش کرے گی۔

شفق نے انجی کے لیے بھرپور تیاری کی تھی۔ وہ دو دن پہلے سے ہی کچن میں مصروف ہو گئی تھی اور شہر یار بھی پوری دلچسپی لے رہا تھا اور اس شام اسکائی بلیو ساڑھی جس پر سلور ستاروں کا ہلکا سا کام تھا، سلور جیولری پہنے وہ تین سالہ بچے کے ساتھ شوہر کے بغیر ہی چلی آئی تو دونوں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"اظہر بھائی نہیں آئے؟" شفق نے پوچھ ڈالا۔ جواب میں پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

"ہر شخص شہر یار نہیں ہوا کرتا۔ میری جان! کہ تم نے کہیں چلنے کو کہا اور تیار ہو گیا۔ قدر کرنا سیکھو اس کی۔"

"اوہو، آج تو نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم اصرار کرتیں۔" شفق نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہر بات میں ضد کیوں شروع کر دیتی ہو۔ ہماری دوست آگئیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔" شہر یار نے شفق سے زیادہ انجی کو تسلی دی تھی جو یوں اکیلے چلے آنے پر رنجیدہ تھی (غالباً)

"ممّا! آپ تو کہتی تھیں۔ چاکلیٹ لے کر دوں گی۔" اس کے بیٹے کا موڈ بگڑنے لگا۔

"آیئے اندر چلیے۔" شہر یار کو خیال آیا۔ وہ ابھی تک گیٹ پر ہی کھڑے تھے۔ کتنی بری بات ہے مہمان کو اندر بٹھانے کے بجائے یہیں کھڑے کھڑے سوال و جواب شروع کر دیے جائیں۔ یہ شفق بھی نا بس پوری احمق ہے۔

"ممّا! چاکلیٹ!" اس کا بیٹا اب پیر پٹخنے لگا۔

"آؤ نا! آنٹی دلاتی ہیں تمہیں چاکلیٹ۔" شفق نے بڑھ کر اس عام سی صورت والے سڑیل مزاج بچے کو گود میں بھر لیا اور لگاتار کئی بوسے بھی دے ڈالے۔

"بڑی والی چاہیے۔" اگلی فرمائش ہوئی۔

"وہ بھی ملے گی۔ پتا ہے مجھے بھی چاکلیٹ کا بڑا شوق ہے اور یہ تمہارے انکل بالکل نہیں کھاتے۔ میں بھی تمہاری طرح ضد کر کے لیتی ہوں۔" وہ بچے کو گود میں اٹھا کر کچن کی جانب بڑھتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"پتا نہیں کب سدھرے گی یہ شفو!" اس کی باتوں پر شرمندہ انجی ہو رہی تھی۔

"آئیے۔" شہر یار اسے لے کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا اور بولا "آپ جیسی دوست کی محبت اسے نہیں بدل سکی تو اب کیا بدلے گی۔ پتا ہے کبھی کبھی تو میں اس کی بچکانہ فرمائشوں پر حیران ہو جاتا ہوں۔"

"دراصل گھر میں چھوٹی ہے نا اور سب ہی خوب لاڈ پیار بھی کرتے تھے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو جناب ہم تو زمانے کی ٹھوکروں میں پل کر جوان ہوئے ہیں اور آج تک اچھے دنوں کی امید پر ہی جی رہے ہیں۔"

"آپ اتنی مایوس کیوں ہیں انجی؟ ان شاء اللہ آپ بہت اچھا وقت بھی دیکھیں گی۔"

"میں مایوس نہیں ہوں شہر یار صاحب! اور اب اپنی دوست کو خوش دیکھ کر تو میں سب بھول ہی گئی ہوں۔"

"انجی! بیٹی کو کیوں نہیں لائیں۔ کس کے پاس چھوڑ آئی ہو؟" شفق اس کے بیٹے کو گود میں اٹھائے چلی آئی تھی اور اس وقت بچے کے ہاتھ میں چاکلیٹ کا پیکٹ تھا۔

"وہ ہماری ایک رشتے کی خالہ آئی ہوئی ہیں۔ ان ہی کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ یہ ایک شیطان کیا کم ہے، توبہ شہر یار صاحب! کیا بتاؤں آپ کو، صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ میرے کام ختم ہونے میں نہیں آتے، بس میری عادت ہے ہر چیز کو ہر وقت درست جگہ پر دیکھنا چاہتی ہوں جب تک گھر کا کونہ کونہ چمکا نہ لوں۔ کچن کی ہر شے ٹھکانے پر نہ رکھ لوں۔ مجھے چین ہی نہیں آتا۔"

اور شہر یار کو یاد آ گیا آج صبح شفق نے اس کی تین شرٹیں پریس کر کے اسٹینڈ پر ہی چھوڑ دی تھیں اور اس کے ٹوکنے پر کہا تھا۔

"اوہو آپ ہر بات کو سر پر کیوں سوار کر لیتے ہیں۔ دودھ بوائل کرنے کے لیے رکھا تھا۔ پہلے یہ کام کر لوں دودھ خراب ہوا تو زیادہ نقصان ہوگا۔" اور کچن میں چلی گئی تھی۔

"انجی تمہاری صحت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ تم پہلے پوری طرح صحت یاب تو ہو جاؤ گھر کے کاموں کا کیا ہے۔ یہ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ یوں خود کو ہلکان مت کیا کرو۔" شفق نے ہمدردی سے کہا تھا۔

"تمہیں نہیں پتا جن لوگوں کے مزاج میں نفاست ہو انہیں ہر چیز کو جگہ پر رکھے بغیر چین نہیں آتا۔ میرا تو اپنا مزاج یہی ہے، مگر یہ جو تم ہونا" اس نے شفق کی جانب انگلی سے اشارہ کیا وہ ہنس پڑی اور

بولی۔

''میں خود بھی کوئی پھوہڑ عورت نہیں ہوں جناب! مگر آپ کو چونکہ بیٹھے بیٹھے حکم دینا ہوتا ہے۔اس لیے حد کردیتے ہیں۔''

''اب کل ہی کی لے لو۔رات کو مجھے اخبار میں ایک اداریہ دیکھنا تھا اور وہ اخبار جو اسی روز کا تھا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا۔''

''میں نے کہا تو تھا۔وہ ملازمہ کا بیٹا ملازمت کی تلاش میں ہے کبھی کبھی وہ اس کے لیے اخبار لے جاتی ہے شاید وہی لے گئی ہوگی۔''

''شاید!'' انجی چونکی۔''یعنی شفو تمہیں یہ پتا ہی نہیں کہ تمہاری ملازمہ تمہارے گھر سے کیا کیا لے کر جارہی ہے۔تو یہ حد ہوتی ہے لاپروائی کی، پتا ہے عورت اپنے شوہر کے گھر کی امین ہوتی ہے۔ایک ایک چیز کی نگران۔تم ملازمہ پر نظر رکھا کرو، ان لوگوں کو ذرا سی ڈھیل ملنے کی دیر ہے بس چلے تو پورے گھر کا صفایا کر کے چلتے بنتے ہیں۔''

''اللہ نہ کرے اور یوں بھی یہ تو بڑی ہی بھلی مانس، دکھوں کی ماری غریب سی عورت ہے۔'' انجی نے ہنس کر شہریار کی جانب دیکھا اور بولی۔

''دیکھا وہی بات۔یہ جتنی گھنی ہوتی ہیں اتنا ہی خود کو مظلوم بنا کر پیش کرتی ہیں اور میں تو ملازمہ رکھنے کے سرے سے خلاف ہوں یہ تو آج کل صحت اجازت نہیں دیتی اس لیے مجبوری ہے۔''

''ماما اور چاکلیٹ چاہیے۔'' اتنی دیر میں اس کا بیٹا ایک پیکٹ ختم کر چکا تھا۔

''بری بات بیٹا۔'' انجی نے پیار سے بیٹے کو سمجھایا مگر بچے پر اس پیار کا الٹا اثر ہوا نیچے لیٹ کر ٹانگیں چلانے اور چیخنے لگا۔

''اچھا اچھا میں ابھی اور لادیتی ہوں۔'' شفق نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک بار پھر اسے لے کر باہر نکل گئی ساتھ میں انجی کو بھی آنے کو کہا۔

''کیا کچھ بنالیا ہے لاؤ میں کچھ ہیلپ کروں تم نے خوامخواہ گھر پر یہ سب کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ آرام سے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھالیتے۔''

''تمہارے لیے یہ سب کر کے مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے انجی! دیکھو ذرا میں نے کیا کیا بنالیا ہے۔''

''شہریار کو تم سے بہت شکایتیں ہیں؟'' راز داری سے پوچھا۔

''نہیں بالکل بھی نہیں۔ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو شکایتیں تو نہیں کہنا چاہیے بس انہیں سنجیدہ مزاج بیوی کی آرزو تھی حالانکہ خود یہ خاصے خوش مزاج ہیں مگر چاہتے تھے بیگم گھریلو قسم کی ہو۔اسے شاپنگ کا کریز نہ ہو۔ سجنے سنورنے میں بھی اعتدال سے کام لے وغیرہ جبکہ مجھے گھومنا پھرنا رات کو دیر تک جاگ کر باتیں کرنا، دن میں دو دو بار لباس تبدیل کرنا ساتھ میں میچنگ جیولری استعمال کرنا اچھا لگتا ہے کہ یہی تو دن ہیں میرے۔میں جانتی ہوں میری زندگی کے یہ دن لوٹ کر تو نہیں آئیں گے۔''

''بالکل ٹھیک کر رہی ہو تم۔یہ مرد تو ہر بات میں اپنی ہی چلانا چاہتے ہیں۔'' انجی نے اسے سمجھایا

پھر ڈشز چیک کرنے لگی۔

پھر شفق کے بہت منع کرنے کے باوجود ٹیبل انجی نے سیٹ کی۔اس کے اصرار پر بولی۔

''تم بس میرا بیٹا سنبھال لو۔میرے لیے یہی بہت ہے۔ سچی صبح سے جو بچوں کے ساتھ لگتی ہوں تو شام ہوجاتی ہے۔''

''چلو پھر ٹھیک ہے اسے میں دیکھ لیتی ہوں۔شفق آنٹی کے ساتھ دوستی کرو گے نا!'' وہ بچے سے باتیں کرنے لگی۔

اسے اکیلے ٹیبل سیٹ کرتے دیکھ کر شہریار نے ہیلپ کی کوشش کی مگر اس نے منع کردیا۔

''مجھے اس کی عادت نہیں۔اظہر کبھی کسی ایسے کام کو کرتے جو نہیں ہیں اب آپ ہاتھ بٹائیں گے مجھے بڑا عجیب سا لگے گا۔''

اس نے ٹیبل سیٹ کر کے دونوں کو آواز دی۔ پھر دونوں کو کھانا بھی خود ہی پلیٹوں میں نکال کردیا بلکہ شہریار کو کھانے کے دوران بھی بار بار پوچھتی رہی۔مختلف ڈشز اس کی جانب بڑھاتی رہی، جب اس نے پانی کے گلاس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو جھٹ پانی انڈیل کردیا۔

''یہ کباب تو اور لیں نا۔اچھا چاول نہیں تو یہ روٹی لے لیں۔'' وہ کتنی توجہ دے رہی تھی۔شفق نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا اس وقت بھی وہ بچے کو کھانا کھلانے میں مصروف تھی۔شہریار کی طرف تو خیر اس طرح کا دھیان اس نے کبھی نہیں دیا تھا۔آج تو اس کی اپنی پلیٹ بھی ٹھنڈی ہورہی تھی۔

شفق اچھا کھانا بناتی تھی مگر شہریار کو آج کھانے پر جو بہت مزا آیا اس کی وجہ اس کا اچھا کھانا بنانا نہیں۔انجی کا توجہ سے سب کچھ پیش کرنا تھا۔

''بہت خوش نصیب ہے انجی کا میاں!''

اور جب رات کے ساڑھے دس بجے وہ دونوں اپنی گاڑی پر انجی اور اس کے بچے کو ڈراپ کرنے گئے تھے اظہر صاحب گھر آچکے تھے۔ بچی کو دودھ کا فیڈر بنا کر پلانے کے بعد اب وہ دو روز پہلے بنائے گئے دال چاول فریج سے نکال کر گرم کرنے کے بعد کھانے بیٹھے تھے۔

''اظہر بھائی! ہم نے تو آپ دونوں کو انوائٹ کیا تھا پھر آپ کیوں نہیں آئے؟'' شفق پوچھ رہی تھی جبکہ شہریار کو یہ سانولا قدرے فربہ سنجیدہ سے چہرے والا مرد بالکل اچھا نہیں لگا تھا انجی کے ساتھ تو بالکل سوٹ نہیں کرتا۔

''بس کچھ کام تھا اس لیے آ نہیں سکا۔میری طرف سے بہت بہت معذرت ویسے بھی جہاں انجی چلی جائیں میری ضرورت باقی نہیں رہتی۔اکیلی ہی کافی ہوتی ہیں۔''

پتا نہیں یہ تعریف تھی یا کیا تھا شفق نے تائید میں سر ہلایا جبکہ انجی گھر آتے ہی بہت سنجیدہ ہوگئی تھی اور لب بھینچے کھڑی تھی۔اس نے ان دونوں کو اندر آنے کو بھی نہیں کہا۔ یہاں تک کہ شفق نے جانے کی اجازت چاہی بچے کو انجی کی گود میں دیا کہ وہ گاڑی میں ہی سو گیا تھا اور اللہ حافظ کہہ کر گاڑی میں آ بیٹھی۔

''عجیب سا ہے انجی کا شوہر!'' شہریار نے تبصرہ کیا۔

''ہے نا، میں تو خود ہی کہتی ہوں۔ وہ انجی کے قابل ہی نہیں۔بس انجی کے گھر والوں نے ایک

بو بھی سُسر اسے سر سے اتار پھینکا کہ اوپر سے یہ پانچ بیٹیاں ہیں، بھابی لوٹی ہے ہیں۔ جو رشتہ آیا ہاں کر دی۔ یہ نہیں دیکھا انجی کتنی اونچی سوچ رکھنے والی، کتنی خوب صورت اور منفرد سی لڑکی ہے اور یہ اظہر مجھے تو شادی کے روز بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ انجی کی قسمت کی خرابی پر میں تو بہت روئی تھی مگر انجی میں بہت صبر ہے اپنے دکھ کسی سے نہیں کہتی، ادھر میرے میکے میں تو سب ہی سمجھتے ہیں کہ انجی بہت خوش قسمت ہے۔''

بات ہو انجی کی تو شفق گھنٹوں بول سکتی تھی اور یہاں تو سننے والا بھی پوری طرح متوجہ اور اس سے متفق تھا۔

۞ ۞ ۞

اگلے روز دن کے گیارہ بجے کے قریب جب شفق چھوٹے موٹے سب کام نبٹا کر وارڈروب سیٹ کرنے کے خیال سے اٹھی تھی کہ انجی کا فون آ گیا وہ کہہ رہی تھی ابھی ابھی سو کر اٹھی ہوں اور پہلا کام یہی کر رہی ہوں۔

''ارے اتنی لیٹ گیارہ بج رہے ہیں۔''

''ہاں بس وہ اصل میں بچے بھی لیٹ اٹھتے ہیں تو میں سوچتی ہوں یہ وقت ہے پھر تو سارا دن کمر سیدھی کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا، تم بتاؤ میاں جی گھر پر ہیں یا چلے گئے۔''

''لو وہ تو صبح آٹھ بجے ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ ناشتا تو تم ہی بنا کر دیتی ہو گی۔''

''ظاہر ہے انجی! میں تو صبح چھ بجے بستر چھوڑ دیتی ہوں۔''

''ہاں ہاں، یہ سب تو کرنا پڑتا ہے یہ بتاؤ کل میرے جانے کے بعد کیا باتیں ہوئیں۔ کچھ میرا ذکر بھی ہوا کہ نہیں۔'' اس کے انداز میں بلا کا تجسس تھا۔ اسی وقت ڈور بیل ہونے لگی۔ شفق کا دھیان بٹ گیا بولی۔

''کچھ خاص نہیں ہم لوگ اصل میں تھکے ہوئے تھے تو جلدی سو گئے۔''

''شہریار کو میری تمہاری دوستی پر اعتراض تو نہیں ہے؟'' انجی نے پھر بات نکالی۔

''وہ انجی باہر گیٹ پر کوئی ہے۔ میں پھر بات کروں گی۔''

۞ ۞ ۞

کچھ دنوں کے بعد میکے جانے کا اتفاق ہوا۔ شہریار کو تو ایک دن رہنا تھا اسے چھوڑ کر اگلی صبح واپس آ جانا تھا جبکہ اس کا ارادہ تین چار روز ٹھہرنے کا تھا کہ قریبی عزیزوں میں شادی تھی۔ میکے آتے ہی وہ مہمان بن کر بیٹھنے کے بجائے بھابھی کے پاس کچن میں آ گئی۔

''لایئے بھابھی! میں کچھ ہیلپ کرواتی ہوں۔''

''ارے نہیں شفق! کام کوئی اتنا زیادہ نہیں ہے ہاں تم یہ بتاؤ کیسی گزر رہی ہے؟ میرا خیال ہے شہریار تو بہت اچھے مزاج کا ہے۔ تمہارا بہت خیال بھی رکھتا ہو گا؟''

''بس بھابھی! سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بیوی کی ہر بات میں مین میخ نکالنے والے۔'' اسے انجی کی بات یاد آئی اور اسی کے انداز میں دہرا بھی دی۔

''ابھی تمہاری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ ہر شخص کا اپنا مزاج ہوتا ہے ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے اور اس میں ڈھلنے میں وقت تو لگتا ہے۔''

''بڑی مشکل سے منایا ہے انہیں کہ مجھے تین چار روز کے لیے فیصل آباد چھوڑ دیں۔''

''یہ تو اس کی محبت ہوئی نا۔ تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔''

''کہاں بھابھی! مرد بڑے مطلبی ہوتے ہیں۔'' اسے انجی کے پڑھائے سبق یاد تھے۔

''گئی تھیں اپنی دوست انجی کی طرف؟'' بھابھی نے اسے سمجھانے کا کام پھر کسی وقت پر اٹھاتے ہوئے موضوع بدلا۔

''ارے لو ایک بار، قریب ہی تو رہتی ہے ابھی کل بھی آئی تھی۔ اسے ایک شادی میں جانا تھا۔ میرے کچھ ڈریسز لے کر گئی ہے۔''

''تمہارے، مگر کیوں؟ اس کے پاس کمی ہے کیا اور تمہارے بالکل نئے والے تو لے نہیں گئی جو تم نے ابھی پہنے بھی نہیں ہوں۔''

''ہاں وہی تو مگر پھر کیا ہوا وہ میری دوست ہے۔''

''شہریار کو پتا ہے؟'' ارم نے پوچھا۔

''لو اس میں انہیں بتانے والی کیا بات ہے اور اگر پتا چل بھی جاتا ہے تو وہ کیا برا مانیں گے۔ وہ تو خود انجی سے اتنے متاثر ہیں۔'' چمچہ ارم کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

''شہریار کے ساتھ جاتی ہو اس کے گھر، جتنی دیر وہاں رہتی ہو وہ بھی ادھر ہی رہتا ہے یا تمہیں ڈراپ کر کے آ جاتا ہے؟''

''اب تو شہریار کی بھی بہت دوستی ہو گئی ہے۔ اصل میں متاثر تو وہ پہلی ملاقات میں ہی ہو گئے تھے۔ اب تو جتنی باتیں مجھ سے ہوتی ہیں اتنی ہی ان سے ہوتی ہیں۔''

''اور اس کا میاں کیا۔ اس سے بھی شہریار کی دوستی ہو گئی ہے؟''

''وہ گھر ہوتا ہی کہاں ہے۔ آپ کو نہیں پتا بھابھی! انجی بہت دکھی عورت ہے اس کی گھریلو زندگی بہت ڈسٹرب ہے، مجال ہے جو اس کا میاں گھر کو ذرا سا بھی وقت دے، پتا نہیں کہاں کہاں پھرتا رہتا ہے، اگر بڑا بزنس مین ہوتا تو گھر میں بھی خوش حالی دکھائی تو دیتی مگر وہاں پرانے سے برتن، اڑے رنگوں کی بیڈ شیٹس، بس ہر شے میلی میلی۔ یہ تو انجی کی ہمت ہے چپ چاپ لب سیے گزارا کر رہی ہے۔ شہریار تو کہتے ہیں آج کے دور میں انجی جیسی بیوی چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔''

''انجی جیسی بیوی اور تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں شہریار؟'' ارم بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

''میرے بارے میں ۔۔۔'' وہ زور سے ہنسی۔ ''کہتے ہیں بہت بچپنا ہے تم لاپروا بھی ہو اور بچوں کی طرح ضد بھی کرتی ہو۔''

''تعریف بھی تو کرتے ہوں گے۔'' ارم ہنسی وہ اس کا ساتھ نہیں دے سکی۔

''پتا ہے انہیں میرا کام والے کپڑے پہننا، برائٹ کلر کی لپ اسٹک استعمال کرنا بالکل پسند نہیں

اور آئی شیڈو سے تو جیسے انہیں الرجی ہے۔ کہتے ہیں انجی سے ہی سبق سیکھو، یقین نہیں آتا۔ تم لوگ اتنی پرانی دوست ہو تمہارے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"انجی تو ہمیشہ شوخ کلر استعمال کرتی تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ بھڑکیلے کپڑے پہنتی تھی۔"

"ہاں میں تو خود حیران ہوئی جب وہ ایک بدلے ہوئے روپ میں سامنے آئی۔"

"اس نے ملنے سے پہلے تم سے پوچھا تھا کہ شہریار کو کیا اچھا لگتا ہے اور کیا پسند نہیں؟"

"اس نے کیا پوچھا تھا۔ میں نے خود ہی سب کچھ بتایا تھا۔ آپ کو پتا ہے انجی سے میں بھلا کچھ چھپا تھوڑی سکتی ہوں۔"

"دیکھو شفق! میں جانتی ہوں۔ تمہارے دل میں جو محبت انجی کے لیے ہے، وہ میرے لیے نہیں ہے مگر تم میری پھپھو زاد بہن بھی ہو اور نند بھی، میں تمہارے لیے کبھی برا نہیں سوچ سکتی۔ تم سے جو بھی کہوں گی۔ غور سے اور ٹھنڈے دل سے سننا۔ کچھ عورتوں کو نمایاں رہنے اور دوسروں پر چھا جانے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ میں نے آج سے بہت سال پہلے جب میں بیاہ کر آئی تھی۔۔۔"

"کیا بات ہے آج کھانے میں کچھ دیر نہیں ہو رہی لگتا ہے آپ دونوں نند بھاوج صرف باتیں بنا رہی ہیں؟" بھیا نے اچانک انٹری دی۔

"بس سب کچھ تیار ہے۔" بھابھی جلدی جلدی بولیں اور اسے برتن ٹیبل پر رکھنے کو کہا۔

پھر مصروفیت میں یہ بات مکمل کرنے کا اس روز موقع نہیں ملا۔

اگلے روز کچھ مہمان چلے آئے۔ پھر شادی کا فنکشن، ارم جو بات کہنا چاہتی تھیں موقع نہیں مل رہا تھا مگر یہ بات دل سے نکلی نہیں تھی۔

جب وہ شہریار کے ساتھ واپسی کے لیے تیار تھی تو بس ارم اتنا ہی کہہ سکی۔

"انجی کی طرف کم جایا کرو۔ اپنے گھر کی جانب اور شوہر کی جانب توجہ دو۔"

اور بھلا اتنی سی بات کا انجی کی دیوانگی پر کیا اثر ہو سکتا تھا جبکہ وہ یہ بھی جانتی تھی ارم بھابھی شروع سے ہی انجی کو ناپسند کرتی ہیں۔

لاہور پہنچتے ہی اس نے انجی کو اپنی واپسی کی اطلاع دی۔

"میری طرف آؤ نا بلکہ میں آج دوپہر کو آ جاؤں گی کھانا بھی مل کر کھائیں گے۔"

"سچ انجی! میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ آ جاؤ بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

"وہ شہریار کو تو اعتراض نہ ہوگا کہ اتنے دنوں کے بعد بیگم آئی اور سہیلی بھی آ ٹپکی ہے۔"

"ارے، وہ کوئی گھر میں تھوڑی بیٹھے ہیں۔ آفس گئے ہیں۔"

"آفس یعنی آج بھی آفس ہے۔ انہیں تمہارے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہے۔"

"خوشی تو ہے مگر جاب بھی تو ضروری ہے نا انجی!"

"بس ہم عورتیں، یہ مرد ہمیں ہمیشہ اپنی مجبوریوں کی داستان سنا کر بلیک میل کرتے رہتے اچھا میں آ رہی ہوں۔ بس بچوں کو تیار کر لوں۔"

اسے تو بس بچوں کو تیار کرنا تھا۔ شفق کو اتنے دنوں سے بکھرا گھر سمیٹنا تھا۔ ملازمہ تو آتی تھی مگر

صرف جھاڑو پوچا لگاتی تھی۔ باقی ڈسٹنگ بھی کرنا تھی۔ شہریار کے بہت سے میلے کپڑے بھی رکھے تھے۔ استری کے لیے بھی اس نے نکالے تھے۔ سب سے ابتر حال میں کچن تھا۔ وہ جلدی جلدی سب سمیٹ رہی تھی۔ جب انجی آئی۔ کچن سمٹ چکا تھا مگر وہ رف سے حلیے میں تھی۔ اسے نہانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

"ہائے شفو! کتنا یاد کیا میں نے تمہیں۔" وہ بیٹی کو گود میں لیے بیٹے کی انگلی تھامے اس کے سامنے تھی۔

ذرا ٹیکسی والے کو فارغ کرو اور تمہارے کپڑے بھی واپس لے آئی ہوں، ٹیکسی میں کالا بیگ ہے۔ اس میں رکھے ہیں۔ وہ بیگ بھی اٹھا لانا۔"

"مما! بسکٹ چاہئیں۔" بچہ ضد کر رہا تھا [illegible]

اس سے فارغ ہو کر آئی۔ بچہ مسلسل [illegible] انجی کو بتانے کے لیے بہت سے قصے تھے مگر انجی نے بھی تو [illegible] نے کے لیے بے چین تھی۔ اس کے قصے شفق سے کہیں زیادہ سنسنی خیز تھے۔

"پتا ہے وہاں ایک میجر صاحب تو مجھ پر عاشق ہی ہو گئے۔ بس جدھر میں، اُدھر ہی میجر صاحب، یہ جو تم سے ڈریسز لے کر گئی تھی۔ میں بتا نہیں سکتی مجھ پر کتنے اچھے لگے۔ کتنی خواتین نے تو مجھ سے اس بوتیک کا نام پوچھنا چاہا۔ میں نے کہہ دیا۔ رہنے دیں ضروری نہیں جو مجھ پر جچ رہا ہے وہ آپ پر بھی جچے۔ بس شفو! کیا بتاؤں اس جواب پر کیسے منہ نکل آئے تھے ان کے بڑا مزا آیا۔"

"اظہر بھائی نے بھی تعریف کی؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

جواب میں انجی نے منہ بنایا اور بولی۔

"کئی سال سے سن رہی ہوں ان کی تعریفیں۔ اب تو بور ہونے لگی ہوں۔"

"کمال ہے انجی! تمہارا شوہر تمہاری تعریف کرتا ہے تو تمہیں اچھا نہیں لگتا؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"جو ہر وقت تعریف ہی کرے پھر اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ تمہاری ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ بس تم ذرا ان میجر صاحب کی تو سنو، ہائے بس شفو! یہ مرد بھی نا ہوں گے چالیس کے قریب۔ بیوی بھی اسمارٹ سی کیوٹ سے بچے مگر جہاں میں وہاں وہاں ان کی پیاسی نگاہیں۔ سچی تم ہوتیں تو دیکھتیں بڑا مزا رہا۔"

"اظہر بھائی بھی تو وہیں ہوں گے انہوں نے میجر صاحب کی تم پر نگاہ کو محسوس نہیں کیا۔ مرد تو اس معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ مرنے مارنے پر بھی اتر آتے ہیں؟"

"کیا شہریار نے ایسا کچھ کیا؟" وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھنے لگی۔

"ہاں جب ہم لوگ ہنی مون کے لیے کاغان گئے تھے نا تو کئی بار بس میری وجہ سے ان کا جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بنا لاؤں۔"

"صرف چائے نہیں بھلکڑ لڑکی! تمہیں بتایا تو تھا۔ ہم لوگ دیر سے سو کر اٹھتے ہیں۔ چھوٹی کو تو

فیڈر بنادیا تھا۔ بیٹے کو تو بھوکا ہی لے آئی تھی۔ اسی لیے تو اب بسکٹ کے لیے ضد کر رہا تھا۔''

''ہائے انجی کیسی ظالم ماں ہو تم!'' اس نے بچے کے گال پر بوسہ دیا۔

''مجھے پتا تھا اپنی خالہ کی طرف جا رہا ہے۔ اس لیے ناشتا نو پرابلم۔''

''ہاں میں لنچ میں اچھا سا تیار کرلوں گی۔''

''لنچ پر تمہارے میاں صاحب بھی ہوں گے۔''

''ہاں بھئی ظاہر ہے وہ تو ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے پھر لنچ کہیں باہر ہی جا کر کرلیں گے۔''

''نہیں نہیں انجی! اتنے دنوں کے بعد تو گھر آئی ہوں، شہریار سے کہا تھا آج کوفتے بناؤں گی تو اب مجھے اچھا نہیں لگتا وہ گھر آئیں اور میں کہوں کچھ بنایا ہی نہیں۔ پھر کبھی چل کر کھائیں گے۔''

''میں تو مہمان ہوں میزبان تم، اب تم جو بھی، جہاں بھی کھلاؤ گی چپ کر کے کھالوں گی۔''

انجی کی باتوں کے دوران ہی اس نے وارڈروب سیٹ کی۔ شہریار اپنی نفاست پسندی کا ڈھنڈورا بھی تو خوب پیٹتا تھا۔ مگر اتنے دن میں مجال ہے جو کچھ بھی ٹھکانے پر رہا ہو۔

انجی قصے سناتی رہی۔ وہ کمرا سیٹ کرتی رہی بیڈشیٹ تبدیل کر کے جب وہ لاؤنج میں آئی۔ انجی بھی ادھر آگئی۔ لاؤنج وہ انجی کی آمد سے پہلے سیٹ کر چکی تھی مگر بیٹھنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اسے ایک بھرپور لنچ کی تیاری کرنا تھی۔ بہت کچھ تو بازار سے منگوانے والا تھا۔ اس کے لیے انجی نے اپنی خدمات پیش کردیں۔

''بچوں کو تم دیکھو۔ میں بس یوں گئی اور یوں آئی۔''

انجی جھٹ کھڑی بھی ہوئی۔ اس نے لسٹ تھمادی۔

واقعی انجی نے بڑی پھرتی دکھائی۔ ایک گھنٹے میں لدی پھندی واپس آگئی۔

''اتنا کچھ؟'' وہ ٹھٹکی اس نے یہ سب نہیں منگوایا تھا۔ شاید وہ اپنی شاپنگ بھی ساتھ ہی کر آئی ہے۔ یہی سوچ کر اس نے سوال نہیں کیا۔

''لو بھئی شفو! میں نے تو تمام پیسے جو تم نے دیے تھے خرچ کر ڈالے۔ یہ سوچ کر کہ روز روز تمہیں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔'' اس نے سب سے پہلے دو تین طرح کے بسکٹس کے پیکٹ اور پھر چاکلیٹ کے پیکٹ نکالے۔ پھر آئس کریم پیک کی باری آئی۔ موسمی فروٹ اور آخر میں اس کی مطلوبہ چند اشیاء۔ بیٹے کو چاکلیٹ اور اس کی پسند پوچھ کر بسکٹ پکڑائے، خود فروٹ لے کر بیٹھ گئی۔

''آؤ نا تم بھی۔ بہت میٹھی ہے۔'' اس نے موسمی کا مزا لیتے ہوئے اسے بھی دعوت دی مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

وہ کوفتوں کا مسالہ بنا چکی تھی مگر ویجی ٹیبل رائس، چکن کڑاہی کے مسالے کی تیاری ابھی باقی تھی۔ شامی کباب کا قیمہ بھی ابھی چولہے پر رکھا تھا۔ دو تین طرح کے سلاد بھی بنانا تھے میٹھے میں تو چلو انجی جو آئس کریم لائی ہے وہی چل جائے گی۔

اس کا خیال تھا سلاد کے لیے وہ انجی سے کہہ دے مگر اس کی بچی نے نیند سے جاگ کر رونا شروع

کیا تو پھر انجی کو سوائے اسے سنبھالنے کے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔

''یہ میرے دونوں بچے بھی نا مجھ پر پڑے ہیں۔ غصے سے خوب چیختے چلاتے ہیں۔'' انجی بچی کو کاندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اور اظہر بھائی کیا وہ غصے میں شور نہیں ڈالتے؟''

''ارے وہ پورا گھنا آدمی ہے۔ مجال ہے جو کبھی اپنے جذبات کا اظہار کرے بس چپ چاپ جو کہوں گی، مانتا چلا جائے گا اور یار! میرے خیال میں شوہروں کی رائے کو زیادہ اہمیت دینا بھی نہیں چاہیے۔ اب صبح مجھ سے فرمارہے تھے آج مٹر پلاؤ کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ میں نے کہا میں تو اپنی دوست کی جانب جا رہی ہوں بازار میں بہترے کھانے ملتے ہیں جو کھانے کو جی چاہے کھالیا کریں، بس شفو! تمہیں تو پتا ہے گھر میں مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں اور دونوں ہی کوکنگ کی شوقین۔ ایسے میں میرے لیے کہاں گنجائش رہ جاتی تھی پھر میری امی خود بھی کھانا بنانے اور گھریلو کاموں میں مصروف رہنے کو ترجیح دیتی تھیں مجھے تو بس گھومنے پھرنے کا شوق رہا ہے۔ خواہش تھی جیون ساتھی بھی ایسا ملے گا، اسے تو اپنے بزنس سے ہی فرصت نہیں اور بزنس بھی کیسا؟ آمدن گزارے لائق اور خواری ہر وقت کی۔ میں تو کہتی ہوں یہ کام چھوڑ کر کوئی دوسرا شروع کردو اور نہیں تو اسپیئر پارٹس کی دوکان ہی کھول لو کہ بزنس بھی وہ اسی کا کرتے ہیں مگر فرماتے ہیں۔ یہ سب اتنا آسان نہیں، بھاڑ میں جاؤ۔ جہنم میں جھونکو، مجھے کیا۔'' انجی شاید تصور میں شوہر کو سامنے پا رہی تھی اسی لیے تلخ ہو رہی تھی۔

''اچھا تم اپنا موڈ مت خراب کرو۔ یوں جل کر کڑھ کر تو اپنی صحت برباد کرلو گی۔ پلیز انجی! میری خاطر اور اپنے ان معصوم بچوں کی خاطر آخر انہیں تم کو ہی دیکھنا ہے۔ اپنی صحت اچھی نہیں ہوگی تو ان کی دیکھ بھال کیسے کر پاؤ گی۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔''

بچی سو چکی تھی وہ اسے لٹانے کے لیے اندر چلی آئی، واپس آکر فریج سے جوس کا پیکٹ نکالا اور گلاس میں ڈال کر پینے لگی۔

''ماما! مجھے بھی دو۔'' اس کا بیٹا کچن کے سامنے لاؤنج میں ہی بیٹھا پرانے میگزین سے کھیل رہا تھا جوس دیکھ کر فوراً ادھر آیا۔

''اوہو ایک تو تم بھی نا باپ کی طرح مجھے کھاتا پیتا نہیں دیکھ سکتے، اتنی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ اس لیے پینے بیٹھ گئی تھی نہیں پیتی۔ تم پی لو، ہو جاؤ خوش۔'' انجی نے گلاس اس کے قریب پٹخ دیا۔

''انجی! انجی! ایسے کیوں بولتی ہو تم اور لے لو نا۔'' اس نے منانا چاہا۔

''کیسے لے لوں۔ تم بھی کیا سوچو گی؟''

شفو نے آگے بڑھ کر فریج کھولا اور دوسرا گلاس بھر کر اسے تھمانے کے بعد پھر کام میں مصروف ہوگئی۔ انجی جوس پینے کے دوران بھی اسے اپنی زندگی کے دکھوں کے بارے میں بتاتی رہی وہ سن سن کر افسردہ ہوتی رہی۔

شہریار گھر آیا۔ اس کے سامنے کچن میں دو خواتین موجود تھیں۔ ایک اس کی بیوی جس کے بال

بکھرے تھے، کپڑے ملگجے اور پاؤں میں باتھ روم سلیپر تھے اور دوسری بہترین تراش خراش کا فٹنگ والا اسٹائلش سوٹ پہنے لائٹ میک اپ کیے ہوئے سامنے تھی اور اس کے پیروں میں جوتی بھی اچھی تھی۔ اس کے چہرے پر نرم مسکراہٹ تھی اور شہریار کی گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ سلاد بنانے کی تیاری میں بہت کچھ اپنے آگے رکھے چھری ہاتھ میں لیے بیٹھی گاجر چھیل رہی تھی جبکہ شفق اس کی کہانی سن سن کر افسردہ سے چہرے کے ساتھ سامنے تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟ کب آئیں؟'' شہریار نے بہت اخلاق سے پوچھا۔

''میں اچھی ہوں بس آج آپ لوگوں سے ملنے کو جی چاہا تو چلی آئی حالانکہ جانتی تھی یہ کتنے دنوں کے بعد میکے سے آئی ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا پسند کریں گے مگر پھر بھی بس رہا نہیں گیا۔''

''کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اور ہمیں تو خوشی ہوتی ہے جب آپ ہمارے گھر آتی ہیں۔''

''تو اور کیا مگر یہ مسلسل ایسی ہی باتیں کر کر کے مجھے غصہ دلاتی ہے۔''

''غصے میں آنے والی بات نہیں ہے شفق! یہ تو تمہارا رویہ ہے جو اس گھر سے ان کی اجنبیت کے احساس کو ختم کر سکتا ہے۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور شفق اثبات میں سر ہلانے لگی۔

انجی کا بیٹا تو لاؤنج میں ٹی وی پر کچھ دیکھنے بلکہ چینل سرچ کرنے میں مصروف تھا کمرے میں آیا تو اس کی بیٹی بیڈ پر سو رہی تھی۔ فیڈر قریب ہی اوندھا پڑا تھا اور دودھ نپل سے ٹپک کر نفیس چادر بھگو رہا تھا۔ تکیے کے پاس پیمپر کا پیکٹ جبکہ بیڈ پر ہی اس کا بیگ ادھ کھلا رکھا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر کچھ اشیاء دھری تھیں۔ اس نے بے اختیار شفق کو آواز دے ڈالی۔

وہ آئی تو بولا۔ ''یہ کیا پھیلاوا ہے؟ تم یہ سب سمیٹ کر ایک طرف رکھو۔ انجی تو مہمان ہے تم اسے یہ سب رکھنے کی جگہ بتاؤ اور پلیز بچی اٹھ جائے تو بیڈ شیٹ چینج کر دینا۔ یہ دیکھو فیڈر سے دودھ ٹپک گیا ہے۔'' اگرچہ دودھ بہت معمولی مقدار میں گرا تھا مگر شہریار کی نفاست پسند طبیعت پر گراں گزر رہا تھا۔

''آپ تو معمولی سی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں جہاں چھوٹے بچے ہوتے ہیں وہاں یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔''

وہ ابھی ابھی انجی کی مظلومیت کے قصے سن کر ہی تو آ رہی تھی اسی لیے شہریار کا یہ سب کہنا اسے انجی کی ذات پر تنقید لگا تھا اور چپ نہیں رہ سکی تھی۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے صرف بیڈ شیڈ چینج کرنے کی درخواست ہی تو کی ہے نا!'' ایک تو تھکن دوسرا شفق کا میلا کچیلا حلیہ تیسرا خوامخواہ اس کا منہ پھلا کر بولنا جس پر وہ ہمیشہ اسے ٹوکتا تھا آج غصہ دلا گیا۔

''آپ کو اچھا ہی نہیں لگتا کہ میری دوست یہاں آئے۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی اتنی دکھی ہے۔'' شفق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''فضول کے اندازے مت لگایا کرو، وہ بہت نفیس لڑکی ہے۔ ایسے لوگوں کو میں ذاتی طور پر بھی

پسند کرتا ہوں آئندہ یہ بات مت کرنا کہ مجھے اس کا یہاں آنا پسند نہیں۔''

وہ سیل فون بستر پر اچھال کر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

شفق گہری سی سانس لے کر باہر آ گئی۔ سب کچھ تقریباً تیار تھا صبح سے باتیں بناتی انجی اب سلاد بنانے بیٹھ گئی تھی مگر وہ کچھ انجی کی باتوں میں کچھ شہریار کے رویے میں ایسی الجھی کہ اسے چینج کرنے اور ہلکا پھلکا سا تیار ہو جانے کا خیال ہی نہیں آیا اور انجی نے بھی اسے یہ احساس نہیں دلایا جب وہ دوبارہ کچن میں آئی۔ انجی بڑی سستی سے سبزی کاٹ رہی تھی اسے دوسری چھری اٹھانا پڑی۔

''کیا کہہ رہے تھے شہریار؟'' یہ سوال ایسا تھا جس کی توقع شفق بہرحال نہیں کر سکتی تھی اور اب تو جو کچھ شہریار نے کہا تھا۔ وہ انجی سے کہنے والا تھا ہی نہیں۔ ابھی وہ خاموش ہی تھی کہ انجی بولی۔

''بہت دنوں کے بعد ملے ہو نا، بے تاب تو ہو گا تمہارے لیے۔'' یہ سب کہتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سا تناؤ اور لہجے میں گہری ٹھنڈک تھی، جسے شفق نے اس لیے محسوس نہیں کیا کہ انجی کا یہ کہنا اسے شدت سے احساس دلا رہا تھا۔ شہریار نے جو کہا بہت غلط کہا۔ وہ اتنے دنوں کے بعد ملے ہیں آج اکٹھے لنچ کر رہے ہیں مگر شہریار نے اس بات کو بالکل بھی دھیان میں نہیں رکھا۔ ایسے میں ہمیشہ احمق لاپروا اور غیر سنجیدہ دکھائی دیتی ہوں وہ چپ چاپ سلاد کے لیے چیزیں بناتی رہی۔ انجی بھی اسی کام میں مصروف کن انکھیوں سے اس کا چہرہ پڑھتی رہی۔

اس روز وہ شہریار کے ساتھ پہلے سے زیادہ بے تکلف تھی۔ اس کے مشاغل، کالج لائف کی باتیں، اس کی پسند ناپسند سب براہ راست ڈسکس کرتی رہی۔ کھانے کی میز پر پہلے ہی کی طرح اس نے دونوں کو خود کھانا سرو کیا۔

اس کے لیے وہ کچن میں شفق کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہہ چکی تھی۔

''میں جانتی ہوں میری جان! تم بہت تھک گئی ہو۔ بس کھانا کھاتے ہی ریسٹ کرو اور ہر اوٹنگی بونگی سوچ کو ذہن سے نکال دو۔''

آخری بات پر شفق نے چونک کر سر اٹھایا تھا تو اس کی بچپن کی سہیلی اس کی درد آشنا، بات کہے بغیر ہی سمجھ گئی تھی۔ وہ انجی سے لپٹ گئی۔ انجی اس کی پشت پر جھکی اور اب وہ اسے اور شہریار کو بار بار کھانا نکال کر دے رہی تھی اور بہت اصرار سے کھلا رہی تھی۔

شفق کچھ تو تھک گئی تھی۔ کچھ اسے انجی کی بات نے یہ احساس دلایا تھا کہ آج اتنے دن کے بعد ملنے کی وجہ سے شہریار کا انداز اس کے لیے بے تابی لیے ہوئے ہونا چاہیے تھا، وہ چپ چپ سی تھی اور اس کی یہ چپ شہریار کو غصہ دلا رہی تھی۔ شرمندہ بھی کر رہی تھی کیسی ال مینرڈ لڑکی ہے اسے احساس نہیں انجی مہمان ہے اور اس کی خاطر اس کا فرض ہے نا کہ وہ بے چاری ہمیں ایک ایک ڈش اٹھا کر پیش کرتی رہے، بکھرے بال، صبح کا دھلا ہوا چہرہ، رات کو پہنے گئے کپڑے اسے اور بھی غصہ دلا رہے تھے۔ کھانے کے بعد شفق برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے پھر اس کا بیٹا کسی بات پر ضد کرنے لگا۔ شفق اسے اٹھا کر لان میں لے آئی۔ اس کے ساتھ کھیلتی رہی۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کا خیال تھا انجی کھانا کھا کر چلی جائے گی مگر وہ ایسے خیال میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شفق نے کپڑے نکالے

اورنہانے کے ارادے سے باتھ روم میں گھس گئی کہ انجی کو شہریار کمپنی دے رہا تھا نا۔

نہا کر نکلی تو شہریار اس کو اپنی اسکول اور کالج کے زمانے کی تصاویر دکھا رہا تھا دونوں خوب انجوائے کر رہے تھے۔ ڈارک پرپل سوٹ جس پر ملٹی کلر سے کڑھائی کی گئی تھی پرپل کا شیڈ دیتی ہی لپ اسٹک لگائے جب وہ سامنے آئی دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''اوں ہوں، یہ کون سا کلر پہن لیا ہے تم نے، پلیز اتنے بھی ڈارک کلر مت پہنا کرو۔''

وہ بلاشبہ اپنی گوری رنگت میں اس کلر کے ساتھ بہت نمایاں ہو رہی تھی شہریار کی نظروں میں ستائش ابھری ہی تھی کہ انجی کے جملے نے اس کی بھی سوچ بدل دی۔

''واقعی میرا خیال ہے انجی ٹھیک کہتی ہے یہ کلر کچھ عجیب سا ہے۔''

''میں تبدیل کر کے آتی ہوں۔'' وہ تو فوراً شرمندہ ہو جانے والوں میں سے تھی۔

''اب رہنے دو۔ پہلے مجھے اکیلے بٹھا کر نہانے گھس گئیں گھنٹہ لگا کر نکلی ہو تو اب چینج کرنے چل پڑو، مجھے تو تم ہر رنگ میں اچھی ہی لگتی ہو۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ دوسرے تمہیں میری نظر سے تھوڑی دیکھتے ہیں۔ لباس شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ وہ کلر ہے جو گنواروں میں خوب پہنا اور پسند کیا جاتا ہے۔''

''وہ انجی میں نے تو۔۔۔'' شہریار کے لبوں پر انجی کی بات سن کر آنے والی مسکراہٹ نے اسے روہانسا کر دیا وہ وضاحت میں کیا کہنا چاہ رہی تھی اسے بھول ہی گئی۔

''اچھا۔ اب اچھی سی چائے تو بناؤ۔ ہم تمہارے انتظار میں بیٹھے تھے ورنہ میں اس وقت چائے لے لیتی ہوں۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن میں چلی آئی۔

''چلو آج چائے کہیں باہر چل کر پیتے ہیں۔'' وہ کچن میں گئی ہی تھی کہ انجی کو خیال آیا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' شہریار نے اثبات میں سر ہلایا۔ انجی، شفو کو آوازیں دینے لگی۔

''چائے رہنے دو۔ ہم کہیں باہر چل کر پیتے ہیں۔''

وہ ہمیشہ شام کی چائے اپنے بیڈ پر بیٹھ کر پورے سکون کے ساتھ پینا پسند کرتی تھی مگر انجی کی خواہش کو رد نہیں کر سکی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم میرے بیٹے کے کپڑے چینج کرو۔ میں بیٹی کو دیکھ لوں۔'' انجی اس کے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئی وہ بچے کے کپڑے لینے اندر آئی تو انجی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے میک اپ میں مصروف تھی۔ تیار ہو کر پورے آدھے گھنٹے میں باہر آئی۔

۞ ۞ ۞

وہ کبھی بھی ایک دوسرے سے جھڑپ کے بعد روٹھے نہیں تھے بات ہوتی اور ختم ہو جاتی اور آج ایسا کچھ خاص ہوا بھی تو نہیں تھا مگر اس کا جی اچاٹ سا تھا اور شہریار بھی بے گانگی برت رہا تھا۔ انجی کو فون پر بتایا تو بولی۔

''مردوں کو نخرے دکھانے کی عادت ہوتی ہے۔ ایک دو روز گزرنے دو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

ویسے کیا تم روٹھ جاؤ تو مناتا ہے۔ گجرے لا کر کبھی گانا گا کر۔''

''میں کبھی روٹھی ہی نہیں۔ ہاں گانے تو وہ ویسے بھی مجھے دیکھ کر گاتے رہتے ہیں اور گجرے بھی لے آتے ہیں۔''

''اچھا، تم اسے بہت اچھی لگتی ہو؟'' پتا نہیں انجی ان کی ازدواجی زندگی کو اتنا کریدتی کیوں تھی اور شفق نے کبھی بھی اس سے کوئی بات کب چھپائی تھی۔

شہریار کی خفگی نے اسے نڈھال کر دیا تھا وہ زیادہ دن سہ نہیں سکی اور اسے بخار ہو گیا۔

''اچھا ہے مر جاؤں جب انہیں پروا ہی نہیں میری تو میں جی کر کیا کروں۔ جب مر جاؤں گی پھر تو یاد کریں گے پھر مجھے پکاریں گے مگر تب میں کہیں نہیں ہوں گی جب تک جئیں گے اپنی زیادتی کا احساس انہیں کچوکے لگائے گا۔'' وہ کیا کیا سوچتی اور روتی رہی شہریار گھر آیا اس نے اپنی طبیعت کی خرابی کے بارے میں نہیں بتایا۔ معمول کے مطابق کھانا تیار کرتی رہی۔ ٹیبل پر لگاتے اسے چکر آیا۔ ڈش تو ٹیبل پر رکھ دی مگر توازن برقرار نہیں رکھ سکی اور خود فرش پر آ گری۔

''شفق!'' شہریار تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ہاتھ لگایا تو اس کا جسم انگارے کی مانند لگا۔

''کیا کروں؟'' اس نے اپنے بازوؤں میں بے ہوش شفق کو پریشانی سے دیکھتے ہوئے سوچا، پھر ذہن میں سب سے پہلے انجی کا خیال آیا۔ اس کو کال کیا۔ شفق کی حالت بتائی۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آ رہی ہوں اور یہیں قریب ہی ناہید کلینک ہے آپ اسے لے کر وہیں پہنچیں میں بھی ادھر آؤں گی۔'' اور ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ دوبارہ گھر آئے تو انجی ان کے ساتھ تھی اور شفق ہوش میں تھی۔

''یہ کیا حماقت ہے شفو! تمہیں بخار تھا تو تم نے شہریار کو بتایا کیوں نہیں۔ ذرا ذرا بات پر اتنی شدید ناراضی، ارے جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تو بڑی سے بڑی بات نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ تم ایک فضول سی بات کو دل سے لگا کر بیٹھی رہیں۔ قدر کرو اپنے میاں کی، ایسے اچھے انسان تو چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔''

''انجی! بچے کہاں ہیں اور اظہر بھائی نے تمہارے یوں آ جانے پر برا تو نہیں مانا؟''

''اظہر پشاور گئے ہیں ان کی واپسی اب ایک ہفتے سے پہلے تو مشکل ہی ہو گی بچوں کی فکر نہ کرو۔ وہ ہیں نا ہماری ایک رشتہ دار۔ بے چاری بیوہ اور لاچار سی ہیں۔ وہ آئی ہوئی ہیں بچے ان ہی کے پاس ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح سنبھال لیتی ہیں۔ تم بس اپنی فکر کرو۔''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اسے نقاہت بہت تھی۔ بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

گھر آ کر شہریار نے اسے سہارا دے کر گاڑی سے اتارا اور بیڈ روم میں لے گیا۔ اسے لاؤنج میں رک جانا چاہیے تھا مگر وہ پیچھے چلی آئی تھی اور شہریار نے اس کی موجودگی کے باوجود شفق کا بوسہ لے کر اسے اپنی بے تابی اور پریشانی کے بارے میں بتایا تھا پھر انجی سے بولا۔

''آپ پلیز اس کے لیے سوپ اور دلیہ وغیرہ بنا دیں۔''

''نہیں، نہیں انجی تم تکلیف مت کرو۔ ابھی بخار کم ہو گا تو میں خود ہی بنا لوں گی۔''

''اوہو! دوست ہے تمہاری۔'' شہریار نے اسے تکلف پر سمجھایا۔

انجی کو کچن میں آنا پڑا اور کچن کے کاموں سے اس کی ہمیشہ جان جاتی تھی وہ اکثر کھانا بازار سے منگواتی یا ملازمہ سے پکواتی۔ اسے وہی غنیمت لگتا اور پھر یہ بیوہ خاتون جن کی عمر پچاس پچپن کے قریب تھی اظہر کی رشتہ دار تھیں جب وہ آجاتیں۔ اسے بڑی سہولت ہو جاتی۔ کھانا بنانے سے تو بالکل ہی جان چھوٹ جاتی اور بچوں کو بھی پھر وہی دیکھتیں۔

''پتا نہیں کس طرح کا سوپ بنانا چاہیے۔'' اس نے کچھ دیر سوچا پھر فریج سے چکن نکال کر ڈھیر سارے پانی میں نمک اور کالی مرچ کے ساتھ ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔

''اب چائے بھی چاہیے۔ اتنا نہیں ہو سکا بازار سے جوس لے لیتے۔ مجھے ملازمہ سمجھ لیا ہے پتا نہیں پتی کدھر ہے۔''

کوفت کے عالم میں چائے تیار کی، شہریار خود چلا آیا ٹرے اس نے ہی سیٹ کی اور اندر لے گیا۔ انجی اب بھی اس کے پیچھے تھی۔ چائے کے ساتھ شفق نے دو بسکٹس لیے دوا لی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔

اس روز بھی چند روز پہلے کی طرح انہوں نے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں اور پتا نہیں کب آپ سے وہ دونوں تم پر آ گئے۔ ایک صوفے پر برابر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے اور تبصرے کرتے رہے۔ شفو کی آنکھ کھلی بخار ہلکا تھا، شہریار اور شفق دونوں انجی کے شکر گزار تھے اور شہریار اسے ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔

''پتا نہیں رات میں کچھ کھانے کو ہے بھی یا نہیں؟''

شفق نے نقاہت کے ساتھ کروٹ بدلتے ہوئے سوچا تھا پھر دوسرا خیال یہ آیا۔ انجی کے ہاں کھانا کھا کر ہی آئے گا یا شاید نہ بھی کھائے کہ مجھے بخار ہے اور گھر میں اکیلی ہوں شاید انجی ساتھ ہی کھانا بھی کر دے۔ مگر شہریار بہت جلدی آ گیا اور کھانا اس کے ساتھ نہیں تھا۔

''وہ فریج میں دیکھیں۔ میرا خیال ہے دوپہر میں جو بنایا تھا۔ موجود ہی ہوگا۔''

''نہیں وہ تو میں نے اور انجی نے کھا لیا تھا۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ میں سینڈوچ بنا لیتا ہوں۔''

شہریار اس کے پاس بیٹھا، دوا بھی پلائی، کھانا بھی کھلایا مگر کچھ کمی سی تھی۔ یا شاید اس کی توقعات ہی زیادہ تھیں۔

❁ ❁ ❁

اگلے روز انجی شام کو ان کے ہاں آئی تھی اور شہریار یقیناً پہلے سے اس کی آمد کے بارے میں جانتا تھا منتظر تھا اور خاصا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ شفو کو ہلکا بخار ابھی باقی تھا۔ انجی آئی اور اس نے خوب انصاف کیا اس نے شفق کو کمرے میں جا کر آرام کرنے کو بھی کہا مگر شفق تیار نہیں ہوئی۔

دونوں کی باتیں، معلومات پسند ناپسند کتنی ملتی جلتی تھیں اور وہ بس ایک جانب بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

''تم شہریار کا خیال نہیں رکھتیں شفق! اتنے دنوں کے لیے میکے جا کر بیٹھ گئیں اب آئی ہو تو ذرا سی بات کو دل سے لگا لیا اور بیمار پڑ گئیں۔ دیکھو، بے چارہ کتنا کمزور ہو رہا ہے۔''

''ایسی باتوں کو یہ نہیں سمجھتی۔'' شہریار نے شکوہ کیا۔

وہ چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگی، آخر کیوں یہ بدگمان ہوا جاتا ہے میری محبت میں کبھی بھی کمی نہیں رہی اس کا جی گھبرانے لگا۔

شہریار کی انجی سے کی گئی چھوٹی سی شکایت اس کی دل کی دنیا میں ہلچل مچا رہی تھی، شاید وہ ابھی کہہ دے گا میں تو مذاق کر رہا تھا، شفق کی محبت کو ناپنے کا تو کوئی پیمانہ ابھی تک ایجاد ہی نہیں ہوا مگر ایسا نہیں کہا اور وہ چپ چاپ بیٹھی منظر میں موجود ہونے کے باوجود منظر سے غائب ہوتی چلی گئی۔

اس کا بخار صبح تک اتر گیا اس نے اٹھ کر ناشتا بنایا کچھ ادھورے کام سمیٹے۔ شہریار تیار ہو کر ٹیبل پر آیا تو اس کی پسند کا ناشتا، پراٹھا اور آملیٹ اس کے سامنے رکھا مگر پتا نہیں وہ کس سوچ میں گم تھا۔ توجہ ہی نہیں دی۔ چپ چاپ ناشتا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''دوپہر میں کیا بناؤں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''اوہ ہاں یاد آیا۔ آج دوپہر میں میرے لیے کچھ نہ بنانا۔ میں لیٹ آؤں گا۔ اوکے جان! آج شام کی چائے پر ملاقات ہو گی اور دیکھو تم کاموں میں مت لگی رہنا۔ اپنا خیال رکھنا۔ کہیں پھر بیمار نہ پڑ جانا۔''

اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شہریار کے جانے کے بعد ابھی وہ ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھی کہ شہریار کی امی کا فون آ گیا۔ وہ بتا رہی تھیں۔

''ٹھیک ایک ہفتے کے بعد پاکستان آ رہی ہوں۔ پورا ایک ماہ اپنی بیٹی کے پاس رہوں گی۔ ابھی تو میں نے تمہارے چاؤ بھی نہیں پورے کیے۔''

شہریار کی والدہ بہت سویٹ نیچر کی مالک تھیں اس لیے ان کی آمد کا سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ ہر وہ خبر جو اس کے لیے اہم تھی اسے انجی کے ساتھ شیئر کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی مگر آج کل انجی کی نہ جانے کیا مصروفیات تھیں جب بھی فون کرتی جواب موصول نہیں ہوتا تھا۔ میسج کیا تو بھی ابھی تک انجی نے بات نہیں کی تھی۔ شاید اس کے میاں آج کل گھر پر ہوتے ہوں گے مگر یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ کال ہی ریسیو نہ کی جائے۔

شام کو شہریار آیا تو اس نے انجی کی طرف چلنے کا کہا۔

''کیوں خیریت؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''اتنے دن ہو گئے اس سے ملے ہوئے۔''

''تم میں اور انجی میں کوئی قدر بھی تو مشترک نہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا پھر تم اس سے ملنے کو بے چین کیوں رہتی ہو؟''

''وہ میری دوست ہے۔'' اس نے کچھ احتجاج کے رنگ میں یاد دلایا۔

''بہر حال آج نہیں، تمہیں پتا ہے لیٹ آ رہا ہوں۔ تھکا ہوا ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے پھر کل چلیں گے۔'' وہ جھٹ مان گئی۔

''کل آئے گی تو دیکھیں گے۔'' وہ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا اب تو اس سے کچھ کہنا ہی فضول تھا۔

❁ ❁ ❁

شہریار کی والدہ کی آمد پر شفق کے میکے والے بھی ملنے آئے تھے۔ رات کو کھانا کھا کر بھیا، ابا اور

شہر یار لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے جبکہ شہر یار کی والدہ شفق کی امی اور بھابھی ارم، شہر یار کی والدہ کے بیڈروم میں آ گئے تھے۔

''ہائے کیا تھا آج انجی بھی ہوتی تھی۔'' اس نے بڑی مسرت سے ذکر کیا تھا۔

''کیا وہ یہاں آتی رہتی ہے؟'' ارم نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں ہاں اکثر، پتا ہے شہر یار بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں بلکہ اب تو کہتے ہیں اس کی پسند نا پسند تم سے زیادہ مجھ سے ملتی جلتی ہے۔''

وہ بہت جوش کے ساتھ ارم کو بتا رہی تھی اسی وقت نبیلہ بیگم (شہر یار کی والدہ) نے اس کی امی سے بات کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف یونہی دیکھا تھا مگر شفق کے جوش اور جواب میں ارم کی سنجیدگی نے حیران سا کیا۔ ارم کرید کرید کر کسی انجی کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور شفق اپنے مخصوص الہڑ پن سے بتائے چلی جا رہی تھی۔

''کون ہے یہ انجی؟'' انہیں بھی تجسس ہوا۔

''وہاں فیصل آباد میں ہمارے محلے میں رہتی تھی۔''

ارم نے کہا۔ شفق نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی آپ! وہ صرف ہماری محلے دار نہیں۔ میری بہت اچھی دوست ہے۔ بس جی یک جان دو قالب والا حساب ہے۔''

''تم بھی جاتی ہو اس کے ہاں؟'' ارم نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

''آں ہاں بالکل۔''

''اکیلی جاتی ہو؟''

''نہیں اکیلی کیوں شہر یار کے ساتھ۔''

''اچھا انہیں کیوں اعتراض نہیں ہوتا تمہاری سہیلی کے ہاں جانے پر۔''

''میں نے کہا نا۔ اب وہ صرف میری سہیلی ہی نہیں ہے۔ شہر یار بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں اور سچی! وہ ہے بھی اتنا پیار کرنے والی کہ کبھی کبھی تو میں اس کی محبتوں پر شرمندہ سی ہو جاتی ہوں۔''

نبیلہ بیگم کو دونوں کے رویوں پر حیرت تو ہوئی مگر انہوں نے دخل نہیں دیا، ایک بار پھر اس کی امی سے باتیں کرنے لگیں۔

''ہم سب چلیں گے کل انجی کے ہاں۔ کتنی حیران ہو گی نا۔ وہ سب کو دیکھ کر۔'' شفق خیالوں میں ہی اس کی حیرت پر مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''نہیں ہم سب صرف تم سے ملنے آئے ہیں۔'' ارم نے صاف انکار کر دیا۔

''اچھا پھر میں اسے یہاں بلا لیتی ہوں۔ کل کھانے پر کہتی ہوں آ جائے۔''

''دیکھ لو بلا کر۔ میرا خیال ہے وہ نہیں آئے گی۔''

''کیوں بھلا۔ وہ کیوں نہیں آئے گی۔ میں ابھی فون کرتی ہوں۔ اور سب کی آمد کے بارے میں بتاتی ہوں۔''

''کسے فون ہو رہا ہے؟'' اب کے شفق کی امی نے پوچھا۔

''امی! انجی کو بلانے لگی ہوں۔'' وہ نمبر ملاتے ہوئے اک جوش کے ساتھ بولی۔

''انجی! یہ ابھی تک تمہارے سر سے انجی کا بھوت نہیں اترا۔'' اس کی امی کے انداز میں بھی کچھ کچھ ارم والا ہی تاثر تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ انجی سے بات کرنے لگی۔ وہ اسے ان سب کی آمد کے بارے میں بتا رہی تھی اور کل آنے کو کہہ رہی تھی۔

''ہائے دیکھو۔ انجی! بھابھی تو پہلے ہی کہہ رہی تھیں تم نہیں آؤ گی مگر میں نے پورے وثوق سے کہا تھا تم آؤ گی۔''

''اوہو، اچھا چلو ٹھیک ہے، کل شام یہ سب تو چلے جائیں گے شہر یار کی امی تو یہیں ہیں نا۔ تم ان سے ملنے آ جانا۔ بہت خوش ہوں گی تم ان سے مل کر۔ بہت اچھی نفیس خاتون ہیں۔ جیسی خواتین شہر یار کو اچھی لگتی ہیں نا جیسی تم ہو نا بالکل ویسی۔''

اس بات پر ارم پھر چونکی تھی اور اس نے کچھ افسوس کے ساتھ شفق کو دیکھا تھا۔

''وہ کل تو اس کے میاں کے کچھ دوست انوائیٹڈ ہیں۔ وہ نہیں آ سکے گی۔''

''اچھا پھر اس سے کہنا تھا ہم سب ابھی آ رہے ہیں۔'' ارم کا انداز استہزائیہ تھا۔

ان لوگوں کی واپسی کے اگلے روز انجی آ رہی تھی اور شفق بڑے جوش سے کچن میں گھسی اس کے لیے نہ جانے کیا کیا تلاش کر رہی تھی۔ شہر یار کو اس نے ایک لمبی لسٹ تھمائی تھی اور اس نے بغیر ناک بھوں چڑھائے سب سامان لا دیا تھا۔

انجی آئی تو ارم کی باتوں کی روشنی میں نبیلہ بیگم نے بہت گہری نظر سے اسے دیکھا تھا۔ سانولی سلونی، جاذب نظر نقوش والی اور بہت لمبے بالوں والی عورت اسے لڑکی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی طراری اور چہرے کے نقوش میں بھول پن نام کو نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں شفق گوری چٹی، قد میں اس سے کم، بہت بھولپن لیے الہڑ سی لڑکی تھی جس کی آنکھوں میں روشنی اور سچائی کا تاثر تھا اور جو محبتیں بانٹنے کی عادی دکھائی دیتی تھی۔

انجی آ کر نبیلہ بیگم سے بہت ہی محبت اور عقیدت سے ملی تھی۔

''مجھے بہت اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا، بہت تعریفیں سنی تھیں میں نے آپ کی۔''

اس دوران وہ نبیلہ بیگم کے تاثرات کا بھی جائزہ لے رہی تھی اور اسے لگا اس کے الفاظ اور انداز نے انہیں کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔

''اچھا کس سے سنی تھیں تعریفیں؟'' انجی کو اس سوال کی توقع نہیں تھی کہ خوشامد وہ چیز ہے کہ جس کی کی جائے پھر اسے اس طرح کے سوالوں کا ہوش نہیں رہتا۔ وہ اس سلسلے میں شفق کا نام لینے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی بولی۔

''شہر یار صاحب نے اور بھلا کون آپ کی تعریفیں کر سکتا ہے؟'' شفق اس کے بچے میں مگن تھی اور

انجی نے دھیرے سے کہا تھا۔

''اچھا، شہریار سے بھی بے تکلفی ہو چکی ہے۔'' وہ ارم کے چہرے کے تاثرات کو ذہن میں لا کر یہ سوال کر گئی تھیں۔

''جی جی آپ کے بیٹے آپ ہی کی طرح بہت اچھے انسان ہیں آنٹی، اور آنٹی۔۔۔! آپ نے کلر بہت خوب صورت پہن رکھا ہے، بہت سوٹ کر رہا ہے آپ پر۔''

نبیلہ بیگم دس سال ایک اسکول کی پرنسپل رہی تھیں۔ اس دوران مختلف مزاج کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا خوشامد کرنے والوں کا تو ایک با قاعدہ گروہ تھا تو وہ انجی کو کیسے نہ پہچانتیں۔ وہ یہ سوچ رہی تھیں کیا اس کی عادت ہی ایسی ہے یا یہ صرف میرے ساتھ ایسا کر رہی ہے مگر کیوں؟ اسے مجھ سے کیا مفاد ہو سکتا ہے۔

''کیسی لگیں میری والدہ؟'' شہریار ٹرے میں کوک کے گلاس رکھے چلا آیا تھا۔ سب سے پہلے انجی کو پیش کرتے ہوئے پوچھا تھا اور اس کی امی ایک بار پھر چونکی تھیں۔ شہریار کبھی کسی کام کو نہ شادی سے پہلے ہاتھ لگاتا تھا، نہ اب ان دو تین روز میں انہوں نے ایسا دیکھا تھا۔

''آپ کیوں لے آئے۔ میں لا رہی تھی۔'' شفق نے شرمندہ ہو کر کہا تھا۔

''تمہیں اتنا ہوش ہی کہاں ہے؟''

یقیناً شہریار کا انداز قابلِ گرفت تھا۔ نبیلہ بیگم تو جب سے آئی تھیں، بظاہر لا ابالی دکھائی دینے والی اس لڑکی کے سلیقے سے متاثر ہوئی جاتی تھیں اور اب بھی وہ اس کے بچوں کو سنبھالنے میں تو لگی تھی۔

''جان! اپنے آپ کو بدلو۔ خصوصاً جب ۔۔رگ گھر میں ہوں پھر تو ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔'' انجی نے کیسی نرمی سے سمجھایا تھا اور وہ کتنی شرمندہ دکھائی دینے لگی تھی۔

''صبح سے تمہاری خاطر کچن میں گھسی ہوئی ہے۔'' نبیلہ بیگم بے اختیار کہہ گئیں۔

''ہاں وہ تو اس کے حلیے سے لگ رہا ہے۔''

انجی کچھ تمسخر سے ہنسی تو شہریار نے تیز سی نگاہ اس پر ڈالی، نبیلہ کو حیرت ہوئی، اتنے اچھے کپڑوں میں تو تھی وہ سادہ چہرے کے ساتھ بھی، وہ انجی سے کہیں زیادہ سجی سنوری اور پیاری لگ رہی تھی۔

شفق کچن میں گئی۔ نبیلہ کا خیال تھا انجی بھی اس کے پیچھے چلی جائے گی اور کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے گی مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ یہیں بیٹھی رہی اور ان سے باتیں کرتی رہی۔ درمیان میں شہریار بھی بولتا رہا آخر نبیلہ ہی یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں ذرا شفق کو دیکھ لوں۔ اکیلی لگی ہوئی ہے۔''

''عجیب ہے تمہاری دوست۔ اسے تمہارا خیال ہی نہیں۔''

''وہ کہتی ہے گھر میں یہی سب کر کے میں تھک جاتی ہوں یہاں آ کر کچھ آرام کرنے کو جی چاہتا ہے اور ایک راز کی بات بتاؤں آنٹی! اسے گھر کے کاموں میں کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ اب بھی کھانا یا تو بازار سے منگوا لیتی ہے یا گھر میں ایک رشتے کی نند ہیں وہ بنا لیتی ہیں۔''

''مجھے لگتا ہے اسے بچوں کی دیکھ بھال میں بھی دلچسپی نہیں۔'' انہوں نے رائے دی۔

''ہاں اسے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ وہ جاب بھی کرنا چاہتی تھی مگر قسمت نے برا کیا بے چاری کے ساتھ، شوہر بالکل الٹ مزاج کے ملے ہیں اسے۔ انہیں انجی کے جذبات اس کے احساسات کی بالکل پروا نہیں ہے۔''

''اکثر رہتی ہے ادھر؟''

''جی ہاں میکہ تو فیصل آباد میں ہے۔ ادھر میرے پاس آ جاتی ہے۔ کبھی کبھار ہم بھی چلے جاتے ہیں ویسے زیادہ تو یہی آتی ہے۔ کہتی ہے تمہارے گھر آ کر بہت سکون ملتا ہے۔ بہت اچھی دوست ہے میری۔''

ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ انجی چلی آئی۔

''آنٹی! آپ کیا کرنے لگی ہیں۔ مجھے بتایئے میں کر دیتی ہوں۔'' وہ جو برتن خشک کرنے میں لگی تھیں۔ انجی نے ان کے ہاتھ سے کپڑا اور گلاس لے لیا۔

انجی ادھر آئی تو پیچھے ہی شہریار بھی چلا آیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

اور جو نظارہ ٹیبل پر نبیلہ بیگم نے دیکھا وہ تو انتہائی حیران کن تھا۔ کتنی محنت سے یہ سب شفق نے بنایا تھا مگر وہ بے چاری تو اب پس منظر میں تھی اور انجی بڑھ بڑھ کر شہریار اور اس کی والدہ کو کچھ نہ کچھ پیش کر رہی تھی۔ آج والدہ کو متاثر کرنے کی کوشش میں وہ شفق کی پلیٹ میں کچھ ڈالنا اور اصرار کر کے کھلانا بھول گئی تھی۔

''ہائے آنٹی! اتنا کم، یہ کباب اور لے لیں شفق! تم نے پودینے کی چٹنی نہیں بنائی۔ وہ تو ضرور بنانا چاہیے تھی۔'' اس نے ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد دوسری بار شفق کو ٹوکا تھا۔

''یہ کیچپ لے لو نا!'' شفق جلدی سے بولی تھی۔

''ہونہہ رہنے دو۔ گلا خراب ہو جاتا ہے۔''

''میٹھے میں کیا بنا ہے، یہ میرا بیٹا تو کچھ لے نہیں رہا۔''

''گاجر کا حلوہ بنایا ہے میں نے۔ شہریار کو بھی بہت پسند ہے۔''

''اوہو کسٹرڈ نہیں ہے۔'' انجی سخت پریشان دکھائی دینے لگی۔

''شفق! کسٹرڈ بنا لو۔'' شہریار نے جھٹ حکم دیا اور اس نے بھی تعمیل میں دیر نہیں کی۔ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھ جاؤ شفق!'' نبیلہ بیگ کو انجی کا انداز غصہ دلا رہا تھا مگر شہریار کا یوں کہنا اور بھی تپا گیا۔

''صبح سے بچی لگی ہوئی ہے، تھک گئی ہے۔ کسٹرڈ میں بنا دیتی ہوں۔''

''ہائے میری اچھی آنٹی! آپ کیوں تکلیف کریں گی۔ آپ پلیز بیٹھ جائیں۔ میں خود بنا لیتی ہوں۔'' وہی پیار بھرا انداز، کتنی میٹھی زبان، کتنی نفیس عورت، بڑی بڑی آنکھیں، لمبے بال۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔'' شفق ابھی تک کھڑی تھی اور کچن میں جانے کو پر تول رہی تھی۔ اس کے برابر ہی تو نبیلہ بیگم کی چیئر تھی۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے چیئر پر بٹھا دیا۔

اور انجی جو کہہ رہی تھی۔ وہ خود بچے کے لیے کسٹرڈ بنا لیتی ہے۔ اب بڑے آرام سے بچے کو چاول

کھلا رہی تھی اور وہ کھا بھی رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے۔ یہ عورت شفق کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہے اور شہریار اس سے اتنا متاثر کیوں دکھائی دے رہا ہے؟'' نبیلہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ یہ بات سمجھنا ضرور چاہتی تھیں۔ میٹھے میں گاجر کا حلوہ تھا جسے شفق نے بہت محنت سے بنایا تھا اور اس حلوے کو انجی اور شہریار نے چکھا تک نہیں۔

''شہریار! آپ کو تو گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے۔'' شفق اس کے انکار پر کہہ رہی تھی۔

''آج دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ ٹیبل سے اٹھ گیا اور شفق کا چہرہ بھی اتر گیا۔

''ارے ایسا منہ کیوں بنالیا۔ اب اس کا موڈ نہیں رات کو کھالے گا اور اگر میرے نہ کھانے پر خفا ہو تو میں یہ پورا ڈونگا ساتھ لے جاؤں گی۔ کتنے ہی دنوں تک کھاتی اور تمہیں یاد کرتی رہوں گی۔'' شفق کھل سی گئی اس بات پر۔ جبکہ وہ لاتعلق سی بیٹھی رہیں۔

''دیکھیے نا آنٹی! کتنی ذرا سی بات پر منہ پھلا لیتی ہے۔ مرد بھلا کہاں برداشت کرتے ہیں ایسی باتوں کو۔''

شہریار کسی کام سے ادھر آیا تو وہ آنٹی سے کہہ رہی تھی۔

''کم عمر اور بھولی ہے مگر دل کی بہت سادہ اور سچی ہے پھر سب سے بڑھ کر یہ انجی! کہ شریف عورتوں نے سارے ناز نخرے اپنے میاں کو ہی دکھانا ہوتے ہیں۔'' پتا نہیں انہیں کیا ہوا کہ لہجہ بھی سخت ہو گیا۔

''آؤ انجی! تمہیں کچھ نیا دکھائیں۔'' شہریار کہہ رہا تھا اور شفق برتن سمیٹ رہی تھی۔

واپسی پر اسے شہریار ڈراپ کر رہا تھا۔

''کیا تم اکیلے لے کر جاؤ گے شفق نہیں جائے گی؟'' نبیلہ بیگم کو کہنا پڑا۔

''شفق کچن سمیٹ رہی ہے اور یہ قریب ہی تو گھر ہے اس کا، میں بس ابھی ڈراپ کر کے آ رہا ہوں۔''

''جی آنٹی! یہاں قریب ہی گھر ہے۔ کیا کروں مجھے رکشا ٹیکسی میں سفر کرتے ڈر لگتا ہے۔''

وہ سوچ کر رہ گئیں۔ آخر آئی بھی تو رکشا یا ٹیکسی سے ہی ہے۔

شہریار کہہ کر گیا تھا یوں گیا اور یوں آیا مگر اب ایک گھنٹہ ہونے کو تھا۔ شفق تو سب سمیٹ کر کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹ گئی تھی۔ ان سے رہا نہیں گیا۔ اس کا نمبر ملایا اور وہ کہہ رہا تھا۔

''امی! راستے میں کچھ دوست مل گئے ہیں۔ اس لیے لیٹ ہو رہا ہوں۔ کچھ دیر سے آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔'' اور انہوں نے انجی کے بیٹے کی آواز سنی تھی۔ وہ اپنی ماں سے کچھ کہہ رہا تھا۔

''کہاں ہے شہریار؟ کیا انجی کے گھر پر نہیں؟'' پس منظر میں شور تھا۔ وہ یقیناً گھر سے باہر کسی جگہ پر ہیں۔ اگر ہیں تو اس نے جھوٹ کیوں بولا۔ ''کیا اس کے دل میں کوئی چور ہے۔'' ارم کا انجی کے بارے میں اکتائے ہوئے لہجے سے بات کرنا اور کرید کرید کر پوچھنا یاد آنے لگا۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ تو گئیں مگر سوچ اس قدر پراگندہ ہو رہی تھی کہ سو نہیں سکیں۔

❁ ❁ ❁

اگلے روز صبح ناشتے کی ٹیبل پر ہی کہا۔

''آج شام کو انجی کی طرف چلیں گے۔''

''انجی کی طرف آج شام نہیں۔ اصل میں اس سے پوچھ کر ہی پروگرام بنانا پڑتا ہے کیا پتا اس کا شوہر آج شام گھر پر ہی ہو۔''

''کیا مطلب شہریار تمہارا؟ کیا تم اس کے شوہر کی موجودگی میں اس کے گھر نہیں جاتے۔''

''اصل میں آنٹی! وہ انجی کا جو شوہر ہے نا وہ کچھ دوسرے مزاج کا بندہ ہے۔ اسے نہیں پسند کہ انجی زیادہ میل جول رکھے۔''

''تو انجی کو اپنے شوہر کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے، اب اگر شہریار کو یہ سب ناپسند ہوتا تو تم ایسا کرتیں؟ نہیں کبھی نہیں۔'' انہوں نے پورے یقین سے کہا تھا۔

شفق نے انجی کو فون کیا اور آنٹی کے آنے کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔

''تم آنٹی کو فون دو۔ میں خود بات کروں گی۔'' اور ان سے بولی۔ ''بھلا بیٹی کے گھر آتے ہوئے ماں کو اجازت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ ضرور آئیں۔ میں منتظر رہوں گی۔''

''بس امی! آپ بھی نا بس ابھی کل ہی تو ملاقات ہوئی ہے انجی سے۔ آج آپ اس کے ہاں جانے کو تیار ہو گئیں۔ وہ بھی کھانے کے ٹائم پر۔ اس بے چاری کو کتنی محنت کرنا پڑے گی۔'' شہریار کچھ کوفت کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

''تو کیا ہوا۔ کل شفق نے بھی تو اس کے لیے سارا دن برباد کیا تھا۔'' انہوں نے یاد دلایا۔

''اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' ماں کی بات اسے اچھی نہیں لگی۔

''اور اس کے گھر ایک عورت ہے جو بچے بھی سنبھالتی ہے، کھانا بھی بناتی ہے۔''

''آپ سے کس نے کہا سارا کام وہ خود ہی کرتی ہے۔''

''لگتا ہے بہت آنا جانا رہتا ہے تمہارا؟''

ماں کے انداز پر وہ چونکا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بولیں۔

''اس کا شوہر پسند نہیں کرتا تو تم لوگ آنا جانا کم کر دو۔'' اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

انجی ان کے ہاں آ کر ڈرائنگ روم تک تو کبھی محدود نہیں رہتی تھی، سیدھی لاؤنج میں آتی، بیڈ روم میں بھی جھانکتی، کچن کے بھی چکر لگتے مگر وہ جب بھی اس کے ہاں جاتے انہیں ڈرائنگ روم میں ہی بٹھاتی۔ ہاں شفق اس کے پیچھے آتی ضرور مگر شروع شروع میں اب وہ اسے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھنے کو کہتی تھی۔

آج بھی ایسا ہی تھا وہ لوگ جا کر بیٹھے ہی تھے کہ انجی کے ہاں رہنے والی خاتون چلی آئیں۔

''ارے شفق! آج بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا۔ شہریار صاحب جب بھی آتے ہیں۔ میں آپ کا ضرور پوچھتی ہوں۔''

نبیلہ نے چونک کر شفق کو دیکھا اور اسی وقت انجی تیزی سے شفق کو کوئی بات سنانے لگی اس کا انداز ایسا تھا کہ نبیلہ بیگم کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ کیا شفق نے خاتون کی بات سنی ہی نہیں۔

''اچھا بھابھی جی! پھر میں چلتا ہوں۔'' ایک جوان سا مرد جس کے چہرے پر تھکن کا تاثر تھا۔ آ کر

جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

"ہائے ابھی سے چلے، سچی بڑا ہی افسوس ہوتا ہے آپ کی گھریلو لائف پر۔ آپ جیسے مرد تو چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ کیسی عورت ہے جس نے آپ کی قدر نہیں کی۔ ہمیشہ گھاٹے میں رہے گی۔"

پتا نہیں کس کی بات ہو رہی تھی اور اس مرد سے، بہت گہری ہمدردی جتائی جا رہی تھی۔

"ذرا ٹھہریے بلکہ اندر آئیے۔" وہ اسے لے کر اندر گئی نبیلہ بیگم بھی اٹھ کر پیچھے آ گئیں۔

"یہ گاجر کا حلوہ ہے، بڑی محنت سے بنایا ہے میں نے، لے جایئے، کھایئے گا آپ کی صحت بہت کمزور ہو رہی ہے، پتا نہیں یہ کیسی بیویاں ہوتی ہیں جنہیں اپنے شوہر کی صحت کی بالکل فکر نہیں ہوتی۔ میں تو اظہر کو روزانہ دودھ کے ساتھ حلوہ گرم کر کے دیتی ہوں۔"

"بھابھی! بہت شکریہ یہ بڑی مہربانی۔ حلوہ اس نے بنایا ہوا ہے۔ گرم دودھ کے ساتھ روزانہ دے بھی دیتی ہے۔ آپ یہ رہنے دیں۔" وہ بہت شکر گزار ہوتا چلا گیا۔

"کون تھا یہ؟" نبیلہ بیگم نے پوچھا۔

"رشتے میں دیور ہوتے ہیں۔" اب اس کے انداز میں اس مرد کے لیے لاپروائی سی اتر آئی تھی۔

وہ شفق کا دیا گاجر کے حلوے کا ڈونگا واپس فریج میں رکھ رہی تھی اور نبیلہ اس کے کچن کی ابتر حالت کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نام نہاد دیور سے جو گفتگو اس نے کی تھی اس اس کے جانے کے بعد جو انداز اس کے لیے اپنایا تھا۔ اس نے نبیلہ پر بہت کچھ عیاں کر دیا تھا۔ وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئیں اور شہریار اور شفق کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"تم نے انجی کا باقی گھر بھی دیکھ رکھا ہے؟" وہ شہریار سے مخاطب تھیں۔

"نہیں، میں ڈرائنگ روم تک ہی آتا ہوں۔"

"لو آج دیکھو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ تمہیں شفق جیسی سگھڑ، سلیقہ شعار بیوی ملی ہے۔"

وہ جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ابھی ابھی خاتون نے جس طرح اس کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ اسے کچھ نہ کہنا ہی مناسب لگا۔ ویسے انجی کے لیے ماں کا یہ انداز اسے اچھا نہیں لگا۔

"ارے آپ لوگ ادھر کیوں آ گئے؟ چلیے نا اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

انجی انہیں لاؤنج میں کھڑے دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھی کہ یہاں ہر طرف کچھ نہ کچھ بکھرا ہوا تھا۔ وہ خاتون جلدی سے آگے بڑھ کر چیزیں سمیٹنے لگیں۔ نبیلہ نے منع کر دیا بولیں۔

"رہنے دو، ہم اُدھر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔"

وہ واپس آ کر بیٹھے تو انجی کا بیٹا شہریار سے بولا۔

"چاچو! آج پھر آئس کریم کھانے جائیں گے کل بڑا مزا آیا تھا۔" نبیلہ تو چونکیں مگر ان کے ساتھ ساتھ اس بات نے شفق کو بھی حیران کر دیا۔ شہریار نے بچے کو جواب میں کچھ نہیں کہا۔ خود کو اخبار میں گم کر لیا۔ شفق کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن میں آئی تو انجی کچھ چیزوں کی لسٹ بنا رہی تھی۔

"کل میرے گھر سے آپ لوگ کس وقت واپس آئے تھے؟ کیا راستے میں دیر لگی تھی؟"

"نہیں نہیں۔ تمہیں تو پتا ہے دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہے۔ ہم سیدھے گھر ہی آئے تھے۔ وہ

شہریار کو ہمیں ڈرائیور کرنے کے بعد کوئی مل گیا ہو گا نا۔ اس لیے دیر ہو گئی ہو گی۔"

وہ خوامخواہ کی وضاحتیں دے رہی تھی اور ادھر نبیلہ بچے کو اس کے ساتھ کھیلنے کے بہانے ڈرائنگ روم سے باہر لے آئی تھیں اور پوچھ رہی تھیں۔ وہ آئس کریم کھانے کہاں گیا تھا۔ کیا وہ پہلے بھی انکل کے ساتھ ریسٹورنٹ جاتے رہتے ہیں۔

"ہاں مگر کبھی کبھی جب میں بہت زیادہ ضد کروں تب ورنہ تو ماما مجھے اور گڑیا کو پھپھو کے پاس چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔"

انجی نے اکثر چیزیں بازار سے ریڈی میڈ منگوائیں اور لسٹ شہریار کو تھمائی۔ ان سے کہنے لگی۔

"محلے کے کسی لڑکے کو بھیجوں گی تو لاپروائی برتے گا۔ یہ سب کچھ ذمہ داری سے لے آتے ہیں۔"

"پہلے بھی منگواتی رہی ہو؟"

"ارے نہیں نہیں آنٹی! آپ پوچھ لیں شفو سے۔ یہ ساتھ ہی تو آتی ہے۔ کبھی بھیجا ہے میں نے آپ کے بیٹے کو بازار؟"

کچن میں اس کے رشتے کی نند کام نبٹا رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے پاس بیٹھی شیرینی میں ڈوبی گفتگو سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر دیکھ رہی تھی۔ ساس بہو دونوں ہی بہت چپ چپ ہیں اور اس کی بات کو زیادہ دھیان سے نہیں سن رہیں پھر یہ بھی ہوا کہ نبیلہ نے اس کی بات کاٹ کر شفق کو کوئی قصہ سنانا شروع کر دیا۔

آج ٹیبل پر پہلے سے زیادہ آئٹمز رکھے گئے تھے۔ یقیناً یہ اہتمام نبیلہ کے لیے تھا مگر انہوں نے صرف گھر کے بنے ویجی ٹیبل رائس تھوڑے رائتہ کے ساتھ لیے۔

"امی! یہ فش بھی لیں نا۔ اس علاقے میں ادھر اس دکان کی فش بہت مزے کی ہوتی ہے۔"

شہریار نے کہا اور انہوں نے سر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔

"تم آتے رہتے ہو ادھر یہ فش کی دعوت اڑانے؟"

انداز ایسا تھا کہ انجی اور وہ، دونوں گھبرا گئے انجی پہلے سنبھلی اور بولی۔

"ارے شفق! تم کچھ لے ہی نہیں رہیں۔ میری جان اتنا اہتمام میں نے تم ہی لوگوں کے لیے تو کیا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" شفق نے بے حد رکھائی سے کہا تھا۔

"اچھا پھر کچھ میٹھا ڈال دوں؟"

"میں نے کہا نا۔ بھوک نہیں ہے۔ تم یہ تکلف مت کرو۔"

اب کے اس کا انداز شہریار کو بہت برا لگا۔ کڑے تیوروں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا مگر وہ متوجہ کب تھی۔ تھوڑا سا کھا کر نبیلہ نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے آنٹی! آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔"

"میں بازار کی بنی اشیاء نہیں کھاتی۔ پہلے میں خود اپنے ہاتھ سے پکاتی تھی۔ اب اللہ نے دونوں بہویں بھی گھر گرہستی کو سنبھالنے والی دی ہیں۔"

انجی اٹھ کر بیٹے کی فرمائش پر اندر سے کچھ لینے گئی تو شہریار بولا۔

''اس نے اتنا سب کچھ آپ ہی لوگوں کے لیے منگوایا ہے مگر پتا نہیں آپ دونوں اتنے نخرے کیوں کر رہی ہیں۔''

''تم تو کھا رہے ہو نا بس کھاتے جاؤ اور جھوم جھوم کر اس کی تعریفیں کرتے جاؤ۔''

نبیلہ نے بنا کسی لحاظ کے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ شفق اب بھی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ بہت سی باتیں بہت سے منظر واضح ہو رہے تھے۔

کمال ہے وہ یہ سب کچھ اب تک کس طرح نظر انداز کرتی آئی تھی۔ مجھ سے بے وقوف عورت بھی زمانے میں کوئی نہیں ہوگی۔

''چلیں آنٹی!'' آخر حوصلہ جواب دے گیا۔

''ہاں ہاں چلو۔'' وہ بھی جھٹ سے بولیں۔

''وہ چائے بنانے گئی ہے۔'' شہریار نے یاد دلایا۔

''پتا نہیں بنانے گئی ہے یا بازار سے منگوانے گئی ہے۔'' انہوں نے تمسخر اڑایا پھر بولیں۔

''ایسی کام چور عورتیں ان ہی مہمانوں کو پسند کرتی ہیں جو بنا کچھ کھائے پیئے ہی اٹھ جائیں۔ میرا نہیں خیال وہ زیادہ اصرار کرے گی۔''

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

''مجھے حیرت ہے شفق! تم جیسی سلجھی ہوئی لڑکی کی دوستی انجی جیسی عورت سے کیوں ہوگئی؟'' واپسی پر گاڑی میں بیٹھی وہ یہ صرف شہریار کو سنانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

''کسی کے بارے میں اتنی جلدی رائے قائم نہیں کر لینی چاہیے۔'' وہ چپ نہیں رہ سکا۔

''میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اسکول میں جاب کی ہے۔ دن میں بیسیوں لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا اور اس کے علاوہ بھی یہاں تک پہنچتے پتا نہیں کتنے چہروں کو دیکھا اور پڑھا ہے، میں نے انجی کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔''

اس دوران شفق بالکل خاموش اور بے حد تھکی تھکی سی تھی، اس نے بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن جس طرح شہریار کھل کر انجی کی طرف داری کر رہا تھا اس کا دل لہولہو ہو رہا تھا۔

''غلطی میری ہی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کے سامنے انجی کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ وہ میری دوست تھی۔ مجھے اچھی لگتی تھی مگر میں نے شہریار کے دل تک اس کا راستہ بنانے کی حماقت کیوں کی اور میں اب تک کچھ سمجھی کیوں نہیں؟ میں نے آنکھیں بند کر کے دونوں پر اعتبار کیوں کیا؟ وہ اس کے ساتھ اکیلی آؤٹنگ پر جاتی ہے۔ شہریار اکثر اس کے گھر بھی جاتا رہتا ہے۔ دل میں چور ہے۔ اسی لیے تو کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔''

''اترو بیٹا! گھر آ گیا ہے۔'' وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا، نبیلہ کی آواز پر وہ گہری سانس لے کر تھکے تھکے انداز میں گاڑی سے اتر آئی۔ اس کے انداز کو شہریار نے حیرت سے دیکھا۔

''کیا ہوا؟ جب تم انجی کے ہاں گئی تھیں بالکل ٹھیک تھیں، شاید امی کی باتوں نے تمہیں ہرٹ کیا

ہے۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کہہ گئی ہیں حالانکہ ہمیشہ انہیں ہر ایک کے ساتھ کھلے دل کھلی بانہوں سے ملتے دیکھا ہے مگر انجی کے لیے ان کا رویہ میرے لیے بھی حیران کن ہے۔''

جواب میں وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی وہ آنٹی کی رائے سے بالکل متفق ہے انہوں نے انجی کے بارے میں جو کہا ہے اسے دل سے مانتی ہے مگر دکھ کا بوجھ اتنا تھا کہ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا، سامنے کھڑا یہ شخص اسے خود سے بڑھ کر پیارا تھا۔ بہت مان تھا اس پر اور اس نے کیا کیا اس پر ایک دوسری عورت کو ترجیح دے کر اسے اپنی نظروں میں دو کوڑی کا کر دیا۔

شہریار بستر پر لیٹتے ہی سو گیا اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھی اور باہر آ گئی۔ شاید آنٹی جاگ رہی ہوں۔ وہ ان کے کمرے میں آئی اور واقعی جاگ رہی تھیں اور بستر پر لیٹنے کے بجائے سنگل صوفے پر بیٹھی کسی سوچ میں گم تھیں۔

''میں آ جاؤں آنٹی!''

''آؤ بیٹا! آؤ، تم ابھی تک سوئیں کیوں نہیں؟'' وہ ان کے پیروں کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گئی، سر ان کی آغوش میں رکھا اور ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔

''نہیں بیٹا! روتے نہیں ہیں، زندگی میں بہت سے ایسے مقام آتے ہیں جب لگتا ہے زندگی بہت بوجھل ہو رہی ہے۔ ہم اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہیں مگر پھر یہ وقت گزر جاتا ہے۔ زندگی پھر سے رواں دواں ہو جاتی ہے بس بیٹا! ذرا عقل سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تم مت گھبراؤ۔ تم اکیلی نہیں ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''مگر میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ شہریار نے ایک دوسری عورت کو مجھ پر ترجیح دے کر مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔''

''تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ ہیرے کی قدر جوہری کو ہوا کرتی ہے۔ تم جان لو کہ اس کی نگاہ جوہر شناس ہے ہی نہیں مگر ہم اسے کیچڑ میں ہاتھ بھی نہیں ڈالنے دیں گے۔''

''کیا میں شہریار پر اپنے شک کا اظہار کر دوں؟''

''نہیں، اس طرح اسے جو جھجک ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ میں اس وقت بستر پر لیٹ کر سونے کے بجائے تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''کیا انجی اپنے میاں سے طلاق لے کر شہریار سے شادی۔۔۔'' اس سے آگے بولا نہیں گیا۔

''میرا نہیں خیال، اس طرح کی عورتیں صرف اور صرف مردوں کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کی متمنی ہوتی ہیں۔ یہ بات تو وہ خود بھی جانتی ہے۔ شہریار اس کے بچوں کو کبھی نہیں اپنا سکتا اور وہ اپنے بچے تو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔''

''وہ شہریار کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ مجھ سے یہ بھی برداشت نہیں ہو رہا۔''

''میں نے کہا نا بیٹا! بہت عقل سے کام لینا ہوگا، میرا خیال ہے۔ ہمیں انجی پر بھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اس کی سیاہ شکل دیکھ چکے ہیں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

صبح شہریار کے آفس جانے کے بعد انہوں نے شفق کے میکے فون کیا۔ کچھ دیر اس کی امی سے بات کرنے کے بعد ارم سے بات کروانے کو کہا۔ اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد انجی کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

''کیا ہوا آنٹی! آپ اس کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''بہت دخل بڑھ گیا ہے اس کا میری بہو کے گھر میں۔ یہاں تک کہ اب تو شفق بھی کھٹکنے لگی ہے۔''

''شہریار بھائی بھی اس کا دم بھرنے لگے ہیں کیا؟''

''ہاں یہی بات تو پریشانی کی ہے۔''

''آنٹی! مجھے وہ کبھی بھی اچھی نہیں لگی۔ جب میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تو وہ میرے میاں سے تو بے تکلف تھی ہی۔ ان کے سامنے مجھے ٹوکتی بہت تھی خود کو عقل کل ثابت کرنے کے چکروں میں رہتی تھی اور آپ تو جانتی ہیں مرد ایسی عورتوں سے، اگر وہ بیوی نہ ہو تو بہت متاثر ہو جاتے ہیں۔ مگر میں بے وقوف نہیں تھی، وہ مجھ سے کہتی ارے بھابھی! یہ کیا ڈل سا کلر پہن لیا ہے آپ نے۔ اور میں پورے اعتماد سے کہتی ڈل یہ کالے کلوٹے لوگوں پر لگتا ہے۔ مجھ پر تو ہر کلر سجتا ہے۔ ہاں تم کبھی بھول کر بھی نہ پہننا۔ کبھی میرے بنائے ہوئے کھانے پر اعتراض کرتی، تب بھی میں ایسا ہی جواب دیتی اور آخر اس نے میرے سامنے آنا ہی کم کر دیا۔ مگر شفق بہت نادان ہے اور پھر وہ اس کی دوستی پر ایمان بھی لا چکی ہے۔''

''تمہاری باتوں سے مجھے ایک تسلی تو ہوئی ہے کہ وہ جو بھی کر رہی ہے صرف اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کر رہی ہے۔ شہریار میں اس کی دلچسپی دوسری طرح کی نہیں ہے۔''

''پھر بھی آنٹی! آپ نگاہ رکھیے۔''

واقعی ارم کا مشورہ معقول تھا اور پھر شہریار کا دل بھی تو اس کی جانب مائل محسوس ہوتا تھا۔

❁ ❁ ❁

شفق دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب انجی کا فون آ گیا۔ وہی بے تکلف اور پیار بھرے انداز، شفق نے اسپیکر آن کیا اور سیل فون لے کر نبیلہ کے پاس آ بیٹھی۔

''ہائے شفق! تمہاری ساس تو مجھے بہت ہی تیز عورت لگتی ہے۔''

نبیلہ کے اشارے پر اس نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اس سے ذرا دور دور رہا کرو اور سنو زیادہ خدمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی جلدی واپس چلی جائے اچھا ہے۔ ویسے گھر جا کر میرے بارے میں کوئی بات تو کی ہوگی۔''

''نہیں وہ جلدی سو گئی تھیں۔ اچھا انجی میں کھانا بنا رہی تھی۔ شہریار آنے والے ہوں گے۔''

''کیا بنا رہی ہو؟''

''قیمہ مٹر۔''

''ہوں میری فیورٹ ڈش۔'' کوئی اور وقت ہوتا تو شفق جھٹ اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالتی مگر آج اس نے ایسا نہیں کیا۔

''اچھا شفق! تم کچن دیکھو میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ فون سے فارغ ہوئی نبیلہ کے ذہن میں نہ جانے کیا آئی۔ اٹھ کھڑی ہوئیں اور آدھے گھنٹے کے بعد وہ انجی کے بیٹے کے ساتھ موجود تھیں۔

''آپ انجی کی طرف گئی تھیں۔ کیا وہ آپ کے ساتھ آئی ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ نہیں صرف اس کا بیٹا! خاصا ضدی اور ہڈ دھرم بچہ ہے، خیر اس کی یہی عادتیں ہمارے لیے سود مند رہیں گی۔''

شفق سمجھی نہیں مگر اتنا بھروسا تھا وہ جو کریں گی غلط نہیں ہوگا اور جب شہریار گھر میں داخل ہوا، بچہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا اور چاکلیٹ کی فرمائش کر رہا تھا۔

''کیا انجی آئی ہیں؟'' اس کے بیٹے پر نظر پڑتے ہی وہ پوچھنے لگا۔

''نہیں میں اس کی طرف گئی تھی۔ بیٹے نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ یہ بھی ضد پر ضد کیے جا رہا تھا۔ اسے میں لے آئی۔''

''یہ بہت ضدی بچہ ہے۔ اسے کیوں لیں آئیں۔ میں دوپہر میں ریسٹ کا عادی ہوں اور یہ اپنے باپ کی کاپی۔'' شہریار کے انداز میں بچے کے لیے بےزاری ہی بےزاری تھی اور اسے نبیلہ نے پہلی کامیابی سمجھا تھا۔

''پلیز اسے خاموش تو کروائیں۔ شفق سے کہیں۔ وہ اسے بہت اچھی طرح ہینڈل کر لیتی ہے۔''

''شفق اس وقت کھانا بنا رہی ہے۔''

''انکل مجھے چاکلیٹ کھانی ہے اور اسی ریسٹورنٹ میں آئس کریم بھی کھانے چلیں نا!''

''چپ خاموش۔ خبردار! جو ایک لفظ بھی بولے۔'' بھانڈا پھوٹنے کے ڈر سے وہ دھاڑا۔ بچہ پھر سے گلا پھاڑنے لگا۔

آج کا لنچ بھی برباد ہوا اور ریسٹ بھی کہ بچے نے بیٹ بال کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ لاؤنج میں کھیل رہا تھا۔ بال بار بار ان کے کمرے کے دروازے پر لگ رہی تھی پھر اچانک شور بند ہو گیا۔ اس نے شکر کا کلمہ پڑھا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

جب نبیلہ بچے کو لے کر دوپہر میں ہی انجی کے ہاں پہنچیں تو وہ خاصی حیران ہوئی۔

''اتنی گرمی میں، شام کو آ جاتیں آپ۔''

''وہ اصل میں شہریار گھر آ گیا ہے۔ یہ روتا ہے تو اُسے غصہ آتا ہے۔ بیٹی، مرد اپنے بچوں کے رونے کو ہی برداشت کرتے ہیں۔ مگر دوسرے کے بچے کی ضد انہیں طیش دلا دیتی ہے۔''

''ہاں ماما! انکل تو بہت گندے ہیں انہوں نے مجھے مارا۔ چاکلیٹ بھی نہیں دلائی۔''

شہریار نے اسے مارا نہیں تھا مگر نبیلہ سارے راستے ہی سمجھاتی آئی تھیں۔ گھر جا کر کہنا انکل نے مجھے مارا۔

انجی کے چہرے کا تاثر واضح طور پر بدلا۔ پھر وہ سنبھلی اور بولی۔

''آنٹی! اندر تو آئیں نا۔''

''کیا گڈو کے پپا گھر پر ہیں؟'' انہوں نے گاڑی دیکھ کر پوچھا۔

''جی ہاں سو رہے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے میں پھر کبھی آؤں گی انجی! تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔ تمہارے بچے بھی بہت پیارے ہیں۔''

وہ واپس آئیں۔ شفق سونے کے لیے کمرے میں نہیں گئی تھی۔ وہیں بیٹھی تھی۔ وہ بھی اس کے برابر بیٹھ گئیں۔ آہستہ آہستہ سب بتانے لگیں۔

اگلے روز جو شہریار گھر آیا۔ انجی کے دونوں بچے اس کے گھر پر تھے۔ پتا چلا انجی اور شفق بازار گئی ہیں۔ بٹی رو رہی تھی، بیٹا ٹی وی پر اپنے پسندیدہ کارٹون دیکھ کر شور کررہا تھا۔ کارپٹ پر بسکٹوں کا چورا ہر سو بکھری تھی، کشن اخبار سب فرش پر تھے۔

گھر آتے ہی ماتھے پر بل پڑ گئے، وہ بے حد نفیس طبیعت کا مالک تھا اور اتنے شور اور ابتری سے اسے سخت الجھن ہوتی تھی۔

''امی! یہ سب کیا ہے۔ کتنا گند ڈال دیا ہے اس نے۔''

''میں کس کس کو دیکھوں؟ یہ سب اس نے انجی کے سامنے ہی کیا ہے۔ وہ تو عادی ہے اس کی، اس کے اپنے گھر کی حالت اس سے بھی ابتر ہوتی ہے۔ نہیں سمیٹا یہ سب۔ اسے بس بازار جانے کی جلدی تھی۔''

''بچوں کو تو گھر چھوڑ آتی۔''

''وہ اس کے رشتے کی نند کچھ دنوں کے لیے کسی دوسرے عزیز کے ہاں گئی ہے۔ بچوں کو کہاں چھوڑتی۔''

''توبہ چوہیا سی ہے اور گلے میں جیسے لاؤڈ اسپیکر نصب ہے۔''

اس نے دانت پیس کر بچی پر تبصرہ کیا اسی وقت بچے نے کسی ڈرامائی سین پر نعرہ بلند کیا اور ریموٹ اٹھا کر مارا۔

''اوئے بدتمیز آرام سے۔'' شہریار نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آف کردیا۔

''انکل مجھے دیکھنا ہے۔'' وہ عادت کے مطابق فرش پر لیٹ کر ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔

نبیلہ کچن میں جاکر شفق کو فون کر چکی تھیں کہ وہ واپس آئیں۔ شہریار سے بچہ ریموٹ لینے کی کوشش میں تھا اور وہ دے نہیں رہا تھا۔

''شہریار بیٹے! اب کمرے میں مت چل پڑنا۔ یہ آفت بچے مجھ سے نہیں سنبھالے جاتے، کچھ مدد کرو۔''

''امی! میں ابھی تھکا ہوا آیا ہوں۔ میں کیا کروں؟'' وہ جھلایا۔

''تم تو ان کے گھر جاتے رہتے ہو۔ تم سے تو کچھ مانوس ہوں گے۔''

''میں نے کبھی انہیں زیادہ لفٹ نہیں کرائی، کالے کالے بچے مجھے اچھے نہیں لگتے۔''

''اچھا میرا خیال کر کے ہی بیٹھ جاؤ۔'' وہ بد دلی سے بیٹھ گیا پھر بولا۔

''کھانے میں کیا بنا ہے۔ میں چینج تو کر آؤں پھر کھانا کھاتے ہیں۔ یہ خر دماغ بھی شاید بہل جائے اور اس چڑیل کے منہ میں فیڈر ہی ڈال دیں۔''

''کھانا تو شفق بنا کر نہیں گئی۔ بس وہ انجی کو جلدی تھی بولی۔ اگر ایک دن وقت پر کھانا نہیں ملے گا تو

کیا ہو جائے گا۔ اصل میں اس کا میاں تو ہے نا بھلا مانس۔۔۔''

''اب کیا ہوا کھاؤں۔ شفق کو نہیں پتا تھا میں آفس سے آنے والا ہوں۔''

''بس بیٹا! سہیلی کا بہت اثر لیتی ہے۔''

''کسی اچھی بات کا بھی اثر لے لے۔''

''کون سی اچھی بات، گھر آئے ہر مرد کے آگے پیچھے پھرنا، اسے اس کی بیوی کے خلاف ورغلانا یا اپنے شوہر کی پروا نہ کرنا۔ ہر کسی کے سامنے اس غریب کا مذاق اڑانا جو اس کے آرام کی خاطر محنت کرتا ہے۔''

ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ شفق کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ نبیلہ نے بچے کے ہاتھ میں پکڑا کھلونا کھینچ لیا۔ وہ پھر سے چلانے لگا۔ ساتھ ہی ڈر کر بچی بھی رونے لگی۔

''چپ کر جاؤ ورنہ اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔'' وہ دھاڑا تھا اور انجی ٹھٹک گئی تھی، پھر تیزی سے اندر کی جانب لپکی، روتی ہوئی بچی کو سینے سے لگایا، بیٹے کا ماتھا چوما۔

''جب سے آئے ہو شہریار بچوں پر ناک بھوں چڑھا رہے ہو۔ سچ ہے مرد پرائی اولاد برداشت نہیں کرسکتا۔''

''ن۔۔۔نہیں، یہ ضد ہی بہت کرتا ہے۔'' وہ کچھ شرمندہ سا ہوا اور اٹھ کر چینج کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہ دونوں انجی کو کھانے پر روکتی رہیں مگر وہ رکی نہیں بچوں کو لے کر واپس چلی گئی۔

تیسرے روز جب نبیلہ اس کے بیٹے کو لینے جارہی تھیں تو شفق نے کہا تھا۔ ''وہ ناراض ہوکر گئی ہے اب نہیں بھیجے گی۔''

''ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے؟'' وہ چلی آئیں۔

انجی واش روم میں گر گئی تھی، ٹخنے پر بہت چوٹ آئی تھی۔ اس سے تو پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا۔

''تمہاری نند کو بھی ان ہی دنوں میں جانا تھا'' وہ بڑبڑائیں۔

''بس آنٹی! سب مطلب پرست ہیں۔'' وہ کراہی۔

''تم اٹھو چلو میرے ساتھ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ میرے گھر ہی رہو۔''

''مگر آنٹی!'' وہ ہچکچائی۔

''کوئی اگر مگر نہیں بس چلو۔'' وہ تینوں کو زبردستی لے آئیں۔ انجی ملگجے لباس میں اور بغیر میک اپ کے تھی۔ نبیلہ نے الماری سے اس کے دو بے حد عام سے جوڑے اٹھائے تھے۔

میک اپ کے بغیر اس کا سانولا رنگ بہت گہرا سانولا لگ رہا تھا۔ مسکارے اور آئی پنسل کے استعمال کے بغیر آنکھیں بھی گہرے ساگر نہیں دکھ رہی تھیں، جامنی ہونٹ اور بھی برا تاثر چھوڑ رہے تھے۔

وہ تکلیف میں تھی۔ یہاں آکر نبیلہ نے اسے اپنے بیڈروم میں لٹایا۔

میک اپ کے بغیر وہ کیسی لگتی ہے۔ وہ خود بھی جانتی تھی۔ خیال تھا شہریار کی آمد سے پہلے وہ میک

اب کرلے گی اس کی پیکنگ تو نبیلہ آنٹی نے کی تھی وہ ایسا کچھ بھی نہیں لائی تھیں، میں شفق سے لے لوں گی مگر شفق پتا نہیں کہاں مصروف تھی۔

شہر یار کی گاڑی کی آواز اس نے سن لی تھی اور وہ بڑی بے چینی محسوس کر رہی تھی، عام سے کاٹن کے کپڑے، الجھے بکھرے بال، بے رونق چہرے، اف یہ شفق کہاں مرگئی ہے۔ اسے بے تحاشا غصہ آیا۔ اسی وقت اس کے بیٹے کے زور زور سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

''امی! امی!'' شہر یار چلا رہا تھا۔ ''آپ آج پھر اس مصیبت کو اٹھا لائی ہیں۔ پتا نہیں اس کالے کلوٹے میں آپ کو کیا کشش محسوس ہوتی ہے، چپ کر جا منحوس!'' اب وہ بچے سے مخاطب تھا۔

''یہی نہیں اس کی بہن بھی آئی ہے۔ تمہارے بیڈ پر سو رہی ہے۔'' نبیلہ نے ہنس کر کہا تھا۔

''میرے بیڈ پر کیوں، میں نے شفق سے پہلے بھی کہا تھا اسے میرے کمرے میں مت ڈالا کرے عجیب سی اسمیل آتی ہے اس سے۔''

''میرا خیال ہے انجی بچوں کو کم کم ہی نہلاتی ہے شاید اس لیے۔'' اس خیال کا اظہار نبیلہ نے کیا پھر اس کے بیٹے کو پیار سے چپ کرانے لگیں۔

''مجھے یہی میگزین چاہیے۔'' بچہ اپنے نام کا ایک تھا۔ اندر انجی غصے میں بل کھا رہی تھی۔

''میرے بچوں کے لیے اتنی نفرت ہے شہر یار کے دل میں۔ کیسے کیسے نام دیتا ہے انہیں اور میری پہلی محبت اپنے بچے ہیں۔ بہت پیار کرتی ہوں میں اپنے بچوں سے۔'' تیز تنفس کے ساتھ سیل اٹھایا اور میاں کو کال کرنے لگی۔ شہر یار کے گھر کا ایڈریس بتا کر جلد آنے کو کہا تھا۔

باہر اس کا بیٹا اب بھی رو رہا تھا۔ شفق نے شاید اسے پانی کا گلاس لا کر دیا تھا۔

''نہیں پیوں گا، نہیں پیوں گا۔''

''مت پیو، مرو ہماری طرف سے۔ خبردار! اب آواز نکالی اور شفق پلیز! اس آفت کو وہاں سے اٹھاؤ۔ دیکھو آرام سے اٹھانا۔ جاگ گئی تو گھر سر پر اٹھا لے گی، آج میری طبیعت ٹھیک نہیں، فلو ہو رہا ہے میں بس ایک کپ چائے لے کر سونا چاہتا ہوں۔''

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا اسی وقت لنگڑاتے ہوئے انجی لاؤنج میں آئی تھی۔

''ارے یہ انجی ہے یا اس کا بھوت۔'' وہ ٹھٹھکا۔

''بیٹا ادھر آؤ میرے پاس۔ فون کیا ہے میں نے تمہارے پپا کو۔ ابھی آ رہے ہیں پھر ہم اپنے گھر چلیں گے راستے میں تم جو کہو گے تمہارے پپا تمہیں دلائیں گے۔''

وہ شہر یار کی طرف دیکھے بغیر بہت سپاٹ انداز میں شاید اسے ہی سنانے کو بچے سے کہہ رہی تھی۔

''انجی تم بھی آئی ہو، میں سمجھا بچے ہی ہیں اور یہ تمہیں ہوا کیا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' انجی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں، شفق سے بولی۔

''بیٹی کو مجھے دو اور آنٹی کے کمرے میں رکھا میرا بیگ بھی لے آنا۔ ان کے پپا آتے ہی ہوں گے۔''

''انجی تم لوگ کھانا کھا کر جانا۔''

''نہیں آنٹی! شکریہ۔ اس کے پپا سے کہا ہے میں نے، وہ بازار سے لیتے آئیں گے پھر ہم نے

اپنے بیٹے کو اس کی پسند کے کھلونے بھی دلوانے ہیں۔''

''اچھا تو بچوں سے پیار کرتا ہے تمہارا میاں، چلو یہ بھی غنیمت ہے۔ میں سمجھی جیسے تم پر توجہ نہیں دیتا ایسے ہی شاید بچوں کو بھی اگنور کرتا ہے۔''

''نہیں نہیں آنٹی! اپنے بچوں میں تو جان ہے ان کی، کوئی ان کے سامنے ان کے بچوں کو کچھ کہہ کر تو دیکھے اور میرا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔ اب تو میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی بس میں، میرے بچے اور ہمارے سر کا سائبان اظہر۔'' یقیناً اس نے یہ سب شہر یار کو سنایا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد اظہر آ گیا، شہر یار نے آج پہلی بار اسے دیکھا۔ اچھا خاصا معقول شخص تھا، کم از کم اس سے تو بالکل مختلف جو کچھ انجی بتاتی رہی تھی۔ آتے ہی بیٹی کو پیار کیا پھر بیٹے کو گود میں لے لیا۔

''چلیے گھر چلتے ہیں۔'' انجی اس کے بے حد قریب کھڑی تھی اور یہ عام سی بات بھی بڑے خاص انداز میں شاید شہر یار کو کچھ جتانے کے لیے کہہ رہی تھی۔

''کھانا کھا کر جاتے آپ لوگ۔'' نبیلہ نے کہا مگر انجی کسی طور تیار نہیں تھی۔

''لو اتنے بھلے مانس شوہر کے لیے یہ عورت کیسے کیسے الفاظ استعمال کرتی رہی ہے۔'' نبیلہ نے ان کے جانے کے بعد کہا تھا۔

''جی آنٹی! انجی کو ہمدردی سمیٹنے کی ہمیشہ سے عادت ہے۔'' آج شفق بھی چپ نہیں رہ سکی تھی۔

''گھر میں کیسا سکون ہو گیا ہے، بچے تو گھر کی رونق ہوا کرتے ہیں مگر اس کے بچے تو آفت ہیں۔'' یہ نبیلہ تھیں۔

شہر یار نے شفق سے دوا کے لیے کہا اور پھر سے کمرے میں چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

شہر یار کو فلو ہوا پھر بخار نے آ لیا۔ تین دن تک وہ آفس نہیں جا سکا اور ان تین دنوں میں ان دونوں نے اسے کمرے میں اکیلا نہیں چھوڑا۔ ایک کام کے لیے اٹھتی تو دوسری آ بیٹھتی۔ وہ اسے انجی کو کال کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں اور شہر یار ایسے موقعے کی تلاش میں تھا بھی نہیں۔ ان تین دنوں میں صرف پہلے روز ہی اس نے انجی کے بارے میں سوچا تھا۔ ''کیا میں بچوں سمیت اسے قبول کر سکتا تھا؟ یا میں کسی طلسم میں گرفتار ہو رہا تھا۔ میں جو ہمیشہ خود کو بہت سمجھ دار سمجھتا رہا، مجھے کیا ہو رہا تھا؟'' وہ خود پر حیران تھا اور بس۔

تیسرے دن وہ آفس گیا اور وقت پر واپس آیا۔ شام میں ان دونوں سے کہیں باہر لنچ کے لیے کہہ رہا تھا اور انہوں نے انکار نہیں کیا۔

بہت دن گزر گئے۔ انجی کا فون بھی نہیں آیا اور شفق خود سے کال کرتی اب تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اور جس روز ڈاکٹر نے شفق کو امید سے ہونے کی خوش خبری دی تھی۔ وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔

''شفق! کیا ہوا بھئی کیا تم خوشی سے رو رہی ہو؟''

''نہیں آنٹی! میں شہر یار کے بارے میں سوچ رہی تھی اگر آپ نہ ہوتیں اور یہ مسئلہ حل نہ کرتیں تو

آج یہ خبر۔۔۔عورت کتنی بے اماں ہے۔''

وہ جواب میں نفی نہیں کر سکیں بس اس کا سر سینے سے لگا کر تھپکنے لگیں۔ پھر اسے خود سے الگ کیا اور بولیں۔

''بیٹا حدیث ہے: ''عورت اپنے مرد کے سامنے دوسری عورت کی تعریف نہ کرے۔'' مگر دوسری بہت سی باتوں کی طرح ہم نے کبھی اس بات پر بھی غور نہیں کیا۔ اس کی حکمت سے ناواقف ہی رہے۔ میں مانتی ہوں بہت زیادہ قصور شہریار کا ہے مگر کیا کریں بیٹا! کہ یہ معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے۔ عورت کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے ورنہ آنسو اور پچھتاوے ہی رہ جاتے ہیں۔''

❁ ❁ ❁

جب ان کے ہاں پہلی بیٹی ہوئی تو شہریار نے بہت چہکتی ہوئی آواز میں ماں کو یہ خوش خبری سنائی تھی۔

''کیسی ہے وہ؟'' فطری اشتیاق کے ساتھ پوچھا تھا۔

''بہت پیاری بالکل شفق جیسی۔'' اور جہاں ماں مطمئن ہوئی تو وہیں ایک آسودہ سی مسکراہٹ شفق کے ہونٹوں پر بھی سج گئی۔

تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہی وہ پوتی کو دیکھنے پاکستان آسکی تھیں۔ وہ گاڑی میں ہی انہیں بتا رہا تھا۔

''بہت ہنس مکھ بچی ہے اور تمیز دار بھی۔''

''اچھا! انجی کے بچوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کے تو نہیں روتی؟'' وہ پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں نہیں امی! وہ میری اور شفق کی بیٹی ہے، بھلا ایسی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''چلو شکر ہے تمہیں ہیرے کی قدر تو ہوئی۔''

''کیا مطلب امی؟'' اس نے ان کی جانب دیکھا اور جواب مل گیا۔

''میں بھٹک گیا تھا امی! اور مجھے آج تک حیرت ہے کیا تھا اس عام سی عورت میں۔''

''بیٹا! میں نے آج تمہیں اس لیے یہ یاد دلایا ہے کہ اب تم بھی ایک بیٹی کے باپ ہو۔''

''امی! میں یہ غلطی کبھی دوہرانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ شکر ہے کہ شفق اس بات سے ناواقف ہے۔'' وہ یہ کہتے کہتے رک گئیں۔

وہ بات جو دو سال سے شہریار پر ظاہر نہیں کی گئی جسے شفق چپکے سے برداشت کر گئی ہے۔ کیا شہریار کو بتا دوں۔

انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر فیصلہ کیا نہیں، شہریار کو بتا دیا تو پھر وہ اپنی محبتوں کے اظہار میں جھجک کا شکار ہو جائے گا اسے اسی غلط فہمی میں رہنے دو کہ شفق کچھ نہیں جانتی۔ وہ تمہاری بے وفائی سے ناواقف ہے۔ اسی میں شفق کی بھلائی ہے۔ گھر قریب آ چلا تھا۔

''امی! شفق نے گھر کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ تمام فرنیچر نیا ڈلوایا ہے۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔''

انہیں وہ شفق یاد آ گئی تھی جس کی دنیا بس لٹنے کو ہی تھی اور شوہر مل جانے کے بعد بھی وہ اس کی واپسی پر بے یقین تھی۔

❁ ❁ ❁

رہ گزارِ زیست

''کل سے تعلیمی اداروں میں موسم سرما کی تعطیلات کا آغاز ہو رہا ہے۔ اف۔۔۔ سرما کے طویل اکتا دینے والے دن، پتا نہیں بار بار یہ چھٹیاں کیوں کر دی جاتی ہیں۔'' دونیہ اکتا کر کہہ رہی تھی۔

''خدا کو مانو لڑکی! سردیوں کے دن تو اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ ادھر سورج طلوع ہوتا ہے، ادھر غروب ہو جاتا ہے۔ کئی کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔ تم انہیں طویل کہہ رہی ہو۔'' اجالا نے اسے ٹہوکا دیا۔

''اگر جو تمہارے گھر کے حالات بھی میرے گھر جیسے ہوں تو پھر ہی تم میری بات کا مطلب سمجھ پاؤ گی۔''

''ناشکری ہو تم تو، ہائے جوائنٹ فیملی سسٹم کے تو اپنے ہی مزے ہیں۔ ہم جب بھی کبھی تایا، چچا یا پھپھو کی طرف جاتے ہیں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ اکٹھے مل کر ہلا گلا کرتے ہیں، خوب کھاتے پیتے ہیں اور قصے کہانیاں بھی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ سچی واپس گھر آتے ہوئے میں تو باقاعدہ رو رہی ہوتی ہوں۔'' اس کے گروپ کی حمنہ کہہ رہی تھی۔

''کبھی کبھی جاتی ہو، اس لیے اچھا لگتا ہے جو ہمیشہ کے لیے ایک چھت تلے سب کو رہنا پڑ جائے تو لگ پتا جائے۔''

''اچھا بھئی تم لوگ کرو بحث، مجھے تو جلدی گھر جانا ہے۔ آج میں امی سے پالک پنیر بنانے کی فرمائش کر کے آئی تھی۔''

روبی یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور دونیہ جو کچھ اور کہنے والی تھی، خاموش سی ہو گئی۔ اس نے رشک بھری نظروں سے روبی کو دیکھا اور سوچا۔

"یاد ہی نہیں پڑتا کبھی ہم نے بھی اپنی امی سے کوئی فرمائش کی ہو، حالانکہ ان کا سارا وقت کچن میں ہی گزرتا ہے لیکن وہ دوسروں کی فرمائشیں پوری کرنے میں ہی اس قدر تھک جاتی ہیں کہ ہمارے لیے پھر کچھ نہیں بچتا۔ نہ وقت، نہ محبت، نہ گرم جوشی۔ ایک تھکی تھکی نڈھال ماں ہمارے حصے میں آتی ہے۔"

"کیا سوچنے لگیں؟" اجالا نے ٹہوکا دیا۔

"کچھ نہیں، چلو روبی کو گیٹ تک چھوڑ آئیں پھر تو پورے پندرہ روز کے بعد ملاقات ہوگی۔"

"ارے! تم تو باقاعدہ اداس ہو رہی ہو۔" اس کی تینوں سہیلیاں ہنسنے لگیں۔

"تم لوگ ان چھٹیوں میں آؤ نا میری طرف، میری امی بہت محبت کرنے والی ماں ہیں اور وہ کھانا تو بہت ہی اچھا بناتی ہیں۔" روبی ان تینوں سے کہہ رہی تھی۔

اجالا اور حمنہ تو جھٹ تیار ہو گئیں لیکن دونیہ اثبات میں جواب نہیں دے سکی۔

"سب سے زیادہ بوریت کا رونا بھی تم رو رہی ہو اور اب جو روبی انوائٹ کر رہی ہے، تب جانے کو تیار بھی نہیں ہو۔" دونوں اس کے پیچھے پڑ گئیں۔

"تمہیں کیا پتا اجازت کا مرحلہ کتنا دشوار ہوگا، میں سب سے پہلے امی سے اجازت لوں گی، وہ کہیں گی۔ ابا سے پوچھ لو۔ ابا کہیں گے، دادی جو مناسب سمجھیں وہی میرا فیصلہ ہوگا اور دادی کوئی فیصلہ خود سے نہیں کرتیں، ان کی طرف سے اکثر فیصلے یا تو ماجد چچا کرتے ہیں یا پھر تایا وحید صاحب اور اپنے والدین کے ہوتے ہوئے میں دوسروں کی مرضی کے مطابق چلنا پسند نہیں کرتی۔"

اس کی بات اور انداز کچھ عجیب سا تھا، وہ تینوں حیران ہوئیں لیکن چپ رہیں۔

"ہم آئیں تمہارے گھر؟" کچھ دیر بعد روبی بولی۔

"خدا کو مانو، ایسا غضب بھی مت کرنا۔ حمنہ کے ڈائی کیے ہوئے شانوں پر لہراتے بال، اجالا کے کیوٹکس سے سجے لمبے ناخن اور روبی کا ہر کسی سے بے تکلف ہو جانے والا انداز، بس سمجھ لو جس روز تم میرے گھر آ گئیں، ہماری دوستی پر بین لگ جائے گا۔ عین ممکن ہے دادی مجھے کالج سے ہی اٹھا لیں۔"

"کتنی خوف ناک ہیں تمہاری دادی۔" اجالا نے جھرجھری لی۔

"میں بھی ان ہی کی پوتی ہوں۔" دونیہ نے چبا کر کہا تھا۔

۞ ۞ ۞

تعلیمی اداروں کی چھٹیاں صرف دونیہ کے لیے ہی نہیں، اس کی امی نائلہ کے لیے بھی آزمائش سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ ایک تو گھر کے اتنے افراد اور چھٹیاں ہوتے ہی اس گھر کی بیٹیوں یعنی دونیہ کی پھپھیوں کو بھی میکے کی رونقیں یاد آنے لگتیں اور وہ چلی آتیں۔

کھانا بنانے کی ذمہ داری امی اور بڑی تائی کی تھی۔ بڑی تائی پچھلے دو برس سے شوگر کی مریضہ ہو چکی تھیں اور پھر ان کے بچے بھی اب جوان ہو رہے تھے۔ سو اب وہ جب چاہتیں من مانی کر جاتیں۔ باقی رہ گئیں نائلہ جو قسمت سے دو بیٹیوں کی ماں تھیں۔ اللہ نے بڑی تائی کی طرح ایک بیٹا دے دیا ہوتا تو شاید ان کی پوزیشن بھی بہتر ہوتی۔ پھر تھیں چھوٹی تائی جنہیں دونیہ نے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ تیوری چڑھائے رکھتی تھیں اور نائلہ بیگم سے پتا نہیں کیوں انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ ویسے دوستی تو

بڑی تائی اور چھوٹی چچی جنہیں دونیہ اور سونیا نخریلی چچی کہا کرتے تھے، ان دونوں سے بھی نہیں تھی لیکن چھوٹی تائی تو ایک محاذ ہی کھولے رکھتی تھیں۔

جس وقت وہ کالج سے گھر آئی، اس کی چھوٹی بہن سونیا بھی اسکول سے آ چکی تھی اور کچن میں امی کے پاس کھڑی کوئی قصہ سنا رہی تھی جسے امی تیزی سے ادھر اُدھر کام کرتے پتا نہیں سن بھی رہی تھیں یا نہیں۔

"نائلہ! ایک کپ اچھی سی چائے بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔" چھوٹے تایا وحید احمد اچانک کچن کے دروازے پر آئے، کچھ دیر خوامخواہ ہی کھڑے رہے پھر جب دونیہ ان کی جانب متوجہ ہو گئی تو کہہ کر پلٹنے لگے۔

"آپ تائی جان سے کہیں نا، امی تو بہت مصروف ہیں۔" دونیہ کو چھوٹے تایا کبھی بھی اچھے نہیں لگے تھے۔ ویسے تو اسے یہاں کوئی بھی اچھا نہیں لگتا تھا بے حس لگتے تھے۔ اونچے اونچے قہقہے لگاتے دادی کی چاپلوسی کرتے وہ اسے اس گھر کا سب سے برا کردار دکھائی دیتے۔ مرضی ہوئی تو جاب کر لی، دل نہ لگا تو چھوڑ دی لیکن رہتے کس قدر ٹھاٹ سے تھے کہ آخر وہ اور چھوٹے چچا ہی تو دادی کے لاڈلے فرزند تھے اور دادی تو وحید چچا کی عقل پر اندھا اعتماد کرتی تھیں۔

"تمہیں کسی نے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟" دونیہ کی بات پر وہ غصے سے آگ بگولہ ہو کر پلٹے تھے۔

"کل ابا نے عاشی سے پانی کا ایک گلاس لانے کو کہا تھا اور اس نے کہا تھا آپ دونیہ سے کہہ دیں۔" اس نے تایا کی لاڈلی کی حرکت دہرا دی۔

"یہ جو چھٹانک بھر کا وجود ہے نا، میں زمین میں گاڑ دوں گا۔ زندہ دفن کر دوں گا بدتمیز لڑکی۔ نائلہ! تمیز سکھاؤ اپنی اولاد کو۔ نہیں تو ضائع ہو جائے گی میرے ہاتھوں۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر امی کو بڑی حقارت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں ابا کو بتاؤں گی۔" تایا کے جانے کے بعد وہ غصے میں تپ کر کہہ رہی تھی۔

"ایسا غضب نہ کرنا، یہ لوگ تو مجھے گھر سے نکال دیں گے اور میرے بعد تم لوگوں کو کون پوچھے گا، کون خیال رکھے گا تمہارا۔" نائلہ بیگم تو زرد پڑ گئیں۔

"امی! اب میں بڑی ہو گئی ہوں، کالج میں پڑھتی ہوں۔ اب بھی آپ اتنا ڈرتی ہیں۔"

"بیٹیاں جتنی بڑی ہوتی جاتی ہیں، والدین کی فکریں بھی اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔"

امی بے حد افسردہ دکھائی دے رہی تھیں، اب وہ چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھیں۔

"کتنی خوب صورت ہیں امی لیکن اپنے حال سے کس قدر لاپروا رہتی ہیں۔ میں نے تو انہیں کبھی کسی تقریب میں بھی میک اپ کیے ہوئے نہیں دیکھا اور یہ تیار ہوں بھی تو کس کے لیے، ابا کو تو امی کبھی نظر ہی نہیں آتیں۔ حالانکہ یہ خاندان کی سب عورتوں سے زیادہ خوب صورت ہیں لیکن سب سے زیادہ ڈری سہمی بھی یہی رہتی ہیں۔"

"اپنی پڑھائی پر بہت توجہ دو تم دونوں اور یاد رکھو، تمہیں بہادر بننا ہے، کسی سے نہیں ڈرنا۔"

''آپ بھی تو ڈرنا چھوڑ دیں امی!''

''اب کیسے چھوڑ دوں، خوف تو لہو میں رچ بس گیا ہے۔'' وہ آنکھوں میں آئی نمی پونچھنے لگیں۔

''چائے بنا رہی ہیں نائلہ بھابھی! ایک کپ میرے لیے بھی بنا دیں۔'' نخریلی چچی نے کچن میں جھانک کر حکم صادر کیا۔

''اب تو امی بنا چکی ہیں، آپ ایسا کریں، یہ کپ تایا وحید کے کے کمرے میں دے آئیں۔'' دونیہ نے کپ ان کی جانب بڑھایا۔

''کیوں، میں کیا ملازمہ ہوں، ان کی اپنی بیٹی اور بیوی موجود ہیں نا۔ ان ہی سے کہو آ کر لے جائیں۔ بھابھی! میرے لیے چائے بھجوا دیجیے گا۔'' اپنی کہہ کر یہ جا وہ جا۔

''کوئی ضرورت نہیں امی!'' دونیہ کو غصہ آ گیا۔

''جانے دو بیٹا! خوامخواہ بات بڑھے گی، فساد پھیلے گا۔ اسے چائے نہ ملی تو اپنے میاں سے شکایت کرے گی، وہ تمہاری دادی کو میرے خلاف بھڑکا دے گا۔''

امی نے ساس پین چولہے پر پٹختے ہوئے جواب دیا تھا۔

وحید احمد کی چائے کا کپ امی نے دونیہ یا سونیا کو پکڑانے کے بجائے بڑے تایا کی ہما کو بلا کر دیا اور بولیں۔

''دے کر آ جانا، ویسے تمہارے ابا اس وقت گھر پر ہیں نا؟'' ہما نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دونیہ نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ امی اسے اور سونیا کو کبھی تایا وحید کے کمرے میں کیوں نہیں جانے دیتیں۔

چچی کی چائے تیار ہو گئی تو انہوں نے دونیہ سے کہا۔ ''جاؤ یہ عفت کو دے آؤ۔ دیر ہو گئی تو شور کرے گی۔''

لیکن دونیہ آج کسی اور دھن میں تھی، چائے لے جا کر ٹیبل پر رکھ دی۔ حالانکہ چچی اس وقت بڑی تائی سے باتوں میں مصروف تھیں، انہیں پتا بھی نہیں چلا اور دونیہ بڑے کمرے سے واپس پلٹ آئی۔

''اتفاق میں برکت ہے، مل جل کر رہنے میں بہت سے فائدے ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم ہمارا کلچر ہے اور یہ ایک نعمت ہے۔''

ایسی باتیں وہ اکثر سنتی تھی۔ دادی اماں کی زبانی بھی اور ٹی وی پر بھی اکثر بحث مباحثے چلا کرتے تھے۔ یہ تو کوئی اس سے پوچھتا یہ کلچر کتنی بڑی ''نعمت'' ہے۔ دور سے دیکھنے والوں کو اگر جو کبھی اس کلچر کا حصہ بننا پڑے تو لگ پتا جائے۔ کہتے ہیں گھر وہ جگہ ہے جہاں انسان کو سکون مل جاتا ہے لیکن یہ گھر جھگڑوں اور سیاستوں کی آماجگاہ تھا۔ کس طرح کس کی ٹانگ کھینچنا ہے، کسے کس کی نظروں سے گرانا ہے، کس پر سارے گھر کے کاموں کا بوجھ ڈال کر خود ایک طرف ہو جانا ہے، خواتین بھی اٹھتے بیٹھتے یہی سوچتی تھیں۔

مردوں کی سوچیں دوسری طرح کی تھیں مثلاً اس مرتبہ اماں سے کون سا جھوٹ بول کر گھر کے خرچ کے لیے کم پیسے دینے ہیں، کون سا بہانا بنا کر صرف اپنے بچوں کو آؤٹنگ کے لیے لے کر جانا ہے، اپنی

بیوی کے نمبر اماں کے سامنے کس طرح بڑھانے ہیں اور باقی بھائیوں کے بچوں کو اپنے بچوں سے کس کس طریقے کو اپنا کر کم تر ثابت کرنا ہے اور بچے تھے تو یہ سوچا کرتے تھے امی اور بڑی تائی کی دوستی ہے، اسی لیے ہمیں بھی بڑی تائی کے بچوں سے دوستی رکھنا چاہیے۔ یہ سونیا ہر مرتبہ کلاس میں پوزیشن لے کر آ جاتی ہے، اسے کچھ ایسے کھیلوں میں الجھانا ہے کہ پڑھائی کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہ بچے اور اس کی شکایتیں بھی دادی جان سے خوب لگانی ہے۔ ہونہہ۔۔۔ سمجھتی کیا ہے یہ خود کو۔

ارجمند بیگم چار سعادت مند بیٹوں کی والدہ ماجدہ تھیں۔ یہ گھر جہاں اب دو منزلہ پکی عمارت تھی، پہلے ان کے شوہر نے بنایا تھا۔ زمین اچھی خاصی تھی۔ ارجمند کے شوہر کو باغبانی کا شوق تھا اور اس خالی زمین پر وہ خوب ہی اپنا شوق پورا کرتے۔ چھ بچے تھے ان کے لیکن وہ زمانہ ایک تو سستا اور سب سے بڑھ کر سادہ تھا۔ اگر بیگم نے خاندان کی تین چار تقریبات میں ایک ہی جوڑا استعمال کیا ہوتا تھا تو قیامت نہیں آتی تھی۔ رشتہ دار یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کون گاڑی پر آ رہا ہے اور کس کے پاس ذاتی سواری نہیں ہے، بس قرابت داری کا پاس ہوا کرتا تھا اور زندگی آسان تھی۔

اللہ نے چار بیٹے دیے تھے جس میں سب سے لائق اور ذمہ دار تیسرے نمبر والا امجد تھا۔ بڑے والا اماں کا لاڈلا چہیتا تھا تو دوسرے نمبر والے کی خوب صورتی پر اماں کو فخر بہت تھا پھر ایسا ہوا کہ آہستہ آہستہ یہ خوب صورتی اماں کے دل میں گھر کر گئی۔ کچھ اس میں وحید کی اپنی کوششوں کا بھی دخل تھا کہ عمر کے دسویں سال تک آتے آتے بڑے والا رشید تو پیچھے رہ گیا، اب اماں کا لاڈلا تھا اور سب سے بڑا رشید تو اب سب کا بھائی جان تھا، ہاں اس سے دو سال چھوٹا اماں کا چہیتا وحید اسے بڑا مان کر کوئی رعایتی نمبر دینے پر کم ہی تیار نظر آتا تھا۔

رشید کے لیے اماں اپنی لاڈلی بھانجی فرحت کو بیاہ کر لائیں۔

اور تب ابا نے اعلان کر دیا، دوسری بہو ان کی مرضی سے آئے گی۔ ابا کے خاندان میں اکثریت گورا رنگ اور خوب صورت نقوش رکھتی تھی، سو ابا کے اعلان سے وحید کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ وہ خود اپنی صورت پر نازاں تھا اور بیوی بھی ایسی چاہتا تھا لیکن اس زمانے میں اپنے منہ سے اپنی شادی کی بات کرنا یا اس سلسلے میں اپنی پسند بیان کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ خیر ابا کے اعلان نے اسے بڑا مطمئن کر دیا تھا۔

بڑی بھابھی فرحت عام سی شکل و صورت والی اور عام سی ہی خوبیاں رکھنے والی لڑکی تھی، اماں کی بھانجی تھی، اس لیے اماں کو پیاری بھی بہت تھی۔ وہ اسے خاص اہمیت دیتی تھیں اور چاہتی تھیں جب تک ابا کے خاندان کی لڑکی دوسری بہو بن کر آئے فرحت کی پوزیشن اتنی مستحکم ہو چکی ہو کہ کوئی اسے اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے۔

ان ہی دنوں امجد دوبئی چلا گیا اور جب پانچ سال کے بعد واپس آیا تو وحید بھی بڑے بھائی کی طرح ایک مقامی کمپنی میں ملازمت کرنے لگا تھا۔ اس نے تعلیم پر کبھی بھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی، سو ملازمت بھی قابلیت کے مطابق ہی تھی لیکن امجد ہر ماہ باہر سے کچھ رقم بھیجتا تھا، اسی لیے گھر کے حالات ٹھیک تھے اور وحید کی کمائی کا بہت سا حصہ اس کی اپنی ہی ذات پر خرچ ہوتا تھا۔ سو وہ بے فکر تھا۔ پانچ سال بعد امجد واپس آیا اور ایک بزنس کا آغاز کیا، تب انہیں اندازہ ہوا کہ اس نے بہت کچھ جمع کر رکھا

تھا۔

اماں چاہتی تھیں، امجد اپنے بھائیوں کو بھی کاروبار میں شریک کرے لیکن ابا کی سوچ بالکل مختلف تھی۔ انہوں نے صاف کہا۔

''امجد کو تجربہ کار اور پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اسے کاروبار اکیلے ہی چلانے دو، ورنہ کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔''

سال بھر میں امجد کے بزنس کی شکل نکل آئی اور گھر میں خوش حالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور امجد نہ صرف ابا کا لاڈلا بیٹا بلکہ اب اماں بہنوں اور بھائیوں کی نظر میں بھی اہم ہو گیا۔

ان ہی دنوں ابا کا اعلان کہ اب وہ اپنے خاندان سے اپنی پسند کی بہو لانے کا ارادہ کر چکے ہیں، وحید کو سرشار کر گیا اور اس کی توجہ اپنے لباس و جوتوں پر مزید بڑھ گئی۔

ایک ہفتہ بعد ابا اپنے آبائی شہر سرگودھا گئے، جہاں ان کے بھائی بہن آج بھی مقیم تھے اور واپسی مٹھائی کے ٹوکرے کے ساتھ ہوئی۔

''لو بھئی بہت مبارک ہو، میں اپنے امجد کی بات پکی کر آیا ہوں۔''

ابا کی بات پر وحید احمد کا مسکراتا چہرہ سپاٹ ہو گیا، جی چاہا واک آؤٹ کر جائے لیکن ابا کے حضور ایسی بے ادبی وہ کر نہیں سکتا تھا۔

''لیکن بڑے بھائی کے بعد باری تو چھوٹے بھائی کی بنتی ہے۔ ابا آپ تیسری نمبر والے بیٹے کی بات کیوں کر آئے ہیں۔'' بڑی بیٹی نے حیرت سے پوچھا۔

''وحید نکما نالائق، عورتوں کی طرح ہار سنگھار کا شوقین۔ کیا یہی رہ گیا ہے میرے خاندان کی گنوں والی لڑکیوں کے لیے۔ وہاں تو امجد جیسا محنتی داماد ہی سجتا ہے۔ وحید کے لیے تمہاری اماں کوئی اپنے خاندان میں دیکھ لے گی۔''

ابا بڑی ترنگ میں بولے اور اماں آگ بگولہ ہو گئیں۔

''کیوں جی، میرا خاندان کسی سے کم ہے کیا؟ سب سے لائق، پڑھا لکھا، کماؤ بیٹا تو اپنے خاندان میں دے دیا اور جو نکما ہے اس کے لیے میری بھانجیاں بھتیجیاں۔ کان کھول کے سن لو جی، ہم بھی کوئی ایسے گرے پڑے نہیں ہیں۔''

اور اس روز اپنے بہن بھائیوں اور بھابھی کے سامنے وحید جی بھر کے شرمندہ ہوا، وہ خود کو کیا سمجھتا تھا اور والدین کی نظر میں وہ کیا تھا جسے وہ اپنی اپنی فیملی میں بیاہنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

اسے امجد سے شدید حسد محسوس ہوا تھا اور جب پتا چلا کہ امجد کا رشتہ ابا کی بے حد خوب صورت بھتیجی نائلہ سے ہوا ہے تو نفرت نے اسے خاکستر کر دیا۔ حسد، جلن اور انتقام کے منصوبوں نے اسے کئی راتوں تک چین سے سونے نہیں دیا۔

''مجھے بدلہ لینا ہے، مجھے اب امجد کو کبھی چین سے رہنے ہی نہیں دینا۔'' اور اس نے منصوبہ بنا کر اس پر عمل نائلہ کی آمد سے پہلے ہی شروع کر دیا۔

وہ اماں کو بہت توجہ دینے لگا اور ان کے کان نائلہ کی جانب سے بھرنے لگا۔

کہتا۔ ''دیکھ لیجیے گا، ابا اسے ہم سب پر فوقیت دیں گے۔ بڑھ بھابھی کی تو حیثیت ہی کیا اس کے سامنے۔ ابا آپ کو بھی نیچا کر دیں گے۔ یہی بات وہ بہنوں سے بھی کہتا تھا اور اس کی باتیں انہیں واقعی سوچنے پر مجبور کرتی تھیں۔ خود اماں جنہیں اپنے سسرال سے کبھی بھی انسیت نہیں رہی تھی، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں، سب سے کماؤ بیٹے کے لیے بیوی اس خاندان سے آ جائے گی اور اب جو آ رہی تھی، وہ ان کے سر پر بھی چڑھے یہ تو ناقابل قبول تھا۔

وہ اب اٹھتے بیٹھتے امجد سے یہ کہنے لگی تھیں۔

''تمہاری بیوی جس خاندان سے آ رہی ہے، انہوں نے مجھے یعنی تمہاری ماں کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ تمہیں آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہوں گے، اس کی باتوں میں کبھی نہیں آنا۔ وہ تمہیں ہم سے الگ کر دے گی اور تم جانتے ہو اس گھر کو تمہاری کتنی ضرورت ہے۔ میں اور تمہاری بہنیں تمہیں دیکھ دیکھ جیتی ہیں۔ تم نے آنکھیں پھیر لیں تو ہم جیتے جی مر جائیں گے۔''

امجد کو پتا ہی نہیں چلا وہ آہستہ آہستہ ان ہی کے ذہن سے سوچتا چلا گیا اور جس روز اٹھارہ سالہ نائلہ دلہن بن کر اس کے گھر میں اتری، وہ مکمل طور پر ماں بہنوں کے زیرِ اثر تھا۔ نائلہ اتنی خوب صورت تھی کہ وحید کے دل میں سلگتی آگ بھڑکنے لگی۔

ادھر ارجمند خاتون اور دونوں بیٹیوں کے خدشات اور بھی گہرے ہونے لگے۔ سرد مہری اول روز سے ہی ان کے رویّوں میں اس قدر عیاں تھی کہ نائلہ سہم سی گئی۔ اس گھر میں صرف تایا ابا تھے جو اس کے لیے بے پناہ پیار اور شفقت کا رویہ رکھتے تھے۔ ہاں وحید احمد جو اس کے چھوٹے جیٹھ تھے، وہ بھی اچھے طریقے سے ملے اور نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا تھا۔

اس کی شادی کے ایک ماہ بعد ہی تایا ابا مختصر بیماری کے بعد چل بسے تو وحید کی باتوں میں آ کر گھر کی خواتین نے اسے نائلہ کی نحوست خیال کیا اور نائلہ کے سامنے اس بات کا اظہار بھی کیا۔ ایسے میں صرف وحید تھا جس نے اس کو حوصلہ دیا جبکہ اس کے شوہر امجد کا رویہ شروع سے ہی بہت لیا دیا تھا اور وہ اپنے بزنس کے بکھیڑوں میں الجھا زیادہ وقت گھر سے باہر بھی رہتا تھا۔

ابا کے جانے کے بعد اماں کو یہ احساس شدید تر تھا کہ اب بیٹے من مانی پر نہ اتر آئیں، انہیں اس سے روکنے کے لیے وہ جذباتی مظاہرے زیادہ کرنے لگی تھیں اور چونکہ سب سے زیادہ یہ مظاہرے امجد کے سامنے ہی ہوتے تھے تو وہ متاثر بھی بہت ہو رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

''ابھی تک جاگ رہی ہو نائلہ!'' وحید نے رات کے گیارہ بجے ٹی وی آف کیا اور جب کھڑکی کے پردے برابر کرنے لگا تو وہ برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھی نظر آ گئی۔ اسے دیکھ کر وہ بھی باہر آ گیا اور قریب آ کر فکرمندی سے پوچھنے لگا۔

''امجد نہیں آئے ابھی تک، ان ہی کے انتظار میں جاگ رہی ہوں۔''

''آئے گا تو کمرے میں ہی جائے گا نا، تم بستر پر لیٹ کر بھی تو انتظار کر سکتی ہو نا۔ سارا دن گھر بھر کے کام کرتی ہو، اس طرح جاگ جاگ کر خود کو بیمار کر لو گی۔ تمہیں بھی تو آرام کی ضرورت ہے نا، کتنی

نازک سی تو ہو تم۔"

واقعی وہ گھر بھر خصوصاً اپنی ساس کا دل جیتنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی تھی اور اس وقت بہت تھکن محسوس بھی کر رہی تھی۔

"وہ باہر کھانا نہیں کھاتے، آئیں گے تو مجھے ان کے لیے روٹی ڈالنی ہے۔"

"اتنے نخروں کی عادت کیوں ڈالتی ہو۔ روٹی بنا کر رکھ دیا کرو۔ شادی سے پہلے بھلا کون اسے پوچھتا تھا، وہ ہم بھائیوں میں کم صورت بھی ہے تو بچپن ہی سے دبی دبائی شخصیت رہی ہے اس کی، اسے ایسے نخروں کی عادت نہیں ہے اب تم اس کی عادتیں بگاڑ کر خوامخواہ اپنے لیے مشکل پیدا کرو گی۔ چلو شاباش سو جاؤ جا کر۔"

"نہیں بھائی! یہ تو میرا فرض ہے، اگر میں باقی سب کے کام کر سکتی ہوں تو وہ تو میرے شوہر ہیں۔"

"اچھا چلو پھر میں بھی تمہارے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔"

وحید اس کا بہت خیال تو پہلے دن سے ہی رکھ رہا تھا، اب جو اس کے برابر کرسی ڈال کر بیٹھ گیا تھا تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اتنی زیادہ بات چیت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ نائلہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ جاتی اور اس نے دل میں اعتراف کیا کہ وہ گفتگو بھی بے حد اچھی کرتا ہے۔

بارہ بجے کے قریب امجد نے گاڑی کا ہارن دیا تو وحید اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پھر یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔

سارا گھر سو جاتا، وہ امجد کے انتظار میں جاگتی تو وحید بھی اس کے ساتھ جاگتا۔ چائے بنا کر لاتا، ساتھ میں کبھی بسکٹ، کبھی نمکو اور دلچسپ باتیں، وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلتا۔ دن بھر کے برے رویوں سے اداس ہو جانے والی نائلہ اس وقت سب بھول کر ہنستی اور کہتی۔

"وحید بھائی! اگر جو آپ نہ ہوتے تو کتنی مشکل ہو جاتی میری زندگی۔"

"اب تو مجھے لگتا ہے نائلہ! امجد کسی اور کو چاہتا تھا، ابا نے زبردستی تمہارے ساتھ اس کی شادی کر دی ہے۔ دیکھو نا، ابھی تک تمہیں ہنی مون پر نہیں لے کر گیا۔ گھر آتا ہے تو بجائے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارنے کے وہ سب کے درمیان ہال کمرے میں بیٹھا رہتا ہے اور اس نے اپنی توجہ بزنس پر بھی بڑھا لی ہے، حالانکہ شادی سے پہلے تو جلدی گھر آ جاتا تھا۔ تمہارے والدین نے بھی جیسے سر سے بوجھ اتارا ہے۔ ابا نے امجد کے لیے چچا سے تمہارا رشتہ مانگا۔ انہوں نے بڑے بھائی پر ہر طرح کا اعتبار کر کے ہاں کر دی۔ ایک بار یہاں آ کر دیکھتے تو سہی ابا کا کون سا بیٹا ان کی بیٹی کے لیے موزوں ہو گا۔"

لیکن اس نے وحید کی یہ بات نہیں سنی۔ وہ تو وہیں اٹک گئی تھی کہ "ابا نے امجد کی شادی زبردستی کروائی ہے۔ شاید اس کی مرضی کہیں اور تھی۔"

اسے یہ تو پتا نہیں تھا، وحید کے کہنے پر اماں نے امجد سے مکان کی تعمیر از سر نو کروانے کو کہا ہے کہ اب پرانی طرز پر بنے اس چند کمروں کے گھر میں گزارا ممکن نہیں رہا تھا۔ بڑے بھائی کے بچے بھی اب بڑے ہو رہے تھے، سو دو کمرے بڑے بھائی کو چاہئیں۔ امجد کا کمرا دلہن کے آ جانے کے بعد چھوٹا پڑ رہا

ہے، اس کے لیے بڑا کمرا ہونا چاہیے۔ اب وحید کی شادی بھی کرنا تھی، سو وحید اور چھوٹا اب ایک کمرے میں نہیں رہ سکتے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اماں یہ سوچیں، ابا کے بعد بیٹے من مانی کرنے لگے ہیں۔ انہی سوچوں نے اسے بے حد مصروف کر دیا تھا اور انہی فکروں میں وہ نائلہ کو نہ مناسب وقت دے پا رہا تھا اور نہ اتنی توجہ جو کہ اس کا حق تھا پھر اماں کو نائلہ سے جو شکایتیں تھیں، اس کی وجہ سے بھی وہ نائلہ کی طرف سے مطمئن نہیں ہو پاتا تھا لیکن فی الحال اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ نائلہ کو اس سلسلے میں سمجھائے۔ بس اماں سے کہا تھا۔

"میری طرف سے آپ کو پوری اجازت ہے۔ آپ نائلہ کو جس طرح چاہیں سمجھائیں اور اس گھر کے ماحول کے مطابق ڈھال لیں اور ہاں اماں! گھر بنانے کے سلسلے میں آپ بڑے بھائیوں سے کہیں کم از کم نگرانی کی حد تک اور سامان خریدنے کے سلسلے میں تو میری مدد کریں۔ میں اکیلا کیا کیا دیکھوں۔"

"تمہیں تو پتا ہے امجد! بڑی بہو کی طبیعت سخت خراب ہے۔ خیر سے پھر خوشی آنے والی ہے مگر ڈاکٹر نے احتیاطیں بھی بہت بتا ڈالی ہیں۔ رشید بڑا پریشان ہے، ہاتھ بھی تنگ ہے بے چارے کا۔ باقی وحید سے میں ضرور کہوں گی۔"

اور وحید نے ہامی بھر لی لیکن صرف زبانی کلامی۔ اس کے پاس روزانہ سو بہانے ہوتے تھے، وہ اپنے سخت گیر باس کی وجہ سے کبھی بھی چھٹی نہیں کر سکتا تھا۔ امجد نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

❁ ❁ ❁

شادی کے دو ماہ بعد جب گھر سے بے حد اصرار کے ساتھ فون آ رہے تھے، وہ اماں کی اجازت سے میکے جانے کی تیاری بہت خوشی کے ساتھ کر رہی تھی لیکن امجد نے یہ کہہ کر وہ تو بے حد مصروف ہے، ایک دو دن تو دور کی بات ایک دو گھنٹے بھی نہیں نکال سکتا، اس کے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔ وہ تو آنسوؤں کے ساتھ رونے لگی۔

"روؤ نہیں نائلہ! میں چھوڑ آؤں گا۔"

وحید نے یہ کہہ کر اسے بے پناہ مشکور کر ڈالا۔ وہاں سب اس کے ساتھ ساتھ امجد کے بھی منتظر تھے لیکن اٹھارہ سالہ نائلہ نے اپنے جانے کو ہی غنیمت جانا۔

کوچ میں وحید اس کے اتنے قریب برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا، شادی کے بعد پہلی بار وہ اس سے جھجک کا شکار ہوئی اور بہت سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وحید نے اپنا بازو اس کی سیٹ کی بیک پر رکھ دیا جو اس کے سر سے تو کبھی شانے سے چھونے لگا تو وہ خود کو بہت بے آرام محسوس کرنے لگی لیکن وحید نے یقیناً کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا، وہ سارا راستہ اس سے اِدھر اُدھر کی پُر لطف باتیں کرتا رہا۔

وہاں اس کے میکے میں سب ہی جمع تھے، اس کے ساتھ ساتھ وحید کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کہ وہ اس کا جیٹھ تو تھا ہی سب سے بڑی بات کہ وہ ان کا احساس کر کے نائلہ کو ملوانے کے لیے لے کر آیا تھا۔

وحید بھی سب سے گھل مل گیا اور سب نے اسے بے حد سراہا۔

"یہ امجد سے زیادہ خوب صورت اور اچھے مزاج کا ہے۔" یہ بات چپکے چپکے کئی عورتوں نے کہی اور

نائلہ کے کان میں بھی پڑی۔ وہ رات کو رکا نہیں، حالانکہ سب نے اصرار کیا لیکن وہ دوپہر کو کھانا کھاتے ہی واپسی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

وہ یہاں ایک ہفتہ رہی اور یوں رہی کہ بھول ہی گئی، وہ سسرال میں ایک ٹینشن سے بھرپور زندگی گزار کر صرف چند دن کے لیے یہاں آئی ہے، اسے لوٹ کر پھر اسی دنیا میں چلے جانا ہے۔ وہ تو یہاں آنے کے چھٹے روز جب وہ بازار سے خالہ کے ساتھ گھر واپس آئی تو دروازے پر امجد کی گاڑی کھڑی دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

”ہائے خالہ! وہ آ گئے ہیں۔ مجھے ابھی نہیں جانا۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

”پاگل مت بنو نائلہ! اور یہ بسورتے منہ کے ساتھ اس کے سامنے مت جانا۔ تم اتنے دنوں سے یہاں ہو اور ایک بار بھی اسے فون نہیں کیا۔“

”تو اس نے کون سا کیا ہے۔“

”کم عمر ہو لیکن اتنی بے وقوف تو نہیں ہو۔ یوں بھی شادی کے بعد لڑکی میں قدرت کی جانب سے ہی بہت تبدیلی آ جاتی ہے۔ تم بھی بچپنا چھوڑ دو اور میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

امجد ایک ہی دن وہاں رکا لیکن یہ اس امجد سے کتنا مختلف تھا جو اسے سسرال کے گھر میں نظر آتا تھا۔ اس نے نائلہ پر بھرپور توجہ دی اور وہ تھکن جو وہاں رہتے ہوئے اس کے وجود اور لہجے سے ٹپکتی تھی، یہاں آ کر وہ اس سے بھی آزاد رہا تھا۔

* * *

گھر واپس آنے پر خوش دلی سے استقبال صرف وحید کی طرف سے ہوا۔

”میں بہت اداس رہا تمہارے بغیر، دیکھو کسی نے میرے کمرے پر بھی توجہ نہیں دی۔ کپڑے بھی ملازمہ نے دھو کر کرسی پر ڈال دیے ہیں۔ پریس کرنے کی کسی نے زحمت نہیں کی۔“ بڑے بھائی کو چھوڑ کر باقی تینوں مردوں کے کام اب اسی کی ذمہ داری تھے۔ اس کے علاوہ اماں کے کام اور کچن کی ذمہ داری کہ گھر میں صرف کپڑے دھونے اور صفائی کے لیے ملازمہ آتی تھی۔

پہلے شروع کے دنوں میں بڑی بھابھی کچن کا کام کر دیتی تھیں مگر پھر ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ کچن میں آتے ہی انہیں ابکائیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ امجد کی بڑی والی بہن جو امجد سے دو سال چھوٹی تھی، اس کی بات ابا کی زندگی میں ہی طے ہو چکی تھی۔ سو اب عطرت تو صرف جہیز کی تیاری میں ہی مصروف رہتی تھی اور چھوٹی ندرت کالج جاتی تھی، اسے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

* * *

گھر کی نئی تعمیر کا کام شروع ہوا تو ہر شے الٹ پلٹ ہو گئی۔ مزدوروں کا شور، گرد اور بے ترتیبی۔ نائلہ تو مزید الجھ کر رہ گئی۔ پیسہ تو امجد کا لگ رہا تھا لیکن اب وحید نے نگرانی کے لیے چھٹی لے لی تھی اور ماجد نے کہا تھا اگلے ماہ سے وہ چھٹی لے کر نگرانی شروع کر دے گا۔

کچن میں نائلہ ہوتی تھی اور وحید کے کچن کے چکر سارا دن لگتے رہتے تھے۔ کبھی چائے چاہیے، کبھی پانی، کبھی وقت بے وقت کوئی نہ کوئی فرمائش۔ وہ اکثر اچانک آ کر اس کے بہت قریب کھڑا ہو جاتا

تھا اور نائلہ کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی لیکن وہ بھلا اس سے کس طرح کہہ سکتی تھی پھر ایک دو بار بظاہر انجانے میں ہی اس کا ہاتھ کچھ اس طرح اسے لگا کہ نائلہ سن سی ہو گئی اور اس نے رات کو امجد سے کہا۔

”آپ لوگ اب وحید بھائی کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ آخر وہ آپ سے بڑے ہیں۔“

امجد دن بھر کے اخراجات میں الجھا ہوا ہوتا، بس ہوں ہاں میں اس کی بات کا جواب دے دیتا۔

نائلہ کا رویہ وحید کے ساتھ بدلنے لگا، وہ اس کی باتوں کے جواب روکھے انداز میں دینے لگی پھر اس نے یہ طریقہ نکالا کہ بھابھی کے تین سالہ فرحان کو لا کر کچن میں بٹھا لیتی۔ بچہ چھوٹا تھا لیکن پھر بھی اسے ایک تحفظ کا احساس رہتا۔ جوں ہی بھابھی کی دونوں بڑی اسکول سے آتیں، وہ انہیں کھانا کھلاتی اور ہوم ورک کرواتی۔ بھابھی کی طبیعت اچھی نہیں تھی، وہ نائلہ کی مشکور ہوتیں۔

انہوں نے ہی امجد سے کہہ کر نائلہ کی کچن میں ہیلپ کے لیے ایک ملازمہ رکھوا دی اور یوں نائلہ کی جان میں جان آئی لیکن اسے احساس تھا، وحید اب بھی اس پر نظر رکھے ہوئے تھا اور وہ حیران تھی اس کی ذہنیت پر جو بھائی کی عزت روندنے کے درپے تھا۔

جب بڑی بھابھی کے ہاں نینو کی پیدائش ہوئی اس وقت اسے بھی پانچواں مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ جونہی بھابھی کا سوا مہینہ پورا ہوا، وہ سرگودھا آ گئی اور دونیہ کی پیدائش تک وہیں رہی۔ سسرال میں اس بات کی مخالفت کی گئی لیکن بڑی بھابھی فرحت نے اس نیکی کو یاد رکھا جو اس نے پورے عرصے ان کی بچیوں اور خود ان کا خیال رکھ کر کی تھی۔ انہوں نے ہی امجد کو سمجھایا کہ اس حالت میں نائلہ کا میکے میں رہنا ہی بہتر ہے۔

اسی عرصے میں اسے وحید کی بات طے ہونے کی اطلاع ملی تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، اس کی غیر موجودگی میں ہی منگنی کی رسم ادا ہوئی کہ وہ کوئی اہمیت کہاں رکھتی تھی۔

دونیہ کی پیدائش کے بعد جب وہ یہاں آئی تو گھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ وحید اور عطرت دونوں کی شادی کی تاریخ ساتھ ساتھ رکھی گئی تھی اور امجد پر شدید بوجھ تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا اور غصہ ور دکھائی دیتا تھا۔ دونیہ کی پیدائش پر اماں نے سخت افسوس کا اظہار کیا تھا۔

”ہائے کاش! میرے امجد کو اللہ بیٹا دے دیتا تو اس کے شانے بوجھ سے خالی ہوتے۔ پر وہ منحوس ایسی خوشی کہاں سے دے سکتی تھی۔“

پھر بھی وہ دونیہ کی پیدائش پر سرگودھا آیا تھا، بڑی بھابھی نے بچی کے لیے تحائف بھجوائے تھے اور وہ بھی بچی کے لیے کچھ چیزیں لے کر آیا تھا لیکن اب اس کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ نائلہ پر توجہ دے سکے یا اپنی بچی کی معصوم صورت کو ٹھیک طرح دیکھ بھی سکے۔

* * *

وحید کی شادی رشتہ داروں میں نہیں ہوئی تھی، کوئی جاننے والے تھے۔ لڑکی کی تصویر بھجوائی گئی تھی۔ اچھے نین نقش تھے اور کچھ ماڈرن سی لڑکی تھی۔ اصل میں وحید کی آمدن بہت کم تھی، اماں نے اس کا رشتہ تو تب سے ہی دیکھنا شروع کر دیا تھا، جب سے ابا نے امجد کی بات نائلہ سے پکی کی تھی لیکن یہ وہ دور تھا، جب پاکستان سے لوگ باہر کے ممالک کا رخ کرنے لگے تھے اور دوسری طرف پاکستان میں اچانک ہی

مہنگائی کا طوفان تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔ سو لوگ لڑکا دیکھتے ہوئے سب سے پہلے آمدن کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ ایسے میں بلقیس کے گھر والوں نے ہاں کی تو اماں کو غنیمت محسوس ہوا۔ حالانکہ ان کے ماحول میں کچھ فرق محسوس ضرور ہوتا تھا۔

تعلیم وہاں کم تھی اور لڑکیاں فیشن کافی کرتی تھیں۔ بہر حال اماں نے ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیا کہ یوں بھی وحید وہ بیٹا نہیں تھا جس سے اماں اور بہنیں مستقبل کی امیدیں وابستہ رکھتی ہیں۔ ساری امیدوں کا مرکز امجد تھا۔ اور وہ پورا اتر رہا تھا۔ اس کی بیوی کم عمر اور دبّو تھی اور بیٹی کی ماں بن کر مزید کمزور ہو گئی تھی۔

وحید اس کا گریز جان کر مزید شیر ہو رہا تھا لیکن نائلہ تنہائی کا موقع نہیں دیتی تھی، اس کے خوف نے نائلہ کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا پھر بلقیس بیاہ کر اس گھر میں آئی جو امجد کی خون پسینے کی کمائی سے ایسی زمین پر تعمیر کیا گیا تھا جو اماں کے نام تھی اور عطرت بیاہ کر سسرال چلی گئی۔

بلقیس کے گھر والے کم پڑھے لکھے تھے، پیسے کی طرف سے بھی فراوانی تھی لیکن ان دنوں جو غیر ملکی فلموں نے پاکستان پر یلغار کی تھی، اس سے پوری طرح مستفید ہونے والوں میں سے تھے۔ وہ وی سی آر کا دور تھا اور وی سی آر بلقیس کے جہیز کے ساتھ ان کے گھر بھی آ گیا تھا۔

دلہن بنی بلقیس کافی خوب صورت لگ رہی تھی لیکن جب منہ دھلا تو وحید کو جھٹکا لگا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ نقش ضرور اچھے تھے لیکن چہرے پر کسی بھولپن، کسی معصومیت کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ پچیس سال کی بتائی گئی تھی لیکن وہ اس سے زیادہ کی لگتی تھی۔ پہلے ہی دن سے وہ بے حد چوکنی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ میرا ہے، یہ بھی میں ہی لے لوں۔" اس کے اندر یہ حرص بہت زیادہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ وحید ہی کی طرح تھی اور اس نے آتے ہی وحید کو اپنے شکنجے میں پوری طرح کسنے کی کوشش کی تھی، تب اسے پتا چلا کہ وہ جوائنٹ فیملی کا حصہ ضرور ہے لیکن کسی طرح کی پابندی قبول نہیں کرتا اور وہیں اس نے وحید کی نظروں کو نائلہ کے تعاقب میں بھی بہت جلد محسوس کر لیا تھا۔

اور شادی کے شروع دنوں میں ہی اس نے نائلہ کے ساتھ بیر باندھ لیا تھا، یہ نہیں سوچا وحید کی نگاہ نائلہ کے تعاقب میں رہتی ہے۔ نائلہ نے تو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی وحید کی جانب دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ وہ گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہے اور اس کے بعد اپنی بیٹی اور بڑے بھائی کے بچوں کو لے کر بیٹھ جاتی ہے۔

وحید کا روّیہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے امجد کی طرح اپنی بیوی کو گھر والوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا تھا۔ بڑی بھابھی اماں کی بھانجی تھیں، انہیں بہت عزیز تھیں پھر نائلہ کی وجہ سے اماں انہیں جان بوجھ کر زیادہ اہمیت دینے لگی تھیں اور وحید نے اماں کو بتا دیا تھا، انہیں بلقیس کو بھی وہی اہمیت دینا ہے جو اس گھر میں بڑی بھابھی کی ہے۔

"فرحت کی برابری کوئی کیسے کر سکتا ہے، وہ بڑی بہو ہے۔" جب وحید نے بلقیس کے سامنے ہی اماں سے یہ بات کہی تو وہ بھی غصے میں آ کر کہہ بیٹھیں۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، گھر میں اہمیت عقل و فراست کی وجہ سے ہونی چاہیے اور میں سمجھتا

ہوں بلقیس آپ کی دونوں بہوؤں سے زیادہ ذہین ہے۔"

"اوہو جی! یہ کیا باتیں شروع کر دیں آپ نے۔ میں تو بس یوں سمجھ لیں اماں جی کی خوشی میں خوش ہوں، ان کی خدمت ہی میرے لیے سب سے بڑھ کر ہے۔ باقی اور مجھے کسی مقام کی ضرورت نہیں۔" بلقیس نے یہ بات کہہ کر وہ کام کروا لیا جو وحید نہیں کروا سکتا تھا۔

چاپلوسی میں بلقیس کا جواب نہیں تھا، گھر کی کرتا دھرتا اماں تھیں۔ امجد ہر ماہ معقول رقم ان کے ہاتھ میں دیتا تھا، وہی اس گھر کی سلطنت کی حکمران تھیں اور جلد ہی بلقیس ان کی دست راست بن گئی۔

بلقیس نے نہ صرف ارجمند بیگم کے گرد خوشامد کا حلقہ تنگ کیا بلکہ وہ امجد کے ساتھ بھی بڑی محبت اور طریقے سے پیش آتی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں امجد نے بھی کہنا شروع کر دیا۔

"بلقیس بھابھی بے حد سمجھ دار اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔"

نائلہ تو اس صورت حال کو دیکھ کر کیا بولتی، ہاں فرحت کو بلقیس سے حسد ہونے لگا تھا اور وہ اس سے کھنچ سی گئی تھیں۔

۞ ۞ ۞

اگلے تین سالوں میں بلقیس دو بچوں کی ماں بن گئی۔ پہلے سال بیٹا تنویر پیدا ہوا تو سال بعد ہی آرزو بھی آ گئی۔ بچوں میں وقفہ کم تھا اس بات کو بنیاد بنا کر بلقیس نے گھر کے کاموں سے عملی طور پر تو ہاتھ کھینچ لیا لیکن ہر معاملے پر نظر پوری رکھی۔

وحید، بلقیس کی محبت کا دم بھرتا تھا لیکن شادی کے بعد بھی جہاں بھی جب بھی موقع ملتا، وہ نائلہ کے ساتھ بے تکلفی کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ یہ احساس اس کے دل سے نکلا نہیں تھا کہ امجد کو اس کی بیوی سے کہیں زیادہ خوب صورت سیدھی سادی بیوی ملی ہے پھر یہ آگ بھی بھڑکتی تھی کہ نائلہ نے اسے کبھی توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ حالانکہ وہ تو خود کو لاکھوں میں ایک سمجھتا تھا۔ نائلہ نے شادی کے بعد کی زندگی صرف اس شخص کی وجہ سے ایک خوف کی حالت میں گزاری تھی، وہ ایک بیٹی کی ماں بن کر بھی اس گھر میں اپنے قدم اکھڑے ہوئے ہی محسوس کرتی تھی۔

ایک روز جب وحید دیر سے ناشتے کی ٹیبل پر آیا تھا اور نائلہ اس کے سامنے میز پر ناشتا رکھ رہی تھی، وحید نے بڑی آہستگی سے اس کے دوپٹے کو اس طرح چھوا تھا کہ وہ سینے سے ڈھلک گیا تھا۔ نائلہ گھبرا کر پیچھے ہٹی تھی کہ برتن بھی گرتے گرتے بچے تھے، تب وحید کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

اندر آتی بلقیس نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تھا، یہ ان کی شادی کے اولین دنوں کی بات تھی اور اس نے نائلہ کے لیے دل میں شدید غصہ اور نفرت محسوس کی تھی۔

"خوب صورت بلا، ڈائن۔۔۔ آج سے تجھ سے تو میری دشمنی پکّی ہے۔" اور پھر اس نے اس دشمنی کو خوب ہی نبھایا۔ نائلہ اماں جان کی پسندیدہ بہو پہلے بھی نہیں تھی بلقیس نے انہیں اس سے اس حد تک متنفر کیا کہ وہ اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ رہیں۔ امجد کو اس نے ہر طرح سے باور کروا دیا کہ "نائلہ کم عقل اور حاسد عورت ہے۔ وہ تم بھائیوں کو ایک ساتھ مل جل کر رہتا دیکھ ہی نہیں سکتیں۔"

اب یہ نائلہ کی قسمت کہ ان ہی دنوں حالات سے گھبرا کر اس نے امجد سے کچھ ایسی بات کی تھی کہ

وہ گھر کا کچن الگ چاہتی ہے، اتنے لوگوں کی موجودگی میں کوئی پرائیویسی نہیں ہے، وغیرہ۔ اب جو بلقیس نے بھی یہ بات کر دی تو سب سچ ثابت ہو گیا۔ امجد نے سب کی موجودگی میں ہی اسے اتنی باتیں سنائیں کہ پھر کبھی نائلہ یہ بات زبان پر نہ لاسکی بلکہ وہ پھر کبھی اس کے سامنے کچھ بول ہی نہ سکی۔

نائلہ کے ہاں سونیا پیدا ہوئی، تب اس کی صحت کافی عرصے تک خراب رہی۔ ان ہی دنوں چھوٹی نند کی شادی تھی، امجد پر بہت بوجھ تھا، وہ اس کی دل جوئی بھی نہ کر سکا۔ کرتا بھی کیوں، وہ دوسری بار بیٹی کی ماں بنی تھی جس پر اماں جان نے تو دل ہی پکڑ لیا تھا۔ بیماری اور نقاہت میں بھی وہ گھر کے کام انجام دیتی رہی۔ وحید نے گھر کی گہما گہمی سے فائدہ اٹھا کر آتے جاتے پھر کچھ ایسی باتیں اور حرکت کی کہ وہ کمرے میں بند ہو کر رہ گئی۔ نند کی شادی کے روز بھی میک اپ نہیں کیا۔ سادہ سے کپڑے پہنے کہ وہ اب ہر مرد کی نظر سے خوف کھانے لگی تھی۔

❁ ❁ ❁

دونیہ نے شعور سنبھالتے ہی اپنے گھر میں عجیب ماحول دیکھا تھا، سب ایک دوسرے سے بے زار ہیں مگر ساتھ رہتے ہیں۔ دن رات منافقت میں کٹتے ہیں۔ تائی بلقیس پیٹھ پیچھے دادی اور پھپھو کا مذاق اڑاتی ہیں اور منہ پر تعریفیں کرتے نہیں تھکتیں۔ چھوٹے ماجد چچا اور ان کی بیوی تو شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اس گھر میں رہ کر گھر والوں پر احسان کر رہے ہیں۔ بڑے تایا اور تائی جان اپنی دنیا اپنے بچوں میں مگن ہیں، انہیں کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

تایا وحید کچھ نہیں کرتے لیکن باتیں ایسی بناتے ہیں جیسے سارے بوجھ انہوں نے ہی اٹھا رکھے ہیں اور اس کے ابا جو دن رات اس گھر کے لیے محنت کرتے ہیں، ان کے پاس اپنے بیوی بچوں کے لیے وقت نہیں ہے اور اس کی امی جو شاید دنیا میں آئی ہی اس گھر کے لوگوں کی خدمت کے لیے ہیں لیکن صلہ نہیں ملتا بلکہ وہی سب میں بری کہلاتی ہیں اور وہ دونوں بہنیں سونیا اور دونیہ کچھ نہ کر کے بھی چالاک مکّار اور دادی کی ناپسندیدہ پوتیاں ہیں۔

اسے اس گھر اور ماحول سے شدید اکتاہٹ ہوتی تھی، گھر میں بھی امی کہتیں۔

"دیکھو دوپٹا اچھی طرح اوڑھ کر رکھو۔ فیشن کے کپڑے کبھی سلوا کر نہ دیتیں۔ ٹی وی بڑے کمرے میں تھا اور نائلہ بیگم انہیں بڑے تایا کے بیٹوں کی موجودگی میں ٹی وی نہیں دیکھنے دیتی تھیں۔

ایک اور بات جو اس نے محسوس کی۔ امی تایا وحید سے بہت گھبراتی ہیں، پہلے اپنا وہم سمجھا لیکن پھر اسے اندازہ ہوا یہ وہم نہیں تھا اور تایا وحید کی آنکھوں میں بھی ایک خاص چمک کو امی کی موجودگی میں اس نے ابھرتے دیکھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا، وہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے امی سے ہی کہتے تھے لیکن جب ان کی بیگم موجود ہوتیں، تب وہ امی کی جانب نہ تو دیکھتے تھے نہ ہی بلاتے تھے۔

یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں لیکن دونیہ غیر معمولی ذہین تھی، حالانکہ اس گھر کا ماحول ان دونوں بہنوں کے لیے کبھی بھی سازگار نہیں رہا تھا، وہ بڑی ہوتی گئی اور ہر بات کا جائزہ لینے کے بعد نتیجہ نکالتی

چلی گئی۔

اس نے آٹھویں کلاس میں ہوتے ہی باپ سے کہہ دیا تھا۔

"میں اپنا جیب خرچ دادی اماں سے نہیں، آپ سے لوں گی۔ نہ صرف مجھے بلکہ سونیا اور امی کو بھی آپ جیب خرچ دیں گے۔"

"یہ کام اماں ہی کرتی ہیں، سب بچوں کو وہی جیب خرچ دیتی ہیں۔"

"مگر ہمیں آپ سے لینا ہے اور اس سے زیادہ لینا ہے، جتنا دادی سب بچوں کو دیتی ہیں کہ وہ بچے دادی اماں سے بھی لے لیتے ہیں اور اپنے والدین سے بھی کہ تایا جان بڑے سیانے ہیں۔ وہ پوری رقم دادی کے ہاتھ میں تھوڑی رکھتے ہیں، تم بتاؤ نا سونیا! یہ سب تو آؤٹنگ پر بھی جاتے ہیں، ڈنر بھی باہر کرتے ہیں اور یہ بچے کتنے اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ ہم بھی اب اپنی شاپنگ آپ کے ساتھ جا کر کیا کریں گے۔"

لہجہ ایسا اٹل تھا کہ امجد حیران رہ گئے۔ وہ تو آج بھی ماں کے سامنے اتنے اعتماد سے اپنا موقف پیش نہ کر سکتے تھے، وہ انہیں اپنا سب سے فرماں بردار و ذمہ دار بیٹا کہتی تھیں اور وہ وہی کردار نبھاتے چلے جا رہے تھے۔

کالج تک آتے آتے دونیہ باپ سے بہت کچھ منوا چکی تھی، وہ اور سونیا پاکٹ منی باپ سے لیتی تھیں، شاپنگ کے لیے بھی اکثر انہیں مجبور کر کے ساتھ لے جاتیں اور نائلہ کو ضرور ساتھ لے کر جاتیں۔

اس کے انداز میں جو بے نیازی اور بے خوفی تھی، وہ بھی گھر میں سب کو بری لگتی تھی اور اسے کسی کی پروا بھی نہیں تھی۔

❁ ❁ ❁

"اے دونی! بھئی بند کرو یہ کتاب، کیا ہر وقت کتاب میں سر گھسائے بیٹھی رہتی ہو۔" فرحان نے یہ کہتے ہوئے خود ہی اس کے سامنے کھلی کتاب بند کر دی تھی۔

"میرا نام دونیہ ہے۔" اس نے کتاب پھر سے کھولتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ہوا کرے گا، میں تو دونی ہی کہوں گا۔"

"پھر میں جواب نہیں دوں گی، تب ہی بولوں گی، تب میرے نام سے بلاؤ گے۔"

"او ہو لڑکی! جتنی خوب صورت ہو، اتنی ہی نک چڑھی بھی ہو۔" وہ جھلا کر کہتے ہوئے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونیہ پھر سے کتاب کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

"اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرو گی، آخر میں کرنا تو وہی ہانڈی چولہا ہی ہے نا۔"

"تم سے مطلب؟" اسے بے تحاشا غصہ آیا تھا۔

"مجھ ہی سے تو مطلب ہے جناب!" وہ معنی خیز انداز میں بولا تھا۔

اسی وقت وحید احمد کی ستارہ ادھر چلی آئی، بالکل بلقیس کی کاپی۔ صورت بھی، عادات میں بھی، خوبرو سے فرحان پر البتہ دل و جان سے فدا تھی اور اس کے سامنے ماتھے کی تیوریاں غائب ہو جاتی تھیں۔

''تم ادھر بیٹھے ہو، میں سارے گھر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں۔''

''جاؤ ٹانگیں دباؤ اس کی۔'' دونیہ نے فرحان سے کہا اور ہنس پڑی۔

''بکومت۔'' وہ جھینپ گیا پھر ستارہ سے بولا۔

''یہ تم ہر وقت مجھے ہی کیوں ڈھونڈتی رہتی ہو، کوئی اور کام نہیں ہے تمہیں۔''

''تم سے کام ہے نا۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''معاف رکھو مجھے۔'' فرحان مزید پھیل کر بیٹھ گیا۔

''مجھے اپنی ایک دوست کی طرف جانا ہے، پلیز لے جاؤ نا۔'' وہ بڑی ادا سے کہہ رہی تھی۔

فرحان نے جھٹ جیب میں ہاتھ ڈالا، بائیک کی چابی نکالی اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تنویر سے کہو تمہیں چھوڑ آئے دوست کی طرف اور یہ تم ہر شام دوست کے ہاں حاضری کو اتنا ضروری کیوں سمجھتی ہو۔''

''ایک ہی دوست کے ہاں روز روز تھوڑی جاتی ہوں، آدم بے زار نہیں ہوں، بہت دوستیں ہیں میری۔'' اس نے دونیہ پر تیز سی نظر ڈال کر کہا تھا۔

''اچھا بھئی، یہ لو پکڑو چابی۔''

''نہیں نہیں، تنویر کے ساتھ نہیں جانا۔ امی منع کرتی ہیں، وہ ٹھیک سے چلاتا جو نہیں ہے۔ تم لے کر جاؤ۔''

اور فرحان بظاہر ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ستارہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دونیہ کی جانب دیکھا لیکن وہ ادھر متوجہ ہی نہیں تھی۔

ستارہ اور فرحان کے جانے کے بعد تایا وحید کا بیٹا تنویر ادھر چلا آیا۔

''تم نے میری امی کو دیکھا ہے دونیہ؟''

''ہاں روز ہی دیکھتی ہوں۔''

''اوہو! میرا مطلب ہے ابھی ابھی۔ پتا نہیں کدھر ہیں، سارے گھر میں ڈھونڈ لیا ہے۔''

''کچن میں فریج کے پاس دیکھو، وہ اکثر وہیں کھڑی کسی نہ کسی فروٹ سے انصاف کرتی پائی جاتی ہیں۔''

تنویر نے اس بات پر غصے سے اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں مگر بعد میں ماں اور دادی سے یہ بات ضرور کر دی۔ نتیجتاً اسے ابو کی عدالت میں حاضری کے لیے بلایا گیا۔

''تمہیں بڑوں کے بارے میں اس طرح بات کرنا زیب دیتا ہے؟ ویسے تو بڑی لائق فائق ہو۔ ہر کلاس میں پوزیشن لیتی ہو لیکن تہذیب کسی نے نہیں سکھائی۔''

''بس ابو! ایسے ہی سچی بات منہ سے نکل گئی تھی۔ جب بھی کوئی فروٹ یا کچھ اور کھانے کو جی چاہا تو وہاں جانے پر ستارہ اور بلقیس آنٹی کو انصاف کرتے ہی پایا۔ آپ کتنا موسمی پھل لے کر آتے ہیں لیکن میرے، سونیا اور امی کے حصے میں تو کبھی کچھ نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے ہم تینوں اس گھر میں دوسرے درجے

کی مخلوق ہیں جسے جب چاہے جس طرح چاہے کوئی بھی ذلیل کر سکتا ہے اور تو اور اس گھر کی ملازمہ بھی ہماری بات سن کر عمل کرنا گوارا نہیں کرتی۔''

وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی اور امجد صاحب جو کچھ دیر پہلے غصے میں دکھائی دے رہے تھے، جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

''ابو! ہم دونوں اور امی تو کھانا بھی سب سے آخر میں کھا پاتے ہیں۔'' یہ کہنے والی سونیا تھی۔

''کیوں بیٹا! تمہیں کوئی منع تھوڑی کرتا ہے۔'' سونیا اس کے زیادہ قریب تھی۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ اس سے پیار اور توجہ سے بات کرتے تھے۔

''اگر ہم بھی کھانا لگتے ہی بیٹھ جائیں تو پھر بار بار روٹی، سلاد، سالن، پانی ٹیبل تک پہنچانے کی ذمہ داری امی کے سر ہی رہ جائے۔ وہ بے چاری اکیلی کیا کیا کریں گی۔ ہمیں تو ان کا خیال کرنا ہی ہے نا۔ ابو! اس گھر میں کتنے لوگ ہیں لیکن سب کے سب ذمہ داریوں سے دور ہیں۔ یہاں تک کہ گھر کے سب مردوں کے چائے پانی کا خیال بھی ہماری امی کو کرنا پڑتا ہے، جبکہ سب کے بیوی بچے ہیں۔''

دونیہ جب بولنے پر آتی تو پھر کچھ بھی کہتے جھجکتی نہیں تھی۔

''قصور تمہاری امی کا ہے، اس نے کسی سے بنا کر رکھی ہی نہیں، اسی لیے کوئی بھی اس کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کرتی۔''

اتنے سالوں میں گھر کے کام نبٹاتے، سب کو دیکھتے امی، ابا کے لیے وقت نہیں نکال پاتی تھیں، وہ ان سے کبھی اپنی کہہ نہیں سکی تھیں اور مرد آنکھوں سے دیکھ کر اکثر اندھا ہو جاتا ہے، وہ کانوں سنی پر زیادہ اعتبار کا عادی ہوتا ہے۔

''ایسا نہیں ہے ابو! اصل میں۔۔۔''

''اچھا بس! مجھے زیادہ باتیں سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بڑوں کی عزت کرنا سیکھو۔ میں نہیں چاہتا جیسے میری بیوی اس گھر میں موجود ہو کر بھی میرے گھر والوں سے فاصلے پر رہی ہے، ایسا ہی تم بھی کرو۔'' وہ اتنا کہہ کر اٹھ کر چلے گئے۔

نائلہ بیگم تمام عرصے میں چپ چاپ بیٹھی رہیں۔

ملازمہ نے آ کر بتایا۔ ''عطرت بی بی (بڑی نند) اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہیں۔ دادی کہہ رہی ہیں چائے کے ساتھ کباب اور سموسے فرائی کر لو۔ باقی انہوں نے فرحان میاں کو بازار بھیجنا ہے۔ رات کے کھانے کے لیے دادی سے آ کر پوچھیں اور جو کچھ موجود نہیں ہے لسٹ بنا کر فرحان کو دے دیں۔ وہ فرحان میاں کہہ رہے ہیں، دوسرا چکر نہیں لگاؤں گا۔''

''ہاں ہاں پھپھی تو صرف ہماری سگی ہے نا، وہ کیوں دوسرا چکر لگائیں گے۔'' دونیہ کو غصہ تو پہلے ہی آ رہا تھا، یہ بات سن کر تپ گئی پھر ماں سے بولی۔

''چائے اور کھانا میں اور سونیا بنا لیں گے، آپ کو کچن میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جیسا تم بناؤ گی کیا پتا نہیں ہے مجھے اور پھر سب کی باتیں سنوں گی میں۔''

وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بڑے کمرے میں یہ تینوں آگے پیچھے داخل ہوئیں، سب ہی موجود تھے۔ بڑے خوش گوار موڈ میں باتیں ہو رہی تھیں، ابا کے شانے پر پھپھو کی بینا نے سر ٹکا رکھا تھا اور ماموں سے کوئی فرمائش ہو رہی تھی۔

"نکل آئیں کمرے سے۔ میں کہتی ہوں تم ماں بیٹیوں کو کسی آئے گئے کا ہوش بھی ہے۔" دادی دیکھتے ہی برسنے لگیں۔

"ارے دادی! چائے اور کھانے کا انتظام ہمیں ہی تو کرنا ہے۔ ان میں سے کسی سے کہیں ذرا، پھر دیکھیے کیسا تماشا ہوتا ہے۔"

سارے بڑوں کی موجودگی میں ایسی بات اس نے پہلی مرتبہ کہی تھی۔

اور کچن میں آکر امی نے آنسو پونچھنے کے بعد اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

اس نے ماں کی ڈانٹ کا برا نہیں مانا، چائے کا پانی چولہے پر رکھنے لگی۔

"رات کو چکن کڑاہی، فرائیڈ رائس اور دم کا قیمہ گھر پر بنے گا۔ باقی بازار سے منگوانے کا کہہ رہی ہیں اماں جان! تم بتا دو کیا کیا منگوانا ہوگا۔" وحید احمد چلے آئے تھے اور بات کرتے ہوئے بغور نائلہ کا چہرہ دیکھ رہے تھے پھر قریب آکر دونیہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لے لیتی ہو، بالکل چڑیا جتنا دل ہے۔ ماں پر گئی ہو نا۔"

"آپ کو ہمدردی جتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ہمیشہ کی طرح امی تایا وحید کے ساتھ بہت روکھے انداز میں بولی تھیں۔

دونیہ کو حیرت ہوئی، اگر کوئی ہمدردی کر ہی رہا تھا تو پھر اس کے ساتھ یوں پیش آنا مناسب تو نہیں تھا۔

"اپنی بیوی اور بیٹی کو تو تخت پر بٹھا رکھا ہے، آجاتے ہیں باتیں بنانے۔" امی نسبتاً بلند آواز میں بڑبڑائی تھیں۔

تایا ہنس پڑے اور دھیرے سے بولے۔

"اس میں تو قصور تمہارا ہی ہے، ہم نے تو چاہا تھا کہ تمہیں بھی تخت پر بٹھائیں۔"

"دونیہ! پانی میں پتی بھی تو ڈالو اور دودھ فریج میں رکھا ہے، نکال لو پھر چائے کے برتن بھی سیٹ کرو۔" وہ جان بوجھ کر جلدی جلدی بولنے لگیں۔

اور تایا خوامخواہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

چائے لے کر خود اندر نہیں گئی نہ ماں کو جانے دیا۔ ملازمہ کے ہاتھ بھجوا دیا اور کوئی ان تینوں کو بلانے نہیں آیا، ابا بھی نہیں۔ دل پر ملال کے گہرے بادل چھا گئے۔

❁ ❁ ❁

"اداس ہو؟" اگلے روز جب وہ کتاب سامنے لیے بیٹھی کہیں اور ہی دیکھ رہی تھی، فرحان اس کے پاس چلا آیا۔

"نہیں، بس ایسے ہی۔" وہ کسی سختی کا مظاہرہ نہیں کر سکی۔

"کل بہت برا کیا چچا نے۔ میں حیران ہوتا ہوں انہیں تمہاری اور چچی کی قدر کیوں نہیں ہے۔"

"آج نہیں تو کل انہیں ہماری اہمیت تسلیم کرنا ہوگی کہ میں امی کی طرح خاموش نہیں بیٹھوں گی۔ خود کو منوا کر چھوڑوں گی۔"

"تمہاری شدت پسندی سے کبھی کبھی مجھے خوف آنے لگتا ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"میرا جی چاہتا ہے، سب کچھ تہس نہس کر دوں۔" دونیہ نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"ایسا نہیں سوچتے، جل جل کر اپنا ہی نقصان کرو گی۔ جب بھی جس پر بھی غصہ آئے مجھ پر نکال دیا کرو۔"

"اچھا جی مگر وہ کس حساب میں؟" اتنے خراب موڈ کے باوجود اس کی بات اور انداز پر دونیہ کو ہنسی آ گئی۔

"شکر ہے تم مسکرائیں تو، میں تو سمجھا تھا بھول گئی ہو۔"

"سچ کہتی ہوں، اب اگر زیادہ عرصہ اس ماحول میں رہی تو یقیناً مسکرانا بھول جاؤں گی۔"

"یہ گھر ہمارا ہے، ہم کیوں نکلیں یہاں سے۔ انہیں ہی کیوں نہ نکال باہر کریں جو ہمارے حق پر قابض ہوئے بیٹھے ہیں۔" فرحان سنجیدگی سے ایک نئی راہ دکھا رہا تھا۔

"جی تو یہی چاہتا ہے۔ چچا ماجد کی نخریلی بیگم اور تایا وحید کی فیملی میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔"

"صرف تمہارے لیے ہی نہیں، خود میری بھی یہی رائے ہے۔ بس دونیہ! تم میرا ساتھ دو تو سب ٹھیک ہوتا چلا جائے گا۔ آج سے دوستی پکی۔"

اس نے ہاتھ بڑھایا، دونیہ نے ایک نظر اس کے کھڑے نقوش والے بااعتماد چہرے پر، دوسری اس کے مضبوط ہاتھ پر ڈالی اور اپنا نازک سا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"بی بی! تم ادھر بیٹھی ہو، ادھر تمہاری دادی سب کو بلا رہی ہیں۔"

ملازمہ دادی کا پیغام لے کر آئی۔ دونوں اٹھ کر ان کے کمرے میں آ گئے۔ وہاں سب ہی جمع تھے۔ دادی کے پلنگ کے قریب میز پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھا تھا اور سب ہی موجود تھے۔ امجد صاحب یقیناً ابھی ابھی آفس سے آئے تھے کہ چینج کیے بغیر ہی نظر آ رہے تھے۔

"امی نہیں ہیں یہاں، آپ نے امی کو نہیں بلایا دادی!" وہ جان بوجھ کر بہت اونچی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

"اے تمہاری ماں کو ہماری خوشیوں سے کبھی کوئی مطلب رہا ہے کیا؟"

دونیہ وہیں سے واپس مڑ گئی اور سونیا جو کمرے میں بیٹھی تھی، وہ بھی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

"دادی! بتا بھی دیں، آخر مٹھائی ہے کس خوشی میں؟" ستارہ اور تنویر پوچھ رہے تھے۔

"بھئی تمہاری چھوٹی پھپھو ندرت نے پورے ایک کنال کا زمین کا ٹکڑا خریدا ہے۔ بس اللہ نے کرم کیا اس پر، بے چاری برسوں سے پیسہ پیسہ جوڑ رہی تھی۔"

"لیکن اماں! ندرت کے پاس تو اچھا بڑا مکان موجود ہے۔" ماجد نے مٹھائی کا ایک پیس اٹھاتے

ہوئے کہا۔

''اے اس کی کیا بات کرتے ہو، عطرت کے سسر مرحوم کا بنایا ہوا مکان ہے وہ۔ سب بھائیوں کے حصے ہیں اس میں، کل کو جائیداد بٹے گی تو کیا ہاتھ آئے گا ندرت کے۔ وہ تو کہتی ہے، مکان جھڑتا جا رہا ہے لیکن میں ایک پیسہ نہیں لگاتی کہ ہے تو مشترکہ، کل کو ملے گا تو وہی ہمیں شرعی حصہ۔ بس اللہ نے اپنی زمین دے دی ہے۔ اب اپنا گھر بنائے گی۔''

اور امجد نے بے ساختہ ہی اس گھر کی جانب دیکھا جس پر عمارت اٹھانے میں سارا پیسہ ان ہی کا لگا ہوا تھا اور زمین سب بہن بھائیوں کی مشترکہ تھی۔

بھائی بھابھیاں بولتے رہے، وہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اماں جان نے مخاطب کیا۔

''امجد! کل اس خوشی میں بیٹی اور داماد کو کھانے پر بلاؤں گی۔ اچھی بڑی سی دعوت کروں گی۔ خرچ کچھ زیادہ آئے گا، تم کچھ پیسے وحید کو دے دینا۔ اے میرے پاس تو جو ہوتا ہے، اس میں مہینہ ہی مشکل سے پار ہوتا ہے اور اپنی بیگم کو بھی بتا دینا، اسے بھلا آئے گئے کا ہوش کہاں ہوتا ہے۔ کہہ دینا کل رات کا کھانا اہتمام سے بنانا ہوگا۔ اگر زحمت نہ ہو تو کل سویرے آ کر مجھ سے پوچھ لے اور وقت پر تیاری کر لے۔''

''بھابھی سست بھی تو بہت ہیں۔'' بلقیس نے رائے دی۔

''اصل میں دل سے نہیں کرتیں نا۔'' چھوٹی والی بہو نے کہا اور وحید بڑے زور و شور سے تائید کرنے لگے۔

باتوں باتوں میں مٹھائی کا ٹوکرا خالی ہو گیا۔ امجد اٹھ کر باہر آئے۔ کچن میں ان کی بیوی کام میں بری طرح مصروف تھی اور وہیں رکھی کھانے کی چھوٹی ٹیبل کے گرد ان کی دونوں بیٹیاں بیٹھی تھیں۔

''ابو۔۔۔!'' دونیہ کی نظر پڑ گئی تو پکارا۔ وہ بھی چلے آئے۔ ''کھا آئے مٹھائی اکیلے اکیلے، امی ہمارے بغیر کچھ نہیں کھاتیں۔''

وہ کتنے آرام سے باپ کو جتا رہی تھی، نائلہ گھبرا گئیں۔

''میں نے بھی کب کھائی ہے۔'' وہ ایک دم سے صفائی دے گئے پھر بولے۔ ''کیا خیال ہے، میں بھی تم دونوں کے نام ایک ایک پلاٹ نہ خرید لوں۔''

''سچ ابو!'' انہیں یقین نہیں آیا اور ان سے کہیں زیادہ بے یقین نائلہ تھیں۔

''ہاں، بالکل سچ۔'' بیٹیوں کی معصوم خوشی پر وہ بے اختیار مسکرائے۔

''آپ وعدہ کریں، اس کی خبر کسی کو نہیں ہونے دیں گے، ورنہ سب بچوں کے لیے پلاٹ خریدنے پڑ جائیں گے اور ابو! آپ کو اتنی محنت کرتے دیکھ کر مجھے آپ کی صحت کی فکر ہونے لگتی ہے۔ سارے گھر کا بوجھ بلکہ ناجائز بوجھ آپ نے اٹھا رکھا ہے۔''

دونوں بیٹیاں کہہ رہی تھیں اور انہیں لگا، وہ واقعی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وحید بھائی اور ماجد نے تو آج تک ڈھنگ سے کوئی کام کیا ہی نہیں تھا۔ اب بڑے بھائی کا فرحان بھی ان ہی کے نقش قدم پر تھا۔ بمشکل بی ایس سی کلیئر کرنے کے بعد وہ صرف ڈینگیں مار رہا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار

تھے۔ پہلا بھتیجا تھا اور انہیں بہت پیارا بھی تھا لیکن وہ مسلسل مایوس کر رہا تھا۔

''نائلہ! کل اماں ندرت کی فیملی کو کھانے پر بلا رہی ہیں، ایک دو ڈشیں گھر پر بنا لینا، باقی میں بازار سے لیتا آؤں گا بلکہ لیتا کیا آؤں گا، ابھی بتا دو تم لوگ۔ کیا کیا ہونا چاہیے، میں آرڈر لکھوا دیتا ہوں۔''

''ہم کیا کہہ سکتے ہیں ابو! یہ فیصلہ تو گھر والے کریں گے۔'' دونیہ کی بات پر جھٹکا سا لگا۔

''کیا تم گھر والوں میں شامل نہیں ہو؟''

''نہیں ابو! ہم شامل نہیں ہیں، ہم دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔''

دونیہ آج یہ سچائی بڑے آرام سے کہہ گئی تھی۔

''جن کے والدین بچوں پر توجہ نہ دیں، اپنے گھر والوں کو یہ نہ بتائیں کہ ان کے بچے ان کے لیے بہت اہم ہیں، وہ ہمارے جیسی زندگی ہی گزارا کرتے ہیں۔'' سونیا آبدیدہ ہو گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

انہوں نے زمین خریدنے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا، اس سلسلے میں اپنے ایک پراپرٹی ڈیلر دوست سے بات کی۔ ارادہ سن کر وہ کہنے لگا۔

''ارے پہلے کیوں نہیں ذکر کیا، ابھی چھ ماہ پہلے تمہارے دونوں بھائیوں نے ایک ہی کالونی میں پلاٹ خریدے ہیں، تم بھی وہیں خرید لیتے۔''

''کون دونوں بھائیوں نے؟'' وہ پوچھتے پوچھتے رک گئے اور پھر یہ کہہ کر فون رکھ دیا کہ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔

''کس نے۔۔۔ بھائی رشید اور وحید نے یا وحید اور ماجد نے؟'' ان کی حالت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ ان سے چھپ کر بھائی اپنی پراپرٹی بنا رہے تھے اور انہیں یہی کہا جاتا تھا، ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، خرچے پورے نہیں ہوتے۔ تینوں بھائیوں کے بچوں کی تعلیم کا سارا خرچ آج تک انہوں نے اٹھایا تھا اور گھر کے اخراجات کے لیے ماں کو ہر ماہ معقول رقم دیتے تھے۔ نائلہ پر توجہ دینے کا پہلے وقت نہیں ملا پھر اس کے خلاف ایسی نفرت پیدا کی گئی کہ وہ اسے توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔

بیٹیوں سے پیار تھا لیکن ان کے پاس وقت ہی کب تھا۔

سارا دن وہ عجیب کیفیت میں گھرے رہے۔ شام کو گھر آئے تو گہما گہمی کا عالم تھا۔ یاد آیا، آج تو ندرت کو کھانے پر بلا رکھا تھا۔ کوفت ہو گئی کہ اب انہیں سونے سے پہلے تک بڑے کمرے میں بھی بیٹھنا تھا۔ باقی تینوں بھائی بلکہ بھابھیاں بھی سلام دعا کے بعد اپنے کمرے میں چلے جاتے یا کبھی تو باہر نکل جاتے لیکن ان کا تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ جانا بہنوں کو خفا کر دیتا تھا۔ بقول ان کے۔

''تم سب سے پیارے بھائی ہو، ہم تو تم سے ہی ملنے کے لیے آتے ہیں۔'' اور وہ ایک فخر کے احساس میں گھرے بیٹھے رہتے لیکن آج کی بات دوسری تھی۔

ہال میں نہ صرف ندرت بلکہ بڑی بہن کی فیملی بھی موجود تھی۔ بھابھیاں، بھائی اور ان کے بچے بھی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''دونیہ اور سونیا نظر نہیں آ رہیں؟'' بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا تھا۔
''ہوں گی ماں کے پاس، سچ کہتی ہوں امجد بھائی! تمہاری بچیوں کے رویے سے دل بڑا دکھتا ہے۔'' عطرت آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔
''ان کی ماں کچن میں اکیلی لگی ہوتی ہے تو اس کے خیال سے وہ بھی ادھر ہاتھ بٹانے لگتی ہیں۔''
ان کی اس بات پر سب نے پہلو بدلا مگر اماں جان تیزی سے بولیں۔
''اے ایسے کون سے کنویں کھودتی ہے ان کی ماں۔ میں تو آج تمہارے انتظار میں بیٹھی تھی۔ دیکھو تو اس کی من مانیاں ذرا سا کیا کہہ دیا، سارا سامان پکا پکایا بازار سے منگوالیا۔ کچھ احساس بھی ہے اسے تم کس محنت سے کماتے ہو۔ حرام کا پیسہ تو نہیں ہے جو یوں لٹا دیا جائے۔''
''یہ آرڈر میں نے ہی لکھوایا تھا۔'' ان کی بات نے اب تو اماں جان کو بھی خاموش کروا دیا۔ وہ چینج کرنے کے لیے اٹھے تو کچن میں جھانکا۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں مصروف تھیں۔

❁ ❁ ❁

آنے والے دنوں میں انہوں نے بیٹیوں کے لیے پلاٹ خرید لیے۔ گھر میں اب تو کسی کو کچھ بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نائلہ بیگم اور لڑکیاں بہت خوش تھیں، اسی خوشی میں لڑکیوں نے آج باہر کھانا کھانے کی فرمائش کی تھی۔ آج سے پہلے وہ کبھی صرف اپنی فیملی کے ساتھ کہیں نہیں گئے تھے لیکن ان کی خوشی کو دیکھتے ہوئے آج ہامی بھر لی۔
قریبی فوڈ کورٹ میں وہ لوگ ابھی آ کر بیٹھے ہی تھے کہ فرحان کو ایک طرح دار سی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور بہت ہی بے تکلفی سے جڑ کر چلتے وہ انہیں دیکھے بغیر ایک دوسرے میں گم باہر نکل گئے۔
''یہ تو نیلی تھی۔'' سونیا ہی کچھ دیر کے بعد بولنے کے قابل ہوئی۔
''کون نیلی؟'' امجد صاحب نے پوچھا اور نظر دونیہ پر پڑی۔ دونیہ کی رنگت سفید ہو رہی تھی اور اس کی حالت ایسی تھی کہ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ فرحان کے حوالے سے ایسے ہی خواب انہوں نے بھی دونیہ کے لیے دیکھ رکھے تھے۔
''یہ فرحان بھائی کی خالہ کی بیٹی ہے۔ میں نے ایک دو بار انہیں موبائل پر بھی باتیں کرتے سنا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے امریکہ سے آئی ہے اور تائی جان چاہ رہی ہیں فرحان اس سے شادی کر کے امریکہ چلا جائے۔ فرحان بھی اس کوشش میں ہے۔ مجھے یہ سب نینو نے بتایا ہے۔ شو مار رہی تھی کہ فرحان بھائی امریکہ جا کر تایا جان کی پوری فیملی کو بلا لیں گے۔ کہہ رہی تھی ایک بار امریکہ پہنچ جائیں ہم لوگ پھر مڑ کر دیکھیں گے بھی نہیں۔''
سونیا بولتی جا رہی تھی، وہ کن انکھیوں سے دونیہ کو دیکھ رہے تھے اور انہیں بہت دکھ ہو رہا تھا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔
''فرحان جیسے نالائق لڑکے کے لیے ایسی ہی لڑکی چاہیے۔ چلو اچھا ہے ورنہ میں تو اس کی طرف سے بہت مایوس ہوں۔ ویسے میری بیٹیوں کو چھوڑ کر اس گھر میں سارے نالائق ہی جمع ہیں۔ تم دونوں پر

فخر ہے مجھے اور تم دونوں اس فخر کو برقرار رکھنا۔''
انہوں نے یہ بات دونیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہی تھی اور دونیہ نے بھی اثبات میں سر ہلاتے دیر نہیں لگائی تھی۔

❁ ❁ ❁

''خدا کا شکر ہے جو میں ابھی بہت دور تک نہیں نکلی تھی ورنہ واپسی کتنی مشکل ہو جاتی اور میری سوچوں کو اس محور پر لانے میں بہت زیادہ ہاتھ تو فرحان کا ہی رہا ہے۔'' اسے فرحان کی بہت سی باتیں، ذو معنی فقرے یاد آنے لگے۔
''کتنا دھوکے باز ہے یہ، اسے یہ بھی خیال نہیں آیا میں اس کے چچا کی بیٹی ہوں اور چچا بھی وہ جنہوں نے ان سب بچوں کو اپنے بچے سمجھ کر ہر ذمہ داری اٹھائی ہے۔''
رات دیر تک وہ سو نہیں سکی لیکن صبح تک اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ رات کو جاگنے کی وجہ سے سر میں شدید درد تھا، وہ کالج نہیں گئی۔
''تم آج کالج کیوں نہیں گئیں؟'' ہال میں آئی تو سب سے پہلے تائی فرحت نے اسے دیکھ کر سوال کیا اور یہیں موجود فرحان بھی اسے دیکھنے لگا۔
''یونہی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔''
''باپ بے چارہ دن رات ان کے لیے محنت کرتا ہے اور ان کی سنو، موڈ نہیں بنا تو کالج نہیں گئیں۔''
یہ کہنے والے تایا وحید تھے۔ جواب میں وہ بہت کچھ کہہ سکتی تھی مگر یہ اس کی تربیت نہیں تھی۔
''آنے دے باپ کو، بتاتی ہوں اسے یہ چھن ہیں تمہاری بیٹی کے۔''
دادی تایا وحید کی بات کے زیرِ اثر کہہ رہی تھیں، اس نے ملازمہ سے ناشتا لانے کو کہا اور اخبار دیکھنے لگی۔
''کچھ دن پہلے تم نے وائٹ قورمہ بنایا تھا، آج میری امریکہ والی بہن اپنی فیملی کے ساتھ آ رہی ہے، بنا لینا۔''
تائی فرحت کہہ رہی تھیں، جواب میں اس نے نینو سے کہا۔ ''کاپی پنسل لاؤ۔ تمہیں ریسپی لکھ دیتی ہوں۔''
''تمہیں کیا تکلیف ہے بناتے ہوئے؟'' یہاں موجود ہر شخص کے چہرے پر غصہ تھا۔ پوچھ وحید احمد رہے تھے۔
''شام کو مجھے اور ابا کو کہیں جانا ہے۔''
''کہاں؟'' یہ آوازیں کمرے کے ہر کونے سے ابھری تھیں۔
انہیں بتانے کے بجائے وہ ملازمہ کو ناشتا جلد بنا کر لانے کے لیے پکارنے لگی پھر خود بھی اٹھ کر چلی گئی۔
''دیکھتی ہوں کیسے یہ کہیں جاتی ہے۔''

اس نے دادی کی آواز سنی تھی، پلٹ کر نہیں دیکھا کہ وہ کون سا کہیں جا رہی تھی۔ اسے تو بس سب کی حیرت مزا دے گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

اس روز امجد صاحب جلدی گھر آ گئے، انہیں فلو ہو رہا تھا۔ طبیعت خاصی گری گری سی تھی۔

نائلہ کو کچن میں ڈھیروں پیاز کاٹتے دیکھا تو کوفت ہوئی۔ اس وقت انہیں گرم پیالی چائے کے ساتھ بیوی کی ضرورت تھی جو پاس بیٹھ کر سر دبائے اور انہیں ہمدردی اور فکر کے ساتھ دوا کھلائے۔

''یہ کیا پھیلاوا ہے؟''

''وہ۔۔۔آج بڑی بھابھی کے میکے والوں کا کھانا ہے شام کو۔'' ان کے سوالیہ انداز میں دیکھنے پر بتانے لگیں۔ ''ان کی امریکہ والی بہن اپنی فیملی کے ساتھ آ رہی ہیں۔''

اور انہیں فرحان کے ساتھ موجود وہ لڑکی یاد آ گئی۔ کیا کیا خواب دیکھے تھے فرحان کے حوالے سے، اسے تو وہ اپنا بیٹا مان چکے تھے اور پل میں سارے خواب ٹوٹے تھے۔

''نائلہ! اچھی طرح ہاتھ دھو کر چائے بناؤ اور کمرے میں آ جاؤ۔''

''وہ میں۔۔۔میں۔۔۔''

انہیں ابھی بہت کام کرنا تھا، بھابھی نے کہا تھا۔ بریانی میں خود بناؤں گی۔ کباب بھی میری نینو بنا لے گی لیکن بریانی کا مسالا انہیں تیار کرنا تھا کہ اگر بھابھی کو کرنا ہوتا تو کچن میں موجود ہوتیں۔ نینو کو کباب بنانے کہاں آتے تھے تو سب کچھ نائلہ پر تھا۔ دونیہ بھی ماں کی ہمدردی میں کچن میں مصروف رہی تھی اور اب اپنے اور ماں کے کپڑے پریس کرنے کے لیے گئی تھی۔

''جن کے مہمان آ رہے ہیں وہ خود ہی دیکھ لیں گے، تم کمرے میں آؤ اور پلیز میرے پاس آنے سے پہلے یہ مسالوں کی خوشبو میں بسے کپڑے تبدیل کر لینا۔''

وہ کہہ کر چلے گئے۔ نائلہ بیگم نے کوفتے ہٹا کر چولہے پر چائے کا پانی رکھا اور خود بریانی کے مسالے کے نیچے آگ دھیمی کر کے دونیہ کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ ان کے کپڑے پریس کر چکی تھی۔

''ارے۔۔۔'' انہیں دھچکا لگا مگر وہ کہاں ایسے کھلے ہوئے کلر پہنتی تھیں۔ ایسے ہی رکھا تھا اب تک، آج اس نے وہی پریس کر دیا۔ زیادہ وقت نہیں تھا جلدی سے پہن کر وہ دوبارہ کچن میں آئیں اور چائے بنانے لگیں۔

''آہا۔۔۔ساری بہاریں تو کچن میں اتری ہوئی ہیں۔''

وحید احمد ایسے ہی اچانک کچن میں نمودار ہوا کرتے تھے۔ وہ کپ میں چائے انڈیلنے لگی تھیں۔ یہ بات سن کر کپ ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے ہی بچا۔

''چائے پی جا رہی ہے اور اکیلے اکیلے؟'' آگے بڑھ کر کپ کے بجائے ہاتھ پکڑ لیا۔

اسی پریشانی پر کسی نے ہاتھ رکھا تو چونک کر مڑا۔ دونیہ کو دیکھا تو جان میں جیسے جان آئی۔

''اوہ۔۔۔تم گڑیا۔۔۔ڈرا ہی دیا۔''

''چور ڈرپوک ہی ہوا کرتے ہیں۔'' دونیہ کا رنگ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ بگڑے۔

''آئندہ اگر آپ میری ماں کے آس پاس بھی دکھائی دیے تو آپ کی بیٹی کا راز فاش کر دوں گی۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''ثبوت کے ساتھ سب کو اس کا کارنامہ دکھاؤں گی۔ بالکل آپ پر گئی ہے، ایسی ہی بے غیرت اور بے حیا ہے۔''

دونیہ احترام بھول گئی تھی۔

''کک۔۔۔کیسا راز۔۔۔؟ تم بکواس کر رہی ہو۔'' بات بیٹی کی تھی، کیسے پسینے نہ چھوٹتے۔

''آپ کے سامنے مجھے کچھ نہیں کہنا، جب دنیا کو سناؤں گی تب سن لینا۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے۔ میرے باپ کا دیا کھاتے ہو اور اسی کی عزت روندتے ہو۔''

وحید کو چپ چاپ کچن سے نکلنا پڑا کہ دونیہ نے اس کی بیٹی کا نام جو لے لیا تھا اور یہ تو وہ بھی جانتے تھے اس کی بیٹی بہت بے باک اور آزادی کی دلدادہ تھی۔

نائلہ ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ دونیہ نے انہیں پانی پلایا اور بولی۔

''شک تو مجھے بہت پہلے سے تھا مگر اب آپ فکر نہ کریں، اگر اس شخص نے دوبارہ آپ سے بدتمیزی کی تو بتایئے گا مجھے۔ میں ابو کو اپنے کالج بلوا کر دکھاؤں گی کہ ستارہ کس طرح پیریڈ چھوڑ کر کالج سے چلی جاتی ہے۔ اس کی دوستی چند آوارہ قسم کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ہے۔ مجھے تو شک ہے وہ اسموکنگ بھی کرنے لگی ہے۔''

اس روز جو ہوا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، فرحت کے اتنے قریبی مہمان آئے اور ابو نہ خود کمرے سے نکلے نہ بیوی کو نکلنے دیا۔ سارا کام گھر کی باقی تین بہوؤں کو دیکھنا پڑا، جس کی وجہ سے ان کا موڈ خاصا خراب ہوا۔

دونیہ اور سونیا مہمانوں سے اچھے طریقے سے ملیں اور یہیں بیٹھی بھی رہیں، خاص کر دونیہ نہیں چاہتی تھی کہ فرحان اس کی غیر موجودگی سے کوئی مطلب اخذ کرے۔

پھر فرحت کی بہن نے فرحان کو اپنی بیٹی نیلی کے لیے مانگ لیا۔ فرحت اور رشید صاحب ان کی بیٹیاں نینو اور ہما پھولے نہیں سما رہے تھے، جبکہ وحید احمد اور ان کی بیوی کو سخت حسد محسوس ہو رہا تھا۔ چھوٹے چچا اور چچی تو خیر کسی کو کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ رسم کی تقریب ایک ماہ بعد رکھی گئی کہ فرحت کی بہن کو اب اپنی سسرالی عزیزوں سے ملنے اسلام آباد جانا تھا۔

''چلو اچھا ہے کچھ وقت مل گیا ہے۔ ہم بھی اکلوتے بیٹے کی منگنی کی رسم دھوم دھام سے کرنا چاہتے ہیں۔'' فرحت مسکرا کر کہہ رہی تھیں۔

''اے اتنے اہم موقع پر امجد موجود نہیں ہے۔ سونیا! باپ کو بلا۔'' دادی کو خیال آیا۔

سونیا نے جا کر یہ خبر والدین کو دی اور دادی کا پیغام بھی۔ نائلہ تو بیڈ سے اتر کر دوپٹا ٹھیک سے

اوڑھنے لگیں، لیکن امجد صاحب نے کہہ دیا جا کر کہہ دو سو رہا ہوں۔
مہمان رات کا کھانا کھا کر خاصے دیر سے گئے۔ صبح ناشتے پر اماں جان نے امجد صاحب کو یہ خوش خبری سنائی اور گلہ کیا۔
”اتنے اہم موقع پر تم موجود نہیں تھے۔ لگتا ہے بیوی کا اثر ہو گیا ہے۔ بھائی، بہنوں سے اب دور بھاگنے لگے ہو تم۔“
”اماں! میری کیا اوقات ہے اس گھر میں۔“ تلخی سے وہ کہہ ہی گئے۔
”ہائے بھائی جان! یہ کیا کہہ دیا آپ نے، ہم تو آپ کو اپنا سب کچھ مانتے ہیں، اس گھر کے سربراہ تو آپ ہی ہیں۔ ہاں فرحت بھابھی کی اڑانیں اب اونچی ہیں۔“ وحید کی بیگم بلقیس موقعہ بہ موقعہ ایسی باتیں کر جانے کی شروع سے عادت رکھتی تھیں۔
امجد صاحب خاموش ہی رہے۔ ندرت کا فون آ گیا۔ دادی موبائل کان سے لگا کر اونچی آواز میں باتیں کرنے لگیں، پھر شاید کچھ خاص بات تھی جو یہاں سے اٹھ کر چلی گئیں، تب بلقیس ادھر اُدھر دیکھ کر بولی۔
”ویسے امجد بھائی! یہ فرحت بھابھی اور رشید بھائی نے کچھ اچھا نہیں کیا، خاندان کی لڑکیاں چھوڑی ہیں امریکا کے لالچ میں، حالانکہ ہم سب نے ہمیشہ کتنی عزت دی ہے ان دونوں کو، فرحان کو تو اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر چاہا ہے لیکن کیا صلہ دیا ہے ان لوگوں نے ہمیں۔“
امجد صاحب بھی دل کی جلن کا اظہار کرنا ہی چاہتے تھے کہ نائلہ ناشتے کے ساتھ چلی آئیں۔
”اے بھابھی! ہمارا تو خیال تھا آپ لوگ دونیہ کی شادی فرحان سے کریں گے۔“ بلقیس اتنی جلدی بات سمیٹنا نہیں چاہ رہی تھی۔
”دونیہ کے لیے؟ کبھی نہیں، میں نے اور نائلہ نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔ ہماری بچیاں بہت ہونہار ہیں۔ بھلا فرحان جیسا لڑکا ان کے قابل ہے۔“
”اچھا، آپ پیار بھی تو بہت کرتے تھے فرحان سے، آپ نے جو توجہ فرحان پر دی کسی اور پر نہیں دی، کتنی مہنگی مہنگی ٹیوشن رکھوا کر دی ہیں آپ نے فرحان کو، اتنی توجہ تنویر پر دیتے تو کبھی مایوس نہ ہوتے۔“
”بچیاں کالج چلی گئی ہیں؟“ وہ بلقیس کی بات کو نظر انداز کرتے نائلہ بیگم سے پوچھنے لگے، جواب اثبات میں ملا تو ناشتے کی جانب متوجہ ہو گئے۔
”بھابھی نائلہ! وحید بھی تیار ہو چکے ہیں۔ ان کا ناشتا بھی لے آئیں اور میں چیز آملیٹ لوں گی۔“
”نائلہ بھابھی! آج ناشتے میں دیر کر دی، ماجد کا موڈ خراب ہو رہا ہے۔“ چھوٹی بھابھی عفت بھی آ گئیں۔
نائلہ خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ اسی وقت بھابھی فرحت، بھائی رشید اور ان کے تینوں بچے چلے آئے، خوش باش ہنستے مسکراتے۔
”چھوٹے چچا ہم تو اب امریکا جا رہے ہیں۔“ نینو نے کتنے فخر سے کہا تھا۔
”اچھی بات ہے۔ بہت مبارک ہو بھئی آپ سب کو۔“ انہوں نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر ناشتا

کرنے لگے۔
”امی! مجھے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔“
ہما، فرحت سے کہہ رہی تھی۔
”ہاں ہاں ناشتا کر لیں، چلتے ہیں پھر بازار۔“
”آج ناشتے میں بھی دیر ہو رہی ہے۔“ ساتھ ہی کوفت بھرے انداز میں وال کلاک کی جانب دیکھا۔ امجد کو نہ جانے کیا سوجھی چائے کا کپ اٹھایا اور یہاں سے اٹھ کر کچن میں آ گئے۔ نائلہ ملازمہ کے ساتھ بری طرح مصروف تھیں۔
”ناشتا کر لیا آپ نے۔“ انہیں یہاں دیکھ کر پوچھنے لگی۔
”ہاں تقریباً کر لیا ہے۔ تم ایسا کرو، اپنا ناشتا اور تھوڑا سا میرے لیے بھی کچھ لے کر کمرے میں آ جاؤ۔“
”اس وقت کیسے آسکتی ہوں، دیکھیں تو سہی کتنا کام پھیلا ہوا ہے۔“
”اس گھر میں تم اکیلی عورت نہیں ہو۔“
”پھر ملازمہ سے بولے۔ جاؤ جا کر کہہ دو، نائلہ بیگم کسی کام سے جا رہی ہیں، ناشتا یہ لوگ خود آ کر بنا لیں۔“
”اماں بہت خفا ہوں گی مجھ پر۔“
”ارے ہاں، اماں کا ناشتا ان کے کمرے میں دے آؤ کنیزن! چلو اب تم آ جاؤ۔“
انہیں شوہر کی بات ماننا ہی پڑی۔

❁ ❁ ❁

نائلہ کا صبح سب کو ناشتا کروانے کے بجائے اپنے کمرے میں چلے جانا گھر بھر کے لیے چونکا دینے والا واقعہ تھا اور بلقیس بیگم نے یہ کہہ کر اس قصے میں رنگ بھر دیا۔
”اصل میں نائلہ کو فرحان سے کچھ اور ہی امید تھی۔ وہ تو دونیہ کو اس سے بیاہنے کا خواب سجائے بیٹھی تھی۔ اب دکھ اور جلن کے باعث وہ ایسی حرکتیں کر رہی ہے۔“
”لو اور سنو، میرے ہیرے جیسے بیٹے کے لیے کیا دونیہ ہی رہ گئی ہے۔“ فرحت نے تنفر سے کہا۔
”ہمارا بھائی شہزادہ ہے شہزادہ۔“ ہما اور نینو بھی گردن اکڑا کر بولی تھی۔
فرحان وہیں بیٹھا مسکرائے جا رہا تھا۔ جیسے تیسے ناشتا ہوا، پھر رشید احمد کی فیملی تو شاپنگ کے لیے نکل گئی۔ ایک ماہ بعد منگنی کی رسم تھی اور اس کے لیے انہیں خوب تیاریاں کرنا تھیں۔
ان کی واپسی رات کو نو بجے کے قریب ہوئی، لدے پھندے آئے اور سیدھا اپنے کمروں میں جانا چاہتے تھے، مگر دادی نے بلوا لیا، تو بادل ناخواستہ ہال میں چلے آئے۔
”ایک تو اس گھر میں پرائیویسی نام کی کوئی چیز نہیں، اب ہر چیز کھول کھال کر سب دیکھیں گے ندیدے لوگ۔“ فرحت بڑبڑا رہی تھیں۔
یہاں پر امجد صاحب، نائلہ بیگم اور ان کی دونوں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔

"یہ دیکھو میں نے اپنے لیے لیا ہے۔" ہما بطور خاص دونیہ کو اپنا سوٹ دکھا رہی تھی اور ان کی ساری فیملی کی نظریں دونیہ پر تھیں کہ صبح بلقیس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی۔

دونیہ نے مسکرا کر ان کی لائی چیزوں کو دیکھا، پھر ہنس کر سونیا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"چلو اسی بہانے فرحان صاحب بھی اہم ہو گئے اور امریکا پہنچ کر تو اور بھی ٹور شور ہو جائے گی، یہاں رہتے تو کس نے گھاس ڈالنی تھی۔"

سونیا بھی ہنسنے لگی اور آج تو اس ہنسی میں ستارہ بھی شریک ہو گئی کہ فرحان کے اس اقدام پر دل تو اس کا بھی خاک ہوا تھا۔

"کیا مطلب ہے۔ میرا بیٹا کیا کم ہے کسی سے۔" فرحت کو دونیہ کا یوں کہنا برا لگا۔ کچھ یہ کہ وہ تو دونیہ کے کچھ اور ہی تاثرات دیکھنا چاہتی تھیں، اس کا یوں کہہ دینا عجیب محسوس ہوا۔

"میرا مطلب ہے جو ان کی قابلیت ہے اس کے ساتھ تو پھر۔۔۔"

"ہاں بھابھی! دونیہ ٹھیک کہتی ہے۔ اچھا فیصلہ کیا آپ نے فرحان کے لیے۔ پڑھنے کا اسے کبھی شوق نہیں رہا۔ ہنر بھی کوئی نہیں اس کے ہاتھ میں۔ وہاں پر آپ کی بہن کی فیملی عرصے سے مقیم ہے۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ تو بندوبست کر ہی لیں گے اس کے لیے۔"

امجد صاحب نے بھی پورے اعتماد کے ساتھ بیٹی کی بات کو آگے بڑھایا تھا۔

"اے بھیا! سچ کہتی ہوں۔ ساری عمر بس جیسے تیسے گزر گئی۔ اب بچہ باہر چلا جائے تو دن پھر جائیں گے، لیکن اس کی شادی کے لیے خرچ کی رقم نہیں ہے ہمارے پاس۔ پہلے بھی تم نے ہی اسے بیٹا سمجھ کر لاڈ اٹھائے ہیں۔ اب بھی سب تم ہی کرو گے۔"

فرحت کی بات پر آج پہلی مرتبہ امجد صاحب کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ جواب میں کچھ بول ہی نہیں سکے۔ ان سے پہلے اماں جان کہنے لگیں۔

"ہاں ہاں کرے گا کیوں نہیں۔ کیا فرض نہیں بنتا اس کا۔ تم فکر ہی نہ کرو۔ ہم شان سے اپنا فرحان بیاہیں گے۔ پہلا پہلا پوتا ہے میرا اور بہت ہی پیارا ہے یہ مجھے۔"

"ابو! ہم بھی فرحان بھائی کے فنکشن کے لیے اپنی شاپنگ کریں گے۔" دونیہ کہہ رہی تھی۔

"ابھی مصروف ہوں میں اور پھر پورا مہینہ پڑا ہے۔ جلدی کس بات کی ہے۔" امجد صاحب چاہتے ہوئے بھی مسکرا نہیں پائے اور دونیہ سے اتنا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کچھ ہوش کے ناخن لے لڑکی! پہلے ہی تیرے باپ پر بڑا بوجھ ہے۔ ابھی دو مہینے پہلے تم نے کالج کے فنکشن کے لیے کپڑے سلوائے تھے، بھلا وہ کیا ہوئے؟"

دادی دونیہ کو ڈانٹنے لگیں۔ امجد صاحب خاموشی سے آگے بڑھ گئے، سر میں اچانک ہی درد اٹھنے لگا تھا۔

❁ ❁ ❁

"نائلہ! تمہارے بھی تو بھائی، صاحبِ اولاد ہیں۔ کیا ان میں سے کسی کا بیٹا ہماری دونیہ کے جوڑ کا نہیں ہے؟"

امجد صاحب آج کل سوچوں میں الجھے رہتے تھے اور ایسے ہی ایک روز انہوں نے نائلہ سے یہ بات کر کے انہیں حیران کر دیا کہ اماں جان نے تو ہمیشہ نائلہ کے والدین کا مذاق اور حقارت کے انداز میں ہی ذکر کیا تھا۔

"ایسی بات تو میں نے کبھی سوچی ہی نہیں، پھر میکے جاتی بھی تو کم ہوں۔ وہاں باقی سب بہن بھائی ملتے جلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے بچوں کے رشتے بھی طے کر چکے ہوں۔"

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے، کچھ دیر کے بعد بولے۔

"جوائنٹ فیملی سسٹم کو جس حد تک ہم لوگ لے جاتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ اب دیکھو نا میرے بھائی بال بچے دار تھے تو ان کی فیملی ان کی ذمہ داری تھی اور بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد ہمارا ایک ساتھ رہنا مذہبی رو سے بھی غلط تھا۔ اب میں جس سے بھی دونیہ کے رشتے کی بات کرتا ہوں۔ وہ عجیب سی نظروں سے دیکھ کر کہتا ہے آپ کے تو اپنے گھر میں لڑکے موجود ہیں۔ کیا آپ کے کسی بھائی نے آپ کی لڑکیوں کا رشتہ نہیں لیا۔ انداز ایسا ہوتا ہے جیسے کمی ہماری بیٹیوں میں ہے۔"

"اسلام میں کزن کا رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا تو جیٹھ سے پردے کا بھی حکم ہے۔"

نائلہ بیگم کا انداز کچھ جتانے والا تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں آج بات بیٹیوں کی آئی تو انہیں خیال آیا تھا جبکہ بیوی کی مشکل کو انہوں نے کبھی نہیں سمجھا۔ وہ گھر میں خود کو محفوظ نہیں سمجھتی تھیں، انہوں نے کبھی میک اپ نہیں کیا۔ شوخ کلر کے کپڑے نہیں پہنے اور امجد صاحب نے اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

❁ ❁ ❁

دونیہ کی دوست اجالا کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ اس نے دونیہ کے ساتھ ساتھ سونیا اور نائلہ بیگم کو بھی انوائٹ کیا تھا کہ جانتی تھی لڑکیاں اکیلی تو شامل نہیں ہو سکیں گی۔ لیکن نائلہ بیگم کو جانے میں الجھن تھی۔ وہ کہاں گھر سے باہر نکلتی تھیں اور اب اتنے برسوں کے بعد ملنا ملانا سب بھول ہی چکی تھیں، لیکن امجد صاحب نے کہا۔

"تم بچیوں کے ساتھ ضرور چلی جانا اور اچھا سا گفٹ بھی لے جانا۔" تو انہیں ہامی بھرنا ہی پڑی۔

"کتنی پیاری سی امی ہیں تمہاری۔" روبی نے ان سے ملتے ہی کہا تھا۔

"ہاں ہم دونوں بہنیں اپنی امی پر ہی تو گئی ہیں۔" دونیہ جھٹ سے بولی۔

"خوش فہمی!" حمنہ نے کہا اور دونیہ، سونیا ہنسنے لگیں۔ آج مہندی کی رسم تھی، کتنی رونق تھی یہاں۔

اجالا ان دونوں کو بھی ڈھولک کے گرد بیٹھنے والی لڑکیوں کے درمیان لے آئی۔

"ہمیں نہ ڈھولک بجانی آتی ہے نہ گانا آتا ہے۔" دونیہ نے پہلے ہی بتا دینا ضروری سمجھا۔

"تو ہم کون سا میراثیوں کے خاندان سے ہیں۔ سب ہی تمہارے جیسے ہی ہیں ایک عالی کے سوا" اجالا نے ڈھولک پر قبضہ جمائے بیٹھے لڑکے کی جانب اشارہ کیا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں میراثی ہوں۔" وہ جیسے برا مان گیا۔ اجالا نے شانے اچکائے۔

"بھول رہی ہو لڑکی تمہارا ماموں زاد اور مستقبل کا دیور ہوتا ہوں، تمہیں ہمارے گھر ہی آنا ہے اور

ہمیں یہ نام دو گی تو میراثیوں کی بہو کہلاؤ گی۔'' وہاں موجود لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

''تمہارے وہ کہاں ہیں؟'' دونیہ نے چپکے سے پوچھا۔

''وہ بے چارے آج پہنچ نہیں سکے۔ مصروف بندے ہیں نا فلائٹ مس ہو گئی، کل آئیں گے۔''

''وہ ادھر اجالا کی ہونے والی ساس اور اکلوتی نند بیٹھی ہیں۔'' حمنہ اور روبی ان سے پہلے آئی تھیں، سب سے تعارف حاصل کر چکی تھیں۔

اجالا کی امی تو مصروف تھیں، حمنہ کی امی آئی تھیں، جبکہ روبی کے ساتھ اس کی آپی آئی تھیں۔ اجالا نے ان دونوں کو نائلہ کے ساتھ بٹھا دیا۔

اتنی رونق، چہل پہل تھی، قہقہے، اوٹ پٹانگ گیت اور بات بات پر جھگڑا۔

''آپ کیا صرف ہنسنے کے لیے آئی ہیں۔'' عالی کی باتوں پر ہر کوئی ہنس رہا تھا لیکن نوٹ وہ شاید دونیہ کو ہی کر رہا تھا۔

''مم۔۔۔میں۔۔۔نہیں تو۔'' وہ سٹپٹا کر بولی۔ قہقہہ پڑا تو پزل ہونے لگی۔

''کوئی گانا ہی سنا دیں۔''

''مجھے نہیں آتا۔'' وہ اِدھر اُدھر سہیلیوں کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی۔

''اچھا چلیں۔ پوئم سنا دیں، وہ تو آتی ہے نا۔''

اس نے اٹھ جانا چاہا، تو سب اس کے انداز میں ''پانچ چوہے گھر سے نکلے کرنے کو شکار'' گانے لگے۔

اتنے میں لڑکے والوں کا شور اٹھا۔ اجالا نے عجلت میں پھولوں کی تھالیاں اور ہار سب لڑکے، لڑکیوں کو پکڑا دیے اور سب ہی قطار کی صورت میں گیٹ کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ اس کی ساری توجہ بھی آنے والوں کی جانب تھی۔ دھیان ہی نہیں دیا برابر میں کون کھڑا ہے۔ وہ تو جب بلیک سوٹ والی لمبی ہیل پر سوار ان کے قریب سے گزری اور عالی نے کہا۔

''صدقے جاواں۔ لڑکی چل رہی ہے یا ڈاچی۔'' تو اس نے چونک کر دیکھا اور گھبرا کر پرے ہٹی کہ مووی بھی تو بن رہی تھی۔

گانوں کا مقابلہ شروع ہوا تو وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آ کر نشستوں پر بیٹھ گئی پھر رسم کا آغاز ہوا۔ دلہن کو مہندی لگائی گئی، اور عالی نے قریب کھڑی اجالا اور دوسری لڑکیوں سے کچھ کہا۔ اب ہونے یہ لگا کہ جو خاتون دلہن کے ہاتھ پر شگن کی مہندی رکھ کر جاتی عالی اور شریر ٹولی مٹھائی اٹھا کر دولہا کی اماں اور بہنوں کی جانب لپکتی۔

''مبارک ہو آپ کو بہت بہت۔'' ساتھ ہی مٹھائی ان کے لبوں سے یوں لگائی جاتی کہ منہ کھولتے ہی بنتی۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے مٹھائی کھلا کھلا کر انہیں نڈھال کر دیا۔

''دونیہ! پتا تو کرو تمہارے پاپا نے ٹائم تو یہی دیا تھا۔ وہ یقیناً گیٹ پر موجود ہوں گے۔'' جب وہ رسموں کو پوری طرح انجوائے کر رہی تھی نائلہ بیگم نے آ کر کہا۔

''امی! سیل ہے نا میرے پاس، ابو اگر آ جاتے تو ضرور بیل دیتے۔''

پھر کھانا بھی لگ گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر حمنہ اور روبی ان کے علاوہ دوسرے ملنے والے بھی چلے گئے تب امجد صاحب کا فون آیا۔

''اماں جان ندرت کے ہاں آئی ہوئی ہیں۔ میں ہی لے کر آیا ہوں۔ کچھ دیر ہو جائے گی۔''

''کمال ہے، اس وقت اماں جان کو ندرت کے ہاں جانے کی کیا سوجھی اور انہیں کچھ احساس نہیں ہم پرائے گھر میں بیٹھے ہیں۔''

نائلہ بیگم پریشان ہونے لگیں۔ عالی نے پریشانی بھانپ لی، قریب آ کر پوچھا۔ اب ایک اجنبی لڑکے کو وہ کیا بتاتیں اتنی دیر میں اجالا اور اس کی امی بھی چلیں آئیں۔ صورت حال علم میں آئی تو عالی سے گاڑی نکالنے کو کہا۔

''آپ لوگ کیوں زحمت کرتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کچھ دیر میں آتا ہوں۔''

''آپ کا اپنا گھر ہے جب تک چاہیں ٹھہریں، میں تو آپ کی پریشانی کے خیال سے کہہ رہی ہوں بہن۔''

اجالا کی امی نے کہا، اتنے میں عالی نے بتایا گاڑی گیٹ پر کھڑی ہے اور یہ لوگ کل آنے کا وعدہ کر کے گاڑی میں آ بیٹھیں۔

راستے میں عالی بات سے بات نکالتا رہا۔ سونیا بے اختیار ہی آواز میں ہنسنے لگتی، تب برابر میں بیٹھی دونیہ اسے ٹہوکا دیتی اور گھور کر دیکھتی تو وہ ایک دم سے چپ ہو جاتی۔

اچھا ہوا جو یہ لوگ عالی کے ساتھ آ گئیں، ابا اور اماں جان کی واپسی تو بہت دیر میں ہوئی۔

''خیریت تو تھی نا؟'' نائلہ پوچھ رہی تھیں، وہ اثبات میں سر ہلا کر صوفے پر بیٹھ کر شرٹ کے بٹن کھولنے لگے۔

''بہت تھک گیا ہوں آج، صبح ہونے میں بھی تھوڑی دیر ہے جبکہ میں تو لمبی تان کے سونا چاہتا ہوں۔''

''صبح آفس لیٹ چلے جائے گا، اب آرام سے سو جائیں۔''

''پتا ہے اماں جان کو اچانک کیوں جانا پڑا، ندرت کی بیٹی بینا کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آ رہے تھے، لڑکا آسٹریلیا میں ہوتا ہے آج کل آیا ہوا ہے ہمارے بہنوئی صاحب کے رشتہ داروں میں سے ہیں۔ ندرت نے بلوایا تھا اماں کو اور وہ ساتھ مجھے بھی لے گئیں یہ کہہ کر کہ اپنے کاروبار کے بارے میں بتانا، لڑکے والوں پر ذرا رعب پڑ جائے گا۔''

''اچھا ہو گئی بینا کی بات پکی؟'' نائلہ نے پوچھا۔

''ابھی تو وہ لڑکی کو دیکھنے آئے تھے، لیکن لگ رہا تھا رشتہ پکا ہو جائے گا۔''

پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''بینا ہماری دونیہ سے چھوٹی ہے نا؟''

نائلہ نے اثبات میں جواب دیا تو کسی سوچ میں کھو گئے۔

۞ ۞ ۞

اجالا کی بہن کی شادی کے روز بھی خوب گہما گہمی تھی۔ دولہا پر خوب فقرے اچھالے جا رہے تھے،

دولہا کے دفاع کے لیے اس کی بہنیں اسٹیج پر چڑھیں تو عالی نے کہا۔

"حاضرین! اس مبارک موقع پر منہ میٹھا نہ کرایا جائے تو خوشی ادھوری رہ جاتی ہے۔"

پھر جونہی یہ لوگ مٹھائی کی پلیٹیں لے کر اسٹیج کی جانب بڑھیں انہیں کل والی درگت یاد آ گئی، وہ لوگ اسٹیج سے بھاگ گئیں، آج دولہا کو خوب خوب مٹھائی کھلائی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

اس روز وہ دس بجے کے قریب امجد صاحب کے ساتھ گھر آئیں۔

تینوں آج کی تقریب کی باتیں کر کے ہنستی بولتی رہیں جبکہ امجد صاحب بالکل خاموش تھے۔ گھر آئے تو اماں جان کا موڈ بگڑا ہوا تھا، امجد صاحب کے لیے پیغام تھا۔

"فوراً میرے کمرے میں آؤ۔"

وہ ملازمہ سے اماں کا پیغام سن کر ان کے کمرے کی جانب بڑھے تو کچھ سوچ کر دونیہ بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔

"جی اماں جان! بلوایا تھا۔" وہ تھکے تھکے سے ان کے برابر بیٹھ گئے۔ اس وقت کمرے میں اماں جان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ دونیہ اندر آئی، لیکن دروازے کے قریب ہی رک گئی۔

"آ گئے بیگار کاٹ کر؟" اماں جان نے ابرو چڑھا کر کہا۔

"کیا مطلب اماں جی! میں سمجھا نہیں۔"

"تم سمجھو گے بھی کیوں، پہلے بیوی تھی، اب بیٹیاں بھی ہیں بے وقوف بنانے کو۔ ارے غضب خدا کا۔ بیٹی کی سہیلی کی بہن کا بیاہ ہے اور ادھر آفت آ رہی ہے۔ کبھی مہندی کی تیاری، کبھی شادی میں شرکت اور تحفہ بھی تو دیا گیا ہے۔ کچھ عقل سے کام لو امجد! بیٹیاں سر پر چڑھی جا رہی ہیں اور تم منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہو۔"

"میری بیٹی کی دوست بہت اچھی فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ انہوں نے ہم سب کو انوائٹ کیا تھا، ملا ہوں اس کے فادر سے۔"

"سب کو، کیا مطلب ہے تمہارا، کیا اب تم تمہاری بیوی اور بیٹیاں ہم سے الگ ہیں؟ اگر نہیں تو پھر تم نے انہیں بتایا کیوں نہیں کہ اس گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں۔"

وہ ماں کے سامنے کبھی بولے ہی نہیں تھے، سو آج بھی بول نہ سکے، لیکن دونیہ آگے بڑھی اور بولی۔

"دادو! آپ ابّا کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔ جب تایا اور تائی اماں نے فرحان بھائی کا رشتہ طے کیا تب کسی نے ابا کو شریک بھی نہیں کیا تھا۔"

"تم ہی ہو فساد کی جڑ، میرے اتنے نیک فرماں بردار بچے کو بھڑکانے والی، میں بتائے دے رہی ہوں۔ آپے میں رہو، پر کاٹ دوں گی تمہارے۔"

"میں بہت تھکا ہوا ہوں اماں جی! آپ نے جس بات کے لیے بلایا تھا کہہ دیجیے آرام کرنا ہے مجھے۔"

"جب سارا دن گدھے کی طرح ہانکے جاؤ گے تھکن تو ہوگی، خیر میں نے اس لیے بلایا تھا تمہارا بڑا

بھائی رشید اور بھابھی تم سے خوش نہیں ہیں۔ تمہارے رویے نے بہت دکھی کیا ہے انہیں۔"

یہ بات سن کندھوں پر ایک دم سے بوجھ آ پڑا، وہ صرف سوالیہ انداز میں ماں کو دیکھ کر رہ گئے۔

"فنکشن ہے فرحان کا، اس گھر کی پہلی پہلی خوشی اور تو نے بھائی سے پوچھا ہی نہیں، اسے کچھ پیسوں کی ضرورت تو نہیں ہے؟ یہ تیرا فرض نہیں بنتا، سب بھول گیا ہے تو؟"

"میں پریشان ہوں۔ آج کل ہاتھ تنگ ہے میرا۔" انہوں نے دھیرے سے کہا تھا، حالانکہ وہ اس وقت بہت کچھ کہہ دینا چاہتے تھے، مگر کہہ ہی نہیں سکے۔

"بہت ملنے والے ہیں تمہارے۔ بڑے بڑے لوگوں سے جان پہچان ہے، قرض اٹھا سکتے ہو۔"

"اماں! اب قرض اتارنے کی سکت نہیں ہے۔"

"گھبراتے کیوں ہو، کیوں دل چھوٹا پڑ رہا ہے، فرحان امریکا پہنچ کر پائی پائی لوٹا دے گا۔"

"کیا کیا لوٹائے گا اماں وہ مجھے؟" ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اماں ایک دم سے چپ سی ہو گئیں اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

***

آنے والے دنوں میں بڑے تایا کی فیملی ان لوگوں سے واضح طور پر کھنچی کھنچی رہی، دونیہ اور سونیا نے تو کیا اثر لینا تھا۔ ہاں امجد صاحب خاموشی سے یہ سب سہہ رہے تھے۔

فرحان کے فنکشن میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ اس وقت ندرت بھی آئی ہوئی تھی تو سب رات کا کھانا بڑے کمرے میں کھا رہے تھے۔ تایا ابا کے موبائل کی مخصوص ٹون بولی تو انہوں نے اسکرین پر جگمگاتے نمبر کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے اعلان کیا۔

"اسلام آباد سے نجمہ (فرحت کی بہن) کا فون ہے۔" اور موبائل کان سے لگا کر "ہاں بھئی نجمہ کیا حال ہے اور ہماری نیلی کیسی ہے؟ کیا۔۔۔؟" پھر نجمہ کی بات سننے لگے، پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی۔ مسکراہٹ بھی غائب ہوئی اور چہرے کا رنگ بھی بدلا۔

"کیا کہہ رہی ہو۔ یہ کیا بکواس ہے، اتنی چھوٹ دے رکھی ہے بیٹی کو۔ ایک ہفتہ رہ گیا ہے فنکشن میں۔ ہماری ساری تیاری مکمل ہے، ہال تک بک کرا لیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے، تمہیں کچھ احساس ہی نہیں، جانتی نہیں ہو تم ماں، بیٹی مجھے۔"

وہ سخت طیش کے عالم میں چلا رہے تھے، سب ہی ان کی طرف دیکھ رہے تھے، فرحت نے اٹھ کر موبائل ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کیا تاریخ آگے بڑھانے کو کہہ رہی ہے؟ اسلام آباد جا کر بیٹھ ہی گئی ہے، بھئی صاف کہہ دو ہم تو اسی تاریخ کو تقریب کریں گے، آخر سارے مہمانوں کو کارڈ بٹ چکے ہیں۔"

اماں بولے جا رہی تھیں۔ رشید صاحب جواب میں کچھ نہیں کہہ رہے تھے، پھر فرحت نے موبائل پٹخا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی رشید صاحب اور ان کے تینوں بچے بھی کمرے سے نکل گئے، حالانکہ یہاں سب منتظر بیٹھے تھے۔

"فرحت کی یہ چھوٹی بہن نجمہ ہے تو میری بھانجی، میں اس کی تیز اور نخریلی طبیعت کو شروع سے ہی

ناپسند کرتی ہوں۔ امریکا جا کر تو مزاج آسمان پر پہنچ گیا ہے، اسے یہ بھی خیال نہیں آیا، لڑکے والوں سے سر جھکا کر بات کی جاتی ہے، اپنی مرضی ان پر ٹھونسی نہیں جاتی۔"

"اماں! اب کہاں کے لڑکے والے، وہی ڈٹ کر بات کرتا ہے جو زیادہ پیسے والا ہوتا ہے، نجمہ بھی جانتی ہے فرحان امریکا جانے کے لیے اس کی ہر بات بنا چوں چرا کے مان جائے گا۔"

چھوٹے چچا ماجد نے طنزیہ انداز میں تبصرہ کیا اور بیگم مزید شہ دیتی رہیں۔

یہ انتظار میں رہے کہ ابھی رشید یا فرحت آ کر انہیں بھی اصل بات سے آگاہ کریں گے، مگر وہ نہیں آئے تو سب کو رات گئے اپنے اپنے کمروں میں آنا پڑا۔

صبح اتوار تھا۔ سب ہی دیر سے اٹھے، سوائے نائلہ بیگم کے کہ انہیں ناشتے کی تیاری کرنا تھی۔ اور ناشتے کی ٹیبل پر ہی انکشاف ہوا نجمہ نے فرحان کے رشتے کے لیے معذرت کر لی ہے، اصل میں نیلی کو اسلام آباد میں اپنا پھپھو زاد بھا گیا تھا۔

"اچھا ہی ہوا جان چھوٹی ایسی بے حیا لڑکی کے ساتھ میرا فرحان گزارا نہیں کر سکتا تھا۔"

یہ فرحت تھیں جو مکمل لاپروائی سے کہہ رہی تھیں۔

"تو اور کیا اماں جان! وہ تو بس مروّت میں ہم نجمہ کو انکار نہیں کر سکے تھے، ورنہ نیلی پسند نہیں تھی ہمیں۔"

رشید نے کہا اور دونیہ نے دل ہی دل میں داد دی۔ کیسے تھے یہ لوگ کل تک مارے خوشی اور غرور کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے اور یوں بات کر رہے تھے جیسے نجمہ نے گن پوائنٹ پر یہ رشتہ کروایا تھا۔

"کارڈ تو بٹ چکے ہیں، اب رشتہ داروں اور ملنے والوں کو منع کرنا عجیب سا لگتا ہے، ہم تو سوچ رہے یہ فنکشن ضرور ہونا چاہیے، کیوں امجد! تمہاری کیا رائے ہے؟"

رشید صاحب جس طرح مسکرا کر یہ بات کر رہے تھے اور جو انداز تھا دونیہ اور اس کے ساتھ سب ہی ٹھٹک گئے۔ امجد صاحب کو ایسی بے چینی سی محسوس ہوئی کہ جواب میں کچھ کہہ ہی نہ سکے۔

"تم نے بتایا نہیں کیا رائے ہے تمہاری؟" امجد صاحب خاموشی سے ناشتا کرنے لگے تو رشید صاحب نے دوبارہ پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، جیسے آپ کی مرضی۔" ان کا انداز سادہ سا تھا، مگر فرحت اور رشید ہنسنے لگے۔

"اوہو تو گویا تمہیں کوئی اعتراض نہیں، سب ہمارے ہاتھ میں دیتے ہو۔"

"ابھی سب لوگ آرام سے ناشتا کریں، یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

وحید جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے اور اسے ٹالنے کو تیزی سے بولے تھے۔

"ہاں بھئی اب تو آپ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش نہ کریں۔ فیصلہ سوچ سمجھ کر اور اماں جان کی رائے سے کریں۔"

بلقیس نے بھی میاں کی بات کو آگے بڑھایا۔ کچھ سوچ کر رشید صاحب اور فرحت خاموش ہو گئے۔

امجد صاحب کے دانت میں رات سے کچھ تکلیف تھی۔ وہ تو ہلکا پھلکا ناشتا کر کے دوا لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چھوٹے ماجد اور ان کی بیگم کو شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ وہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ نکل گئے۔ اماں جان کے کمرے میں ہونے والی میٹنگ میں رشید، فرحت، وحید اور ان کی بیوی بلقیس ہی موجود تھے۔ ابھی یہ اجلاس جاری تھا کہ بڑی پھپھو عطرت اپنی فیملی کے ساتھ چلی آئیں، جو کچھ یہاں آ کر انہوں نے سنا، پسند نہیں آیا۔

"میں صاف کہہ دیتی ہوں اماں! دونیہ کو میں اپنی بہو بنانے کا ارادہ رکھتی ہوں، اس کی طرف تو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔"

"لیکن تمہارا احسن تو دونیہ سے چھوٹا ہے۔" فرحت نے یاد دلایا۔

"چند سالوں کے فرق سے کچھ نہیں ہو جاتا۔ اپنوں میں یہ باتیں کب دیکھی جاتی ہیں۔ بس دونیہ کی اب کوئی بات نہیں کرے گا۔"

اور اماں جان بیٹی کی مخالفت کیسے کر سکتی تھیں، بولیں۔

"اے ہاں میں تو بھول رہی تھی۔ عطرت کئی بار تو ذکر کر چکی ہے مجھ سے اپنی اس خواہش کا، میں چپ تھی کہ وقت آنے پر ہی سب کو بتاؤں گی۔"

"چلو پھر ہم سونیا کا رشتہ لے لیتے ہیں۔" رشید نے ماں اور بہن کو ایک ساتھ ہوتے دیکھا تو بولے۔

"سونیا تو میرے تنویر کی دلہن بنے گی۔"

بلقیس نے ان کی بات سنتے ہی کہا اور وحید زور و شور سے اثبات میں سر ہلا کر بولے۔

"ہاں ہاں، یہ بات تو میں نے بہت پہلے امجد کے کان میں ڈال دی تھی۔ بس ہم دونوں بھائی مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں، پھر اعلان بھی کر دیں گے۔"

اب کے رشید اور فرحت تلملا کر رہ گئے، وہ تو یہ سوچے بیٹھے تھے نیلی ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہوا دونیہ تو موجود ہے اور سودا یہ بھی گھاٹے کا نہیں، امجد صاحب کا جو کچھ ہے بیٹیوں کا ہی تو ہے۔

رشید تو شکست کے احساس میں گھر کر یہیں بیٹھے رہے، فرحت اٹھیں اور امجد صاحب کے کمرے میں آ گئیں۔ نائلہ بیگم اس وقت کچن میں تھیں، امجد صاحب، بھابھی کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے، کچھ دیر حال احوال پوچھنے کے بعد وہ اصل بات پر آ گئیں بولیں۔

"بھیا! ہوشیار رہنا تمہاری دولت پر سب کی نظر ہے۔ ہم دونیہ کو اپنی بیٹی بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں، لیکن عطرت سے یہ برداشت نہیں ہو رہا۔ وہ چاہتی ہے بھائی کا کاروبار اس کے بیٹے کے نام لگے۔ خوامخواہ ضد کر رہی ہے اور اماں جان بھی بیٹی کی ہم نوا بن گئی ہیں۔ یہ جوڑ کسی طرح مناسب نہیں اور پھر دونیہ اور فرحان اکٹھے پلے بڑھے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں آپس میں تایا، چچا کی اولاد ہیں، یہ احسن، عطرت کا بیٹا ہے، لیکن خون تو ایک غیر خاندان کا ہے نا۔"

ان ساری باتوں کے جواب میں انہوں نے صرف اتنا کہا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں سونا چاہتا ہوں۔"

''ہاں ہاں سوجانا، میں تو صرف تمہیں چوکنا کرنا چاہتی تھی، اب کسی کی جذباتی بلیک میلنگ میں مت آنا۔ یہ بچی کی زندگی کا فیصلہ ہے۔''

❁ ❁ ❁

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اماں جان کا پیغام ملا، وہ بلا رہی تھیں۔ ان کے پاس گئے تو کمرے میں عطرت بھی موجود تھیں۔ بڑی ہی محبت سے ملیں، اپنے برابر بٹھایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر کچھ دیر بعد بولیں۔

''بزنس کیسا جا رہا ہے تمہارا؟''

''کیسا بزنس۔ کہاں کا بزنس؟ سب خسارے میں ہے، میں تو بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔'' انہوں نے مصلحتاً جھوٹ بولا تھا۔

''کیا واقعی؟'' وہ بے یقین تھیں۔

''اب کیا جھوٹ بولوں گا میں۔''

''نہیں نہیں، ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے، پرسُن کر جی کو دھچکا سا لگا ہے۔ دو بیٹیوں کا ساتھ ہے۔ اس پر ایسے حالات، کیا بنے گا تمہارا۔''

''اب تو جو بھی آئے گا اسے بس تن کے کپڑوں میں ہی میری بچیوں کو لے جانا ہوگا، کچھ نہیں ہے میرے ہاتھ میں۔''

''آئے ہائے نوبت یہاں تک آ گئی ہے تم نے بتایا تک نہیں۔ میں بھی کہوں آج کل اتنے گم صم کیوں رہتے ہو، ہائے کیسے چلے گی گھر کی گاڑی۔ کتنے ہی تو فرض ابھی ادا ہونے والے باقی ہیں۔''

اماں جان بہت پریشان ہو کر کہہ رہی تھیں۔ انہیں پریشان کرنا امجد کو اچھا تو نہیں لگا، مگر مجبوری تھی۔

''وہ رشید بھائی اور فرحت بھابھی فرحان کے لیے ارادہ تو رکھتے ہیں۔ ان سے کہیں اماں کہ وہ دونیہ کا رشتہ لے لیں۔ امجد کا کچھ بوجھ تو ہلکا ہوگا۔''

عطرت کے خیالات میں فوراً تبدیلی آ گئی تھی۔ امجد صاحب کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''نہیں۔ وہ نہیں مانیں گے۔ وہ فرحان کو کسی پیسے والے گھر میں بیاہنا چاہتے ہیں۔'' اماں جان نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اوہو اماں! آپ بات تو کر کے دیکھیے۔'' عطرت نے دباؤ ڈالا تو انہوں نے نیم رضامندی سے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر بھائی سے بولیں۔

''ابھی لڑکیوں کی عمر ہی کیا ہے۔ اپنے وقت پر سب کچھ ہو جائے گا۔ تم پوری توجہ اپنے کاروبار کی طرف دو۔ اتنی مہنگائی ہو رہی ہے، گھر کیسے چلے گا۔''

''ٹھیک ہے اماں! آپ فکر مت کریں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''امجد کا بزنس گھاٹے میں جا رہا ہے۔'' تھوڑی دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، ہر کوئی ان سے استفسار کر رہا تھا، وہ سب کو جواب دیتے تنگ آ گئے تھے مگر ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ مالک ہے۔''

یہ بات صرف نائلہ بیگم نے کہی تھی اور دل سے جیسے ہر ملال چھٹ گیا تھا۔

''ہاں ابو! اب تو میں اور سونیا اس قابل ہیں کہ پڑھائی کا خرچ ٹیوشن پڑھا کر پورا کر سکتے ہیں اور اگر زیادہ مسئلہ بنا تو میں پڑھائی چھوڑ کر جاب کر لوں گی۔ آپ ٹینشن مت لیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، ہمیں بس آپ کی صحت عزیز ہے۔''

ایسا کہنے والی دونیہ تھی، وہ آسودگی سے مسکرائے اور بولے۔

''جس کے پاس اتنی بے لوث محبتیں ہوں۔ وہ بھلا کہاں سے غریب کہلائے گا۔ تم لوگ میرے ساتھ ہو۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

''ابو اگر آپ پسند کریں تو میں شام میں آپ کے آفس آ جایا کروں۔ کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لوں گی۔'' دونیہ نے جھجکتے ہوئے کہا تھا، لیکن وہ تو بہت خوش ہو گئے، بولے۔

''ارے یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔ کالج سے میں تمہیں پک کر لوں گا۔ لنچ دونوں باپ، بیٹی آفس میں کریں گے، باقی ایک دو گھنٹے تم وہاں پر ہی گزارنا اور چار بجے کے قریب ہم اکٹھے گھر آ جایا کریں گے۔''

''تھینک یو ابو! تھینک یو سو مچ۔'' وہ بے حد خوش تھی اور اس نے پتا نہیں کیا سوچ کر یہ خبر گھر بھر میں نشر بھی کر دی۔

❁ ❁ ❁

''تمہارا چچا امجد اپنی بیٹی کو آفس لے کر جا رہا ہے، تم بھی اس کے آفس چلے جایا کرو، آخر پتا تو چلے بزنس کی صورت حال کتنی خراب ہے۔''

رشید نے فرحان سے کہا تھا تو فرحت بھی جھٹ سے بولیں۔

''تمہارے ابا بالکل ٹھیک کہتے ہیں آخر یہ سب تمہیں سنبھالنا ہے۔ مجھے دونیہ کے آفس جانے والی بات بالکل پسند نہیں آئی، لڑکی خود مختار ہو جائے گی تو ہم لوگوں کے لیے مشکل بن جائے گی، مجھے منہ زور بہو نہیں چاہیے۔''

''اوہو امی! پہلے پتا تو چلے امجد چچا کے پاس اب ہے کیا، اگر وہ کنگال ہو چکے ہیں تو پھر میں ہرگز یہاں شادی نہیں کروں گا۔''

''نا اپنی قابلیت بھی تو دیکھو، میں تو سوچ کر پریشان ہوتی ہوں تمہارا بنے گا کیا۔''

''امی! امجد چچا نے تو بیٹیوں کے لیے کوئی جائیداد تک نہیں بنائی، اگر کاروبار بھی ٹھپ ہو جاتا ہے تو پھر یہاں شادی کرنے کا بھلا کیا فائدہ ہوگا۔''

''فرحان ٹھیک کہہ رہا ہے، اسے کچھ دن امجد کے آفس جا کر حالات کا اندازہ لگانے دو، پھر دیکھتے

ہیں کیا کرنا ہے۔''

''کل سے فرحان بھی تمہارے آفس جایا کرے گا۔'' دونیہ کو جاتے تیسرا روز تھا جب رشید صاحب نے اطلاع دینے والے انداز میں انہیں بتایا تھا۔

''فی الحال تو میرے پاس کوئی جگہ خالی نہیں ہے، پھر یہ بھلا کر بھی کیا کر سکے گا۔'' اتنا صاف جواب، رشید صاحب کو تو یقین نہیں آیا۔ مدد کے لیے اماں جان کی طرف دیکھا۔

''اے یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اسے وہاں نوکری کی کیا ضرورت ہے، آخر کل کو یہ سب اس نے تو دیکھنا ہے۔''

امجد صاحب نے اس بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا، مگر آج پہلی بار نائلہ بیگم بول اٹھیں کہ انہیں اس بات میں دونیہ کی انسلٹ فیل ہوئی تھی، جب نیلی نے ٹھکرا دیا تو وہ دونیہ کو اپنانے کی بات کر رہے تھے، وہ بھی اس طرح کہ انہیں پورا یقین تھا امجد صاحب تو انکار کر ہی نہیں سکتے۔

''میری بیٹیوں کو اللہ سلامت رکھے، وہ خود ہی باپ کا ہاتھ بٹائیں گی۔''

''ہونہہ مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا۔ یہ ہم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ اب دوبارہ بولیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''دادی! اگر گھر کی باقی عورتیں بول سکتی ہیں تو میری ماں پر یہ پابندی کیوں ہے؟''

''لو سن لو امجد! اس نافرمان بیٹی کو آفس لے کر جاتے ہو، مت بھولو یہ اس بے حس، خودغرض عورت کی بیٹی ہے۔''

وہاں ایک نیا جھگڑا شروع ہو گیا اور یہ دیکھ کر سب مزید طیش میں بولنے لگے کہ دونیہ اپنی بات کہہ کر پورے سکون سے کھانا کھا رہی تھی۔ رشید صاحب کا جی چاہ رہا تھا پانی کا بھرا گلاس اس کے منہ پر دے ماریں اور دادی کو گھنی میسنی نائلہ بیگم کی شکل دیکھ کر تاؤ آ رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

اجالا کی امی اور آنٹی انکل ان کے ہاں آئے۔ اجالا کے گھر والوں نے ابھی تک صرف نائلہ بیگم اور ان کی بیٹیوں کو ہی دیکھا تھا، گھر کی باقی خواتین کی تیزی طرّاری نے انہیں حیران پریشان کر دیا۔ ہر طرف سے جرح ہو رہی تھی کہ آخر وہ یہاں آئیں کس سلسلے میں ہیں، دادی نے تو صاف کہہ دیا۔

''ہم لوگ تو بیٹیوں کی سہیلیوں کا اسکول، کالج کے علاوہ ملنا پسند ہی نہیں کرتے۔''

ادھر ڈرائنگ روم میں امجد صاحب کے علاوہ وحید بھی جا بیٹھے تھے اور بڑی کھوجتی نظروں سے علی احمد صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

مہمان خواتین کوئی بھی بات اشارے میں بھی کہے بغیر اٹھ کر چلی گئیں۔

اگلے روز اجالا نے بتایا۔

''آنٹی تو تمہاری چچیوں سے مل کر پریشان ہی ہو گئی تھیں۔ داد دیتی ہیں تمہاری ہمت کی، وہ کہہ رہی تھیں وہاں جا کر رشتے کی بات کرنا ہی محال ہے اور یہی بات انکل بھی کہہ رہے تھے۔ تمہارے والد

سے زیادہ تو تمہارے تایا بولتے رہے اور بولتے ہوئے انہیں اس سے بھی غرض نہیں تھی کہ سامنے والا ان کی گفتگو میں کتنی دلچسپی لے رہا ہے۔ انکل کہہ رہے تھے اب وہ تمہارے ابا کے آفس جا کر ہی ان سے رشتے کی بات کریں گے۔''

دونیہ یہ سب سن کر چپ رہی کہ اجالا جو کہہ رہی تھی غلط بھی نہیں تھا۔

امجد صاحب کا بیوی، بچوں کی جانب بڑھتا ہوا رجحان ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی اور انہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کاروبار میں گھاٹے کی بات بھی انہوں نے جھوٹ کہی ہے۔ اب اچانک ہی سب کے رویّے بھی بدلنے لگے تھے۔ دونیہ، سونیا خاص اہمیت اختیار کر گئی تھیں اور کاموں کے لیے نائلہ بیگم کو اب کوئی نہیں پکارتا تھا۔

❁ ❁ ❁

علی احمد صاحب نے آفس میں امجد صاحب سے ملاقات کی اور دونیہ کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگا۔ امجد صاحب عالی سے مل تو چکے تھے، پہلی ملاقات میں اس نے متاثر کیا تھا، لیکن بہرحال رشتہ یوں ایک ہی ملاقات میں تو طے نہیں پا سکتا تھا، لیکن انہوں نے احمد صاحب کو اچھی امید ضرور دلائی اور خود بھی انہیں بہت اچھا لگا۔ وہ جو دونیہ کے لیے فکرمند تھے یہ بوجھ بھی اتر گیا۔ بہت ہلکے پھلکے موڈ کے ساتھ گھر آئے تو پتا چلا دونوں بہنیں آئی ہوئی ہیں، ان کے بچے اور گھر کے باقی بچے جنہیں اب بچے تو نہیں کہا جا سکتا تھا، بلکہ ساری جوان پارٹی لان میں جمع تھی، خوب قہقہے لگ رہے تھے۔ وہ رک گئے، خاندان کے اتنے لڑکوں میں کوئی ایک بھی تو ایسا نہیں جس کی قابلیت پر فخر کیا جا سکے، سب کے سب نالائق، وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

''شکر ہے آج جلدی آ گئے ہو، بہنیں کب سے انتظار میں بیٹھی ہیں۔'' اماں جان دیکھتے ہی کہنے لگیں۔ وہ سلام کر کے وہیں بیٹھ گئے۔ دونیہ چائے کا پوچھنے لگی۔

''میں نے تو سنا تھا دونیہ بھی تمہارے آفس جانے لگی ہے، لیکن یہ تو گھر پر ہے۔'' بڑی پھپھو پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں آج اس کی طبیعت اچھی نہیں تھی، اسی لیے کالج سے گھر آ گئی۔''

''ہائے صدقے جاؤں کیا ہوا طبیعت کو؟'' اور پھپھو کی محبت پر وہ سونیا کو دیکھ کر مسکرا دی۔

''اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو احسن سے کہتی ہوں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔''

''ارے احسن کیوں لے کر جائے گا۔ اس کے بڑے تایا رشید گھر پہ ہیں۔ خود اپنی بیٹی کو لے کر جائیں گے۔''

احسن کے نام پر فرحت چوکنی ہو کر جھٹ بولی تھیں۔

''احسن کوئی غیر نہیں ہے اس کی بڑی پھپھو کا بیٹا ہے۔'' عطرت نے جل کر یاد دلایا تھا۔

''ٹھیک ہے وہ پھپھی زاد بھائی ہے۔ لیکن بہرحال تایا سے بڑھ کر تو نہیں ہے۔''

امجد صاحب کو اس لڑائی سے الجھن ہونے لگی۔ وہ دونیہ سے نائلہ بیگم کے بارے میں پوچھنے لگے۔

''امی کچن میں ہوں گی۔''

''سونیا! اپنی امی سے کہو تیار ہو جائیں، ہمیں حامد صاحب کے ہاں جانا ہے۔''

''ایں۔۔۔ یہ حامد کون ہے، بہنیں ادھر ملنے آئی ہیں اور تم بیوی کو لے کر باہر نکل رہے ہو۔''

''ضروری کام ہے اماں!'' سونیا، ماں کو پیغام دینے جا چکی تھی۔

حامد، اجالا کے ابو کا نام تھا، دونیہ سمجھ گئی وہ کس سلسلے میں جا رہے ہوں گے اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

❁ ❁ ❁

دونیہ کی بات پکی ہونے کی خبر سب کو اتنا خفا کر دے گی یہ تو امجد صاحب کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اماں جان نے تو اس رات کھانا تک نہیں کھایا۔ بڑی بھابھی آنسو بہانے بیٹھ گئیں تو عطرت نے خبر سنتے ہی ادھر آ کر تصدیق کرنے کے بعد کہہ دیا۔ اگر دونیہ کا رشتہ عالی سے طے کیا گیا تو وہ تمام عمر بھائی سے بات نہیں کرے گی۔

''جیسے آپ لوگوں کو اپنے بچوں کا مفاد عزیز ہے، ایسے ہی مجھے بھی اپنی بچی کے مستقبل کا خیال ہے۔ میں نے دونیہ کے لیے وہی چنا جو بہتر لگا۔''

''اپنوں کو چھوڑ کر بیٹی باہر بیاہی ہے، سوچ لو دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ تمہیں چاہیے تو یہ تھا گھر کی بات گھر میں رکھتے۔''

''اب اس معاملے میں کوئی نہیں بولے گا، عالی میرا ہونے والا داماد ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ لوگ اس کی آمد پر اسے عزت دیں، خوش دلی سے استقبال کریں۔''

''ہونہہ!'' عطرت اور فرحت نے غصے سے سر جھٹکے جبکہ بلقیس خاموش کسی سوچ میں گم تھیں۔ انہوں نے اس ساری بحث میں بالکل حصہ نہیں لیا اور بیوی کی خاموشی یقیناً کوئی معنی رکھتی ہے۔ یہ سوچ کر وحید بھی چپ رہے تھے۔

امجد صاحب وہاں سے اٹھ کر گئے تو عطرت اور فرحت بولنے لگیں۔ بلقیس نے وحید کو اشارہ کیا، دونوں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

''دیکھو جی، دونیہ کا رشتہ تو امجد نے طے کر دیا، اب یہ دونوں پاگل ہیں جو لکیر پیٹ رہی ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں، اس سے پہلے کہ وہ سونیا کی بات کہیں پکی کر دیں یا خاندان میں ہی ان احمقوں میں سے کسی کا دھیان سونیا کی طرف چلا جائے، ہمیں امجد سے سونیا کی بات کر لینی چاہیے۔ یوں بھی سونیا کم عمر اور بھولی ہے۔ دونیہ کی نسبت اسے بہلا پھسلا لینا مشکل نہیں ہے۔''

''ارے بیوی۔۔۔ بات تم نے سچ کہی۔ دیکھو تو ان احمقوں کو وہ بات پکڑے بیٹھے ہیں جو اب بن ہی نہیں سکتی۔''

''داد دو میری عقل کو اور جلدی اٹھو۔ امجد اس وقت اپنے کمرے میں اکیلا ہے، وہیں چل کر بات کرتے ہیں۔ ویسے بھی میرا تنویر، فرحان کے مقابلے میں پڑھائی میں اچھا ہے۔ فرحان کو تو سارے خاندان نے لاڈ کر کے بگاڑ چھوڑا ہے۔''

امجد صاحب کمرے میں اکیلے نہیں تھے، نائلہ بیگم بھی موجود تھیں۔

''بہت مان سے ایک بات کرنے آئے ہیں امجد! وعدہ کرو، انکار کر کے دل نہیں توڑو گے۔''

بلقیس کی بات پر چوٹی گوندھتی نائلہ کے ہاتھ ساکت ہو گئے اور امجد صاحب نے ٹی وی کا ریموٹ ایک جانب رکھ دیا۔

''اگر بات معقول ہوئی تو انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔''

''یہ کیا بات ہوئی، ہم کیا تم سے کوئی نامعقول بات کریں گے۔'' بلقیس نے کچھ برا مان کر لیکن بڑی محبت سے کہا اور وحید بھی اثبات میں سر ہلانے لگے۔

''آپ دونوں بات تو کریں، اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔'' وہ کچھ ٹھٹک گئے تھے کہ یقیناً بات اہم تھی۔ اتنا اصرار کسی بے معنی بات کے لیے تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

''دونیہ کو تم نے خاندان بھر کی مخالفت مول لے کر غیروں میں دے دیا، حالانکہ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا۔ دعا ہے دونیہ کی قسمت بہت اچھی رہے۔ ہم تو آج اپنی جھولی پھیلا کر سونیا کے لیے آئے ہیں، ہمیں مایوس نہ کرنا امجد!''

''نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔'' نائلہ ایک دم بہت تیزی سے بولی تھیں اور ساری تیاری چھوڑ کر کمرے کے اس حصے میں چلی آئی تھیں، جہاں نشستوں پر یہ لوگ بیٹھے تھے۔

''ایک گھر میں رہتے ہوئے اختلافات ہو جاتے ہیں لیکن انہیں دل سے لگا کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ تنویر سادہ مزاج کا بھولا بھالا لڑکا ہے، سعادت مند ہے۔ تم گواہ ہو امجد! اس نے فرحان کی طرح کبھی تم سے بے جا فرمائش نہیں کی۔ اس کے مزاج میں سنجیدگی ہے، ذمہ دار ہے۔ اماں جان کے باہر کے سارے کام وہی کرتا ہے، اب صرف اس لیے کہ وہ ہمارا بیٹا ہے اور ہم غریب لوگ نائلہ کو پسند نہیں۔ میرے بچے کا رشتہ مت ٹھکراؤ۔''

''ہم فوری جواب نہیں مانگ رہے، سوچ لو اور میرا خیال ہے جب نائلہ ٹھنڈے دل سے سوچے گی تو وہ بھی انکار نہیں کرے گی۔'' وحید نے یہ بات نائلہ پر کچھ کہتی نظر ڈال کر جس انداز میں کہی تھی، وہ اس کا مطلب بخوبی سمجھ گئی تھیں۔

دونوں امجد صاحب کو خاموش چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔

''آپ سونیا کا رشتہ ہرگز تنویر کے ساتھ نہیں کریں گے۔'' نائلہ بے چین ہو کر ان کی جانب بڑھی تھیں۔ شاید اتنے برسوں میں پہلی بار انہوں نے یوں زور دے کر اسے کوئی بات کی تھی۔

''سن رہے ہیں نا آپ، ایسا کوئی فیصلہ ہمیں نہیں کرنا۔''

''ارے تم تو یوں پریشان لگ رہی ہو جیسے میں نے انہیں ہاں کر دی ہے۔ نائلہ! میں جانتا ہوں، یہ بچی کی ساری عمر کا معاملہ ہے، جھٹ سے فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں۔'' وہ نرمی سے سمجھا رہے تھے۔

''نا آج نا کل، یہ فیصلہ کرنا ہی نہیں ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، تم تیار ہو جاؤ، ہمیں نکلنا ہے۔ لیٹ ہو جائیں گے۔''

''اب تو کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر جا بیٹھیں۔

''میں نے کہا ہے نا، پریشان مت ہو۔ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔''

لیکن نائلہ بیگم کا خوف کم نہیں ہو سکا۔ امجد صاحب نے تسلی دی تھی لیکن وحید نے جاتے وقت بڑے جتاتے ہوئے تنبیہی انداز میں جو کچھ کہا تھا، وہ اسے کیسے نظر انداز کر دیتیں۔ اس کی بدفطرت سے اچھی طرح آگاہ تھیں۔ اتنے برس صرف اس بدنیت شخص کی وجہ سے انہوں نے کانٹوں پر گزارے تھے، وہ تو گھر کی چار دیواری میں بھی غیر محفوظ رہی تھیں۔ ان کا سکون غارت ہو گیا تھا۔

حامد صاحب کے ہاں سے واپس آ کر امجد صاحب سو گئے لیکن نائلہ بیگم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

۞ ۞ ۞

اگلے روز حسبِ معمول امجد صاحب اور دونیہ آفس سے اکٹھے آئے۔ دونیہ تو اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے قریب سے گزر کر باہر جاتی بلقیس کو سلام تک نہیں کیا۔ امجد صاحب نے بلقیس کو سلام کیا، وہ جواب دے کر ستارہ کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ امجد صاحب کچن کی طرف آئے، یہاں نائلہ موجود نہیں تھیں۔ ملازمہ ان کے پوچھنے پر بولی۔

''وہ تو بلقیس بی بی کے کمرے میں پانی اور سر درد کی گولی لے کر گئی ہیں۔ وحید صاحب ابھی ابھی آئے تھے کچن میں، کہہ رہے تھے بلقیس بی بی کے سر میں بہت درد ہے، تڑپ رہی ہے بے چاری تو بی بی دوا لے کر گئی ہیں۔''

یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ ستارہ اور بلقیس کو انہوں نے خود گھر سے باہر نکلتے دیکھا تھا، وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وحید کے کمرے کی جانب چل پڑے۔

نائلہ کمرے میں داخل ہوئیں تو نیم تاریکی تھی۔ صوفے کی بیک ان کی جانب تھی لیکن اس پر پڑا بلقیس کا دوپٹا دروازے سے نظر آ رہا تھا۔ شاید بلقیس صوفے پر بیٹھی تھی۔ نائلہ بیگم پانی اور ٹیبلٹ لے کر اسی طرف آئیں تو صوفے پر بیٹھنے والے نے ایک دم ہاتھ پکڑ لیا۔ وحید کو دیکھ کر وہ شاید چیخنا چاہتی تھیں لیکن اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''خاموشی سے میری بات سن لو۔''

''ہاتھ چھوڑو میرا ذلیل انسان! تمہیں نہ رشتوں کی شرم ہے نہ لحاظ۔''

یہی وہ وقت تھا جب امجد صاحب وحید کے کمرے کے دروازے تک آئے اور اندر سے آتی آوازوں پر جم گئے۔

''ہاں یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کتنا بدفطرت انسان ہوں۔ اب تک تو تم مجھ سے بچتی آئی ہو نائلہ! مگر اب میں ساری حدود پار کر لوں گا، ڈرو کہ میں تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑوں گا۔ آباد رہنا چاہتی ہو تو سونیا اور تنویر کے رشتے کے سلسلے میں بالکل نا بولنا۔''

عورت چاہے کتنی بھی کمزور ہو لیکن اولاد کی زندگی کے ہر خطرے کو وہ ہنس کر اپنی جان پر لے لیا کرتی ہے۔ ''میں تمہیں بتائے دیتی ہوں، سونیا کا نام بھی اپنی زبان پر لائے تو برا ہو گا۔''

وحید نے نائلہ کو جھٹکا دے کر اپنی جانب کھینچا۔ نائلہ نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس اس پر دے مارا۔ جو پیشانی پر لگا اور خون بہہ نکلا۔ نائلہ سے وحید کو کہاں ایسی توقع تھی اور اب تو امجد صاحب

بھی کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

''تم۔۔۔ تم نے دیکھا اپنی بیوی کو۔ میں عرصے سے اس کے کرتوتوں پر پردہ ڈال رہا ہوں لیکن اس عورت کی۔۔۔''

''بس آگے کچھ مت کہنا کہ میں بھول چکا ہوں کہ تم میرے بھائی ہو۔'' امجد نے نائلہ کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر چلے آئے۔

''میرا قصور نہیں ہے، مجھے تو دھوکے سے کمرے میں بلایا گیا تھا۔'' نائلہ رو رہی تھیں۔

''میں بھی آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا بنا رہا ہوں۔ تمہارا، اپنی بیٹیوں کا گناہ گار ہوں میں۔ مجھے معاف کر دو نائلہ! آج میں سمجھ سکتا ہوں تم نے سہاگن ہوتے ہوئے بھی کسی بیوہ کی طرح روپ اجاڑ کر زندگی کیوں گزاری ہے۔ تمہارا چہرہ ہر دم خوف کی تحریر کیوں لیے ہوئے رہا ہے اور تم نے کیوں کچن کو ہی اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔ سارا قصور میرا ہے اور جو وقت بیت گیا، وہ واپس نہیں آ سکتا۔ تمہارا سنہری دور ختم ہو چکا۔ جوانی ڈھل چکی اور میں گھر بھر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مشین بنا رہا۔ حالانکہ بھائیوں کی فیملی میری ذمہ داری تو نہیں تھی۔'' ٹوٹے ہوئے لہجے میں وہ کہے جا رہے تھے۔

۞ ۞ ۞

پھر جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا۔ امجد صاحب نے گھر خرید لیا۔ اس گھر میں جوان کا حصہ بنتا تھا، اسے بیچ دیا اور یہاں سے جانے کا اعلان کر کے سب کو حیران سے زیادہ پریشان کر دیا۔

''اماں جان! آپ ہمارے ساتھ چلیں گی؟'' وہ اماں سے کہہ رہے تھے جو ان کے یہاں سے جانے کے فیصلے پر بہت غصے میں بیٹھی تھیں۔

''میں تو کبھی نہ جاؤں گی۔ ارے تم ایک دھاگے میں پروئے موتی تھے، تم نے اس لڑی کو توڑ دیا۔''

''میری بات بھی سنیں اماں! بچے جوان ہو رہے ہیں، اس گھر میں لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی۔ چچا تایا کے بچے بہن بھائی نہیں ہوتے، یہ میری بچیوں کے لیے محرم تو نہیں ہیں نا، پھر میں کیسے انہیں یہاں رکھ سکتا ہوں۔''

''بس آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔''

اماں کو ساتھ جانا تھا، وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ نائلہ کے علاوہ کوئی بہو ایسی نہیں جو ان کی خدمت سر جھکا کر کر سکے۔

امجد صاحب کے اس گھر سے نکلتے ہی وہ تینوں بھائی جو صرف مفاد کی خاطر اکٹھے تھے، الگ ہو گئے کہ اب اکٹھے رہنے میں جو فائدہ تھا، وہ تو امجد صاحب کی صورت میں جا چکا ہے۔

بہنوں نے بھی اپنے حق کا مطالبہ کر دیا اور اس مکان کے حصے بخرے کرتے ہی خاصے جھگڑے اٹھے، یہاں تک کہ تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار بھی نہیں رہے۔

ہاں امجد صاحب کے ہاں وحید اور بلقیس کے سوا سب ہی کا آنا جانا تھا۔ وہ ان کی خودغرضی جان کر بھی مسکرا کر استقبال کرتے تھے۔ دونیہ کی شادی پر ان سب نے رونق لگائی بلکہ ہاتھ بھی بٹایا کہ اب نائلہ بیگم اور امجد صاحب کا بھی ایک مقام تھا کہ آج انہوں نے خود کو منوا لیا تھا۔ سمجھ گئے تھے۔

لاکھ خوبیاں رکھتے ہوئے بھی ہمیں خود کو منوانا پڑتا ہے اور یہ کہ ہماری طاقت ہم سے جڑے رشتوں میں ہے۔ اولین فرض بھلا کر جب دوسروں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لیتے رہیں گے تو دوسرے بھی آپ سے اپنا بوجھ اٹھوانا اپنا حق سمجھ لیں گے۔ رشتے خوب صورت ہیں، رشتے بہت اہم ہیں، ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں۔ سب سے کٹ کر ہم ادھورے ہیں لیکن رشتوں کو برتنا بھی ایک فن ہے۔ کچھ لو، کچھ دو کا اصول یہاں بھی لاگو ہوتا ہے، تب ہی زندگی اطمینان سے بسر ہوتی ہے، تب ہی آخری عمر میں افسوس نہیں، آسودگی ہاتھ آتی ہے۔ بس بات ساری سمجھ کی ہوا کرتی ہے۔

❁ ❁ ❁

روایت

"نیلے سوٹ پر سلور باریک گوٹے کا کام ایسا اٹھا ہے کہ دیکھ دیکھ جی نہیں بھرتا۔ ملتان سے آئی تھی وہ عورت۔ بڑی صفائی ہے اس کے ہاتھ میں، بہت خوب صورت کام کرتی ہے۔ میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا جتنے دن وہ ادھر اپنی بہن کے گھر ٹھہری میں نے ثروت کے لیے نیلے سوٹ پر گوٹے کا کام کروالیا۔"

صدیقہ اپنی بھابھی سلمیٰ کو بڑے شوق سے جارجٹ کا نیلا سوٹ دکھا رہی تھی اور سلمیٰ اس سوٹ کو دیکھتے ہوئے پیچھے بہت پیچھے ماضی میں اتر گئی تھیں۔

ایسے ہی گہرے نیلے رنگ کا سلک کا سوٹ تھا جس پر اماں نے بڑے ارمانوں کے ساتھ گوٹا لگایا تھا اور پھر سلیقہ کر اس کے جہیز کے لیے رکھ دیا تھا۔

"اماں! میری پیاری اماں۔ میرے لاڈ، میرے ناز سب تمہارے ساتھ ہی چلے گئے۔"

دل کچھ ایسا بوجھل ہوا کہ وہ اپنی نند کے گھر بیٹھ نہیں سکیں۔ صدیقہ نے کہا بھی کہ "سلمیٰ کچھ دیر رک جاؤ۔ آج ثروت نے کوفتے بنائے ہیں اور میری ثروت ویسے تو تمام گھریلو امور میں طاق ہے مگر کھانا تو کمال کا بناتی ہے اور اس کے بنائے کوفتوں کی تو ہمارے محلے میں دھوم ہے۔"

"ہاں ممانی جان! بس آدھا گھنٹہ مزید بیٹھ جائیں۔" ثروت نے بھی کہا تھا مگر وہ ضروری کام کا بہانا کر کے واپس آ گئیں۔

کام تو انہیں کوئی نہیں تھا بس یادوں کا سلسلہ تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ سلمیٰ کے دونوں بیٹے اور میاں اپنی اپنی جاب پر تھے۔ بیٹی کالج گئی ہوئی تھی۔ وہ آ کر کمرے میں لیٹ گئیں۔ موسم میں کچھ خنکی تھی۔ کمبل پہلے پیروں پر پھر پورا اوڑھ لیا۔ اوڑھتے ہی آنکھوں میں جمع

پانی بہنے لگا۔ یہ نیلا جارجٹ کا گوٹے والا سوٹ کیا کیا یاد دلا گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

''اماں! نسرین کی شادی ہے آپ کو پتا تو ہے وہ میری کتنی اچھی سہیلی ہے۔ مجھے تیل، مہندی، مایوں، شادی، ولیمہ سب میں شرکت کرنا ہوگی۔''

''ہاں تو کرو شرکت۔ میں نے کب تمہیں منع کیا ہے، پڑوس کا معاملہ ہے اور صرف تمہیں ہی نہیں ہم سب کو بلایا ہے۔''

''اماں! میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اتنے دن شرکت کے لیے میرے پاس کپڑے بھی تو اتنے ڈھیر ہونے چاہئیں۔''

''کیوں یہ کہاں لکھا ہے؟'' اماں جواب تک بڑے سکون سے بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں، بھڑک ہی تو اٹھیں۔

''تو پھر آپ کیا چاہتی ہیں۔ میں یہ دو چار گھسے ہوئے سوٹ ایک بار پھر ہر جگہ پہن کر جاؤں۔ ساری سہیلیاں مذاق اڑائیں گی میرا۔''

''کوئی مذاق نہیں اڑائے گی۔ ان میں سے کون سی ساہوکار کی اولاد ہے۔ سب کے پاس اتنے ہی جوڑے ہیں جتنے تمہارے پاس ہیں۔ کنواری لڑکیاں کہاں بکسے بھر بھر کپڑے بناتی ہیں۔ وہ سادہ ہی اچھی لگتی ہیں۔''

''اماں! ایک بھی تو سوٹ اس قابل نہیں ہے۔''

''ہائے ہائے کیا بولتی ہے لڑکی! کفر نہ بولا کر۔ پتا نہیں کس طرح ایسی باتیں منہ سے نکال جاتی ہے۔ اللہ کے غضب سے ڈر بھی نہیں لگتا۔ کتنا نواز رکھا ہے اس نے۔ ضرورت کی ہر شے تمہارے پاس ہے مگر پھر بھی جب بھی بولو گی ناشکری ہی کرو گی۔''

''اماں! دیکھیں نا پچھلی کتنی ہی شادیاں میں نے انہی تین جوڑوں میں نبٹا دی ہیں مگر نسرین تو میری بچپن کی سہیلی ہے۔ کیا سوچے گی وہ کہ مجھے اس کے بیاہ کی ذرا بھی خوشی نہیں ہے ایک جوڑا تک نہیں بنا سکی میں۔''

''کچھ نہیں سوچے گی وہ۔'' اماں اب پھر مطمئن ہو کر مٹر چھیلنے لگی تھیں۔

''اچھا یہ تو بتا دیں۔ آٹھ دس روز تک روزانہ کا آنا جانا، بھلا تین جوڑے کہاں کہاں کھپاؤں گی؟''

''یہ تین جوڑے تم مہندی، شادی اور ولیمے کے فنکشن میں آرام سے پہن سکتی ہو۔ باقی کے دنوں میں گھر کے عام کپڑوں میں سے کوئی سے استری کر کے پہن لینا اور دوپٹا ساتھ میں وہ چنری کا لے لیا کرنا جس پر تم نے ستارے ٹانکے ہیں۔''

''اماں! وہ میں کہنا یہ چاہ رہی تھی کہ اگر آپ۔۔۔ وہ جو آپ نے اتنے ڈھیروں کپڑے ٹرنک میں رکھ چھوڑے ہیں ان میں سے ایک دو دے دیں تو میں خراب تھوڑی کروں گی۔ بس تھوڑی سی دیر پہن کر رکھ دوں گی، ساری سہیلیوں میں میری شو بن جائے گی نا اماں!''

''ہاں اور بیاہ کے روز جب سب لوگ جہیز میں پرانے کپڑے دیکھ کر جو باتیں بنائیں گے تب کیا عزت رہ جائے گی؟ بس بی بی! اپنی سوچیں اپنے تک ہی رکھا کرو۔ ایسی باتیں کر کے میرا دماغ مت گرم کیا کرو، لو بھلا کیا فرمائش ہو رہی ہے۔ جہیز کے کپڑوں میں سے ایک دو جوڑے نکال دو۔ تھوڑی دیر پہنوں گی۔ خراب نہیں کروں گی۔'' اماں آخر میں اس کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں ہنسی تھیں۔

''اماں! وہ سامنے والوں کی رشیدہ کو اس کی اماں نے دو جوڑے نئے بنا کر دیے ہیں، وہ تو ضرور ہی مجھے جتائے گی کہ نسرین کی سب سے قریبی اور پرانی سہیلی تو میں ہی ہوں۔''

''دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنی راہ کھوٹی نہیں کرتے۔ اب جتنے میں تمہارے دو نئے جوڑے آئیں گے اتنے میں، میں تمہارے لیے جہیز کی کوئی چیز ہی لے کر ڈال لوں گی۔ کل کو تمہاری ہی عزت ہو گی اور پھر برتو گی بھی تم ہی۔ تب اپنی اماں کو یاد کرو گی اور دعائیں دو گی۔''

''اماں! آپ آنے والے کل کے لیے میری آج کی ہر خوشی برباد کرنے پر تلی رہتی ہیں اور بھلا یہ کل کس نے دیکھا ہے؟''

''بس بس۔ ذرا جو پیار سے بات کر لوں بدتمیزی پر اتر آتی ہے، اپنی یہ عادت بدل لے۔ لڑکیوں کو صابر و شاکر مزاج والی ہونا چاہیے اور تُو ہے کہ بات بات پر منہ بنا لیتی ہے۔ ذرا کسی نے سخت بات کہہ دی۔ رونے بیٹھ گئی۔ کسی نے مذاق اڑا دیا دل پر لے لیا۔ سچی کہتی ہوں احمق لڑکی! مجھے تیری بڑی فکر ہے۔ سدھر جا، میری باتیں سن کر کنویں میں نہ ڈالا کر۔ تیرے ہی فائدے کے لیے کہتی ہوں۔''

''پتا نہیں کیا فائدہ ہے اور کیا نقصان۔'' اس وقت وہ بری طرح چڑی ہوئی تھی۔

''اے ہے بالکل ہی پاگل ہو رہی ہے۔ ماں کی محبت پر شک کر رہی ہے۔ ارے اگر ایک ایک پیسہ جوڑتی ہوں تو کس کی خاطر؟ اچھی سے اچھی چیز خرید کر پیٹی میں سنبھال دیتی ہوں تو کس لیے، کبھی تو نے مجھے اپنے لیے کچھ لیتے دیکھا ہے۔ میں نے بنائے ہیں مہنگے جوڑے؟''

''تو اماں! ایسا کیوں ہے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ کو اسی طرح چیزیں خریدتے اور پیٹی میں غائب کرتے ہی دیکھا ہے۔ پتا نہیں یہ پیٹی کب بھرے گی۔''

''یہ سلسلہ تو تیری شادی ہو جانے تک جاری رہے گا۔'' اماں مسکرا رہی تھیں شاید وہ جاگتی آنکھوں اس کی شادی کا سپنا دیکھ رہی تھیں۔

اماں نے اس کی شادی کے لیے بڑے ہی خوب صورت اور مہنگے جوڑے بنوا کر بکس میں رکھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ہوا لگوانے کے لیے نکالا کرتی تھیں۔ سلمٰی بڑے شوق سے ہر بار یہ جوڑے دیکھتی اور جی چاہتا بس جلدی سے شادی ہو جائے تب یہ سارے کے سارے اماں کے قبضے سے نکل کر اس کے پاس آ جائیں گے اور وہ روز ایک نیا جوڑا پہنے شان سے اِدھر اُدھر گھوما کرے گی۔

''یہ فیروزی موتیوں والا سوٹ، وہ گلابی، جس پر باریک ستارے ٹکے ہیں، جامنی سلک کا سوٹ جس پر اماں نے بہاولپور سے کڑھائی کروائی ہے اور یہ نیلا سوٹ ملتانی گوٹے کے کام والا۔ اس کے

علاوہ بھی بہت سے جھلمل کرتے مہنگے مہنگے قیمتی سوٹ اور پیٹی میں سنبھالا گیا جہیز، کراکری، بجلی کا سامان، نرم نرم شنیل کی رضائیاں اور گدے، خوب صورت بیڈ شیٹس، پتا نہیں کب یہ سب استعمال کرنا نصیب ہوگا۔ اب تو نسرین بھی بیاہ کر جارہی ہے۔ ٹھیک ہے عمر میں مجھ سے دو سال بڑی ہے۔ پر ہے تو میری کلاس فیلو اور میری کلاس کی کتنی ہی لڑکیاں میٹرک میں پہنچنے سے پہلے ہی بیاہی گئیں مگر اماں کی ایک یہ بھی ضد ہے جب تک میٹرک نہیں کروں گی وہ میرا بیاہ نہیں کریں گی۔ کہتی ہیں آج کل لڑکی کا پڑھا لکھا ہونا بڑا ضروری ہے۔ شاید اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ مگر یہ چمکتے دمکتے رنگ برنگے سوٹ اور قیمتی سامان، حالانکہ میں اماں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ شادی کے لیے جلدی تو مجھے بھی نہیں ہے۔''

اسے میٹرک کیے دو سال گزر گئے مگر اس عرصے میں اماں کو کوئی رشتہ پسند نہیں آیا۔ یا شاید یہ اماں کا بہلاوا تھا اس کے لیے۔ اصل میں رشتے کے لیے آنے والیوں کو وہی پسند نہیں آرہی تھی یا پھر یہ چھوٹا سا دو کمروں کا سادہ سا مکان اس کے مقدر کی راہ میں حائل ہورہا تھا۔

کچھ بھی تھا اس نے اس عرصے میں اماں کو کبھی اپنے لیے پریشان نہیں دیکھا۔ وہ مطمئن بھی تھیں اور پرامید بھی، جب بھی کام کاج سے فارغ ہوتیں۔ اس کے دوپٹوں پر تو کبھی قیصوں پر بیلیں ٹانکنے بیٹھ جاتیں۔ جوڑا مکمل ہوتا تو جھٹ ٹرنک میں غائب ہوجاتا، کبھی کسی کو دکھاتی نہیں تھیں۔ کسی پڑوسن نے انہیں دوپٹا سجاتے دیکھا کسی نے قیص پر موتی ٹانکتے تو اکثر فرمائش ہوتی ''خالہ مکمل ہونے پر بس ایک نظر دکھا تو دینا۔''

مگر وہ جو بڑی بامروت تھیں۔ اس معاملے میں بے مروت ہوجاتیں۔ بس وہ چاہتی تھیں کہ جب سلمٰی کا جہیز نمائش کے لیے سجایا جائے تو دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ جائیں۔ وہ پہلے سے دکھا کر کوئی بھی چیز پرانی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اور پھر وہ رشتہ آگیا جسے اوپر والے نے سلمٰی کے نصیب میں لکھا تھا اور نصیب کا لکھا دنیا والے نہیں مٹا سکتے تھے۔ بس اچانک ہی سب طے ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ لڑکے کی ماں ابھی سال چھ مہینے اور گھر گھر سیریں کرنے اور مزے اڑانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس کی بہنوں کو بھی بڑا اچھا لگتا تھا۔ جب ہر گھر میں اصرار کر کے انہیں مزیدار چیزیں کھلائی جاتی تھیں۔ اور یہ سامنے بیٹھنے والے میزبانوں کو کچھ بھی کہہ لیں، بے چارے بیٹھے مسکراتے رہتے تھے کہ شاید یہی ہماری بیٹی کو پسند کرلیں مگر تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ سارے پروگرام دھرے رہ گئے۔ لڑکے کی اماں کو جوڑوں میں درد تو پہلے بھی تھا مگر ان کے ہاں سے جانے کے پندرہ دن بعد تو گھٹنوں کا وہ حال ہوا کہ چلنا پھرنا دوبھر ہوگیا اب گھر کو کون سنبھالے، میاں نے کہا۔ ''بہو لے آؤ۔ ورنہ چند دنوں میں ہی یہاں کتے ہی نہ لوٹنے لگیں۔''

''ہاں، وہ جو آخر گھر دیکھا تھا۔ سلمٰی نام تھا اس لڑکی کا۔ اچھی لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی بھی تھی اور اماں بھی کوئی زیادہ تیز طرار عورت نہیں تھی۔ چلو پھر وہاں ہاں کہلوا دیتے ہیں۔''

اور یوں سلمٰی انوار کے نام ہوگئی۔ انوار تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ضرور تھا مگر لاڈلا ہرگز نہیں تھا۔ تینوں بہنیں ماں کا عکس تھیں تو وہ صورت شکل عادت سب میں ابا پر پڑا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا

اور سر جھکا کر ناک کی سیدھ میں چلنے والا۔ چار سال پہلے سرکاری محکمے میں جس سیٹ پر بیٹھا تھا آج بھی اسی پر تھا اور آئندہ ترقی کا امکان بھی نہیں تھا۔ ابا نوکری سے فارغ ہوچکے تھے۔ ان کا دن اب محلے کی دوکانوں کے تھڑوں پر اپنے ہم عمروں کے ساتھ بیٹھ کر اخبار کی ہر چھوٹی بڑی خبر پر تبصرے کرتے گزرتا تھا۔ گھر آتے تو ریڈیو کان سے لگا کر بیٹھ جاتے کہ زمانہ ہی ریڈیو کا تھا۔ ٹی وی آتو چکا تھا مگر عام نہیں تھا۔ محلے میں ایک آدھ گھر میں ہی ٹی وی آیا تھا اور لوگ ان گھروں کو رشک وحسد سے دیکھتے تھے۔

ان خوش نصیب ٹی وی والے گھروں میں انوار کا گھرانہ شامل نہیں تھا۔ اس لیے اس کی بہنیں ڈرامے اور ہفتے میں ایک بار دکھائی جانے والی فیچر فلم دیکھنے کے لیے چار گھر چھوڑ کر آسیہ کے گھر جایا کرتی تھیں۔ حالانکہ آسیہ بڑی نک چڑھی مغرور سی لڑکی تھی مگر مجبوری تھی۔ ٹی وی دیکھے بغیر رہا بھی تو نہیں جاتا تھا۔

ابا کو لڑکیوں کا یوں رات گئے تک غیر کے گھر گھسے رہنے پر کبھی کبھی اعتراض ہوا کرتا تھا مگر اماں کہہ دیتیں۔

''وہ اکیلی تھوڑا وہاں بیٹھی ہیں۔ سارے محلے کی عورتیں وہاں جمع تماشے کا لطف اٹھا رہی ہوں گی۔ یہ تو میں ہوں جو گھر بار کی فکر میں ادھر گھسی بیٹھی ہوں۔ توبہ ہے اس گھر کے بکھیڑے ہی ختم نہیں ہوتے۔ ہوں بھی کیسے، جس گھر کے مردوں کو چوبیس گھنٹے فرمائشی پروگرام نشر کرنے کی عادت ہو وہاں عورتیں آرام اور تفریح کو ترس ہی جایا کرتی ہیں۔''

دراصل صبح ابا نے مولی والے پراٹھوں کی فرمائش کردی تھی اور وہ جانتے تھے اب اس کا خمیازہ ہفتہ بھر بھگتنا ہوگا مگر اب تک وہ بھی عادی ہوچکے تھے۔

ہاں سلمٰی کو دیکھنے کے بعد انہوں نے بیٹے سے کہا تھا۔

''تمہیں بہت مبارک ہو انوار میاں! کہ بیوی کے معاملے میں خاصے خوش قسمت ٹھہرے ہو۔ لڑکی صورت شکل میں اچھی ہے مگر سب سے بڑی خوبی یہ کہ اپنے ہر انداز سے بھولی بھالی معلوم ہوتی ہے، تم میری والی غلطی مت کرنا۔ شروع دن سے ہی بیوی پر رعب قائم کرلینا کہ بعد میں موقع نہیں ملتا، بس یہ کام پہلی ملاقات پر ہی ہوجائے تو ہی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔''

''ابا! آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں۔ وہ بھولی بھالی ہے۔''

''ارے احمق! عورت کو جب سر اٹھانے کا موقع دے دیا جائے تو پھر یہ سر اٹھاتا ہی چلا جاتا ہے۔ تمہاری اماں تو اسے اپنے تسلط میں رکھے گی ہی مگر ایسا نہ ہو وہ تمہاری اماں کے اس ناجائز قبضے کا انتقام تم سے لینے لگے۔''

''ٹھیک ہے ابا! آپ ہمیشہ سے میرے دوست اور راہنما بھی رہے ہیں میں آپ کے مشوروں پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے اور یہ بھی سن لو ایسا کرلو گے تو ساری عمر ہمیں دعائیں دو گے اور تمہارا وہ حشر نہیں ہوگا جو تمہاری والدہ صاحبہ کے ہاتھوں ہمارا ہورہا ہے۔''

انوار نے بات سنی اور سمجھی ہی نہیں بلکہ گرہ میں باندھ لی کہ ماں بہنوں کی حکمرانی سے وہ خود بھی کچھ خاص خوش نہیں تھا مگر مجبور تھا کہ ان کے آگے بولنے کا حوصلہ نہیں پاتا تھا۔

❁ ❁ ❁

شادی کی تاریخ دے دی گئی۔ دونوں جانب تیاری عروج پر تھی۔ انوار کے گھر میں تو کنواری بہنیں موجود تھیں ہی۔ بری کی تیاری کروانے بڑی آپا بھی پانچ بچوں کے ہمراہ پہنچ جاتیں اور صبح سے شام تک یہیں رہتیں۔ بچے گھر میں خوب اودھم مچاتے اور اکلوتے ماموں سے فرمائشی پروگرام بھی جاری رہتا۔ وہ تو پہلے ہی اماں کے ہاتھ پر ساری تنخواہ رکھ کر بس اپنے کرائے کے حساب سے جیب میں ڈالتا تھا۔ ان کی فرمائشوں کو پورا کرنے کا مطلب آئندہ کچھ دنوں تک پیدل دفتر آنا جانا ہوتا تھا۔ اور اسے بچوں کی بات ماننا پڑتی تھی ورنہ آپا کے ساتھ ساتھ دونوں بہنیں اور اماں بھی ناراض ہو جاتیں۔ اور اب جب سے رشتہ ہوا تھا اب تو ادھر ذرا اس نے کسی معاملے میں چوں کی ادھر جھٹ کہہ دیا گیا۔

''ہاں جی اب ہماری پروا کسے ہے۔ اب تو سب کچھ آنے والی کے لیے ہے۔ ہماری تو شکلیں بھی بری لگنے لگی ہیں۔''

''خوامخواہ میں، تم بہنوں کی جگہ کوئی لے سکتا ہے بھلا۔ ارے ابھی تمہارے ماں باپ زندہ ہیں اور یہ گھر بھی میرے یعنی تمہاری ماں اکبری خاتون کے نام ہے۔ مجال ہے کسی کی جو تمہیں آنکھیں دکھائے اور یہ انوار تمہارا اکلوتا بھائی، ہونہہ اس احمق میں عقل تھوڑی ہے۔ اسے تو میں نے اب تک انگلی پکڑ کر ساتھ رکھا ہے۔ تب ہی سیدھے راستے پر ہے۔ بعد میں کوئی اسے چھوڑ تھوڑا دوں گی اس دوسرے خاندان کی پرائی عورت کے لیے۔ ارے وہ تو دو دن میں اس کو کاٹھ کا الو بنا کر رکھ دے گی۔ تم لوگ دل میلا نہ کرو۔ ایک ہی ایک بھائی ہے تمہارا، پورا حق رکھتی ہو تم تینوں اس پر اور ان بچوں نے ماموں سے لاڈ نہیں کرنے تو ان منحوس صورتوں، چوروں والے کرتوتوں کے مالک دو ٹکے جوگے چاچوں سے کرنے ہیں اور چاچو کو تو گولی مارو۔ ان معصوموں کا تو باپ ہی پکا میسنا ہے، دس نمبری پکا بدمعاش۔''

وہ اکلوتے داماد کو کوسنے لگتیں جو انہیں ''گرو'' ماننے سے انکاری تھا اور بڑی آپا یعنی اپنی بیوی کی عقل مندیوں کو سراہنے کے بجائے چالاکی و مکاری کا نام دیا کرتا تھا۔

صبح سے شام تک بری کی تیاریاں ہوتیں۔ اکثر کھانا قریبی تنور سے منگوالیا جاتا کہ پکانے کا وقت اب اس مصروفیت میں کس کے پاس تھا اور تنور والا صابر کتنی صفائی سے پکاتا ہے یہ بات انوار اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی لیے اکثر وہ دستر خوان سے بھوکا ہی اٹھ کھڑا ہوتا۔

''جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے ہیں مارے خوشی کے انوار بھائی کی تو بھوک ہی اڑ گئی ہے۔'' چھوٹی بہن سلطانہ عرف ننھی بڑے طنز کے ساتھ کہتی۔ باقی بھی شاکی نظروں سے دیکھنے لگتیں اور اس کا جی تو چاہتا ان سے پوچھے کہ ''کیا شادی دکھی ہونے کا نام ہے؟ اور اگر انہیں اس کا شادی کرنا پسند نہیں تو کس لیے لڑکی ڈھونڈنے ہر ہفتے نکل جایا کرتی تھیں۔'' مگر وہ یہ سب کہہ کر اماں کے عتاب کو دعوت نہیں دے سکتا تھا۔ اکبری خاتون جب توپوں کو منہ کھول دیتیں تو پھر بند کروانا کسی کے بس کی بات

نہ ہوا کرتی تھی۔

❁ ❁ ❁

پھر وہ دن بھی آپہنچا جب سلمٰی دلہن بن کر اماں کی عمر بھر کی جمع پونجی لے کر اس گھر سے رخصت ہوئی۔ اماں نے شادی سے چند روز پہلے یہ سارا سامان بکسوں اور پیٹی سے نکالا تھا۔ بڑے پیار سے ایک ایک چیز پر ہاتھ پھیرتی رہی تھیں اور سلمٰی کو انہیں خوشی کے ساتھ برتنے کی دعائیں دیتی رہی تھیں۔

''اتنی اداس کیوں ہو اماں! میں آتی جاتی رہا کروں گی۔'' آنے والے وقت کے سپنوں میں کھوئی وہ اماں کی بے پناہ اداسی پر ہنس پڑی تھی۔

''جب تُو ماں بنے گی، تب جانے گی۔ جسم کا حصہ الگ کر کے دوسروں کی جھولی میں ڈال رہی ہوں۔ جوں جوں تیری شادی کے دن قریب آرہے ہیں۔ مجھے تیری پیدائش کا وقت، تیرے بچپن کا زمانہ سب بڑی شدت سے یاد آرہا ہے۔ سلمٰی میری گڑیا! اللہ تجھے ہمیشہ خوش رکھے۔''

اماں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور ان آنکھوں کے بھیگتے ہی سلمٰی مستقبل سے حال میں آ گئی۔ اس روز وہ اماں کے گلے لگ کے یوں روئی کہ اماں کو اسے بہلانا مشکل ہو گیا۔

''اچھا سن، میری بات تو سن نا۔''

اماں اس کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ اس نے بس پلکیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ ہونٹ ابھی تک کپکپا رہے تھے، بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''یہ جو گوٹے کا کام والا نیلا سوٹ ہے نا، یہ مجھے بہت پسند ہے اور یہ تجھ پر سجے گا بھی خوب۔ شادی کے بعد جب تو پہلی بار میری طرف اپنے دولہا کے ساتھ آئے گی تب یہی سوٹ پہن کر آنا۔''

اس نے شرما کر سر جھکا لیا مگر دل میں پکا ارادہ کر لیا۔

اور اب اماں سے دور وہ اجنبی لوگوں کے درمیان سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور سب نے کہا تھا۔ اب یہی اس کے اپنے ہیں۔ اسے انہی کے ساتھ رہنا ہے انہی کے لیے جینا مرنا ہے۔

''امی! امی! دلہن کی چوڑیاں کتنی پیاری ہیں۔ میں لے لوں؟'' بڑی نند کی بیٹی اس کی چوڑیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی ماں سے اجازت لے رہی تھی۔

''ماموں سے پوچھ۔'' اس کی نند نے ادھر کمرے میں ہی مگر دلہن سے فاصلے پر سنبھل کر بیٹھے اپنے بھائی انوار کی جانب اشارہ کیا۔

ایسی فرمائش پر جو ایک بچی کی سراسر احمقانہ فرمائش تھی، ماموں سے پوچھنے والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی مگر وہ اپنی بہنوں کو خوب سمجھتا تھا۔ یہ بات اصل میں اس کی آزمائش کے لیے ہی کہی گئی تھی اور اسے اس آزمائش میں پورا اترنا ہی تھا، اس لیے جونہی بچی نے کہا۔ ''ہیں ماموں! یہ میں لے لوں؟'' جھٹ بولا۔

''لے لو بیٹا! جو پسند ہے لے لو۔ آپ کو منع کس نے کیا ہے۔''

''اگر اسے ممانی ہی پسند آگئی تو پھر؟'' انوار کا جواب بہنوں کو پسند آیا تھا اس لیے اب کے خوش گوار انداز میں چھیڑا جا رہا تھا۔

”اے لڑکیو! یہاں کیا بندر کا تماشا ہو رہا ہے۔ اٹھو کوئی کام دھندا بھی دیکھو۔ مہمانوں کے بچے رو رہے ہیں۔ اٹھ کر انہیں کھانا ہی نکال دو۔ وہ کہیں سوئیں تو کچھ سکون ہو توبہ! اٹھ مجھے دودھ کا ایک گلاس ہی گرم کر دے۔“

اکبری بیگم یہ کہتے ہوئے سلمیٰ کے قریب بیڈ پر گرنے والے انداز میں بیٹھیں پھر لیٹ گئیں۔ یوں پھیل کر کہ بے چاری دلہن تو کنارے پر ہی آ لگی۔

”نھی! یہ کمبل تو اوڑھا دے۔ جسم درد سے ٹوٹ رہا ہے۔ حرارت ملے گی تو سکون ہوگا۔“

وہ تو یقیناً لمبا پروگرام بنائے ہوئے تھیں اور تو کوئی کچھ نہ کہہ سکا، سو ابا بولے۔

”انوار کی اماں! اپنے کمرے میں چلو، مجھے تم سے ضروری بات کرنا تھی۔“

”کر لینا ضروری باتیں۔ دو گھڑی آرام بھی کر لینے دیا کریں۔ ہر طرف مہمان بھرے ہیں۔ مجال ہے جو کوئی جگہ خالی ہو۔ اب جو ذرا کمر سیدھی کرنے لیٹی ہوں تو آپ کو سوئیاں چبھنے لگی ہیں۔“

”ہاں ابا! جو ضروری بات ہے۔ وہ ذرا ٹھہر کر بھی ہو سکتی ہے، اماں کو ذرا آرام کر لینے دیں۔“ بڑی والی ہر معاملے میں بولنا ضروری سمجھا کرتی تھی۔

”میرا خیال ہے یہ کمرا اماں، ابا کو ہی دے دو۔ دولہا، دولہن بے چارے ان کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔“

یہ کہنے والے اکلوتے بدتمیز داماد صاحب تھے۔ اکبری خاتون دانت کچکچا کر رہ گئیں۔

”کیوں اماں! دل کی بات کہہ دی ہے نا میں نے؟“

آخر اماں کو اٹھتے ہی بنی۔ کمرے میں موجود کتنے ہی مہمان داماد صاحب کی ان باتوں کو مذاق سمجھ کر ہنس رہے تھے۔

ابا نے تو انوار کو بڑا سمجھایا تھا مگر یہ وقت ہوتا ہی جادو بھرا ہے۔ اچھے سے اچھے مرد کے بھی حواس جواب دے جاتے ہیں۔ انوار میاں کو بھی ابا کی کوئی بات یاد ہی نہ رہی۔ وہ تو بس سلمیٰ کو آنے والے وقت کے سنہرے سپنے دکھاتا رہا اور سلمیٰ نے ایک ہی رات میں اس بات پر یقین کر لیا کہ وہ دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہے۔

۞ ۞ ۞

صبح اس کا چہرہ کھلا کھلا اور آنکھوں میں جگمگاہٹیں تھیں اور کوئی چونکا یا نہیں لیکن تجربہ کار اماں اور آپا ضرور کھٹک گئیں اور انوار کا بھی جائزہ لیا۔ وہ بھی بڑا مطمئن اور خوش باش دکھائی دے رہا تھا اور بات بے بات مسکرائے جا رہا تھا۔

”وے ادھر آ، آج کیا سارا دن کمرے میں گھسے رہنے کا ارادہ ہے بے حیا، اور کچھ نہیں تو کنواری بہنوں کا ہی لحاظ کر لے۔“

اماں نے کنواری بہنوں کا لحاظ کیا نہ نئی نویلی دلہن کا۔ سب کے سامنے جوان بیٹے کو شرمندہ کر کے دلہن کو یہ بتا دیا کہ کسی دھوکے میں نہ رہنا۔ اس راج دھانی کی رانی میں ہوں اور یہ جس پر مان کر کے تم سر

اٹھائے بیٹھی ہو وہ میرے اشارے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔

انوار، ماں کی جھاڑ پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا کمرے سے باہر چلا گیا اور اکبری بیگم نے فاتحانہ انداز میں اپنے سے بہت چھوٹی اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کی ہم عمر اس لڑکی کو دیکھا جو شوہر کو پڑنے والی اس جھاڑ کے بعد کچھ بے چین اور خوف زدہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اکبری خاتون واپس جانے کے بجائے وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔ جوتے اتارے اور پیر بھی اوپر رکھ لیے۔

”خالہ! آپ کے پاؤں میلے ہو رہے ہیں۔“ ان کی بھانجی سے نئے صوفے پر یہ داغ برداشت نہیں ہو سکے تو بول اٹھی۔

”تو کیا ہوا بی بی! میری چیز ہے جیسے چاہوں برتوں۔“

”نہیں بالکل نہیں۔ اپنی چیز کے ساتھ کون ایسا سلوک کرتا ہے یہ تو وہ لائی ہے جسے قدم قدم پر کم تر ہونے کا احساس دلاتا ہے اور اس کی لائی ہر چیز کو بے وقعت جانتا ہے۔ ہر وہ چیز جو اس کی ماں نے ہر خواہش کو دفن کر کے بنائی ہے۔ جس میں ایک ماں کی چاہت اور ارمان ہیں۔ اپنی بیٹی اپنے ہی جسم کے اس حصے کے لیے دعائیں ہیں جسے دنیا کی ریت کے مطابق خود سے جدا کیا گیا ہے۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔

”اے صدیقہ! ولیمے کے کھانے کے بعد دلہن رواج کے مطابق اپنے گھر جائے گی۔ اس کے ایک دو جوڑے نکال دینا۔“ اکبری خاتون صوفے پر نیم دراز بیٹی سے مخاطب تھیں۔

”اچھا نکال دیتی ہوں۔ ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔“ صدیقہ نے سستی سے جواب دیا۔

”میں نکال دیتی ہوں۔“ یہ بھی کوئی رشتے کی بھانجی یا بھتیجی تھی۔

”نہیں نہیں رہنے دو۔ ابھی واقعی بڑا ٹیم (ٹائم) پڑا ہے۔“ اکبری خاتون نے روک دیا۔

پھر صدیقہ سے بولیں۔ ”کہیں جہیز کھول کر نہ بیٹھ جانا۔ بری میں سے جوڑے رکھنا۔“

”جب تم میری طرف آؤ تو نیلا گوٹے والا سوٹ پہن کر آنا۔“ اسے ماں کی معصوم سی خواہش کا اظہار یاد آ گیا مگر وہ ساس سے کچھ کہہ نہ سکی اور ولیمے کے بعد بری کے دو جوڑوں کے ساتھ میکے آ گئی۔

”اماں! آپ نے کہا تھا، نیلا جوڑا پہن کر آنا مگر کپڑے صدیقہ نے رکھے تھے۔“

”چل بیٹا! کوئی بات نہیں، یہ بھی اچھے ہیں۔“ ماں نے ماتھا چوم لیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”کیا بات ہے بیٹا؟“ ماں اس کے آنسو پہ خود بھی پگھلنے کو تھی۔

”اماں! تم سے دور جا کر مجھے تمہاری محبت کا احساس ہوا اور مجھے لگا ہے اماں کہ اب ایسی سچی کھری محبت مجھے دوبارہ کہیں سے نہیں ملے گی۔“

”ایسا نہیں سوچتے۔ شکر کرو وقت پر اپنے گھر کی ہوئیں۔ ان رشتوں کی قدر کرو۔ دل سے اپنا مانو پھر ساس بھی ماں اور نندیں بہنیں لگنے لگیں گی اور پھر بیٹا سب سے بڑھ کر تو شوہر کا رشتہ ہے۔ اگر میاں بیوی میں محبت ہو جائے تو یہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بن جائیں تو پھر سمجھو دنیا ہی جنت بن جاتی ہے۔“

اور اس نے سوچا۔ ”انوار تو بہت اچھے ہیں یقیناً ہم دونوں کی زندگی بہت مزے میں گزرے گی۔“

انوار نے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لی تھی اور یہ پندرہ دن دعوتوں میں ہی گزر گئے۔ اس کا کمرا چھوٹا سا تھا۔ بس وہاں پر ڈبل بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل کے بعد اتنی ہی گنجائش تھی کہ دو کرسیاں اور ایک میز رکھ کر باقی گزرنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا جائے۔ اس کی پیٹی کے ساتھ ساتھ بکس اٹیچی سب اسٹور میں رکھے گئے تھے اور چابیاں اماں کے پاس تھیں۔

اسے جب بھی کہیں جانا ہوتا کہ کپڑے اس کی نندیں نکال کر دیتیں اور یہ اکثر بری کے کپڑے ہوتے۔ جہیز کے اگر نکالے بھی گئے تو وہ جوڑے جو ہلکے کام والے اور سادہ سے تھے۔ اسے الجھن ہوتی۔

”آخر یہی تو دن ہیں پہننے اوڑھنے کے۔ ان ہی دعوتوں میں تو سب دلہن کے کپڑے شوق سے دیکھتے ہیں پتا نہیں یہ لوگ مجھے بھاری کام والے خوب صورت جوڑے کیوں نکال کر نہیں دے رہیں۔“

اس روز انہیں انوار کے چچا کے ہاں جانا تھا اور ابھی ابھی چھوٹی نند کا نکال کر دیا ہوا بری کا گرین سوٹ اس کے بیڈ پر پڑا تھا۔

”یہ اتنا سادہ سا سوٹ۔“ اس نے جوڑا اٹھا کر جائزہ لیا اور بے دلی سے ایک طرف ڈال دیا۔

”کوئی اور پہن لو۔ تمہارے پاس کوئی کمی تھوڑا ہی ہے۔“ انوار ابھی ابھی آفس سے آیا تھا اور کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

”یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔ جب میرے پاس اتنے ڈھیر کپڑے ہیں تو ہر مرتبہ ہی سادہ اور کم قیمتی کپڑے کیوں مجھے پہننے کے لیے نکال کر دیے جاتے ہیں۔“

”تم جا کر اپنی مرضی سے نکال لو۔“

”چابی اماں کے پاس ہے۔ ایک بار میں نے مانگی تھی تو کہنے لگیں۔ لڑکیاں لاپروا ہوتی ہیں کہیں رکھ کر بھول جاؤ گی تو مصیبت ہو جائے گی۔ اب میں تو ایسی لاپروا نہیں ہوں اور پھر کپڑے نکالنے کے بعد میں نے چابی انہیں واپس ہی کر دینا ہے نا۔ جائیں نا، اماں سے تھوڑی دیر کے لیے چابی لا دیں۔ میں کوئی دوسرا جوڑا نکال لوں گی۔ یہ والا تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔“

”لو بھلا میں کیوں جاؤں۔ تم جا کر اماں سے چابی لے لو۔ اس میں اتنا گھبرانے والی آخر کیا بات ہے؟“

”بس وہ مجھے آپ کی ماں سے ڈر لگتا ہے۔“

”کمال ہے۔“ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنسا۔ بیوی سے یہ نہیں کہہ سکا وہ خود اماں کا لختِ جگر ہونے کے باوجود ان سے ڈرتا ہے۔

”بس میں آج کوئی اچھا سا جوڑا پہنوں گی۔“

”مجھے تو یہ رنگ بڑا پسند ہے اور میں سوچ رہا تھا تم یہ پہن کر کتنی اچھی لگو گی۔“

انوار کے کہنے کی دیر تھی وہ جو آج یہ سوٹ پہننے پر تیار نہیں تھی۔ جھٹ راضی ہو گئی۔ عورت کو کیا

چاہیے، اپنے مرد کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت۔ ہونٹوں پہ تعریف۔ اگر وہ اسے اسی رنگ میں دیکھنے کا آرزومند تھا تو پھر جی جان سے وہ اسے پہننے کو تیار تھی۔

ادھر انوار نے اس کو رضامند دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

ابھی وہ کپڑے استری کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اماں چلی آئیں۔ حسبِ عادت بغیر دستک دیے دھاڑ سے دروازہ کھولا اور انوار کو دیکھتے ہی بولیں۔

”کچھ حیا، کچھ شرم، لحاظ، مروت ہے یا بیاہ ہوتے ہی سب اٹھ گیا؟“

”کیا ہوا اماں جان! میں سمجھا نہیں؟“ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”ہاں، تُو ننھا تیری عقل ابھی کچی، تُو بھلا کہاں سمجھے گا ان باتوں کو۔ وے بے شرما، جوان بہنوں والا گھر ہے اور تُو کمرے میں گھسا بیٹھا رہتا ہے۔“

”اماں! تو میں کہاں بیٹھوں۔ یہ میرا کمرا ہے۔ آفس سے آ کر آرام کرنے کے لیے اپنے ہی کمرے میں بیٹھ سکتا ہوں۔“

”آہو، اور یہ جو ابھی تک پہلے دن کی دلہن بنی پھرتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جب تُو کمرے میں ہو تو یہ بھی کمرے سے باہر قدم نہ نکالے، ہائے میرے ربا! میں تو ان لوگوں کی ظاہری معصومیت دیکھ کر دھوکا کھا گئی۔ مجھے کیا پتا تھا اندر سے پورے ہیں یہ لوگ۔“

وہ جو بولنا شروع ہوئیں تو حسبِ عادت بولتی چلی گئیں اور ایسے الزام سن کر مارے شرمندگی کے سلمٰی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جبکہ انوار بھی چائے کا کپ میز پر رکھے چپ چاپ بیٹھا یہ سب سن رہا تھا۔ اس روز سلمٰی کو اندازہ ہوا کہ اس کا شوہر ان مردوں میں سے ہے جو ماں کے سامنے غلط بات کو غلط کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اور اس کے سینے میں کچھ ٹوٹ گیا۔

بڑی بے دلی سے اس نے وہی ہرا سوٹ پہنا، جیسے تیسے میک اپ کیا اور انوار کے ساتھ اس کے چچا کے گھر چلی آئی مگر آج انوار کے ساتھ چلتے اٹھتے بیٹھتے اس کے دل میں کسی فخر کا احساس نہیں جاگا۔ اس کی کسی شوخ بات پر زور کی بے ساختہ ہنسی نہیں آئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی آنکھوں میں جگنو نہیں چمکے۔ جبکہ انوار ویسا ہی تھا گھر سے باہر آتے ہی وہ گھر کے اس ماحول کو بھی فراموش کر چکا تھا مگر سلمٰی کے ذہن میں ساس کی باتیں گونج رہی تھیں۔

میزبانوں کے ساتھ چٹکلے چھوڑتے ہوئے انوار بار بار اس کی طرف دیکھتا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا سلمٰی آج بجھی بجھی سی ہے مگر اس نے نہ وہاں نہ گھر واپس آ کر اسے بہلانے کی کوشش کی بلکہ سرے سے نظرانداز ہی کر گیا۔

سلمٰی کو اپنی ساس کے مزاج سے ڈر تو پہلے ہی لگتا تھا مگر اب تو انہیں سامنے پا کر ہی گھبراہٹ سی طاری ہونے لگتی تھی۔ گھر کے کام تو اس نے شادی کے پندرہ دن بعد ہی شروع کر دیے تھے اور کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ دن تمہارے کام کرنے کے نہیں ہیں۔ اس کی ساس صحت مند تھیں اور اس نے خود دیکھا تھا کہ شادی کے شروع دنوں میں وہ اچھا خاصا کام کرتی تھیں مگر جونہی سلمٰی کام پر لگی ساس نے ہاتھ

کھینچ لیا۔

دونوں نندیں بھی سارادن گھر پر ہوا کرتی تھیں۔ صدیقہ گھر کے کام کرلیا کرتی تھی جبکہ ننھی بس ننھی ہی تھی۔ بڑی آپا ہفتے میں ایک چکر بمعہ بچوں کے لگالیا کرتی تھیں اور اماں کی یہ کوشش ہوتی تھی شام کو وہ جلدی واپس چلی جائیں۔ ان کے شوہر کو انہیں لینے کے لیے نہ آنا پڑے۔ داماد کو وہ سارے زمانے کے سامنے برا بھلا کہتی تھیں مگر مجبوری تھی کہ اس کے سامنے زبان بھی بند رکھنا پڑتی اور خاطر خدمت کی مصیبت الگ تھی۔

❁ ❁ ❁

آج کل اکبری خاتون کو صدیقہ کے رشتے کی بھی بڑی فکر تھی۔ آس پڑوس میں کہہ رکھا تھا۔ رشتہ کروانے والی دو تین عورتیں بھی با قاعدہ رابطے میں تھیں۔

صدیقہ درمیانی صورت والی قدرے فربہ جسم کی لڑکی تھی پھر گھر کے مالی حالات بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں تھے تو آنے والیاں ایک بار آ کر دوسری بار راستہ بھول جاتیں۔ اکبری خاتون اس کا غصہ بھی انوار اور اس کی بیوی پر نکالتیں۔ جنہیں اپنے چاؤ چونچلوں سے فرصت نہیں تھی۔ احساس ہی نہیں تھا کہ ماں بہن کس قدر اداس اور مغموم رہتی ہیں۔

''دیکھیے اگر صدیقہ کا رشتہ نہیں ہو رہا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' ایک روز وہ انوار کے سامنے رو ہی پڑی۔

''ارے تم دل چھوٹا کیوں کرتی ہو۔ اماں بے چاری پریشان ہیں۔ اب ایسے میں ہم پر ہی غصہ نکالیں گی۔ محلے والوں سے تو جا کر نہیں کہیں گی۔''

''مگر اس میں میرا کیا قصور؟''

''دماغ مت چاٹو۔ ذرا جو آرام کرنے گھر آتا ہوں تو یہاں تم تھانیدار بن کر کھڑی ہوتی ہو۔'' وہ بھی اسی پر خفا ہونے لگا تو چپ چاپ وہاں سے ہٹ گئی۔

''سنو، اب منہ بنا کر کیوں بیٹھ گئی ہو۔ اٹھو آج مٹر ڈال کر چاول ہی بنالو۔ بڑا دل چاہ رہا ہے۔''

''چاول گھر میں نہیں ہیں۔''

اس نے انوار کے ہلکے پھلکے سے انداز پر اندر ہی اندر جل کر بڑی مشکل سے نارمل انداز میں جواب دیا۔

''پتا نہیں انہیں احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ان کا خوامخواہ میں ڈانٹ ڈپٹ کرنا مجھے کتنا اکیلا کر دیتا ہے۔''

''اوہو! نہیں ہیں تو محلے کے کسی بچے کو بھیج کر منگوالو۔'' آرام سے حل پیش کیا گیا۔

''کیسے منگوالوں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''مجھے پتا ہے بیگم صاحبہ! تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ صاف کہو کام چوری ہے۔ چاول پکانا ہی نہیں چاہتیں ورنہ کیا اماں سمندر پار گئی ہیں جو تم پیسے لے کر چاول منگوا نہیں سکتیں۔''

''اماں سے آپ پیسے لے کر چاول اور مٹر لے آئیں۔'' وہ کہہ نہیں سکی کہ اماں سے ایسی خرچے والی بات کر کے شامت بلوانا اسے پسند نہیں۔

''تم میری ماں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتیں۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

''اف میرے خدا! کیا کروں میں۔ سمجھتے ہیں اپنی ماں کی عادت کو۔ پتا بھی ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر کس طرح سناتی ہیں مگر پھر بھی سارے قصور میرے ہی کھاتے میں ڈالیں گے۔''

باہر سے اب اکبری خاتون کی گھن گرج کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً انوار نے مٹر پلاؤ کی فرمائش کر دی تھی۔ اماں اسے بے غیرت بے بس جیسے القابات سے نواز رہی تھیں۔

''احساس ہی نہیں کہ کس طرح خرچے پورے کرتی ہوں۔ بس بیوی نے جو کہہ دیا وہ پورا کرنا فرض ہو گیا۔ اس سے پوچھا ماں کے گھر کتنی بار مٹر پلاؤ بنتا تھا۔ خوب جانتی ہوں اس کے پچھلوں کو۔ کہیں کے کارخانے دار نہیں ہیں۔ یہاں آ کر شہزادی بن بیٹھی ہے۔ اوقات بھول گئی ہے اپنی۔''

اب اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ جا کر صفائی پیش کرتی۔ انہیں بتاتی کہ مٹر پلاؤ کا آئیڈیا اس کا نہیں، ان کے لختِ جگر کا ہے۔ اور وہ لختِ جگر، نورِ نظر او نچا پورا مرد سر جھکائے وہ سب سن رہا تھا جو اس کی بیوی اور اس کے میکے کے بارے میں کہا جا رہا تھا، ایک بار بھی وضاحت پیش کرنے کی جرأت نہیں کی۔

اب ظاہر ہے اسے کمرے میں گھس کر تو نہیں بیٹھے رہنا تھا۔ بہت سے کام اس کے منتظر تھے، سو ہمت کر کے اٹھی اور باہر آ گئی۔ سامنے ہی سسر صاحب کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ اسے دیکھا پھر انوار کو پھر خوامخواہ ہی مسکرائے۔ کم از کم اسے تو ایسے ہی محسوس ہوا اور پھر اخبار دیکھنے لگے۔

وہ کچن میں آ کر برتنوں کے ڈھیر کی جانب متوجہ ہوئی اور چپ چاپ انہیں رگڑنے لگی۔ جب اماں ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس کو خوب رگڑ چکیں اور خاموش ہوئیں تب انوار نے دھیرے سے کہا۔

''اماں! آپ کے ہاتھ کا مٹر پلاؤ کھانے کو دل تو میرا چاہ رہا تھا۔ اسے تو مٹر پسند ہی نہیں ہیں۔''

اماں نے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔ ویسے اس کی بیوی کے خلاف اتنا بولنے پر بھی انوار نے جس بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا اس سے اماں کا دل بیٹے کی طرف سے خاصا خوش ہو چکا تھا، اسی لیے اب خاموشی سے پیسے تھما دیے اور بولیں۔

''جا، جا کر لے آ مٹر بھی اور چاول بھی۔ مٹروں کے ساتھ ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈلوا لینا۔ میں خود تیرے لیے اپنے ہاتھ سے پکاؤں گی۔ یہ بدسلیقہ تو ہر چیز کا ستیا مار کر رکھ دیتی ہے۔ پتا نہیں اتنے سال ماں کے گھر کیا کرتی رہی ہے۔ کسی بات کا کوئی طریقہ نہیں ہے اس میں۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سودا لینے چلا گیا۔

اماں نے مٹر پلاؤ بنایا۔ خوشبو بتا رہی تھی بہت اچھا بنا ہوگا۔ مگر اس نے ایک چمچہ بھی نہیں لیا۔ دوپہر کی ایک روٹی رکھی تھی۔ وہی چائے کے ساتھ کھالی۔ پتا نہیں یہ احتجاج وہ کسے دکھانا چاہتی تھی۔ یہاں کون تھا جو اس کے نہ کھانے پر بے چین ہوتا، بار بار اس سے اصرار کرتا۔ انوار نے اماں اور بہنوں کے ساتھ بیٹھ کر سو سو تعریفیں کر کے کھانا کھایا۔ وہ کمرے میں لیٹی تکیے پر سر رکھے آنسو بہاتی اپنی پیاری ماں کو

یاد کرتی رہی۔

''کیا قانون ہے یہ قدرت کا۔ وہ جو جی جان سے زیادہ چاہتی ہے اسی کو چھوڑنا پڑتا ہے۔''

''ہاں جی ادھر لیٹی ہو۔ میں سمجھا باورچی خانے میں کام کر رہی ہو۔ کھائے تم نے چاول؟ اچھے بنے تھے ہے نا۔ اماں کے ہاتھ میں ذائقہ ہی بڑا ہے۔ زبان بھی کراری، ہاتھ بھی کرارا۔''

وہ خود ہی ہنسنے لگا۔ اس نے یونہی رخ موڑے ہوئے چپکے سے آنسو پونچھ ڈالے۔

❁ ❁ ❁

ایک سال گزر گیا اور اس ایک سال میں کیا کیا نہ ہو گیا۔ اس کی ماں دنیا میں واحد اس کی غم گسار اس کی محبت میں خود کو بھول جانے والی ماں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ کیسی قیامت بیت گئی اس کے دل پر مگر اس صدمے کو جھیلنے کے لیے وہ اکیلی ہی تھی۔ انوار کا افسوس بس رسمی سا تھا۔ اسے سنبھلنا تھا۔ اسے سنبھل گئی کہ وہ امید سے تھی اور اس کے رونے اداس ہونے پر فوراً کہا جاتا تھا۔

''ماں کا سوگ منانے بیٹھی ہے، آنے والے کی فکر نہیں ہے کہ اس سیاپے کا اس پر کتنا برا اثر پڑے گا۔''

''اور جو اس گھر میں گھٹن ہے، مجھ پر جو پابندیاں ہیں۔ ان کا کیا اثر پڑے گا۔ اس بارے میں کبھی کسی نے نہیں سوچا؟''

ماں دنیا سے کیا گئی۔ اس کا دل سہم سا گیا۔ وہ خود کو بالکل بے سہارا سمجھنے لگی۔ انوار کو دیکھ کر اکثر اسے خیال آتا کہ کیا شریکِ سفر اسے کہا جاتا ہے؟ زندگی بھر کا ساتھی اتنا بے گانہ اور بے اعتبار ہوا کرتا ہے؟

طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر کسی کام کے سلسلے میں اسے کوئی رعایت نہیں تھی کہ ''ان دنوں میں جتنا کام کرو اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔''

اس کی ساس اور بڑی آپا اکثر اسے بتایا کرتی تھیں کہ یہ جو کام وہ کرتی ہے وہ تو کچھ بھی نہیں۔ وہ دونوں تو ان دنوں میں صبح سے شام تک لگی رہتی تھیں کبھی دن میں کمر سیدھی کرنے کے لیے نہیں لیٹی تھیں۔

صبح سے سر میں درد اور طبیعت بے حد گری گری تھی۔ آج صدیقہ کو دیکھنے کچھ عورتیں بھی آ رہی تھیں۔ کام پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ عام دنوں میں تو صدیقہ ہاتھ بٹا ہی دیا کرتی تھی مگر آج اس کی اپنی تیاری ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

شام کو تین عورتیں لڑکے والوں کے مخصوص ٹھسے کے ساتھ تشریف لائیں اور آج تو اماں اور آپا کی خوش اخلاقیاں دیکھنے کے لائق تھیں۔ ان خواتین کی ہر بات کا جواب مسکرا کر اور نہایت اخلاق سے دیا جا رہا تھا ایک وہی تھی جو خاموش اور کچھ اکتائی ہوئی سی دکھائی دیتی تھی۔ عورتیں کھانے سے پورا انصاف کرنے کے بعد صدیقہ کے ہاتھ پر دو سو روپیہ رکھ کر اور انہیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر گئیں تو اکبری خاتون کے تو مارے خوشی کے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

''شکر ہے کسی کو صدیقہ پسند تو آئی۔''

''اصل میں بات یہ ہے کہ آٹھ بیٹے ہیں ان کے۔ چھ وہ بیاہ چکے ہیں گویا سارے ارمان نکل چکے ہیں۔ اب تو بس ان کے لیے اتنا کافی ہے کہ ساتویں نمبر والے کے لیے ایک عورت ذات تلاش کر لی جائے۔ اسی لیے انہوں نے لڑکی پر زیادہ غور ہی نہیں کیا۔ بس دیکھا اور ہاں کر دی۔''

آپا کی یہ بات صدیقہ کو جلتے انگارے کی طرح لگی۔

''آپ کا کیا خیال ہے، میں بدصورت ہوں، کوئی عیب ہے مجھ میں، جو ذرا غور سے دیکھے وہ پسند نہیں کر سکتا؟''

''پتا نہیں، یہ تو ان سے پوچھو، جو پہلے اس گھر میں آتی رہی ہیں اور کبھی کسی نے ہمیں اپنے پاس آنے کی دعوت نہیں دی۔ بھئی سچ کہتی ہوں صرف تمہاری خاطر ایسی ایسی موٹی بھینسوں کو لفٹ کرائی ہے جن کی باتیں سن کر جی کرتا تھا چپیڑیں مار کر گھر سے باہر نکال دوں اور یہ جو آج آئی تھیں، تو یہ مسکرا مسکرا کر میرا تو جبڑا دکھ گیا ہے۔''

''آہو، مسکرانے کی عادت جو نہیں ہے۔''

صدیقہ کو آپا کی باتوں پر اکثر ہی غصہ آ جایا کرتا تھا اور آج تو وہ سخت بری لگی تھیں کہ انہوں نے اس کی صورت کو نشانہ بنایا تھا۔

بڑی آپا بچوں کے ساتھ نہیں آئی تھیں کہ اماں نے منع کر دیا تھا۔ اب کہہ رہی تھیں۔

''چائے کے ساتھ جو کچھ بنا ہے وہ سب گھر لے کر جاؤں گی کہ میں صرف آپ لوگوں کے کہنے پر بچے گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔''

''اپنے بچوں کو تھوڑی تمیز سکھا دیں پھر ان کے آنے پر ہمیں اعتراض نہیں ہو گا۔''

صدیقہ کو بدلہ اتارنے کا موقع مل گیا۔ لڑائی پھر شروع ہو گئی۔ وہ برتن اٹھا کر کچن میں آ گئی اور تھکن سے چور سستی کے ساتھ دھونے لگی۔

رات کو ابا اور انوار گھر آئے تو یہ خبر بڑی خوشی کے ساتھ انہیں سنائی گئی۔ انہیں بھی اطمینان ہوا، رات جب انوار سونے کے لیے کمرے میں آیا تو خاصے خوش گوار موڈ میں تھا اور اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا۔

''ایک اور ڈیوٹی جبکہ میں اب سونا چاہتی تھی۔''

❁ ❁ ❁

صدیقہ کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی اور ساتھ ہی تیاریوں کا آغاز ہوا۔ اماں پانچ چھ جوڑے خوب بھاری کام والے ہونے چاہئیں۔ صدیقہ لاڈ سے فرمائش کر رہی تھی۔

''ہاں پیسے درختوں پر لگتے ہیں۔ کوئی فائدہ ہوتا ہے ان بھاری کپڑوں کا ایک بار بھی پہنے نہیں جاتے۔ میں نے تو بہو کی بری بھی ہلکی بنائی تھی۔ دیکھ لو کتنا کام آئی۔ وہی کپڑے یہ استعمال کر رہی ہے اور جہیز کے بھاری بھاری جوڑے بکسوں میں پڑے سڑ رہے ہیں، بس میں نے کہہ دیا۔ تمہیں نئے بھاری جوڑے بنانے کی ضرورت نہیں۔ سلمیٰ کے جو بھاری جوڑے کیڑوں کی خوراک بننے کے لیے پڑے

ہیں۔ان ہی میں سے تمہیں دے دوں گی۔“

اور سلمٰی نے چونک کر ساس کی جانب دیکھا مگر وہ ادھر متوجہ ہی کب تھیں۔

”انوار آجائے تو کرتی ہوں اس سے بات۔میرے جہیز کے کپڑوں پر کسی کا کوئی حق نہیں۔“

دن بھر وہ انگاروں پر لوٹتی رہی اور شام کو جب انوار آیا تو جا کر اماں کے کمرے میں بیٹھ گیا۔وہ رات کا کھانا بناتے ہوئے لفظوں کو ترتیب دیتی رہی کہ اسے انوار کے سامنے طریقے سے بات کرنا ابھی تک نہیں آیا تھا۔مگر بات کے جواب میں وہ یوں بھڑک جائے گا اسے گمان بھی نہ تھا۔

”بکسوں میں بند کپڑے جو تمہارے کسی کام کے نہیں اگر میری بہن کو مل جائیں گے تو اس میں برا کیا ہے۔تم اس گھر میں رہتی ہو۔ہر چیز استعمال کرتی ہو۔جو جی چاہے کھاتی پیتی ہو،کیا میں نے کبھی کوئی اعتراض کیا؟“

اس بات پر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔

اماں کی محبت سے مہکتے یہ جوڑے کسی اور کے ہوئے۔وہ گلابی جوڑا جس پر اماں نے بڑے ارمانوں سے اپنے ہاتھ سے ستارے ٹانکے تھے اور کہا تھا۔”جب میرے بیٹی اسے پہنے گی،شہزادی لگے گی۔“

”اور وہ انگوری کلر کا جوڑا جس پر دھاگے کا کام بڑے چاؤ سے کیا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر نیلا گوٹے والا سوٹ،اس کا دل یوں بھر آیا کہ ضبط نہ کر سکی۔اور ماں اور اس کی آنکھوں میں چمکتے خواب یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”اماں! کیوں تم نے دن رات ایک کر کے ایک ایک ٹانکا بھرا۔کیوں تم نے پیسے بچا بچا کر یہ جوڑے بنائے۔اماں! محبتوں سے گندھے یہ جوڑے میرے دل کا ناسور بن گئے ہیں۔“

اس کا جی چاہتا تھا وہ گھر آنے والی ہر عورت کو اس ظلم کے بارے میں بتائے،مگر دل کی بات مان لیتی تو پھر سر چھپانے کا آسرا نہ رہتا۔اب تو وہ بھی ایک ماں تھی۔اس کی گود میں ننھا عبران آچکا تھا۔اور اگر وہ لوگ عبران کو اس سے چھین لیتے پھر وہ کیا کرتی،جیتے جی مر جاتی۔

خاموشی ہی اس کے حق میں بہتر تھی۔کھلی آنکھوں سب دیکھنا دل کا کٹ کٹ جانا مگر پھر بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجانا اس کی مجبوری تھی۔

انوار ویسا ہی تھا۔اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ،ہنسی مذاق کرنے والا مگر دوسروں کے سامنے اسے اکیلا چھوڑ دینے والا۔اور اب اسے انوار کی باتوں،اس کے ہنسی مذاق کے جواب میں زندہ دلی دکھانے،اس کے ساتھ دینے اور کامیاب بیوی اچھی بیوی کا کردار ادا کرنے سے اکتاہٹ ہوتی تھی۔وہ ہنس کر کوئی معنی خیز بات کرتا اور یہ بجائے شرما کر مسکرانے کے بس ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھے جاتی۔

”مجھے لگتا ہے تمہیں اب میں اچھا نہیں لگتا۔“ وہ منہ پھلا لیتا،نخرے کرتا،غصہ دکھاتا وہ جواب میں ہاں کہتی نہ نا۔کسی کام کے بہانے سے اٹھ کر باہر آجاتی۔

اس کے دل کو سب سے زیادہ گلے انوار ہی سے تو تھے۔وہی تو تھا جو بڑے دھڑلے سے بارات

لے کر اس کی ماں کے خوشبوؤں سے مہکتے آنگن میں آیا تھا اور سلمٰی کے سارے حقوق اپنے نام لکھوا کر بدلے میں اپنا نام اور اپنا ساتھ اس کے لیے لکھ کر اپنے گھر لے آیا تھا۔

”میں کون ہوں اس کی؟“

وہ سو جاتا اور سلمٰی ننھے بیٹے کو گود میں لیے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش میں بیٹھی انوار کا چہرہ دیکھے جاتی۔

”سارا دن کام کرتی ہوں۔سب کی بے دام لونڈی ہوں اور پھر بھی بڑا احسان جتا کر کہتا ہے تم جو جی چاہے کھاتی پیتی ہو۔کیا میں نے کبھی ٹوکا ہے تمہیں۔“ آنسو پلکوں کا بند توڑ کر بہہ نکلتے۔”اگر اتنا کام میں گلی محلے کے گھروں کا کروں تو کپڑا روٹی تو دیں گے ہی پیسے بھی میرے ہاتھ آجائیں گے۔“

جہیز کی تیاری کے سلسلے میں بڑی آپا اکثر آجاتی تھیں۔اکبری خاتون کی پوری کوشش ہوتی شام کو وہ جلدی چلی جائیں۔اس کے میاں کو لینے نہ آنا پڑے مگر بڑی آپا واپسی کی تیاری میں ہی اتنی دیر لگا دیتیں کہ داماد صاحب انہیں لینے آپہنچتے۔

”کب سے بکواس کر رہی تھی جلدی کر لے جلدی کر لے مگر اسے ہمارا کیا درد۔میں جو پیسہ بچا بچا کر جہیز بنا رہی ہوں اب اس پیٹو کی خاطر مدارت میں کتنا خرچا اٹھ جائے گا۔“

وہ بڑبڑاتیں مگر مجبور نظر آتیں اور سلمٰی کو ان کے داماد کی آمد پر بڑی خوشی اور سکون کا احساس ہوتا کہ وہی تو تھا جو اکبری خاتون کو نیچا دکھا سکتا تھا۔وہ دل سے اس کی خاطر داری کرتی۔

”صدیقہ! رخصت ہوتے وقت سلمٰی بھابھی کو ساتھ ہی لے کر جاؤ گی۔“

جب اس نے چائے اور پکوڑے آپا کے میاں کے سامنے لا کر رکھے تو وہ کمرے میں موجود ساس بیگم،چھوٹی سالی اور صدیقہ پر نظر ڈال کر عجیب سا سوال کر بیٹھے۔

”اے ہے کیسی باتیں کرتے ہو جی! سلمٰی بھابھی کیوں ساتھ جانے لگی؟“

آپا کچھ حیرت سے کچھ بگڑ کر بولیں جبکہ اماں کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

”دیکھو نا،سارے کام تو سلمٰی بھابھی کرتی ہیں۔صدیقہ کو تو سسرال جا کر بڑی مشکل پیش آئے گی۔میرا تو خیال ہے ساتھ لے ہی جاؤ۔انوار میں تو تم لوگوں کو انکار کرنے کی جرأت نہیں۔اماں حکم کریں گی وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا کر یہ فیصلہ قبول کر لے گا،کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا سلمٰی بھابھی؟“

وہ کہنا چاہتی تھی۔”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ مگر کہہ نہیں سکی مگر اپنے ہونٹوں کو خفیف سی مسکراہٹ سے بچا بھی نہیں سکی۔

”میری بیٹیاں سب کاموں میں طاق ہیں۔“ اماں نے غصہ پیتے ہوئے اطلاع دی۔

داماد صاحب ہنسے اور ہنستے چلے گئے۔

”جب میری اور آپ کی بڑی صاحب زادی کی شادی ہوئی تب آپ نے میری اماں کو بھی یہی کہہ کر بے وقوف بنایا تھا۔“

اماں بل کھا کر رہ گئیں۔

''تُو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے جا کر ہانڈی کی فکر کر۔'' اماں نے سارا غصہ سلمٰی پر نکالا۔

یہ سن کر داماد صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور بولے۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں۔ اسے صدیقہ کے ساتھ کر دیں ورنہ وہاں جا کر کام کون کرے گا۔ اب ہر داماد میرے جیسا صابر و شاکر تو ملنے سے رہا کہ بیوی نے جو ملغوبہ تیار کر کے سامنے رکھا چپ کر کے کھا لیا۔''

''چلو واجدہ! اٹھاؤ اپنے بچوں کو رات ہو رہی ہے نکلنے کی کرو۔'' اماں، بڑی آپا کی طرف پلٹ گئیں۔

❁ ❁ ❁

صدیقہ بیاہ کر اپنے گھر کی ہوئی۔ اماں نے سکھ کا سانس لیا کہ خیر خیریت سے دوسری بچی بھی بیاہ دی۔ سلمٰی کو اس شادی سے کوئی فرق نہیں پڑا، وہی باتیں تھیں وہی اس کی دن بھر کی مشقت۔ ہاں جس روز شادی کے بعد صدیقہ اس کے جہیز کا نیلا سوٹ پہن کر ان کے ہاں آئی تھی، سلمٰی کا دل ایسا کٹ رہا تھا کہ تکلیف کی شدت سے وہ پیلی پڑ رہی تھی۔ اماں کی محبت ان کے ارمان یاد آ رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی۔

''کبھی میں بھی کسی کی پیاری ہوا کرتی تھی اور میرے پیار کرنے والوں کی یہ نشانیاں تک مجھ سے چھین لی گئی ہیں۔ اماں میری اماں!''

''میری بچی بیاہ کے بعد دوسری بار ادھر آئی ہے اور تُو اس کے آنے پر کھلے دل سے استقبال کرنے کے بجائے ٹسوے بہانے بیٹھ گئی ہے۔''

وہ باورچی خانے میں یادوں میں گم بیٹھی تھی جب ساس نے آ کر بڑی بے رحمی سے یادوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

❁ ❁ ❁

وقت کب رکا ہے۔ کوئی چاہے نہ چاہے آنے والے کی جگہ خالی ہو ہی جاتی ہے۔ اس کی ساس نے سوچا تھا بہو کو کبھی سر اٹھانے ہی نہیں دیں گی۔ مگر وہ بھول گئی تھیں کہ سب کچھ سوچ کے مطابق نہیں ہوا کرتا، بازار جاتے ہوئے ان کے رکشے کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ننھی ساتھ تھی اور دونوں کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ننھی کا چہرہ بگڑ گیا اور اماں کی ریڑھ کی ہڈی پر ایسی چوٹ آئی کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئیں۔

ننھی کے چہرے کے زخم تو بھر گئے مگر اس حادثے کی یادگار ایک نشان ہمیشہ کے لیے اس کے چہرے پر رہ کر اس کی قسمت کا دروازہ بند کر گیا اور وہ بس اماں کو سنبھالنے کے قابل ہی رہ گئی۔ وہ اپنے نصیب کی تاریکی پر ایسی حیران ہوتی کہ اکثر اماں کے کام کرنا ہی بھول جاتی۔ اکبری خاتون کے اس انجام نے سلمٰی کے اندر پہلے سے زیادہ خوفِ خدا پیدا کر دیا۔ وہ ان کے کام اکثر کر دیا کرتی تھی مگر اس

نے ان سے مخاطب ہونے، ان کے پاس بیٹھ کر دلجوئی کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

اب وہی گھر کی کرتا دھرتا تھی۔ انوار جو مہینے بھر کا خرچا پہلے اماں کو تھما دیتا تھا۔ اب وہ اس کے ہاتھ میں دیتا۔ صدیقہ اور بڑی آپا اب بھی آتی تھیں۔ دونوں ننھی کو سمجھاتیں۔

''سب کچھ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرو۔ انوار بھائی کے آگے پیچھے رہا کرو۔''

مگر جو کچھ ننھی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اس کے باعث اسے اب ایسی سیاستوں سے دلچسپی نہ رہی تھی۔

اکبری خاتون ایسی حالت میں سال بھر ہی جی سکیں اور ان کی وفات کے چھ ماہ بعد سلمٰی نے ننھی کی شادی ایک پچاس سالہ ایسے مرد سے کر دی جو پہلے بھی بیوی رکھتا تھا مگر اولاد کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ ننھی بہت روئی پیٹی۔ صدیقہ اور بڑی آپا نے بھی بہت شور مچایا۔ انوار اور ابا کو بھی ساتھ ملانا چاہا مگر یہ دونوں وہ مرد تھے جو شروع سے گھر کی سربراہ بن جانے والی عورت کو سب کچھ سونپ کر بے فکر ہو کر بیٹھ جانے کی عادت رکھتے تھے اور اب سربراہ سلمٰی تھی پھر ان کے خیال میں ننھی کے چہرے پر جو عیب تھا اس میں یہ رشتہ بھی غنیمت تھا۔

ننھی کی شادی پر تینوں بہنوں کو اس گھر میں سلمٰی کی اہمیت اور طاقت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہو گیا۔ اب اگر میکہ آباد رکھنا تھا تو اس سے بنا کر رکھنا مجبوری تھی۔

❁ ❁ ❁

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بچے جوان اور بڑے بوڑھے ہوتے چلے گئے۔

سلمٰی کے دونوں بیٹے بہت ہی لائق اور مؤدب نکلے اور پھپھیوں کو ان پر بے حد پیار آنے لگا۔ اس محبت کا مطلب سلمٰی خوب جانتی تھی۔ دونوں ہی بیٹیوں والی تھیں اور بیٹیاں بھی عام سی صورتوں اور عام سے گنوں والی جبکہ سلمٰی کی اکلوتی بیٹی رافعہ بھی بھائیوں کی طرح لائق، باادب اور خوب صورت تھی۔

کبھی اس کی تینوں نندوں میں بڑی دوستی ہوا کرتی تھی مگر اب تینوں ہی سلمٰی کے پاس آ کر ایک دوسرے کی شکایت کیا کرتی تھیں اور اپنی بیٹیوں کو اکثر ممانی کے ہاں رہنے کو بھیجا کرتی تھیں۔ لڑکیاں یہاں آ کر زبردستی ہی اس کے ساتھ کام کروانے، اس کی خدمت کرنے کی کوشش کرتیں اور سلمٰی کے دونوں بیٹے عبران اور سلمان خوب ہنسا کرتے۔

اور اس روز وہ عبران کے ہمراہ صدیقہ کی طرف آئی تھی اور صدیقہ اسے بتا رہی تھی۔

''میں نے اپنی ثروت کے لیے بہت کچھ بنا لیا ہے ایسی ایسی قیمتی کراکری خریدی ہے بھابھی! کہ جو دیکھتا ہے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کپڑے بھی بہت اچھے بنوائے ہیں۔'' پھر وہ اندر سے جارجٹ کا نیلا جوڑا لے آئی جس پر گوٹے کا بہت نفیس کام کیا گیا تھا۔

''دیکھو بھابھی! یہ جوڑا کتنا خوب صورت ہے میں نے بڑے ارمانوں سے بنوایا ہے۔''

اور سلمٰی پیچھے بہت پیچھے چلی گئی۔ وہاں جہاں اس کی ماں آنکھوں میں خواب لیے اس کا جہیز بنا رہی تھی۔ پیسے بچا بچا کر بیٹی کے کپڑے بنوا رہی تھی اور کہتی تھیں۔

''انہیں پہن کر میری بیٹی شہزادی لگے گی۔'' اس نے ایک نظر نیلے جوڑے کو پھر ثروت کو دیکھا اور اٹھ کر گھر چلی آئی۔

گھر آتے ہی اس نے سب کو فیصلہ سنا دیا۔

''میں عبران کے لیے ثروت کو مانگ رہی ہوں۔''

اس کے فیصلے پر سب کو حیرانی تھی کہ وہ تو نند کی بیٹی کو کبھی اس آنگن میں نہ لانے کا عہد دُہرایا کرتی تھی۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا اسے اب رسم نبھانی ہے۔ ساس کی روایت کو آگے بڑھانا ہے اور شاید اس طرح کر کے وہ اپنی اماں کی محبت کا کچھ قرض ادا کرنا چاہتی تھی۔ طریقہ صحیح تھا یا غلط مگر کمزور جب زور پکڑتا ہے تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ چار دیواری میں بھی اور معاشرے میں بھی۔

یہ حادثات محبت

''**دوبار** دستک دی ہے جی میں نے دروازے پر، صاحب دروازہ نہیں کھول رہے۔'' نذیراں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹے کے انتظار میں بیٹھی حسنہ بیگم کو آ کر اطلاع دی تھی۔

''رات کتنے بجے گھر آیا تھا داور؟'' حسنہ نے پوچھا۔

''رات کو بڑی دیر سے آئے تھے جی! میں اور سکھاں اپنا کام نبٹا کر کوارٹروں کی طرف جا رہی تھیں تو ہم نے ان کی گاڑی کی آواز سنی تھی۔ میں تو کہتی ہوں اب آپ جلدی ان کی شادی کر دیں۔ دیکھ لینا جی ثمین بی بی آ کر ساری عادتیں ٹھیک کر دیں گی۔ آخر کو وہ کالج میں لڑکیوں کو پڑھاتی ہیں نا جی!'' نذیراں نے اپنی طرف سے بہترین مشورہ دیا تھا اور شاید واقعی اس مسئلے کا حل بھی یہی تھا۔ تب ہی داور ٹیبل پر آ گیا۔ انہیں سلام کیا اور اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔

''اتنی دیر؟ تمہیں پتا ہے، میں ناشتا تمہارے ساتھ کرتی ہوں۔''

''رات بہت دیر تک نیند نہیں آئی اماں جی!'' چھتیس سالہ داور حسین کی آنکھیں کم خوابی کی چغلی کھا رہی تھیں۔

''نیند کیوں نہیں آتی تمہیں؟ آخر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ، داور اللہ کے شکر گزار بندے بننے کی کوشش کرو، ہر نعمت تمہارے پاس ہے، لیکن میں نے کبھی تمہیں خوش نہیں دیکھا۔''

''اللہ نے اس وجود میں روح بڑی بے چین ڈال دی ہے، ماں جی!''

''پھر ناشکری۔'' وہ ناگواری سے بولیں۔

''یہ جو ہم آرٹسٹ لوگ ہوتے ہیں نا یہ ہمیشہ بے چین رہتے ہیں اور یہ بے چینی ہی ہم سے ایسے اشعار کہلوا دیتی ہے، ایسے پورٹریٹ بنوا لیتی ہے کہ ہمارا نام ہمارے بعد بھی زندہ رہ جاتا ہے، گویا ہم مر کر بھی نہیں مرتے اور اس احسان کی قیمت کے عوض قدرت ہمیں ہمیشہ مضطرب رکھتی ہے۔''

''میں آج ثمین کی طرف جاؤں گی۔'' انہوں نے بغور بیٹے کو دیکھتے ہوئے اس کی منکوحہ کا نام لیا

تھا۔ وہ اس نام کے ساتھ اس کے چہرے پر جو رنگ دیکھنا چاہتی تھیں۔ نظر نہیں آیا اور انہیں مایوسی ہوئی۔

''تم خوش نہیں ہوا اس رشتے پر، لیکن یاد رکھو، شرفاء میں نکاح بہت اہمیت رکھتا ہے۔''

''ہوں!'' داور حسین نے لب بھینچے اور روشن پیشانی پر ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔

''کیا تمہیں ثمین پسند نہیں ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے ماں جی! سب ٹھیک ہے۔ ثمین آپ کے میکے کی ہے۔ آپ کو پسند ہے بس ٹھیک ہے۔''

''کیا ٹھیک ہے؟'' وہ جذباتی ہو کر ذرا اونچی آواز میں بولیں۔

''تو آپ کیا چاہتی ہیں مجھ سے، میں کیا اس کا نام سن کر ناچنے لگ جایا کروں۔ اس کا ذکر سن کر پھر کچھ اور سننے کی خواہش نہ کروں، کیوں آخر کیوں؟''

''مجھے لگتا ہے میں اس لڑکی کو اس گھر میں لا کر زیادتی کر رہی ہوں اس کے ساتھ۔''

''ماں جی! میں بیٹا ہوں آپ کا، کسی بھی عمر کو پہنچ جاؤں۔ آپ کے لیے بچہ ہی رہوں گا، لیکن پھر بھی یہ یاد رکھیے کہ میں چھتیس سالہ مرد ہوں اور ثمین بھی کوئی سولہ سترہ سالہ لڑکی نہیں ہے۔ میچور ہے اور ایک کالج میں لیکچرار ہے۔''

''تجھے کیا پتا پگلے! عورت عمر کی کسی بھید ہائی میں پہنچ جائے۔ اس کا دل بند کلی کی طرح نازک اور اَن چھوا ہی رہتا ہے۔''

''اور آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ ثمین بی بی میری محبت میں دیوانی ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور جیسے انہیں لاجواب کرنے کو یہ سوال اٹھایا تھا۔

''شریف خاندان کی نیک، پاک باز بچی ہے اور ایسی لڑکیاں جس کی ہو جائیں، اسی سے دل بھی لگاتی ہیں۔''

''چلیے۔ آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔ ناشتا کیجیے۔ پہلے ہی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اس نے تیزی سے بات پلٹ دی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ کمرے میں آیا اور یہاں اس کی سائیڈ ٹیبل پر ثمین کی تصویر حسنہ بیگم نے ابھی کچھ دن پہلے بڑے اہتمام سے سجائی تھی۔ یہ نکاح کے موقع پر لی گئی تصویر تھی۔ خوب صورت کام کا دوپٹا سر پر ٹکائے نفیس میک اپ اور جگمگاتی جیولری کے بیچ اس کی اپنی شخصیت سج تو گئی تھی لیکن چھپ بھی گئی تھی۔ یہ صرف ایک دلہن تھی، جبکہ وہ ثمین سے ایک دو بار ویسے بھی مل چکا تھا، اٹھائیس سال کے قریب عمر کی یہ لڑکی جو ایک مقامی کالج میں لیکچرار تھی۔ اپنے بھائی، بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اپنے باپ کے لیے ذہین فطین بیٹی اور ماں کے لیے عقل و دانش کا سمبل تھی۔ اس کا ہر، ہر انداز سنجیدگی اور پختگی لیے ہوئے تھا۔ وہ بہت زیادہ حسین و جمیل نہیں تھی۔ اس کے باوجود بے پناہ خود پسند تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے ہمیشہ سے سراہنے والے بہت ملے تھے۔ وہ بلا کی پراعتماد تھی۔

تب صرف ان دونوں کی بات ہی طے ہوئی تھی، حسنہ بیگم نے صرف اس کو گھر بلوانے اور داور سے ملوانے کے لیے میلاد کا اہتمام کروایا تھا اور اسی کی خاطر گھر کو اندر باہر سے اس قدر سجایا تھا کہ پورے

پندرہ دن اس پر کام ہوتا رہا تھا۔

''تمہیں اچھا لگا اپنا گھر؟'' انہوں نے ہونے والی بہو کو اپنے ساتھ لگا کر پوچھا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن ماں جی! آپ اب اس گھر میں کچھ تبدیلیاں کیوں نہیں کروا لیتیں۔ دیکھیے نا۔ یہاں داخل ہوتے ہی ایسا لگتا ہے ہم پچھلی صدی میں داخل ہو گئے ہیں۔''

''چلو تم اپنا کمرا اپنی مرضی سے سیٹ کر لینا۔'' اور حسنہ بیگم کی اس بات پر جہاں ثمین نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، وہاں داور نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا اور اس وقت ایک شکن اس کے ماتھے پر نمودار ہوئی تھی۔

اس روز ثمین نے گھر کی ایک ایک جگہ کو دیکھتے ہوئے بے شمار اعتراض کیے۔ اسے لان میں لگے پودوں پر بھی اعتراض تھا اور داور نے سب سن کر صرف یہی سوچا تھا، کچھ لوگ ہوتے ہیں دوسروں کی سوچ ان کی پسند کی ذرا پروا نہ کرنے والے، بے دردی سے تجزیہ کرنے اور منہ پر کہہ دینے والے، اف تو کیا یہ میرا بھی نصیب بننا تھا۔ یہ لڑکی جس کا نام ثمین ہے، جو چار بیڈ روم والے ایک عام سے گھر میں رہتی ہے۔ ایسے علاقے میں جہاں اپر مڈل کلاس بستی ہے۔ اس نے ساری عمر ایسا محل اگر دیکھا بھی ہوگا تو اس میں داخل ہونے کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا، لیکن اس کا غرور اور اس کی شخصیت پر پڑا پردہ کتنا دبیز ہے۔ یوں لگتا ہے یہ کسی ایسے ہی محل سے یہاں آ گئی ہے، بلکہ اس سے بہتر محل سے جب ہی تو اسے یہاں پر کچھ بھی پسند نہیں آ رہا تھا۔

اس وقت وہ دونوں ماں، بیٹا اس وقت بیرونی طرف والے برآمدے میں کھڑے تھے۔ وہ ثمین کو رخصت کرنے کے لیے یہاں تک آئے تھے اور ادھر ہی رک گئے تھے۔

سامنے لان میں مغلیہ طرز پر بنائے دو فوارے چل رہے تھے اور آبشار کا ڈیزائن بھی وہی صدیوں پرانا تھا۔ مگر یہ داور نے بہت شوق سے بنوایا تھا۔

''کہاں گم ہو تم؟'' حسنہ بیگم کا خیال تھا وہ ثمین سے مل کر بہت خوش ہوگا، لیکن اسے تو چپ لگ گئی تھی اور پھر اس چپ کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی۔

''میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔''

''کب تک واپس آؤ گے۔ اس وقت شام تو اتر رہی ہے۔''

''میں دو، تین روز میں آ جاؤں گا۔''

''دو، تین روز، مگر کہاں جا رہے ہو؟'' وہ اب کے جھلائی تھیں۔

''جھنگ والی زمینوں پر جا رہا ہوں۔ بڑے دنوں سے چکر نہیں لگا۔''

''صبح چلے جانا۔''

''نہیں۔ مجھے ابھی جانا ہے۔''

اور وہ جانتی تھیں اس کا ارادہ اٹل ہے۔ اب ان کی سنے گا بالکل نہیں۔

''امی! آپ اس جنگلی کو کھانا الگ سے دیا کریں۔ یہ ٹیبل پر بیٹھ کر جس طرح کھاتا ہے نا، پھر

میرے لیے تو ایک نوالہ لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔'' ثمین اپنے بھائی ثاقب کی جانب ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی اور ثاقب کی سمجھ میں اپنی غلطی بالکل نہیں آ رہی تھی، وہ کچھ شرمندہ سے انداز میں سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔

''ثاقب! تم تمیز کے ساتھ کیوں کھانا نہیں کھاتے۔'' ماں نے ڈانٹا۔

''مگر مجھے بتائیں تو میں نے کیا کیا ہے؟'' اب ماں کیا بتاتی۔ اسے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ثاقب سے کیا گستاخی ہو گئی ہے۔

''یہ پلیٹ دیکھی ہے اس کی۔ انبار لگا رکھا ہے۔ آخر یہ سب کچھ یہیں رکھا ہے۔ تم آرام سے کھا سکتے ہو، لیکن ندیدے ہو، لالچی پن ختم ہی نہیں ہوتا تمہارے اندر سے۔''

''بیٹی تم کیوں اپنا کھانا خراب کرتی ہو۔ دیکھو تمہاری ماں نے کتنی محنت سے تمہاری پسند کی ایک ایک ڈش بنوائی ہے۔'' باپ نے پچکارا۔

''یہ سب مجھے بھی پسند ہے۔'' ثاقب پھر بے تکی سی ہنسی ہنس کر بولا تھا۔

''تو پھر تم ہی کھاؤ۔ میں نہیں کھا رہی۔'' وہ جھٹکے سے اٹھی اور سب کے پکارنے کے باوجود اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

''دیکھا کر دیا نا موڈ خراب اس کا۔'' ماں نے گھور کر ثاقب کو دیکھا، جو اس جرم کے بعد اپنی پلیٹ بھی چھوڑ کر بیٹھ گیا تھا، اس کے باقی کے تینوں بھائی، بہن جو اس سے چھوٹے تھے، وہ بھی ملامتی انداز میں اسے گھور رہے تھے۔

''شہوار اٹھو۔ آپی کو کھانا اس کے کمرے میں دے کر آؤ، سارا دن کی تھکی ہاری کھانا کھانے بیٹھی تھی بے چاری۔'' انیقہ بیگم نے چھوٹی بیٹی سے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو ثاقب! تم بھی کھانا شروع کرو، یہ فضول کے نخرے مت دکھاؤ۔'' اب کے ثاقب کو گھر کا اور اس نے پھر پلیٹ کی جانب ہاتھ بڑھا دیے۔

ثمین اس متوسط طبقے کے گھرانے کی بڑی بیٹی تھی، ذہین لائق فائق اونچی اڑان اڑنے کی خواہش رکھنے والی، خدا نے رنگت بے حد صاف دی تھی۔ ماں سنوار کر رکھتی اور وہ بچی سب کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی۔ پورے چھ سال تک وہ اکلوتی بیٹی رہی اور ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بن کر رہی، پھر چھ سال کے بعد ثاقب اس دنیا میں آیا۔ وہ بھی بہن کی طرح گورا چٹا تھا، بلکہ نقوش اس سے بھی اچھے تھے۔ لیکن بے حد کمزور اور بیمار۔ وہ ہر وقت روتا رہتا تھا۔ انیقہ کے لیے تو اسے سنبھالنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔ اسے اس کی نانی ہی دیکھتی تھیں اور ثاقب کے ڈیڑھ سال کے بعد شہوار اور پھر دو سال کے بعد عاقب دنیا میں آئے، وہ دونوں ہی اپنے والدین کی طرح عام سی صورتوں والے عام سی رنگت والے بچے تھے، نہ تو بہت ذہین، نہ ثاقب کی طرح بیمار اور کند ذہن۔

عمر کے پہلے دس سال ثاقب نے بیماریوں سے لڑتے اور اپنوں کے بے زار رویے کو دیکھتے ہوئے گزارے۔ وہ ثمین کے مقابلے میں کچھ بھی تو نہیں تھا اور وہ کبھی اس جیسا بن بھی تو نہیں سکتا۔ وہ کبھی کلاس میں اچھی پوزیشن تو کیا پہلی دس پوزیشنز میں بھی شامل نہیں ہو سکتا۔ وہ زندگی میں کبھی کچھ نہیں کر

سکتا۔ یہ وہ خیالات تھے جو اس نے اپنے ذہن میں بٹھا لیے تھے۔ وہ دس سال کی عمر میں بھی اپنی کلاس میں پیچھے تھا، جبکہ ثمین عمر کے لحاظ سے کلاس میں آگے تھی۔

جب وہ بارہ سال کا تھا تو نانی کی وفات ہو گئی اور وہ اپنے والدین کے پاس آ گیا۔ اتنے سالوں کی دوری، کبھی کا ملنا ملانا، وہ تو اپنوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اجنبیوں میں تھا۔ وہ جو بہت تکلیف دہ تھے، خاص کر ثمین جسے اس کی ہر بات پر اعتراض ہوتا تھا۔ وہ جو خود بھی پڑھ رہی تھی۔ شام میں ٹیوشن بھی دے رہی تھی۔ جس کے مشورے پر سارا گھر چل رہا تھا، جس کی ہر بات غور سے سنی جاتی اور اس پر عمل بھی یقینی ہو جاتا تھا۔ وہ چھوٹے بہن بھائی کے ساتھ بہت رعب سے بات کرتی تھی، لیکن وہ دونوں ایک تو آپس میں دوست تھے۔ دوسرے وہ برے نہیں اوسط درجے کے طالب علم تھے اور تیسری بات شاید یہ کہ وہ بچپن سے ثمین کو دیکھتے آ رہے تھے۔ عادی تھے اس کے اور پھر یہ کہ وہ ثاقب کی طرح جسمانی طور پر بے حد کمزور اور احساس کمتری کا شکار بھی نہیں تھے۔

ثاقب کی کمزور شخصیت، کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ وہ اس گھر کا بیٹا تھا۔ لیکن ایک عضو معطل کی طرح۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا وہ کبھی زندگی میں کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس کے والدین پڑھے لکھے اور سوشل تھے۔ گھر میں لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا اور ہمیشہ سے ثاقب کا تعارف ہر آنے جانے والے سے بڑی شرمندگی سے کروایا جاتا تھا۔ جب وہ نانی کے ہاں رہتا تھا، تب بھی یہی صورت حال تھی اور اب جبکہ اسے یہاں آئے بھی کئی سال ہو رہے تھے وہ تب بھی وہی تھا نکما، نالائق باعثِ شرمندگی۔

تعلیم مکمل کرتے ہی ثمین کو کالج میں جاب مل گئی، اور اس نے اعلان کیا کہ اب وہ اس گھر کے حالات بدل کر رکھ دے گی۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ہم ابھی تک اس چار بیڈ روم والے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے ہیں۔ وہ ذہین تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مادیت پرست اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو جانے والوں میں سے بھی تھی یہ اور بات کہ وہ بظاہر بڑی بے نیاز دکھائی دیتی تھی اور اس نے کبھی کسی دوست، کسی رشتہ دار یا ملنے والوں میں سے کسی کی بھی تعریف نہیں کرتی تھی، جیولری، مہنگا لباس، جوتے، پرفیوم کسی کے پاس کیا، کیا ہے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ مغرور اپنے آپ میں گم رہنے والی لڑکی ان چیزوں کی کتنی شدید خواہش رکھتی ہے۔

اس نے جاب شروع کی تو ابا نے ثاقب کو محلے میں ہی جنرل اسٹور اسٹارٹ کروا دیا۔

''میں تو ابھی پڑھنا چاہتا تھا۔'' اس نے کمزور سا احتجاج کیا۔

''پڑھ لکھ کر کون سا تیر مار لو گے تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔'' ابا سے زیادہ ثمین نے اس کی مزید پڑھنے کی خواہش کا مذاق اڑایا اور مخالفت کی، ثاقب کو دکان سنبھالنا ہی پڑی۔

حسنہ بیگم، ثمین کے ابا کے دور پار کے عزیزوں میں سے تھیں۔ ان کے والد اپنے وقت میں شہر کے مشہور سرجن تھے اور حسنہ کی شادی ان کے خاندانی نواب دوست کے بیٹے سے ہوئی تھی۔ حسنہ بے حد سادہ مزاج کی نیک نیت خاتون تھیں۔ اتنے بڑے گھرانے کی بہو بننے کے بعد بھی مزاج کا وہی رنگ تھا، وہ اپنے دور پار کے عزیزوں کے ہاں اب بھی جایا کرتی تھی۔

کسی شادی کے فنکشن میں ہی انہوں نے ثمین کو دیکھا۔ اس لڑکی کا ٹھہرا ٹھہرا انداز اور رکھ رکھاؤ

انہیں متاثر کر گئے۔ سو رشتہ مانگ لیا۔ انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے پہل تو ثمین حیران ہوئی، پھر بے حد خوش اور پھر سوچا ایسا تو ہونا تھا۔ ثمین کوئی عام سی لڑکی تھوڑا ہی ہے۔ اس کے لیے ایسے ہی گھر سے رشتہ آنا چاہیے تھا۔

داور کی تصویر دیکھی تو پہلی بار کچھ ٹھٹکی۔ کچھ الجھی، اتنا خوب صورت مرد، ایسا تو میں نے نہیں سوچا تھا، نہ ہی میری ایسی کبھی خواہش رہی ہے۔ خوبرو مرد پر قابو پانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اسے احساس ہوا وہ داور کے مقابل کی نہیں ہے۔ لیکن اس کی ماں نے پسند کیا ہے مجھے، آخر ایسا کچھ خاص تو ہے نا مجھ میں۔ لیکن حسنہ کے بارے میں تو ہر کوئی یہی کہتا ہے سادہ مزاج کی خاتون ہیں۔ ضروری نہیں جو ماں نے مجھ میں دیکھا اور پسند کیا وہی بیٹے کو بھی پسند ہو۔

✡✡✡✡

قدیم شہر کا قدیم بازار، گلیاں اور چھوٹی چھوٹی لیکن سامان سے لدی ہوئی دکانیں، یہ متوسط طبقے کا بازار ہے، لیکن داور اکثر ادھر آتا تھا۔ وہیں ایک پرانی طرز کا ہوٹل ہے صدیوں سے چلا آرہا ہے۔

آج بھی وہ بڑے موڈ میں اپنے دوست اور منیجر عزیز کے ہمراہ ادھر آیا تھا۔ کپڑے کی چھوٹی سی دکان سے وہ نکلی تھی اور بے خبری میں اس سے ٹکرا گئی تھی۔ داور تھام نہ لیتا تو گر پڑتی اور اچھا تھا جو تھام نہ لیتا کہ اب جو بجلی دل پر گری تھی اس سے تو بچ جاتا۔ لوگ کہتے ہیں آئیڈیل نہیں ملا کرتے۔ سوچ کے تراشے یہ بت بس ذہن تک ہی محدود رہتے ہیں۔ لیکن وہ تو وہی تھی، جسے اس نے سوچا تھا اور جس کی تصویر بنانے کی کئی بار کوشش کی تھی لیکن یہ معصومیت وہ کبھی کینوس پر اتار نہیں سکا۔

''پلیز!'' وہ اس کے بازوؤں میں تھی اور اس کے دیکھنے کے انداز پر جتنا بھی نروس ہوتی کم تھا۔

داور چونکا اور اس پر جمے ہاتھوں کی آفت ڈھیلی کر دی وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی اور پھر اسی رش کا حصہ بنتی چلی گئی، جو اس بازار کا معمول تھا۔

''آپ کو کیا ہوا ہے داور صاحب؟'' عزیز جانتا تھا وہ حسن پرست ہے۔ وہ عزیز کی آواز سن کر ہی چونکا اور بولا۔

''عزیز کہاں گئی ہے وہ، دیکھو دیکھو کہیں اتنے ہجوم میں کھو نہ جائے۔ لیکن وہ کھو چکی تھی۔ ان پتلی گلیوں میں جہاں لوگوں کو قطار در قطار چلنا پڑتا تھا یہاں دوڑ کر اِدھر اُدھر اسے تلاش کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کیسا کھانا کہاں کے ذائقے وہ سب بھول کر صرف اسی کی تلاش میں تھا جو دوبارہ نظر ہی نہیں آئی۔ تلاش بے سود رہی لیکن وہ مایوس نہیں تھا۔ یہیں کہیں قریب ہی رہتی ہوگی۔

وہ نہیں ملی پھر دل کہیں نہیں لگا، وہ گھر آ گیا۔ لائبریری کے ایک حصے میں جہاں وہ اور اس کے شوق ہوا کرتے تھے۔ وہاں اس کے تصور کی کئی ادھوری تصاویر پڑی تھیں۔ وہ حسن پینٹ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بلور کی طرح چمک دار آنکھیں، روشن پیشانی، بھرے بھرے ہونٹ اور گلاب رنگ میں ڈوبی صاف چمک دار رنگت اور جسے اس نے چھوا تھا وہ لمس اب تک ہاتھ کی پوروں پہ احساس بن کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ یہ سب اپنی تصویر میں دکھا سکے گا۔ نہیں کبھی نہیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔

بہت دیر لائبریری میں بیٹھ کر یہ انہونی انجوائے کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہ کمرا جہاں اس کے سرہانے کے بالکل قریب ثمین کی تصویر تھی اور یہ تصویر تب لی گئی تھی جب ان کا نکاح ہوا تھا۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا پھر سر جھٹک دیا۔ وہ کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا، وہ مل گئی تھی اور اب اسے پانا تھا۔ کیسے؟ کس طرح؟ اس کے لیے کیا کیا کرنا ہوگا؟ کون سا رشتہ توڑنا ہوگا تو فی الحال وہ یہ سب نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

یہ سب اس نے آنے والے دنوں میں سوچا اور اس کا حل تو بڑا آسان لگا وہ بیک وقت دو بیویاں رکھ سکتا ہے اور اگر ثمین کو اعتراض ہوا تو وہ ثمین کو بڑے آرام سے چھوڑ سکتا ہے۔

پھر پرانے شہر کی اس آبادی کے اس نے بہت سے چکر لگائے۔ وہ بار بار اس بازار سے گزرا اور پورے سات دن بعد بھی جب ناکامی ہوئی تو وہ سوچنے لگا کیا واقعی حقیقت میں، میں نے اسے دیکھا تھا کہیں وہ میرے تخیل کی ہی پیداوار تو نہ تھی۔

شاید وہ اس پر یقین بھی کر لیتا اگر جو دوسری بار بھی اسے وہی صورت دکھائی نہ دے جاتی۔ اس روز وہ پی سی میں لنچ کے بعد گاڑی میں ملک کے معروف سیاست دان کے ساتھ تھا۔ موضوعِ گفتگو بے حد سنجیدہ تھا جب اچانک اس کی نگاہ قریب سے گزرتی کالج وین پر پڑی اور وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ اف اب کیا کروں، اس نے بس ایک جھلک ہی دیکھی اور وین مخالف رخ پر مڑتی چلی گئی لیکن اس نے پہچان لیا تھا وہ وہی تھی اگر جو یہ بزرگوار ساتھ نہ ہوتے تو پیچھا کرتا۔ اس کے بعد کی گفتگو اس نے غیر حاضر دماغی کیفیت کے ساتھ کی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا داور صاحب؟'' آخر ان صاحب کو پوچھنا پڑا۔

''نہیں میری طبیعت واقعی خراب ہو رہی ہے۔'' وہ اس وقت تنہائی چاہ رہا تھا، اس کے لیے بہانہ تو کرنا ہی تھا نا!

اس روز شام تک وہ بے کل رہا اور پھر اس نے سوچا اگر دوسری بار ملی ہے تو تیسری بار بھی مل سکتی ہے۔ وہ اسی شہر میں رہتی ہے یقیناً اب تک میں نے جی جان سے اسے تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، ورنہ مل چکی ہوتی خیر ابھی بھی کچھ بگڑا تھوڑی ہے۔ میں اسے تلاش کر بھی لوں گا۔ وہ یقیناً کالج میں پڑھتی ہوگی اور وین روزانہ اسی راستے سے گزرتی ہوگی تو پھر اس تک پہنچنا کون سا مشکل کام ہے۔ اس سوچ نے اسے بے حد مطمئن کر دیا تھا۔ آج بڑے دنوں کے بعد وہ سکون کی نیند سویا تھا۔

✡✡✡✡

''اے، اے دیکھ تو ثریا اپنی لڑکی کی نادانیاں، میں کہے دیتی ہوں اگر یہی لچھن رہے تو اگلے گھر جا کر ہم سب کی ناک کٹوائے گی۔ کہنے کو کالج میں پڑھ رہی ہے اور عقل دیکھو تو نام کو بھی نہیں ہے۔''

نانی کو جلال آیا کس بات پر ہے۔ زریں کی سمجھ میں تو اب تک یہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ سفید دوپٹے پر زردے کے چاول پھیلانے کے بعد حیران کھڑی نانی کی صورت تک رہی تھی۔

''ستیاناس جائے تیرا زریں! میں پوچھتی ہوں کیا نشہ کرتی ہے جو کچھ سجھائی نہیں دیتا، لے کے ماں کا اتنا پیارا سفید دوپٹا خراب کر دیا۔'' ماں نے کمر پر ہاتھ جڑنے کے بعد غلطی سے بھی آگاہ کر دیا۔

''اوہ!'' اس نے ہونٹ سکیڑ کر سفید دوپٹے کی جانب دیکھا، جس پر اب جگہ جگہ پیلے نشان پڑ چکے

تھے۔

''جاؤ جا کر برتن دھوؤ۔ یہ کھانا بنانا سلیقہ مند بیبیوں کا کام ہے۔ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔'' ماں سخت خفا تھی اور نانی اب بھی بڑبڑا رہی تھیں۔

''دیکھیے نا میں نے کوئی جانتے بوجھتے تھوڑا کیا ہے اصل میں میرا دھیان کل کے ٹیسٹ کی طرف تھا تو مجھے بالکل خیال نہیں آیا۔ چاول سفید وپٹے پر نہیں پھیلانے چاہئیں۔''

''چل شکل گم کر۔ جا چلی جا یہاں سے اور جا کر کتابوں میں سر دے کر بیٹھ جا۔ کم بخت اگلے گھر جائے گی، تب ماں اور نانی کی قدر ہوگی۔ کتنی بار کہا ہے جو کام بھی کیا کر دھیان سے کیا کر مگر نا۔ سننا کس نے ہے۔''

''خالہ ثریا آپ کے گھر کچھ مہمان آرہے ہیں۔'' محلے کے بچے نے آ کر اطلاع دی۔

''کون مہمان؟'' اپنی خفگی بھول کر وہ متوجہ ہوئیں۔

''وہی آپ کے گاڑی والے رشتے دار جو کبھی کبھی ہی آیا کرتے ہیں۔''

''ارے یہ تو انیقہ آپا کی بات کر رہا ہے شاید۔'' ثریا نے جلدی سے چارپائی پہ دھرے دھلے کپڑے اٹھانے کی کوشش کی۔

''اے کیا انیقہ کو یہاں صحن میں بٹھاؤ گی۔'' نانی نے انہیں جلدی جلدی کپڑے اٹھاتے دیکھ کر طنزیہ انداز میں جتایا۔

''نن۔۔۔نہیں تو اماں! وہ تو میں بس۔'' انہوں نے سٹپٹا کر کپڑے دوبارہ پٹخ دیے تو زریں ہنسنے لگی۔

اتنی دیر میں مہمان چھوٹا سا صحن عبور کر کے ادھر ہی آرہے تھے۔ نانی کمرے کے دروازے تک آئیں اور ٹھٹکیں۔ انیقہ یعنی ان کی رشتے کی بھتیجی اکیلی نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی وہی بیٹی جو خاندان کی سب سے لائق فائق لڑکی تھی۔ کسی کالج میں پڑھاتی تھی اور بقول انیقہ بیگم اس نے خاندان بھر کا نام روشن کر دیا تھا۔ کہاں کسی غریب رشتہ دار کے ہاں آتی تھی۔ بہت سال پہلے کسی رشتہ داری کی شادی میں دیکھا تھا لیکن نانی کو شکلیں کہاں بھولتی تھیں۔ اب جو دیکھا تو جھٹ پہچان لیا۔

''ارے انیقہ! یہ تمہاری بڑی لڑکی ہے نا۔ کیا بھلا سا نام تھا، ذہن سے نکل گیا۔''

''جی پھپھی! یہ میری ثمین ہے ماشاء اللہ سے فخر ہے یہ ہمارے گھر کا۔ ایسی بیٹیاں نصیبوں والے کے ہاں ہی جنم لیتی ہیں۔'' ثریا ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھانا چاہتی تھیں کہ ان کا موڈ تو نانی کے کمرے میں بیٹھنے کا ہو رہا تھا۔ نانی کی بدرنگ آئینہ ٹوٹی سنگھار میز اور پرانا سا پلنگ جس کی بیڈ شیٹ اپنا رنگ و روپ نقش و نگار سب کھو چکی تھی۔ ثریا اور نانی دونوں انہیں گھیر گھار کر اپنے ڈرائنگ روم (کہ وہ آنے والوں کے لیے ڈرائنگ روم ہرگز نہیں تھا) میں لے آئیں۔

یہاں چھوٹے سے کمرے میں لکڑی کی چار نازک نازک کرسیاں دھری تھیں۔ ایک سنگل بیڈ جس پر نئی بیڈ شیٹ پڑی تھی اور کرسیوں کے درمیان ایک عدد میز جس پر انتہائی فضول سا گلدان دھرا تھا۔ ثمین نے چاروں طرف تنقیدی نظر سے دیکھا۔ اور اس گھر کا موازنہ اپنے گھر سے نہیں، داور کے گھر سے کر ڈالا

اور غرور سے گردن مزید تن گئی۔ ہونٹوں پر تمسخرانہ ہنسی ابھری اور پھر چپک کر رہ گئی۔

''پھپھی آپ کی نواسی دکھائی نہیں دے رہی۔'' کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انیقہ بیگم نے پوچھا تو ثریا نے یہیں سے زریں کو آوازیں دینا شروع کر دیں اور دوسری آواز پر دوپٹے کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی زریں سامنے آ گئی۔ اس نے بڑے ادب سے دونوں کو سلام کیا پھر سوالیہ انداز میں ماں کی جانب دیکھنے لگی اور ثمین جو ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ آنکھوں میں سرد مہری اور غرور لیے بڑے لیے دیے انداز میں بیٹھی تھی۔ زریں کے معصوم حسن کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی۔ سچ تو یہ کہ اس نے اتنا بھولپن آج تک کسی لڑکی کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا، ہر نقش بولتا ہوا اور ہاتھ پاؤں اور بدن جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ انیقہ نے بتایا تھا۔ ''میری پھپھی کی نواسی خوب صورت ہے۔'' لیکن وہ اتنی خوب صورت ہوگی ثمین سوچ بھی نہیں سکتی تھی، کالی شلوار، فیروزی اور پنک پھولوں والی قمیص اور سبز دوپٹا مگر وہ پھر بھی کتنی سج رہی ہے۔ اس کے سامنے ثمین کو اپنے کپڑے جوتے جیولری کی چمک سب ماند پڑتی دکھائی دینے لگی۔ پھر اس نے دیکھا۔ زریں اس کے نازک سے بریسلٹ کو بڑے غور اور ستائش سے دیکھ رہی ہے، گلے میں خوب صورت سا لاکٹ چھوٹے چھوٹے ٹاپس وائٹ گولڈ کی جیولری امپورٹڈ تھی۔ بھلا زریں جیسی لڑکی نے یہ سب کہاں دیکھا ہوگا۔

''بیٹی کی کہیں بات وات نہیں چلائی انیقہ! اب تو خیر سے استانی ہو گئی ہے۔''

''لو آپ کو پتا ہی نہیں۔'' انیقہ چہک کر بولیں پھر خود ہی کہنے لگیں۔ ''ہاں مصروفیت ہی اتنی رہی۔ آپ کے ہاں میرا آنا ہوا ہی نہیں۔ میری ثمین کا نکاح ہو چکا ہے اور پتا ہے جدی پشتی رئیس ہیں وہ لوگ۔ لڑکے کی والدہ سے میرے شوہر کی کچھ رشتہ داری نکلتی ہے، بس ثمین انہیں بے حد پسند تھی۔ مانگ لیا اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے۔ ان کا گھر دیکھیں جو پھپھی تو حیران رہ جائیں، محل ہے محل اور چار چار گاڑیاں کھڑی ہیں ان کے پورچ میں۔''

ثمین کی سسرال کی ڈینگیں مارتے ہوئے وہ نان اسٹاپ بول رہی تھیں یہ بھی بھول گئی تھیں کہ یہ وہ رشتہ دار ہیں جن کے سامنے ہمیشہ لیے دیے رہتی ہیں، ملتی بھی ہیں تو جیسے احسان کر کے۔

''اے انیقہ!'' اتنے بڑے لوگوں میں بیٹی دے دی پورا کیسے کر پاؤ گی؟'' نانی نے بجائے متاثر ہونے کے بے حد عجیب سا سوال کر دیا۔ ثمین سے ناگواری چھپائی نہیں گئی، ناگواری کی تیز لہر ابھری اور اس کے چہرے کا احاطہ کر گئی۔ انیقہ نے ٹھٹک کر نانی کو دیکھا اور بولیں۔

''کیا مطلب ہے پھپھی آپ کا، ہم کیا کم ہیں کسی سے۔ ماشاء اللہ کھاتا پیتا گھرانہ ہے میرا، پھر میری ثمین کی تعلیم، سمجھداری انہیں اور کیا چاہیے تھا۔''

''ہاں ہاں انیقہ بہن! ٹھیک کہہ رہی ہو تم، یہ بتاؤ چائے کے ساتھ سموسے منگوالوں یا بیسن کی مٹھائی۔ تمہیں پتا ہے نا ہمارے علاقے کی یہ مٹھائی تو سارے شہر میں مشہور ہے۔''

''کچھ بھی نہیں۔ ہم تو بس ملنے چلے آئے تھے۔'' لہجہ اب بھی نارمل نہیں تھا۔ وہ تو اپنے تئیں یہ سمجھے بیٹھی تھیں، یہ گھرانہ انہیں بے حد خوش حال اور تعلیم یافتہ خیال کرتا ہے۔ نانی کب بھلا ان کے گھر گئی تھیں، جو یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ کوئی بہت زیادہ دولت مند نہیں ہیں۔ یہ غریب رشتہ دار تو ایسی ہی باتوں

سے اندازے لگاتے ہیں۔

ثریا چائے بنانے گئی تھیں، نانی بھی چپ تھیں، جب ثریا چائے کے ساتھ بیسن کا مشہور حلوہ اور قیمے والے سموسے لے کر آئی تو ثمین نے صرف چائے کا کپ اٹھایا۔ مزید کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔

''ڈائٹنگ کر رہی ہیں آپ۔ اس سے تو چہرے پر رونق ہی نہیں رہتی اب تو آپ کی شادی ہونی ہے۔ ڈائٹنگ چھوڑ دیں آپی!'' زرّیں نے بڑے سادہ سے انداز میں مشورہ دیا تھا۔

کپ ثمین نے دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ کیا مطلب ہے اس کا، کیا میرا چہرہ بہت روکھا پھیکا دکھائی دے رہا ہے، جب ہی تو کہہ رہی ہے، اب تو ڈائٹنگ چھوڑ دیں۔ لگتا ہے بہت مان ہے اپنی شکل پر ہونہہ!''

''پھپھی! میں ایک مقصد کے لیے آئی تھی۔'' ادھر انیقہ بیگم نے بات کا آغاز کیا۔

''کوئی کمیٹی وغیرہ ڈالنا چاہتی ہو، ہاں ادھر ہمارے محلے میں بہت سی عورتیں شوہروں سے چھپ کر کمیٹی ڈالتی ہیں۔''

نانی کو دل میں آئی بات کہہ دینے کی عادت تھی۔

''ہم کمیٹیاں نہیں ڈالتے۔'' ثمین نے پتا نہیں کس بات کا بدلہ لینے کا چبا چبا کر کہا تھا۔

''پھپھی! میرا بیٹا ثاقب یاد ہے پچھلی بار جب میں آئی تھی تو وہی میرے ساتھ آیا تھا۔''

''ہاں ہاں، پتا ہے۔'' نانی نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''تو بس پھر میں اسی کے لیے آئی ہوں، رشتہ ڈال رہی ہوں زرّیں کے لیے۔''

زریں اٹھ کر کمرے سے باہر چلی آئی اور یہ دونوں ماں بیٹی خاموش بالکل چپ۔ (پتا نہیں شادیٔ مرگ ہو گیا شاید۔۔۔)

''میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔ رشتوں کی کمی نہیں لیکن پھپھی غیروں سے بہولاتے جی ڈرتا ہے پھر سوچتی ہوں کہ پہلا حق بھی تو اپنوں کا ہوتا ہے۔''

''ہوں۔ ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔ زرّیں کا باپ دو روز کے لیے شہر سے باہر گیا ہے آتا ہے تو پھر ہی کچھ فیصلہ کرتے ہیں۔''

ادھر ثمین مزید بیٹھنے کو تیار نہیں تھی۔ چائے کا کپ رکھتے ہی اٹھنے کا کہنے لگی، جبکہ ثریا کہنے لگی۔

''تھوڑی مٹھائی لو۔ یہ سموسہ چکھ لو۔'' لیکن وہ تو خود کو ابھی سے جاگیردارنی سمجھنے لگی تھی۔ ان عام سے لوگوں سے ملنا تو اس کا احسان تھا ان پر۔

''ہاں!'' انیقہ نے پہلے ایک پھر اس کے ذائقے سے مجبور ہو کر دوسرا سموسہ بھی اٹھا لیا تھا۔

''اچھی خوب صورت ہے نا!'' زریں کے یہاں سے واپسی پر وہ ثمین سے پوچھ رہی تھیں۔

''گھر کی حالت دیکھی آپ نے اور پھر ان ماں بیٹی کے کپڑے، ہمارے ہاں کام کرنے والی ماسی بھی ان سے اچھا پہنتی ہے۔''

''چھوڑو۔ ہمیں اس سے کیا مطلب۔ تم تو جانتی ہو اپنے ملنے والوں میں جہاں جہاں ثاقب کے رشتے کی بات کرنے کی کوشش کی۔ یوں تیوری چڑھا کر گھور کر دیکھا گیا جیسے ہم نے ان کے پورے

خاندان کی توہین کر دی ہے۔ بس تب ہی میرا دھیان زریں کی جانب گیا۔ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ جب میرے ملنے والے اسے ثاقب کی دلہن کے روپ میں دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ تب انہیں پتا چلے گا۔ میرا بیٹا ایسا بھی ناکارہ نہیں جیسا انہوں نے سمجھ رکھا تھا۔ اسے ان کی بیٹیوں سے کہیں زیادہ خوب صورت دلہن مل سکتی ہے۔''

ماں کی بات سے متفق ہوتے ہوئے ثمین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

۞۞۞۞

کچھ حیرت اور اس پر خوشی کا غلبہ اس کی تو بھوک ہی مر گئی تھی۔ مہمانوں کے لیے جو بیسن کی مٹھائی اور سموسے منگوائے تھے۔ بچے بڑے خوش تھے، آج تو عرصے کے بعد گھر میں زردہ بھی پکا تھا لیکن کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بس بستر پر لیٹ کے ثاقب کو بار بار سوچنا چاہتی تھی۔ لیکن ماں اور نانی موقع کہاں دے رہی تھیں، مہمانوں کے جانے کے بعد آٹا گوندھا، دال پکائی اور اب امی کہہ رہی تھیں۔

''شام گہری ہو رہی ہے۔ دونوں چھوٹے بھائی آوارہ گردی کے بعد گھر لوٹنے والے ہوں گے۔ آتے ہی روٹی کے لیے شور مچائیں گے۔ پکا کر رکھ دو۔''

افوہ۔ اتنا بھی خیال نہیں اب میں اس گھر میں مہمان ہوں۔ اس کا جی چاہا اپنے سے دو سال بڑی نسرین جو بیاہ کر بھی اسی محلے میں گئی ہے، بھاگ کر اس کے گھر جائے اور اسے بتائے۔ بڑے اونچے گھر سے رشتہ آیا ہے میرا، یہ فیشن ایبل ساس، نند ہیں میری۔ پڑھی لکھی بھی ہیں اور گاڑی والی بھی ہیں اور مجھے تو ابھی محلے کے بچے نے بتایا وہ گاڑی میری نند خود چلا رہی تھی۔ ہائے میں بھی گاڑی چلانا سیکھوں گی۔ کتنا مزا آئے گا۔

اپنے خیال میں گم ایک بار روٹی ڈالتے ہوئے ہاتھ جلایا ایک بار روٹی۔

اسے تجسس تھا ماں اور نانی کمرے میں بیٹھی کیا باتیں کر رہی ہیں۔ اسے رشتے کے آنے پر جتنی خوش اور حیران وہ تھیں اسے دیکھتے ہوئے یہ تو دھڑکا دل کو نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ کہیں یہ انکار نہ کر دیں۔

''روٹی بن گئی ہے تو اپنا میرا اور اماں کا کھانا نکال کر کمرے میں لے آؤ، باقی روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ کر پلاسٹک کی تھیلی میں بند کر کے رکھ دو۔ بھائی آئیں گے تو پھر انہیں نکال دینا۔'' یہ ہر روز ادا ہونے والے جملے تھے لیکن لہجہ بدلا ہوا تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی اس کی ماں کتنی خوش ہے۔

۞۞۞۞

زریں کے گھر والے اپنے ٹائم پر آئے، زریں کے والد غفار احمد، والدہ ثریا اور نانی مٹھائی اور کیک کے ہمراہ، وہ بے حد جھجکتے ہوئے آئے تھے، ہاں نانی کی سج دھج دیکھنے کے لائق تھی۔ سفید ساٹن کی شلوار جو نہ جانے کب سے سنبھال سنبھال کر رکھی تھی کہ رنگ بھی سفید کے بجائے پیلا سا ہو رہا تھا، ساتھ میں پھول دار ریشمی قمیص آنکھوں میں سرمہ، کانوں میں سونے کے ٹاپس، سر پر استری شدہ چکن کی سفید چادر۔ ثریا اور غفار سادہ سے حلیے میں تھے، انیقہ بیگم کو ناگواری کا احساس ہوا۔

''کیا سوچیں گے ہمارے ملازم، یہ ملنے والے ہیں ہمارے۔'' انہوں نے گھر میں کام کرنے والی دو، بارہ اور چودہ سالہ بچیوں کے بارے میں سوچا۔

رشید صاحب مہمانوں سے باتیں کر رہے تھے، لیکن بڑے خشک سے انداز میں جیسے کہ آفس میں نئے امیدواروں سے انٹرویو لیا جاتا ہے۔ ثاقب ادھر ہی صوفے کے ایک کونے پر مضطرب سا بیٹھا تھا، پتا نہیں یہ بیل منڈھے چڑھتی بھی ہے یا نہیں۔

"ابو کا انداز بھی عجیب سا ہے اور ادھر مجھے دیکھنے کے بعد پتا نہیں اس کے ابا کی کیا رائے ہو میرے بارے میں۔"

"آپ لوگ شروع سے گندے نالے کے علاقے میں ہی رہتے ہو؟" رشید صاحب نے ایک اور عجیب سا سوال بے حد عجیب انداز میں داغا اور ثمین نے چہرے پر کچھ اور بھی سنجیدگی اور مدبّر پن پیدا کرتے ہوئے مہمانوں کی جانب دیکھا۔

"آہو جی! ادھر ہی رہتے ہیں۔ لڑکیاں میری پانچ ہیں، چار بیاہ چکا ہوں، سب اپنے برابر والوں میں بیاہی ہیں۔ اب ساری بال بچے دار ہیں اور اپنے بچوں کو پڑھا رہی ہیں۔ بس جی میں تو کہتا ہوں، بیٹیاں اپنے جیسے گھروں میں ہی دینا چاہئیں، ورنہ نئے ماحول میں مرجھا کر رہ جاتی ہیں۔"

ان کے خشک رویے اور تیکھے سوال، غفار جیسے محنت کش، خوددار شخص کو تھوڑی دیر بعد ہی اعتماد میں لے آئے اور جہاں اس نے ان خیالات کا اظہار کیا سب کو جھٹکا لگا۔ وہ تو سمجھ رہے تھے، اس احسان پر یہ لوگ کبھی سر نہیں اٹھا سکیں گے، ہاتھ باندھے آگے پیچھے رہیں گے، لیکن لڑکی کے باپ کے خیالات۔۔۔

"رشتہ داری میں اونچ نیچ کیسی، یہ امیری غریبی تو غیروں کے لیے ہوتی ہے، کیوں پھپھی؟"

اب کے انیقہ بیگم نے میدان سنبھالا۔ وہ اب ثاقب کو ہر حال میں بیاہ دینا چاہتی تھیں اور زریں تو ایسی لڑکی تھی جسے وہ اپنے ملنے والوں میں بڑے فخر سے دکھا سکتی تھیں۔

"آپ نے ماحول کے فرق کی بات کی ہے تو دیکھیں غفار صاحب! یہاں گھر میں زیادہ لوگ تو ہیں نہیں۔ ثمین کی اب شادی ہو جائے گی۔ باقی دونوں بچے پڑھ رہے ہیں۔ میں اپنی ملازمت کے جھملیوں میں اور میری بیوی تو سوشل ورکر ہے۔ پیچھے گھر میں کون بچتا ہے پھر بچی کو نئے ماحول میں کہاں ایڈجسٹ ہونا پڑے گا، بلکہ سمجھیں کہ اب تو ماحول وہ خود اس گھر میں آ کر بنائے گی۔"

اب کے رشید صاحب بھی باس کی سیٹ سے اتر آئے تھے اور ثمین جو گھر کے اس کمرے میں اب تک خود کو پروفیسر اور انہیں نالائق اسٹوڈنٹس خیال کر رہی تھی، سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

غفار احمد نے ثاقب کی جانب ذرا غور سے دیکھا اور اس کے کاروبار کی نوعیت جاننا چاہی جو ثاقب سے پہلے رشید صاحب انہیں بتانے لگے اور یوں بڑھا چڑھا کر بتایا، جیسے ثاقب جنرل اسٹور نہیں چلا رہا، کسی سپر اسٹور کا مالک ہے۔

"لگتا ہے کام بہت زیادہ کرتے ہو۔ کچھ صحت کی طرف بھی دھیان دو پتر!" غفار کا یہ کہنا ان سب کے لیے مزید پریشانی کا باعث تھا۔

انیقہ بتانے لگیں۔ "واقعی بہت محنت کرتا ہے اور کھانے پینے کی طرف سے بہت لاپروا ہے، بس اب زریں آ جائے گی خود ہی خیال رکھے گی اس کا، چلو جی مٹھائی کا ڈبا کھولو۔ منہ تو میٹھا کریں سب۔"

رشید صاحب نے کمال ہوشیاری سے ان ہی کا لایا ہوا مٹھائی کا ڈبا کھولنا شروع کیا۔ پہلے غفار اور

پھر دونوں خواتین کی جانب مٹھائی بڑھائی، پھر اپنے اہل خانہ کو دی اور سب نے مبارک باد کا شور بپا کر دیا، غفار صاحب نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز، شور اور ہنسی میں دب گئی۔

"کمال ہے جی آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جما رہے ہیں۔" غفار صاحب کو کچھ عجیب لگا۔

"جس گھر میں اتنی خوب صورت لڑکی ہو نا بھائی صاحب! وہاں آنے والے یونہی جلدی مچایا کرتے ہیں۔ بس زریں ہماری، اور پھپھی! سمجھا دیجیے انہیں اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔ بس اتوار کو آ رہے ہیں ہم لوگ۔" انیقہ بیگم نے بڑے دلار سے نانی کو مخاطب کیا تھا اور وہ تو اس رشتے پر پہلے بھی راضی تھیں۔ یہ گھر دیکھ کر تو ان کی جانب سے انکار کی کوئی گنجائش رہی ہی نہیں تھی۔

مہمانوں کو کھانا کھلانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

❁❁❁❁

نومبر ختم ہونے کو تھا، یہ موسم مہمان پرندوں کی آمد کا تھا، جو دور دیسوں سے اڑ کر لمبی مسافتیں طے کر کے گرم علاقوں میں آتے ہیں اور پھر پورا موسمِ سرما یہاں قیام کرنے کے بعد موسم میں گرمی آتے ہی واپس اپنے اپنے دیس کو اڑ جاتے ہیں۔ ان خوب صورت پرندوں کا قیام ادھر پانیوں پر بھی ہوتا ہے۔ جنگلوں میں بھی بسیرا کرتے ہیں اور چولستان بھی ان کی آمد سے سج جاتا ہے اور شکاری بھی اسی موسم کا تو انتظار کرتے ہیں گو کہ شکار پر پابندی ہے، عام آدمی کی رسائی نہیں ہے لیکن خواص کے لیے کیا پابندی ہو سکتی ہے۔

یہ عجیب تضاد ہے کہاں ایک شاعر اور مصور اور کہاں شکار کا شوقین ایک شکاری، لیکن یہ حقیقت ہے داور حسین کے مزاج کا ایک یہ رخ بھی تھا، اسے شکار خصوصاً چولستان کے علاقے میں کھیلے جانے والے شکار سے بے حد دلچسپی تھی۔

یہ صحرائے کبیر ہے، جہاں صحرائی جھاڑیوں کی بہتات ہے اور ان ہی جھاڑیوں میں ہرن، تلور اور بھوکڑ رہتے ہیں، جن کے لیے شکاری صحرا میں آتے ہیں، لیکن ان تک پہنچنا آسان نہیں۔

داور حسین ہر سال اپنے یار دوستوں کی ٹولی کے ساتھ ادھر آتا، قیام تو ریسٹ ہاؤس میں کیا جاتا، پھر سفر جیپوں پر شروع ہوتا کہ جیپ ہی صحرا میں انہیں دور تک لے جا سکتی ہے۔ رات کو محفل ریسٹ ہاؤس کے کھلے سبزے الاؤ روشن کر کے بجتی ہے تو کبھی بڑے ہال میں یہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ مقامی گانے والے اور گانے والیاں بلائی جاتی ہیں۔ بہت سے آنے والے ان کی زبان نہیں سمجھتے، صرف موسیقی کا لطف اٹھاتے ہیں، لیکن داور ان کی زبان سمجھنے لگا ہے اور خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ کا کلام اسے روح کے تاروں کو چھیڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مقامی لوگ چولستان کے علاقے کو روہی کہتے ہیں اور روہی کی عورت روہی کی طرح منفرد البیلی ہے۔ مناسب قد کاٹھ اور دبلا جسم جس کی لچک اور ملائمت بے مثال ہے اور دانتوں کی چمک دلوں پر بجلی بن کر گرتی ہے۔ ستواں ناک کی لونگ لشکارے مارتی ہے اور آواز کی خوب صورتی یہاں آنے والوں کو قدم یہیں جما لینے پر مجبور کرتی ہے۔

آج کا دن بھی کمال رہا۔ انہوں نے چنکارہ ہرن شکار کیا تھا اور اب الاؤ پر اسے روسٹ کیا جا رہا

تھا، مقامی گانے والی بلائی گئی، جس کا شوخ لباس اور بھدے چمک دار زیورات الاؤ کی روشنی میں اور بھی چمک دار اور شوخ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس وقت ''چھلا'' گا رہی ہے اور اس کی آواز کی لہروں پر فرکرتے داور کہیں اور پہنچ گیا۔ اب وہ اس کے ساتھ ہے جو تصور میں تراشی گئی تھی اور اللہ کی قدرت مجسم اس کے سامنے آئی تھی، تب اس نے اسے چھوا تھا۔ اس کے سامنے بلوریں جام رکھ دیا گیا۔ یہ جو خاص لوگوں کے لیے امپورٹ کی جاتی تھی اور حسنہ بیگم نہیں جانتیں، اس کے شوہر کی طرح بیٹا بھی گھر سے باہر دوستوں کی محفل میں یہ شغل فرمالیتا ہے۔ وہ کبھی پی کر آؤٹ نہیں ہوا، لیکن آج کی بات اور تھی، آج تو وہ مدہوش ہو جانا چاہتا تھا۔

محفل پوری رات سجی رہی، دن اترنے لگا اور سازندوں نے ساز سمیٹ لیے، اب سب کمروں میں چلے گئے۔ پوری رات کے جاگے اب پردے گرا کر سوئیں گے، آج کا دن بھی اور پھر آنے والی رات بھی شاید سوتے جاگتے ہی گزرے، ہاں پھر اگلی صبح وہ تازہ دم ہو کر روہی کا رخ کریں گے۔ ایک بار پھر صحرائے کبیر کے پراسرار حسن کی باتیں ہوں گی۔ ابھی انہیں پورے پندرہ دن یہاں رہنا تھا، یہاں آنے والے سب مرد ہیں، ان میں سے کوئی جو شادی شدہ ہے، وہ بھی بیوی بچوں کو لے کر نہیں آیا، لیکن داور صبح سویرے ابھرے سورج کو دیکھ کر سوچ رہا ہے اب جب میں ادھر آؤں گا تو اسے ساتھ لے کر آؤں گا اور میں اسے سیاہ ہرن دکھاؤں گا، جس کی خوب صورت آنکھیں بالکل عورت کی حسین آنکھ سے مشابہ ہے، اس کی آنکھ جیسی ہے اور وہ حیرت سے اسے دیکھتی کیسی لگے گی۔

پندرہ دن چہل پہل سے دور ایک اور ہی دنیا میں گزار کر جب وہ گھر آیا تھا تو یہاں کچھ اور ہی تیاریاں تھیں۔ اس کی ماں زیورات کے لیے چکر لگاتے اور کپڑے خریدتے تھک نہیں رہی تھی۔

''میں اب جلد ہی تمہاری شادی کر رہی ہوں۔'' اس نے خبر کو سرسری انداز میں سنا اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''تم بھی چلو نا۔ کسی روز میرے ساتھ کچھ زیورات اپنی پسند سے خرید لو۔''

''ایک بات کہوں آپ سے؟'' اس نے ماں کی خوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ہاں بالکل کہو۔'' وہ ساڑھی پر بنا موتیوں کا کام دیکھنے میں مگن تھیں۔

''ایک شادی میں اپنی پسند سے بھی کروں گا اور بہت جلدی کروں گا۔'' ساڑھی کا پلو ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو داور؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اور یہ کوئی جرم بھی نہیں۔''

''جرم ہے داور! یہ جرم ہے، عورت کا نازک دل کرچی کرچی کر کے تم کہتے ہو ظلم نہیں ہے۔''

وہ رونے لگیں، داور اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا، گویا اس کا مقصد صرف اطلاع دینا تھا۔ ہاں رات کے کھانے پر جب ملاقات ہوئی تو وہ دن بھر پتا نہیں کہاں رہنے کے بعد واپس آیا تھا۔ اداس اور کچھ جھلایا ہوا تھا۔ اس کے موڈ کو دیکھ کر انہیں اپنی خفگی کو ایک طرف رکھنا پڑا۔ اسے کھانے کی مختلف ڈشز پیش کرتی رہیں۔ اس نے برائے نام کھایا، پھر قہوے کے لیے کہہ کر ہال کمرے میں ٹی وی کے سامنے جا

بیٹھا۔

''ارے ہاں داور! ایک بات تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔'' کچھ دیر کے بعد وہ بھی آ بیٹھیں۔

''کون سی بات؟'' اس نے ٹی وی پر نگاہ جمائے ہوئے پوچھا۔

''اپنی ثمین کے بھائی کی بات پکی ہو گئی۔ ثمین اور اس کی والدہ آئی تھیں مٹھائی لے کر، بتا رہی تھیں کوئی فنکشن نہیں کیا، مجھے دکھانے کے لیے تصاویر لائی تھیں۔ دیکھو تو کتنی پیاری بچی ہے۔ ثاقب کی طرح ہی معصوم بھولی بھالی۔''

انہوں نے تصویر اس کی جانب بڑھائی۔ اس نے سرسری نگاہ ڈالی اور پھر۔۔۔

جب سیاہ ہرن کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا ہے، دم دینے سے پہلے وہ آخری بار اپنے قاتل کی جانب بوجھل پلکوں کو اٹھا کر دیکھتا ہے۔ انسانی آنکھ سے مشابہہ اس کی آنکھ ایسے میں کلیجہ ہلا کر رکھ دیتی ہے، یوں لگتا ہے انسان کے ہاتھوں ایک انسان مارا گیا۔

اف میرے خدا! شکاری نے موت کی اذیت کو آج محسوس کیا، ماں کو فون کی آواز نے متوجہ کر لیا۔ وہ یہاں سے اٹھ کر چلی گئی اور داور حسین کی آنکھ سے آنسو لڑھک گئے۔ تصویر کو ہاتھ میں لیے وہ اپنے کمرے میں آ گیا، کتنی دیر کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے کے بعد اس نے ایک بار پھر ہاتھ میں تھامی تصویر کو دیکھا۔ کسی نتیجے پر پہنچ کر گہرا سانس کھینچا، اور اسے ثمین کی تصویر کے برابر اپنی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب وہ مطمئن تھا۔ وہ تقریباً نو بجے اپنے کمرے میں آیا تھا اور اب جب وہ اپنے بستر پر آیا تو رات کا ایک بج رہا ہے۔

✿✿✿✿

''کیا خیال ہے، کپڑے بنواتے ہوئے زریں کی رائے نہ لے لی جائے۔ منگنی کے روز بھی باقی سب تو ہماری لے کر گئی چیزوں کی تعریف کر رہے تھے، لیکن پھپھی نے کہہ دیا، پرپل کلر زریں کو پسند نہیں ہے۔''

''یہ بات آپ کی پھپھی نے آپ سے کہی اور آپ نے سن لی۔ میں ہوتی نا تو اسی وقت اس نواب زادی کے سر پر پہنچ جاتی اور پوچھتی، اس نے کبھی خواب میں بھی اتنی مالیت کا جوڑا دیکھا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو یہ کتنے کا آیا ہے؟'' ثمین کو ماں کی بات پر آج پھر نئے سرے سے غصہ آیا تھا۔

''ہاں برا تو مجھے بھی لگا، لیکن پھر سوچا ان لوگوں میں سے کسی نے ہمیں تو نہیں ایسا کہا۔ یہ تو پھپھی نے ہی اپنی سادگی میں مجھ سے یہ بات کہہ دی ہے، اس گھر کی کوئی اور عورت یہ بات کرتی تو میں بھی تمہاری طرح چپ نہ رہتی، صاف اوقات یاد دلا دیتی۔''

''تو بس پھر یہ زریں کے مشورے پر بری بنانے کا خیال دل سے نکال دیں، مجھے تو یہ سوچ کر ہول اٹھ رہے ہیں، پتا نہیں جہیز میں کیا الا بلا اٹھا کے لائے گی۔''

پھر کچھ یاد آیا تو بولی۔

''یہ آپ نے ثاقب کو دیکھا، آج کل اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل رہے ہیں۔ مسکراہٹ ہے تو چہرے سے جدا ہی نہیں ہوتی اور خود کو سنوارنے میں بھی بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے تو کبھی کپڑے

تبدیل کرنے کا خیال بھی خود سے نہیں آتا تھا، ہمیں ہی کہنا پڑتا تھا، اب نہالولباس تبدیل کرلولیکن ذرا غور کیجیے اور وہ اس کے سسرال والے بھی ہیں ویسے گھنّے میسنے لوگ۔ پتا ہے نالڑکے کا دل مٹھی میں کرلو تو سب اپنی جیب میں ہوتا ہے۔ ثاقب صاحب کو خوب ہی تحائف دیے ہیں، انگیجمنٹ پر بھی پورے چار سوٹ اسے دے ڈالے ہیں، حالانکہ مجھے تو ان کی جانب سے ایک کی بھی امید نہیں تھی۔''

''کچھ بھی کرلیں، ہاتھ کچھ نہیں آنے والا ان بے چاروں کو پتا نہیں ہے نا ابھی ثاقب کتنے سادہ معصوم ذہن کا مالک ہے، وہ تو ابھی تک میری انگلی تھام کر چلنے کے چکر میں رہتا ہے۔''

''اس کی سادگی اور معصومیت نے ہی تو ہمیں اس گھر کے در پر جانے پر مجبور کیا ہے امی! ورنہ کیا ہم ایسے گھر کی لڑکی کو بہو بنا کر اپنے گھر لا سکتے تھے۔''

''دیکھنا کس کا فون ہے؟'' فون کی گھنٹی نے بات سے دھیان ہٹا دیا، ثمین نے ریسیو کیا اور خبر ایسی تھی کہ وہ کچھ دیر کو بول ہی نہیں سکی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں، پھڑ پھڑاتے لب انیقہ کا دل گھبرا گیا، جلدی سے بڑھ کر ریسیور تھام لیا۔ ثمین جا کر پھر سے صوفے پر بیٹھ گئی، بے دم اور ہراساں کہ فون پر اسے جو خبر سنائی گئی وہ داور کے ایکسیڈنٹ کی تھی۔

انیقہ کی حالت بھی ثمین سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ انہوں نے ایک نظر گم صم بیٹھی بیٹی پر ڈالی اور سوچا اگر داور کو کچھ ہو گیا تو اس کی منکوحہ کی حیثیت سے ثمین۔۔۔ نہیں نہیں اللہ نہ کرے۔ وہ ایسا سوچ کر ہی لرز اٹھیں پھر جلدی جلدی رشید صاحب کا نمبر ملانے لگیں۔

ثمین، رشید صاحب اور انیقہ بیگم جب شہر کے معروف پرائیویٹ اسپتال پہنچے تو وہاں حسنہ بیگم کے ساتھ ساتھ داور کے بہت سے دوست بھی موجود تھے۔ حسنہ کی حالت خاصی خراب تھی۔ وہ بے حد پریشان تھیں اور بار بار رونے لگتی تھیں، یہاں آ کر ہی انہیں حادثے کی سنگینی کا پتا چلا، داور بے ہوش تھا اور اس کو چوٹیں بھی خاصی آئی تھیں۔ داور نہ رہا تو؟ ثمین کا دل گھبرانے لگا وہ بھی حسنہ کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

اس وقت شام ہو رہی تھی اور وقت تھا کہ شاید تھم گیا تھا۔ ڈاکٹر پیشہ وارانہ انداز میں تسلی تو دے رہے تھے لیکن ان کا لہجہ بتا تا تھا وہ خود بھی کچھ زیادہ پر امید نہیں ہیں۔

رات جیسے آنکھوں میں کٹی اور جب ڈاکٹر نے آ کر داور کے ہوش میں آنے کی خبر سنائی، تب ہی ان کے لیے صبح طلوع ہوگئی۔ حسنہ تو وہیں سجدے میں گر پڑیں اور ثمین بھی جیسے شام کی رکی سانس اب بحال ہوئی۔ وہ ہوش میں تو آ چکا تھا لیکن ابھی کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

✡✡✡✡

رشید صاحب نے فون کر کے ثاقب کو بلوا لیا تھا۔ اب ثاقب کو یہاں رہنا تھا اور یہ لوگ گھر واپس جا رہے تھے۔ آنے والے دن عجیب بے کیف سے رہے، داور کی بائیں ٹانگ میں فریکچر ہوا تھا اس کے علاوہ کندھے پر زخم تھے۔ سر کی چوٹ خاصی تکلیف دیتی تھی۔ اسی لیے اسے نیند کی دوا دے دی جاتی تھی تو کبھی درد کے لیے انجکشن لگایا جاتا تھا۔ ڈاکٹرز کے لیے جو بات حیران کن تھی وہ یہ کہ داور زندگی سے مایوسی کی باتیں کرتا تھا۔ اسے اپنی صحت کے بحال ہونے میں خود ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ جب ہوش میں ہوتا تو بہت کڑوی کسیلی اور الجھی ہوئی گفتگو کرتا تھا۔

''کیا نہیں ہے اس کے پاس، لیکن کچھ لوگ ناشکرے ہوتے ہیں۔'' یہ سب سن کر لوگ ایسا سوچنے میں حق بہ جانب تھے۔

ثمین اسپتال میں اس سے ملنے آئی تو وہ سوتا بن گیا اور بہت دیر تک سوتا ہی رہا، یہاں تک کہ وہ واپس چلی گئی۔

''یہ ثمین بی بی آپ کے لیے لائی تھیں۔'' اس کی ملازمہ نذیراں بہت شوق سے پھولوں کا وہ گلدستہ اسے دکھا رہی تھی۔

''پرے کرو۔'' اس نے ہاتھ سے بکے پیچھے کر دیا اور خود دیوار پر پتا نہیں کیا دیکھنے لگا۔

''وہ بے چاری بڑی دیر انتظار کرتی رہیں پر آپ تو ایسے سوئے کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔''

''جن کے نصیب سو جائیں پھر انہیں جاگ کر کیا کرنا ہوتا ہے۔ انہیں بھی ہمیشہ کے لیے سو جانا چاہیے۔ پتا نہیں میں بچ کیسے گیا۔''

''اف یہ قسمت کیا چاہتی ہے مجھ سے، میں نے تو کبھی رب کے وجود سے انکار نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے پھر ایسے موڑ پر لا کر اللہ مجھ سے کیا منوانا چاہ رہا ہے۔ میں مانتا تو ہوں کہ بے بس ہوں، پھر۔۔۔ پھر کیوں؟ کیوں؟'' وہ چلّانے لگا۔

✡✡✡✡

ثمین اگلے روز بھی آئی اور جتنی دیر وہ بیٹھی رہی، داور سر درد کی شکایت کر کے آنکھیں موند کر لیٹا رہا، حالانکہ ثمین بری اچھی تیاری کے ساتھ آئی تھی اور پیاری بھی لگ رہی تھی۔

''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟ یہ کب تک ٹھیک ہو جائیں گے؟''

خاموشی سے اکتا کر اس نے یہاں موجود داور کے قریبی دوست سے پوچھا۔ وہ تفصیلات بتانے لگا اور ثمین داور کے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔

''مانا کہ بہت تکلیف میں ہے لیکن کہتے ہیں جو دل کے قریب ہوتے ہیں، ان کی قربت تکلیف کے احساس کو کم کر دیا کرتی ہے۔ کیا میرے آنے پر داور ایسا کچھ بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس نے تو ایک کے بعد دوسری نظر بھی مجھ پر نہیں ڈالی۔'' وہ بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی داور کے قریب آ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ داور نے تب بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔

''کچھ لیں گے آپ، چائے بناؤں آپ کے لیے؟''

داور نے نفی میں ہلکا سا سر ہلایا، جس پر تکلیف ہوئی اور وہ سسکاری بھر کر رہ گیا۔

''جوس لے لیں۔'' ثمین چائے سے انکار پر کہنے لگی، تب نذیراں آگے بڑھی اور بولی۔

''جب انہیں کچھ چاہیے ہوگا وہ بتا دیں گے۔ اس طرح تو انہیں غصہ آ جاتا ہے جی اور غصہ ان کے لیے اچھا نہیں ہے۔''

''کچھ کھائیں پئیں گے نہیں تو پھر جلد اچھے کیسے ہوں گے؟'' ثمین کو نذیراں کے سامنے ایسے ہی سبکی کا احساس ستانے لگا تھا۔ کیا سوچتی ہوگی داور کے لیے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔

"اللہ ٹھیک کرے میرے سائیں کو۔" نذیراں پورے جذب سے بولی۔

"کیا یہ کھانے میں اسی طرح نخرہ کرنے لگے ہیں۔" ثمین نے پھر پوچھا تب ہی داور بول اٹھا۔

"نذیراں! تم لوگوں نے جو مذاکرات کرنے ہیں نا باہر جا کر کرو، میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔" پھر سبکی کا احساس، ایسے رویے کی وہ کب عادی رہی تھی۔ گھر میں سب کی توجہ کھینچی، پھر ذہین اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے اسکول اور کالج میں بھی مقبول رہی، لیکن یہاں جہاں سب سے زیادہ من چاہی بننا ایک آرزو ہوا کرتی ہے۔ وہاں کیا حیثیت ہے اس کی۔

ثمین کا جی چاہا اب وہ یہاں رکے نہیں فوراً چلی جائے۔ اسے یہاں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ تب تک جب تک وہ بیاہ کر داور کے محل میں نہیں پہنچ جاتی۔ اس کے بعد کیا کرنا ہوگا۔ یہ فیصلہ حالات کے مطابق ہی کیا جائے گا۔

"آجایئے بی بی صاحب!" نذیراں دروازے کے قریب اس کی منتظر کھڑی تھی۔

"تم جاؤ۔" وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔ نذیراں کے جانے کے بعد اس نے داور کی جانب دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا، گویا جانے کا ہی منتظر تھا۔

"اچھا داور! میں چلتی ہوں۔" کچھ کڑوی کسیلی کہنے سے اس نے خود کو بہ مشکل روکا۔ داور نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا اور وہ باہر آگئی۔

برے موڈ کے ساتھ وہ گھر آئی تو انیقہ ایک خبر کے ساتھ منتظر تھیں۔

"آج ثاقب کے سسرال والے آئے تھے۔"

"اچھا؟" اس نے سرسری لیا۔

"وہ لوگ اب شادی کی ڈیٹ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے بتایا نہیں داور کے بارے میں۔" اس نے تنک کر کہا۔

"بتایا تھا، لیکن یہ کوئی ایسی وجہ تو نہیں کہ ہم انہیں دو تین ماہ بعد کی ڈیٹ نہ دے سکیں۔ داور اب خدا کے فضل سے ٹھیک ہے، اس کی حالت خطرے سے باہر ہے، چند دنوں میں اسپتال سے گھر آجائے گا۔" ثاقب یہیں موجود ماں اور بہن کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ ماں کی بات سے اسے پورا اتفاق تھا لیکن وہ بہن کے چہرے کی برہمی پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا، جانتا تھا ثمین کو زریں پسند نہیں ہے لیکن آخر زریں کو ایک نہ ایک دن اس گھر میں تو آنا ہی ہے۔

"تو آپ کے خیال میں ان ہی دنوں میں ڈیٹ رکھنے کے لیے جانا مناسب رہے گا۔"

اس نے ابرو اچکا کر کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا تھا۔ انیقہ نے کچھ نہیں کہا لیکن وہ ثمین کے رویے کو سمجھ نہیں سکی تھیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولیں۔

"کیا داور کی طبیعت پھر سے زیادہ خراب ہوگئی ہے؟"

"خدا نہ کرے، طبیعت خراب ہو اس کے دشمنوں کی۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں ثاقب کے سسرال والوں کو کوئی احساس نہیں ہے کہ ہم اس وقت کس پریشانی میں گھرے ہیں، انہیں صرف اپنی بیٹی کے شادیانے بجوانے کی جلدی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ اس کی والدہ اور والد تمہیں پتا تو ہے ہاسپٹل گئے تھے۔ وہ دوبارہ بھی جانا چاہتے تھے لیکن یہ ہمارے لیے بھی سبکی کا باعث بن رہے تھے نا! کہاں تمہاری سسرال اور کہاں یہ نچلے طبقے کے لوگ۔ پھر بعد میں فون پر میں نے ہی کہہ دیا اور اب اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر جا چکا ہے، بہت بہتر ہے۔"

"ہاں بس اسی لیے وہ لوگ تاریخ رکھنے کی بات کر گئے کہ ان کے خیال میں داور اب بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔"

ثمین نے کچھ سوچا پھر بولی۔ "امی! میرا خیال ہے، ان لوگوں کو آپ اسی ماہ کے آخر کی یا پھر اگلے ماہ کے شروع کی تاریخ دے دیں۔"

"ہائیں! میں سمجھی نہیں، ابھی تم ناراضی کا اظہار کر رہی تھیں، اب اتنی جلدی مچا رہی ہو۔"

"دیکھیں نا امی! اس وقت تک داور کی صحت اتنی بحال نہیں ہو سکے گی کہ وہ کوئی تقریب اٹینڈ کر سکیں اور جب وہ ایسی حالت میں ہوں گے تو ان کی والدہ بھی جلد ہی واپس چلی جائیں گی اور ہمارے لیے یہی بہتر ہے۔ وہ ثاقب کی سسرال کے بیک گراؤنڈ سے نہ ہی واقف ہوں۔"

ثمین کی بات پر انیقہ بیگم نے زور شور سے اثبات میں سر ہلایا پھر بولیں۔ "میں بات کرتی ہوں تمہارے ابا سے۔"

"ضرور بات کریں لیکن ہونا وہی چاہیے جو میں نے ابھی کہا ہے ورنہ میری تو بڑی سبکی ہو جائے گی امی!"

"ہاں بیٹا! مجبوری میں ایسے لوگوں سے رشتہ جوڑ بیٹھے ہیں جن سے ملتے ہوئے اب ہمیں ساری عمر شرمندہ ہی رہنا ہے۔"

پھر ثاقب کی شادی ایسے ہی ہوئی جیسے کہ ثمین نے پروگرام بنایا تھا۔

بارات میں تو یہ لوگ بے حد مختصر لے کر گئے تھے ہاں ولیمہ کی تقریب میں حسنہ بیگم شریک تھیں اور صرف ان ہی کی وجہ سے ثمین کو یہ تقریب ہوٹل میں رکھوانا پڑی، ورنہ وہ تو ثاقب کی شادی پر کچھ زیادہ خرچ کرنے کی قائل نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کن لوگوں میں بیاہ کر جا رہا ہے اور اس کا جہیز کیسا ہونا چاہیے۔ اسی سوچ کے پیشِ نظر اس نے زریں کی بری بہت ہلکی سی بنوائی تھی، جہاں جس طرح بھی ممکن ہو وہ پیسہ بچا رہی تھی۔

حسنہ بیگم نے آنے کی ہامی بھر کر اسے کوفت میں ہی مبتلا کیا تھا۔ حسنہ بہت رکھ رکھاؤ والی سادہ دل کی مہربان خاتون تھیں اور داور کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں ملازموں کی کمی تھوڑا ہی تھی، جو وہ ایسا بہانہ بنا کر انکار کر دیتیں۔

وہ آئیں اور زریں کے لیے دو خوب صورت جیولری سیٹ بھی لے کر آئیں۔ اس کے علاوہ پانچ عدد جوڑے اور نقد بھی تھا، جو سب کا سب انہوں نے زریں کو ہی گفٹ کیا۔

❁❁❁❁

حسنہ بیگم کا فون آیا تھا، داور کا بخار ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ پریشان تھیں۔ فون سنتے ہی ثمین ان

کے ہاں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''اس وقت؟'' ابیقہ نے پریشانی کے عالم میں وال کلاک کی جانب دیکھا، جہاں رات کے دس بج رہے تھے، ثمین نے نوٹس نہیں لیا۔
''ثاقب بھی آج اپنی سسرال میں ہے، ورنہ وہ تمہارے ساتھ چلا جاتا۔ تمہارے ابا اور چھوٹا ابھی گھر میں آئے ہیں۔ اور میرا تو خود صبح سے بی پی ہائی ہے۔''
''میں بچی تھوڑا ہی ہوں۔ خود چلی جاؤں گی۔''
''جب واپس آنا ہو تو فون کر دینا۔ چھوٹا ٹیوشن کے لیے گیا تھا۔ ایک گھنٹے تک آ ہی جائے گا۔''
''ہو سکتا ہے مجھے پوری رات رکنا پڑے۔ میں اپنے کپڑے بھی لے کر جا رہی ہوں۔ صبح تیار ہو کر وہیں سے کالج چلی جاؤں گی۔''
ماں کو اطلاع دینے والے انداز میں بتا کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔
جس وقت وہ داور کے ہاں پہنچی، وہاں سب جاگ رہے تھے اور پریشان تھے، ملازمائیں نشست گاہ کے باہر ہی برآمدے میں سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں اور ملازم بھی ادھر ہی موجود تھے۔ اسے دیکھ کر سب نے مؤدبانہ سلام کیا اور بتایا۔
''بیگم صاحبہ! ادھر نشست گاہ میں ہی موجود ہیں۔''
وہ ادھر ہی چلی آئی، اتنے بڑے ہال کے بائیں کونے میں رکھے سرخ اور گولڈن مخملیں صوفے پر حسنہ بیٹھی تھیں۔ وہ ادھر ہی چلی آئی۔
''اب کیسی طبیعت ہے داور کی؟'' اس نے جاتے ہی سلام کے بعد پوچھا۔
''کچھ بہتر ہے۔ ڈاکٹر اس کے کمرے میں موجود ہے۔ بخار کا زور ٹوٹ رہا ہے۔'' حسنہ بیگم غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھیں۔
''اگر داور اب ٹھیک ہے تو پھر اتنی پریشانی کیوں؟''
ثمین نے ان کے خاموش چہرے پر ایک نظر ڈال کر سوچا۔ کہا کچھ نہیں۔
''کھانا لگواؤں تمہارے لیے؟'' حسنہ بیگم پوچھ رہی تھیں۔
''جب آپ کا فون آیا میں کھانا کھانے ہی لگی تھی لیکن اب تو پریشانی سے بھوک پیاس سب ختم ہو گئی ہے۔''
''نہیں نہیں، تم فکر مت کرو۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں۔ صبح تک تو داور بالکل ٹھیک ہو گا۔ بس میں بہت گھبرا گئی تھی۔ ٹانگ پر پلاستر چڑھا ہوا ہے۔ کندھے کا زخم بھی ابھی تک اچھا نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ٹمپریچر تو میں نے سوچا کہیں انفیکشن ہی نہ ہوا ہو۔ گھر میں لاکھ نوکر چاکر موجود ہوں لیکن میں پھر بھی اکیلی ہی ہوتی ہوں نا۔ اسی لیے تمہیں فون کر لیا۔''
آج داور جب بخار سے نیم بے ہوش تھا۔ اس کے پاس وہی تھیں اور دواؤں کے لیے دراز کھولتے ہوئے انہوں نے خوب صورت فریم میں جڑی زریں کی تصویر کو دیکھا تھا، یہ تصویر اس کی شادی کے موقع پر لی گئی تھی اور انہوں نے یہی داور کو دکھائی تھی پھر وہ شاید واپس لینا بھول گئی ہوں گی لیکن فریم

میں بجی اس کے سرہانے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں۔ ان کی تو سوچ ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر کی آمد پر وہ اس کے بیڈ روم سے باہر آ گئیں اور یہ تصویر بھی ساتھ ہی لے آئیں۔ لا کر اپنے کمرے میں الماری میں چھپا دی لیکن کیا تصویر چھپا دینے سے مسئلہ حل ہو گیا۔ ان کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ داور کی کہی کچھ باتیں اور ثمین کے ذکر پر اس کا روکھا سا انداز ثمین کو دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر نہ تو خوشی کی رمق ابھرتی تھی نہ ہی آنکھوں میں شوخی اترتی تھی۔
کیا میں نے انجانے میں ثمین کے ساتھ زیادتی کر ڈالی ہے۔ یہ بہت ذہین ہے۔ بڑی سمجھدار اور پیاری بچی ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے جب مرد کے دل پر پرائی عورت کا سایہ پڑ جائے تو پھر اپنی عورت کی خوبی اسے خوبی نہیں لگتی۔
ثمین کے لیے کھانے کا پیغام ملازمہ کو دے کر، وہ اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد خود کو سنبھال کر وہ دوبارہ ثمین کے سامنے آ گئیں۔
وہ اس وقت قہوہ لیے ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھا تو ٹی وی آف کر دیا۔
حسنہ کچھ سوچ کر زریں کے بارے میں پوچھنے لگیں۔
''آج کل میکے گئی ہوئی ہے۔'' ثمین نے مختصراً کہا۔
''اچھی لڑکی ہے لیکن کس فیملی سے ہے۔ یہ میں نہیں جانتی۔ تم کچھ بتاؤ اپنی بھابھی کے بارے میں۔''
''وہ لوگ پیسے کے لحاظ سے کچھ کم ہیں، زریں پانچ بہنوں میں چھوٹی ہے، ابھی پڑھ رہی تھی ہم نے ثاقب کے لیے مانگ لیا بس پھر شادی ہو گئی۔ تعلیم ادھوری رہ گئی لیکن آپ تو جانتی ہیں ہمارے گھر میں تعلیم کو کتنا اہم سمجھا جاتا ہے۔ میں نے زریں سے کہا ہے کہ تم شادی کا یہ مطلب مت لو کہ اب پڑھائی سے چھٹی ہو گئی۔ پڑھنا تو تمہیں پڑے گا۔''
''وہ خوش تو ہے نا، میرا مطلب ہے ثاقب پسند آیا ہے۔''
حسنہ بیگم نے ثمین کی بات مکمل طور پر شاید سنی ہی نہیں تھی اور سوال کر دیا حالانکہ اس کا جواب ثمین ایک ہی دے سکتی تھی اور اس نے کہا بھی یہی۔
''جی ہاں وہ بے حد خوش ہے۔'' پتا نہیں یہ سچ تھا کہ جھوٹ۔
''میرا مطلب ہے کہ ثاقب بہت بھولا اور سادہ لڑکا ہے، آج کل کی لڑکیاں خود بھی تیز ہوتی ہیں اور ایسا ہی جیون ساتھی پسند کرتی ہیں۔''
''جی ہاں لیکن زریں بہت خوش ہے۔'' ثمین نے مسکرا کر کہا۔
''چلو اللہ انہیں خوش ہی رکھے میں کسی روز چکر لگاؤں گی تم لوگوں کے گھر کا، بس ابھی تو مجھے داور کی وجہ سے فکر رہتی ہے پتا نہیں میرے بچے کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ بیماری تو اس پر آئی ہے لیکن وہ تو ہنسنا بھی بھول گیا ہے ہر وقت الجھا الجھا سا رہتا ہے۔''
یہ سب تو ثمین نے بھی محسوس کیا تھا لیکن رائے کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔
✿✿✿✿

زریں اور ثاقب گئے تو دو روز کا کہہ کر تھے لیکن ادھر ثمین گھر سے نکلی اور ادھر ان کی واپسی صرف ایک روز کے بعد ہی ہوگئی۔

''تم لوگوں کو تو کل آنا تھا۔'' انیقہ پوچھے بغیر رہ نہیں سکیں۔

''جی امی! لیکن کیا کرتی۔ اپنا گھر اتنا یاد آرہا تھا۔ ثاقب نے کہا بھی اچھا نہیں لگتا مگر میں نہیں مانی۔ سب سے کہہ دیا۔ بس آج ہی اپنے گھر واپس جارہی ہوں۔''

زریں نے بلاتکلف وجہ بتادی تھی اور جس طرح زور دے کر اپنا گھر کہا تھا۔ انیقہ کے ماتھے پر شکن ابھر آئی، ''یہ لڑکی کتنی دلیر اور کیسی زندہ دل ہے۔ ثاقب کو تو انگلیوں پر نچائے گی۔'' وہ سوچ کر رہ گئیں۔

''کتنی ہنسی آتی ہے اسے۔'' انیقہ نے ناگواری سے اسے دیکھا اور اس کے جاتے ہی ثاقب سے اظہار بھی کردیا۔ وہ بے چارہ جو بڑا اسرشار سا بیٹھا تھا۔ ایک دم سے دبک گیا۔

''کہے دیتی ہوں ابھی سے لگام ڈالو، ورنہ پھر کچھ نہیں کرسکو گے۔ ساری عمر اس کے اشاروں پر ناچتے ہی رہ جاؤ گے۔''

وہ انہیں ٹالنے کو جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ کھانا گرم کر کے زریں ادھر آپہنچی۔ ڈائننگ ٹیبل کے بجائے اس نے ادھر لاؤنج میں ہی کھانا لگادیا اور انیقہ سے بولی۔

''آپ بتارہی تھیں ثمین باجی اپنی سسرال گئی ہوئی ہیں۔''

''ہاں، داور کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔'' وہ روکھے سے لہجے میں بولیں۔

''تو آپ کیوں نہیں گئیں۔ دیکھیے نا شادی سے پہلے ہی ثمین باجی کا اپنی سسرال جانا کچھ اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''اے بی بی! تم اپنے فلسفے اپنے پاس رکھو، تم کون ہوتی ہو۔ ہمیں اچھی بری سمجھانے والی اور تم کیا جانو، بڑے لوگوں کے رسم ورواج۔ گندی نالیوں کے کنارے پر بسنے والی لڑکی آج ہمیں عقل سکھارہی ہے۔''

وہ بہت اونچی آواز میں بولنے لگیں، زریں نے گھبرا کر ثاقب کی جانب دیکھا تو وہ نظر چرا گیا۔

تب وہ خود ہی انیقہ سے بولی۔

''میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ باجی کی ساس مجھے بہت رکھ رکھاؤ والی لگی تھیں۔''

''اچھا اور ہم لوگ کیا اخلاقیات نہیں جانتے۔ ہم رکھ رکھاؤ والے نہیں ہیں۔ لڑکی! میں سمجھ چکی ہوں تمہیں، شکل سے جتنی معصوم ہو اندر سے اتنی ہی شاطر ہو، بس غلطی ہوگئی مجھ سے، ثمین نے تو پہلی نظر تم پر ڈالتے ہی تمہیں ریجیکٹ کردیا تھا لیکن میں نے ہی اس کی بات نہیں مانی اور ٹھوکر کھائی۔''

ان کی آواز سن کر رشید صاحب اور دونوں بچے بھی اپنے کمروں سے نکل آئے۔ انہوں نے اسی طرح غصے کے عالم میں ساری باتیں انہیں بھی سناڈالیں۔

''بات سنو لڑکی! تم اپنی حد میں رہو اور ثمین پر کسی قسم کا اعتراض کرنے کی اب جرأت مت کرنا۔''

رشید صاحب نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا تھا۔ شہوار اور عاقب بھی لب بھینچے گھور گھور کر اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اٹھی اور کھانا یونہی چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی لیکن ان لوگوں کی آوازیں دیر تک آتی رہیں۔

اسے شدید بھوک لگی تھی۔

''ذرا سی بات پر کیسا فساد اٹھادیا ان لوگوں نے۔ جو کہنے کو پڑھے لکھے مہذب کہلاتے ہیں۔''

ثاقب بہت دیر بعد کمرے میں آیا تب تک باہر کی آوازیں دم توڑ چکی تھیں۔

''تم نے کھانا بھی نہیں کھایا زریں!'' وہ اس کے قریب بیٹھا کہہ رہا تھا۔

''تم نے کھالیا؟'' وہ پوچھنے لگی، اس نے نفی میں سر ہلادیا لیکن پھر ساتھ ہی اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''کیا مطلب۔ صاف صاف بتاؤ کھایا ہے یا نہیں؟''

''وہ میں تو نہیں کھا رہا تھا زریں! لیکن امی نے زبردستی کھلادیا۔''

زریں نے کروٹ بدل کر آنکھیں موندلیں۔

''تمہیں بھوک تو لگی ہوگی اٹھو نا۔ کھانا لے آؤ اپنے لیے اور ان کی باتوں کا برا مت مانا کرو۔ بس ثمین سے محبت کی وجہ سے جذباتی ہوجاتے ہیں۔ ثمین بڑی سمجھ دار ہے کبھی کچھ غلط نہیں کرتی۔ اس لیے تم کبھی نہ تو اسے کوئی مشورہ دینے کی کوشش کرنا اور نہ ہی اس کے کسی بھی کام میں مداخلت کرنا، اب اگر وہ داور کے گھر گئی ہے تو کچھ سوچ کر ہی گئی ہوگی۔''

''مجھے نیند آرہی ہے ثاقب!'' زریں نے اسی روٹھے انداز میں اسے ٹوک دیا۔ ثاقب نے اسے آنکھیں موندے پڑے دیکھا ہاتھ بڑھایا پھر رک گیا۔ ''امی کہتی ہیں اس کے زیادہ نخرے مت اٹھاؤ ورنہ یہ تم پر حاوی ہوجائے گی۔ کاٹھ کا الو بنا چھوڑے گی تمہیں۔''

''نہیں نہیں اب مجھے مرد بن کر جینا ہے۔'' اور اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ تکیہ درست کیا اور لیٹ گیا، زریں منتظر رہی۔ ابھی وہ بلائے گا۔ ابھی ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی جانب کھینچ لے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ثاقب کے ہلکے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اٹھ کر پانی کا گلاس لبوں سے لگالیا کہ شاید اس سے ہی کچھ آسرا ہوجائے اور نیند آجائے لیکن نہیں۔ آخر کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد اسے بھوک کے ہاتھوں مجبور ہوکر اٹھنا پڑا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکا۔ لاؤنج سنسان پڑا تھا وہ دبے قدموں باہر آگئی۔ رخ کچن کی جانب تھا۔ فرج کھول کر دیکھا۔ دودھ، ڈبل روٹی، اور فروٹ موجود تھا۔ اس نے ڈبل روٹی اٹھائی۔ سلائس پر جام لگایا اور یہیں کھڑے کھڑے کھانے لگی۔

کچھ آسرا ہوا۔ اب نیند آہی جائے گی۔ وہ اسی طرح دبے قدموں اپنے کمروں کی طرف چل دی۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا ثمین سے چھوٹی شہوار جاگ رہی ہے اور اپنے کمرے سے نکل کر کچن میں ہی آرہی ہے۔ اس سے اسے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ چوری تھوڑا ہی کی ہے میں نے، اپنے گھر کے کچن میں کھڑی ہوں۔ سر کو جھٹکا اور آگے بڑھ گئی۔

اگلے روز سہ پہر کو ثمین کی واپسی ہوئی اور اس کے استقبال کی تیاریاں کی گئیں جیسے وہ کئی روز کے

بعد واپس آ رہی ہو۔ اس کی پسند کا کھانا، شام کی چائے پر خاص اہتمام اور انیقہ نے زریں سے اس کا ایک سوٹ بھی پریس کروا کر اس کے واش روم میں ٹانگ دیا۔

"تھکی ہو گی بے چاری اسے اپنے کمرے کی عادت ہے، پتا نہیں رات کو ٹھیک سے نیند بھی آئی ہو گی یا نہیں۔"

وہ سب اس کی آمد کے منتظر تھے جبکہ زریں کو ثاقب کا انتظار تھا۔ صبح ثاقب تو سو کر اٹھنے کے بعد رات کی بات بھول چکا تھا لیکن زریں کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ اس نے اس کی کسی بھی بات کا جواب ٹھیک سے نہیں دیا اور وہ خاصا الجھا ہوا دوکان پر گیا تھا۔

"مجھے ثاقب کے لیے کچھ بنا لینا چاہیے۔" یہ سوچ کر وہ کچن میں آ گئی۔ فریج کھول کر جائزہ لیا۔ موسم کی سبزی موجود تھی وہ مٹر نکال کر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" انیقہ نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

"ثاقب کے لیے بنا رہی ہوں، انہیں مچھلی پسند نہیں ہے۔"

انیقہ نے کہا کچھ نہیں لیکن سر سے پاؤں تک بغور اسے دیکھا ضرور۔

✡✡✡✡

ثمین گھر آئی۔ تھکی تھکی سی تھی جبکہ اس سے پہلے وہ جب بھی ہونے والی سسرال جاتی تھی واپس آ کر اس کے قصے ہی ختم نہیں ہوا کرتے تھے۔

"تھک گئی ہو، کیسی طبیعت تھی داور کی؟" کھانا کھا کر وہ لاؤنج میں آ بیٹھی تو بہن بھائی بھی یہیں چلے آئے۔

"رات تو اس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ صبح حالت خاصی بہتر تھی۔ ویسے اس کی والدہ بھی بڑی جلدی گھبرا جاتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا ہے عورت کا کام سوائے مصیبت میں گھبرانے اور ہولانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ امی! مجھے اس گھر میں جا کر بہت محنت کرنا پڑے گی۔ بہت کچھ بدلنا ہو گا۔"

"تم جو بھی کرو گی اچھا ہی کرو گی۔ اب جا کر ریسٹ کر لو۔ نئی جگہ ٹھیک سے نیند بھی کہاں آئی ہو گی۔"

"نہیں میں بہت آرام سے سوئی۔ یہ بڑا سا بیڈ، اتنا سجا سجایا کمرا، ملازماؤں کی فوج۔"

اب وہ وہاں کے قصے سنانے بیٹھ گئی، جو سب نے دلچسپی سے سنے، سوائے زریں اور ثاقب کے سب یہیں موجود تھے، پھر شہوار نے کل کی بات چھیڑ دی اور انیقہ بھی الف سے "ے" تک بہو کی کارستانیاں سنانے لگیں۔

"دیکھ لیجیے میں ایک دن کے لیے گھر سے باہر کیا گئی، نکال لے اس نے پر پرزے۔ آپ لوگوں کو تو یہ کچھ سمجھتی ہی نہیں، لیکن میں کروں گی اس کا کچھ نہ کچھ علاج۔"

"سمجھا دیا ہے میں نے اسے۔" رشید صاحب نے بتایا۔

"جس پر ثمین نے سر جھٹکا اور بولی۔

"چھوٹے گھر کی لڑکی ہے، ہمارے گھر کی ہر چیز کو کیسی حیرت سے دیکھتی ہے اور اب گھر پر ملکیت

جتانے لگی ہے۔ اور وہ گھنّا ثاقب کو دیکھو تو کیسے بیوی کا آنچل تھام تھام کر پھرتا ہے۔"

✡✡✡✡

باپ نے دوکان پر آ کر حساب کتاب چیک کرنا شروع کیا۔ دن بھر کی آمدن وہ اپنی جیب میں ڈال لیتے ادھر ماں اور بہن بات بات پر زن مریدی کے طعنے دیتیں۔ وہ تو پہلے ہی دبی دبائی شخصیت کا مالک تھا۔ اس صورت حال میں بوکھلا کر رہ گیا۔ ہاں زریں اسے اچھی لگتی تھی وہ اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب تو یہ بھی خواب ہو رہا تھا۔ انیقہ بیگم نے ثمین کے کہنے پر رات کے کھانے کی ڈیوٹی اسے سونپ دی تھی۔ ثاقب نو بجے کے قریب گھر آتا تو وہ کچن میں ہوتی تھی اور جب دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کے لیے گھر آتا تھا، تب بھی اسے کوئی نہ کوئی کام سونپا دیا جاتا۔

وہ زریں پر ہی خفگی جتانے لگتا۔

"تھوڑا انتظار کریں نا۔ میں بس یہ کام منٹوں میں ختم کر کے آ رہی ہوں۔" ایک روز جب وہ دوپہر کو گھر آیا تو سیدھا کچن میں زریں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ زریں اور ثاقب کو پتا نہیں چلا ثمین کچن کے دروازے کے قریب ہی موجود تھی۔

اس روز زریں نے جیسے تیسے کام نبٹایا۔ بہت جلدی سب تیار کر کے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"آج گوشت کو بھونا نہیں گیا۔ مسالا بھی کھڑا کھڑا ہے اور یہ روٹیاں بھی لگتا ہے بہت ہی تیز آنچ پر پکائی گئی ہیں۔"

ادھر کھانا شروع ہوا ادھر ثمین کے اعتراضات بھی شروع ہو گئے اور سب ہی ثمین کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

"بات سنو بی بی! تم کسی محل سے نہیں آئیں جو یہاں آ کر ذرا ذرا سے کام کرتے تکلیف ہوتی ہے۔ دھیان سے یہ سب کیا کرو۔ آخر تم اپنے اسے کچے پکے مکان میں اس سے زیادہ کرتی آئی ہو۔ عجیب مصیبت میں جان ہے۔ جی تو چاہتا ہے یہ سب اٹھا کر پکانے والی کے منہ پر مار دوں۔"

ثمین بولتی بھی جا رہی تھی اور کھاتی بھی جا رہی تھی اور زریں سنتی جا رہی تھی اور کھاتی بھی جا رہی تھی اس کی اس ڈھٹائی پر سب اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے، لیکن اس کا پتا جب چلتا جب وہ کسی کی جانب دیکھتی، ثاقب ساری صورت حال سے پریشان اور شرمندہ تھا۔ وہ بے چارہ تو منتظر تھا زریں کام سے فارغ ہو کر کمرے میں آ جائے پھر بہت دنوں کے بعد دل کی باتیں ہوں گی لیکن یہ جھگڑا جو شروع ہو چکا تھا۔

✡✡✡✡

حسنہ کی جانب سے جلد شادی پر اصرار بڑھنے لگا تھا۔ انہیں اعتراض بھی نہیں تھا، بس وقت اس لیے چاہ رہے تھے کہ ہر شے ثمین جیسی بیٹی کے شایان شان بنائی جا سکے۔

کچھ رقم ثمین نے جوڑ رکھی تھی۔ کچھ اس کے والد کے پاس تھی۔

آج کل ثاقب کا موڈ بھی بہت خوش گوار تھا۔

"تم نئے کپڑے نہیں بنواؤ گی؟" ایک روز جب وہ دونوں گھر پر اکیلے تھے۔ ثاقب نے زریں

سے پوچھا تھا۔
''اتنے بہت سارے تو ابھی نئے کے نئے پڑے ہیں۔''
''میرا جی چاہتا ہے، ہم دونوں بھی کسی روز بازار چلیں اور میں تمہیں بہت سی شاپنگ کرواؤں۔''
اس کی بات پر زریں کھل اٹھی۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر ابھی چلتے ہیں۔'' وہ اس کے برابر صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ فوراً پر جوش انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔
''تم تو ابھی سے تیار ہو گئیں۔'' ثاقب مسکرایا۔
''ہاں تمہارے ساتھ گھومنا پھرنا میری بھی آرزو ہے۔'' اس کی بات پر ثاقب نے گہری سانس کھینچی اور بولا۔
''ہاں مگر زریں! شاپنگ کے لیے گھومنے پھرنے کے لیے پیسہ بھی تو چاہیے جو فی الحال میرے پاس نہیں ہے تم جانتی ہو میں جو کچھ بھی کماتا ہوں۔ سب ابا کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔''
پھر اس کی خاموش صورت دیکھ کر تسلی دینے کو بولا۔
''لیکن حالات ایک جیسے تھوڑا ہی رہیں گے میرا تو خیال ہے بلکہ یقین ہے ثمین کے جاتے ہی حالات بدل جائیں گے، پھر ہم پر اتنی روک ٹوک نہیں ہوگی ہم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں گے۔'' اور زریں نے بھی اس بات کا یقین کر لیا۔
فون کی بیل ہونے لگی۔ ثاقب نے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب حسنہ تھیں، سلام دعا کے بعد اس نے ریسیور زریں کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے بڑے ادب اور سلیقے سے حسنہ کو سلام کیا، جس کا جواب حسنہ نے کچھ توقف کے بعد دیا، پھر پوچھنے لگیں۔
''تم خوش تو ہو اپنے میاں کے ساتھ؟''
''جی آنٹی! بہت خوش ہوں، ثاقب بہت اچھے انسان ہیں۔'' اسے لگا حسنہ بیگم کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں لیکن پھر اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

مہندی کے روز زریں نے ہلکے پیلے رنگ کا سوٹ پہنا تھا جس پر گوٹے کا کام اور ستارے لگے تھے، سوٹ بہت قیمتی تو نہیں تھا لیکن کام خوب صورت تھا اور پھر پہننے والی کا قد بت دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ تھوڑے سے سنگھار سے وہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔
لڑکے والوں کی جانب سے مہندی بھی شاندار تھی اور مہندی لے کر آنے والیوں کے زیورات اور لباس بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ادھر سے ثمین کی کولیگ اور اسٹوڈنٹ شریک تھیں۔ رشتہ داروں میں صرف وہ بلائے گئے تھے جو تقریب کے شایانِ شان حیثیت کے مالک تھے۔ زریں کے گھر والوں کو اس شادی کی تقریب میں مدعو کیا ہی نہیں گیا تھا۔
مہندی لے کر آنے والوں کے استقبال کے لیے شہوار کے ساتھ زریں بھی کھڑی تھی اور حسنہ اسے دیکھ کر لڑکھڑا گئی تھیں۔ وہ اتنی حسین اور معصوم دکھائی دیتی تھی کہ ایک بار تو بیٹے کے دل کا ملال ان کے دل میں اتر آیا تھا۔

پھر وہ پوری تقریب کے دوران اپنی سوچ سے دامن نہیں چھڑا سکیں۔
اگر یہ داور کی محبت تھی تو اس نے وقت پر اپنی خواہش کا اظہار کیوں نہیں کیا، یہ لڑکی کتنی مطمئن اور آسودہ ہے تو کیا داور کی محبت یک طرفہ ہے، اور کیا ثمین کی شخصیت میں اتنی کشش ہے کہ وہ زریں کا سحر توڑ دے گی۔
ان کی آنکھوں کے سامنے بار بار داور کا بے تاثر چہرہ آ رہا تھا، آج کے دن جو چمک اس کے چہرے پر ہونی چاہیے تھی وہ سرے سے مفقود تھی۔
''اب کل لڑکی والوں کو مہندی لے کر آنا ہے ان میں زریں بھی شامل ہوگی۔'' انہوں نے گھبرا کر پہلو بدلا تھا۔
''چلیے نا آنٹی! ثمین کو رسم کے لیے لایا جا رہا ہے۔'' ان کی رشتے کی بھتیجی نے متوجہ کیا تھا۔
ثمین چہرہ آنچل میں چھپائے اور سجے سجائے پیڑھے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ انہوں نے ہلکا آنچل اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا اور پتا نہیں کیا جانچنا چاہا لیکن آج ان کے دل میں جیسے داور کا دل دھڑک رہا تھا وہ جلدی سے رسم کر کے پیچھے ہٹ گئیں۔
''کیا بات ہے آنٹی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ پانی لاؤں آپ کے لیے؟'' زریں ان کے قریب کھڑی پوچھ رہی تھی۔
''میں ٹھیک ہوں۔ ادھر بیٹھ جاؤ میرے پاس۔'' انہوں نے بے ساختہ کہا تھا۔ زریں کو اسٹیج کی جانب جانا تھا لیکن وہ بیٹھ گئی۔
''کبھی ملی ہو داور سے؟'' وہ خود کو روک نہیں سکیں۔
''نہیں کبھی نہیں لیکن میں نے آنٹی سے اور سب گھر والوں سے سنا ہے وہ بہت اچھے ہیں۔''
زریں کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر سچائی کی جھلک تھی۔
''کیا ثمین، داور کو خوش رکھ سکے گی؟''
پتا نہیں یہ سوال انہوں نے خود سے کیا تھا یا زریں سے، جواب زریں نے دیا، وہ کہہ رہی تھی۔
''آپ دعا کریں نا آنٹی! دعا میں بہت طاقت ہے۔''
''تم دعا پر یقین رکھتی ہو؟''
دور اسٹیج پر بیٹھی ثمین نے حسنہ بیگم کے ساتھ زریں کو دیکھ لیا تھا، قریب بیٹھی شہوار کے کان میں کچھ کہا تھا اور شہوار فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں کی جانب لپکی تھی۔
''تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟'' جاتے ہی اس نے بڑی بدتمیزی سے یہ کہہ کر حسنہ بیگم کو حیران کر دیا تھا۔
زریں اس کی بڑی بھاوج ہے اور یہ کس طریقے سے اس کے ساتھ بات کر رہی ہے اور زریں بھی پھر رکی نہیں، فوراً چلی گئی تھی۔

''زریں نہیں جائے گی آخر گھر میں کسی کو میرے پاس بھی تو رکنا چاہیے۔''

سبز جوڑا پہنے ثاقب کے لائے موتیے کے گجرے اور کنگن پہنے جب وہ سجی سنوری دولہا والوں کے ہاں مہندی لے جانے کی تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ تب ہال میں بیٹھی ثمین نے بڑی سنجیدگی سے پہلے فیصلہ سنایا پھر مہمانوں کی موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے وجہ بھی بتادی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے نگاہ زریں کے چہرے پر رکھی تھی، وہ اس کے چہرے پر غصے اور بے بسی کا تاثر دیکھ کر لطف لینا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ زریں بڑے سکون سے ایک جانب جا بیٹھی تھی۔

''ارے بھاوج ہے تمہاری۔ اس کا جانا تو ضروری ہے۔''

ایک سینئر کولیگ نے کہا تھا۔ لیکن گھر والوں کے لیے ثمین کا کہہ دینا پتھر پر لکیر کی طرح تھا۔

''اوہ تو زریں خود بھی جانا نہیں چاہ رہی۔'' ثمین کے اندر ایک گرم گرم لہر اٹھی۔

بے حد خوب صورت اور کم عمر یہ بااعتماد لڑکی جسے دیکھ کر یہ لگتا تھا اسے کسی کے رویتے کی کوئی پرواہی نہیں ہے وہ بس خود میں مگن ہے، اس کی شخصیت کو ہر دم جیسے چیلنج کرتی آئی تھی۔ تب ہی اس نے انیقہ سے کہا تھا۔

''امی! آپ زریں کو لے ہی جائیں۔ ملازمائیں تو ہیں گھر پر۔''

ماں نے یوں فیصلہ بدل جانے پر سوالیہ انداز میں بیٹی کی جانب دیکھا۔ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

زریں جس گاڑی میں ثمین کی سسرال پہنچی۔ وہ گاڑیوں کی قطار میں سب سے آخری گاڑی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا وہاں تو سب سے زیادہ شدّت سے انتظار ہی اسی کا ہو رہا تھا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کب سے کھڑا وہ صرف اسی کے دیدار کا منتظر ہے۔ وہ بھول گیا ہے وہ کسی کی بیوی، کسی کے گھر کی عزت ہے، اسے صرف اتنا یاد تھا یہ وہ چہرہ ہے جس کے حسن کو وہ کبھی کینوس پر اتار نہیں سکا جس کی معصومیت جس کی آنکھوں کی چمک اور جس کے بدن کی کشش وہ پینٹ کرنے سے قاصر ہے۔

یہ وہی چہرہ ہے جسے اس کے تخیل نے بارہا تراشا ہے اور اپنا مانا ہے۔ وہ تو اس کی تلاش میں جگہ جگہ بھٹکا ہے۔ یہ قسمت کی بات کہ جب ملی ہے تو نام کے ساتھ کسی اور کا نام ہے، لیکن اس بات کی پروا کسے ہے؟ دولت اور طاقت سے سب چھینا جاسکتا ہے۔ ناممکن کو ممکن کیا جاسکتا ہے۔ پھر اسے اس پری وش کی جھلک نظر آگئی تھی اور گویا دل نے قرار پکڑا بھی تو ایسا جس میں پہلے سے زیادہ بے قراری تھی۔

اچانک بالکل اسے اس تقریب میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور جو روشنیاں اس کے گھر کو منور کر رہی تھیں وہ اس کے اندر بھی جگمگانے لگی تھی۔

''داور بھائی!'' اس کے دوست اور کزن زمان کی بیوی نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ وہ جلدی سے کھڑکی سے پیچھے ہوا، اور ''آجایئے بھابھی!'' کہتا ہوا صوفے کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''ارے! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا۔'' وہ خفا ہونے لگیں۔

''اوکے میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

برقی قمقموں سے سجاوٹ کی گئی تھی جو جگمگا رہی تھی۔ لان میں لگے فواروں سے موتیوں کی طرح گرتا پانی رنگ برنگے آنچل اوڑھے اک بے خودی میں گیت گاتی ہنستی مسکراتی لڑکیاں، مہندی کے سجے سجائے تھال، مٹھائی کے ٹوکرے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں۔ سب کچھ تو تھا لیکن حسنہ بیگم کا دل بجھا بجھا سا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی نگاہ بار بار زریں کی جانب اٹھ جاتی تھی۔

''داور کو تو رسم کے لیے باہر لائیں۔'' انیقہ بیگم کے کہنے پر حسنہ جیسے کسی خیال سے چونکیں پھر اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ کچھ لڑکیوں کو اشارے سے بلایا اور داور کو لے کر آنے کو کہا۔

''میں قاسم اور راشد کو اطلاع کرتی ہوں۔'' لڑکی نے اس کے قریبی دوستوں کا نام لیا اور بیس منٹ کے لیے وہ اپنے دوستوں، رشتے کی بہنوں اور بھابھیوں کے ہمراہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ لیے روسلک کے سفید کرتا شلوار میں وہ بے حد سج رہا تھا اور حسنہ تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔

''کہیں اس نے پی تو نہیں رکھی۔'' وہ چھپاتا تھا لیکن حسنہ بیگم اس کے اس شغل سے واقف تھیں۔

اسے سجی سجائی مخصوص نشست پر لا کر بٹھایا گیا، لڑکی والوں کی جانب سے آنے والی ثمین کی سہیلیاں اور شہوار چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں، اس نے ان سب کے ہجوم میں زریں کو تلاش کرنا چاہا لیکن وہ ان میں نہیں تھی۔

شگن ہونے لگے اس کے ہاتھ پر باری باری خواتین مہندی رکھ رہی تھیں اور صدقہ اتار کر مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ ایسے میں ہنسی مذاق زوروں پر تھا۔ تبھی وہ بالکل اچانک چھم سے سامنے آئی تھی۔ مسکراتا چہرہ، بھاری کام کا سوٹ اور گولڈ کی جیولری سے سجی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھی تھی مسکرا کر داور کی جانب دیکھنے کے بعد ذرا سی مہندی اس کے ہاتھ پر رکھی تھی۔ روپے وارے تھے اور جب مٹھائی والا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تھا تو داور نے بڑی بے تکلفی سے کلائی تھام لی تھی۔

''ایک شرط پر مٹھائی لوں گا۔''

وہ کہہ رہا تھا، سامنے وہ عورت تھی جس کے دل میں صرف شوہر کی محبت تھی اور یہ جسم بھی اس کی امانت تھا، کلائی تھامنے والے اس ہاتھ میں کوئی خاص بات ضرور تھی اور مسکراتے چہرے پر چمکتی آنکھیں ایسا کچھ ضرور کہہ رہی تھیں کہ وہ بری طرح گھبرائی تھی، ٹھٹک کر داور کی جانب پھر سے دیکھا تھا جس نے زریں کے یوں دیکھنے پر کلائی پر گرفت مزید مضبوط کردی تھی۔

''چھوڑیں نا!'' زریں کی آواز میں خفگی اتر آئی تھی جبکہ اس محفل میں موجود سب ہی اس مذاق کو انجوائے کر رہے تھے۔

''یہ مٹھائی تو منہ میں ڈال دیں۔'' داور نے اسے اپنی جانب کھینچ کر کہا تھا۔ زریں نے ہاتھ میں پکڑا مٹھائی کا ٹکڑا دوبارہ تھال میں رکھ دیا۔

''آپ ہاتھ چھوڑیں میرا۔'' ناراضی پوری طرح عیاں ہونے لگی تھی۔

''داور! یہ کیا مذاق ہے؟ چھوڑو اس کا ہاتھ۔'' حسنہ کی آواز سرد اور آنکھیں بھرپور تنبیہ کر رہی تھیں۔ داور کو ہاتھ چھوڑنا پڑا اور زریں کی کلائی کی بہت سی چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ وہ رکی نہیں فوراً اسٹیج

سے نیچے اتر آئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''اے کیا ہوا، ذرا سے مذاق پر بگڑ کیوں گئی تھی؟'' انیقہ اس کے سر پر پہنچ گئی تھیں، وہ کچھ نہیں کہہ سکی سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ انیقہ پلٹ گئیں اور اس نے سوچا۔ اب گھر جاتے ہی عدالت لگے گی، ثمین کو بھی بتایا جائے گا اور ثاقب کے علم میں بھی یہ بات آئے گی۔ اسے تو یقیناً بہنوئی کی یہ حرکت بہت بری لگے گی اور ثمین کا موڈ شاید میری اس گستاخی کا سن کر خراب ہوگا۔ لیکن اس کے دونوں اندازے غلط نکلے، ماں اور بہن نے جب جا کر ثمین کو بتایا تو اس کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا تھا۔

''کیا داور نے کسی دوسری لڑکی کے ساتھ بھی ایسا مذاق کیا تھا؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''نہیں، بس اسی کو ہماری بہو جان کر ذرا ہنسی مذاق کرنا چاہا تھا لیکن یہ نواب زادی کسی کو اپنے قابل ہی کب سمجھتی ہے۔''

انیقہ بول رہی تھیں لیکن ثمین انہیں کب سن رہی تھی۔ اس کے سامنے زریں کھڑی تھی، سجی سجائی قیامت ڈھاتی ہوئی۔ تو کیا داور کو بھی اس کے منحوس سراپے نے متوجہ کر لیا۔

اور ثاقب نے کمرے میں آتے ہی زریں سے کہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے نا، داور بھائی سے ہمارا کیا رشتہ ہے ایک تو وہ بڑے آدمی ہیں دوسرا یہ رشتہ تو ہوتا ہی نازک ہے، لیکن تمہیں ذرا بھی احساس نہیں۔ ان کے مذاق پر برا مان گئیں۔ پتا نہیں تم ہمیشہ ایسے کام کیوں کرتی ہو جس پر میرے گھر والوں کو اعتراض ہوتا ہے۔''

زریں کے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ اس نے پلٹ کر ثاقب کی جانب نہیں دیکھا اور اس کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دیا لیکن ابھی جو کچھ ثاقب نے کہا وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو اس نے سوچا تھا۔ لب کاٹتے ہوئے وہ بے دلی سے جھمکے اتارنے لگی، تب بازو میں ہلکی سی درد کی لہر اٹھی اس نے کلائی کی جانب دیکھا جہاں سرخ نشان اب تک موجود تھا اور درد بھی، کبھی اتنی مضبوطی سے ثاقب نے نہیں پکڑا تھا، اتنی بے تابی اور بے چینی سے زریں ناواقف تھی۔

✡✡✡✡

شادی کے روز اسٹیج پر ثمین کی دوستوں کا قبضہ رہا۔ اسے کسی بھی رسم کے لیے نہیں بلایا گیا اور اس نے بھی اس بات پر شکر ادا کیا۔ یہاں تک کہ وہ ثمین کی رخصتی کے وقت بھی آگے نہیں بڑھی۔

گہری سانس اندر اتار کر ہلکی پھلکی ہو کر اس نے آس پاس نظر دوڑائی، انیقہ اور شہوار رو رہی تھیں، عاقب اور اس کے سسر رشید صاحب کے چہرے ملول تھے وہ سب ایک دوسرے سے نزدیک کھڑے تھے جبکہ ثاقب کچھ فاصلے پر تھا اور بڑے لاپروا انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، تو گویا ثاقب بھی میری ہی طرح سوچ رہا ہے وہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہوئی تو وہ مسکرا دیا پھر کہنے لگا۔

''باقی گھر والے تو اب گھر چلے جائیں گے مجھے یہاں پر تھوڑا کام ہے۔ ٹھہر کر آؤں گا۔ تم میرا انتظار کر لو۔ اکٹھے چلیں گے۔'' اور زریں کو کیا چاہیے تھا۔ مسکراہٹ ہونٹوں پر سج گئی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آج تم بہت بہت اچھی لگ رہی تھیں، سب سے الگ سب سے پیاری، میں نے آتے جاتے

ہر بار ذرا رک کر تمہیں دیکھتا تھا۔'' وہ چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔

''ثاقب!'' باپ کی آواز پر وہ مزید کچھ کہتے رک گیا اور ''جی ابا'' کہتا ان کی جانب لپکا۔ زریں بھی سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔

''ہم لوگ جا رہے ہیں۔ تم بھی جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ ٹائم خاصا ہو رہا ہے چلو آؤ زریں۔'' ساتھ ہی انہوں نے اسے پکارا۔

زریں نے ثاقب کی جانب دیکھا۔ لیکن باپ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے کے بجائے وہ سعادت مندی سے سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اور وہ خاموشی سے ان لوگوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اچانک انیقہ بیگم کو کچھ یاد آیا۔ وہ زریں کی طرف متوجہ ہوئیں اور بولیں۔

''ثمین کہہ رہی تھی زریں سے کہنا کل ڈھنگ سے تیار ہو کر آئے جیسے آج چھمک چھلو بنی گھوم رہی تھی نا کل اتنا میک اپ کرنے زرق برق کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں ہے، کوئی ہلکے کام والا جوڑا پہننا اور میک اپ بھی لائٹ سا کرنا۔''

''اگر باجی کہیں تو میں کل کی تقریب میں شریک ہی نہیں ہوتی۔ یوں بھی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''یہ باجی باجی کی کیا رٹ لگائے رکھتی ہو تم، اتنی بڑی بھی نہیں ہیں — تم سے ثمین جی کہا کرو۔''

زریں نے کچھ نہیں کہا۔ آنکھیں موند کر سر پھر بیک سے ٹکا دیا اور یہ لوگ آج کی تقریب کی باتیں کرنے لگے۔ جب ثاقب گھر آیا، زریں کمرے کی لائٹ آف کر کے سو چکی تھی۔ اس کی خفگی کی وجہ وہ سمجھتا تھا اور اپنی صفائی میں کہنے کو اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا ارمانوں کو تھپک کر وہ بھی کروٹ بدل کر سو گیا۔

✡✡✡✡

موسمِ سرما جب گرم علاقوں میں شروع ہوتا ہے تو ٹھنڈے علاقوں کے پرندے ان گرم علاقوں کی جانب سفر شرع کرتے ہیں۔ یہ نسل نسل کے خوب صورت پرندے دریاؤں کے کناروں پر جنگلوں میں اور ریگستانوں میں اترتے ہیں۔ ان مہمان پرندوں کی آمد سے ساحل، جنگل اور صحرا سج جاتے ہیں پھر جوں ہی سرما آہستہ آہستہ گرما میں تبدیل ہونے لگتا ہے یہ پھر سے اڑان بھرتے ہیں اور اپنے علاقوں کی جانب سفر شروع کر دیتے ہیں۔ یہ عارضی ٹھکانے کو چھوڑ دیتے ہیں۔

''لیکن میں اس خوب صورت پرندے کو جانے نہیں دوں گا۔ پردیس کو ہی اس کا دیس بنا دوں گا۔''

''کیا سوچنے لگے۔'' ثمین کی آواز اسے خیالات سے باہر لے آئی تھی۔

اس نے ایک نظر نئی نویلی دلہن کو دیکھا اور مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ (مرد کا دل بڑا وسیع ہے وہ بیک وقت کئی کئی محبتیں پال سکتا ہے)۔ ثمین سے اسے محبت اور الفت کا دعوانہ سہی لیکن وہ ہم سفر تھی، پڑھی لکھی ذہین بیوی اور داور کا رویہ اس کے ساتھ پہلے دن سے ہی خاصا مناسب تھا کہ وہاں اس کے دل میں گنجائش کافی زیادہ تھی اور دھن دولت کی بھی کمی نہیں۔ وہ دو تو کیا کئی عورتوں کو ان کی من چاہی آسائشیں

مہیا کر سکتا ہے مگر ہاں اس کے اپنے دل کی خواہش یا پھر اب ضد وہ ایک ہی ہے یہ بھی بھلا کوئی بات ہے جسے داور حسین نے اتنے سال سوچا، وہ ملے تو اس کے ساتھ کوئی دوسرا کھڑا نظر آئے۔ اس منظر کو تو مجھے بدلنا ہے۔ اس نے مسکرا کر ثمین کی کمر میں ہاتھ ڈالا تھا۔

''امی کی طرف چلیں؟'' ثمین نے پوچھا تھا اور جیسے اس کی دل کی بات کہہ دی تھی۔

ثمین نے جانے سے پہلی اپنی آمد کی اطلاع انیقہ کو کر دی کہ استقبال شایانِ شان جو چاہ رہی تھی، زریں دن بھر کے کام نبٹا کر ابھی کمرے میں جا کر لیٹی تھی کہ شہوار ثمین کی آمد کا بتا کر امی کے بلانے کا پیغام دینے لگی۔

✡✡✡✡

تھوڑی دیر میں ثمین اور داور گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اس کا لباس، زیورات، سج دھج وہ تو پہچانی نہیں جا رہی تھی، ثمین بڑھ کر ماں کے گلے لگ گئی تھی۔ انہوں نے بے ساختہ پیشانی چوم لی۔ پھر داور کی جانب متوجہ ہوئیں، جو لب بھینچے دروازے میں ہی رک گیا تھا اور سر جھکا کر ان لوگوں کی آمد سے بے نیاز کھڑی زریں کو دیکھ رہا تھا۔

لیکن اس وقت انیقہ بیگم نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ متوجہ کس جانب ہے۔ وہ تو بس والہانہ انداز میں اس کی جانب لپکی تھیں۔ لیکن داور کا انداز اتنا ہی سرد تھا۔ اس نے صرف سر کے اشارے سے سلام کیا اور پھر نشستوں کی جانب بڑھ گیا۔ ثمین نے صوفے پر اپنے برابر اس کے لیے جگہ رکھی لیکن وہ جا کر سنگل صوفے پر بیٹھ گیا اور زریں باہر کی جانب چل پڑی۔

''ادھر آؤ۔ ہوش میں تو ہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے گھر آئے مہمانوں کو سلام بھی کرنا ہوتا ہے۔'' انیقہ نے ڈانٹ کر یاد دلایا تھا۔ وہ رک گئی وہیں کھڑے کھڑے دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔ ثمین اور انیقہ کو تو دکھائی نہیں دیے لیکن داور نے اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ لیے تھے۔

''چھوٹے گھر کی ہے نا، اکثر ہمیں شرمندہ کرواتی ہے۔'' ثمین ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

''آ، ہاں ٹھیک ٹھیک۔ چھوٹے اور بڑے گھرانوں میں فرق تو بڑا واضح ہوتا ہے۔''

اتنا جتاتا ہوا انداز ماں بیٹی جیسے سن ہو کر رہ گئیں اور وہ بڑے ناقدانہ انداز میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

انیقہ بیگم شرم سار سی بیٹھی تھیں تو ثمین حیران تھی، وہ اس کے موڈ کے اس رنگ کو ابھی ابھی دیکھ پائی تھی، ورنہ اتنے دنوں میں اس نے ایک بار بھی کم حیثیتی کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا اور نہ ہی اس کے کسی انداز سے غرور جھلکتا تھا۔

''مجھے اپنے یہاں لے کر نہیں آنا چاہیے تھا۔'' ثمین کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

شہوار اور عاقب کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑے جوش و خروش سے دونوں کو سلام کیا۔ لیکن دونوں کا انداز ٹھس تھا اور انیقہ بھی خاموش بیٹھی تھیں۔

''آپ چائے نہیں لو گی؟'' جب زریں سب کو سرو کر چکی تو بڑی اپنائیت سے پوچھنے لگا۔

''نہیں میں ثاقب کے ساتھ ہی پیوں گی۔''

اسی نام پر مسکراہٹ غائب ہوئی اور جب بولا تو آواز بڑی دھیمی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

''آج ہمارے ساتھ پی لیں۔''

''نہیں وہ دراصل۔۔۔'' زریں نے کچھ کہنا چاہا۔ اس نے بات کاٹ دی اور بولا ''اگر آپ نہیں پیو گی تو پھر میرا کپ بھی یہ رکھا ہے۔''

زریں بوکھلاتی نہ تو اور کیا کرتی۔ جلدی سے اپنے لیے چائے انڈیلنے لگی، وہ پھر مسکرانے لگا اور ثمین کا بس نہیں چل رہا تھا۔ دھکے دے کر زریں کو کمرے سے باہر نکال دے۔ یہ یقیناً اسے بہت معصوم اور ہمدردی کے لائق سمجھ رہا ہے۔

اس نے اب زریں کی طرف دھیان سے دیکھا۔ بلیک اورنج ٹائی اینڈ ڈائی کا دوپٹا، کالی شرٹ جس پر اورنج دھاگے سے کڑھائی کی گئی تھی اور گھیر دار اورنج شلوار، کاش جادو آتا وہ مکھی بنا کر اسے دیوار سے چپکا دیتی۔ بکھرے بکھرے بال، روئی روئی اداس آنکھیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی زبردستی کی مسکراہٹ۔ یہ جادوگرنی ہے۔ ثمین نے شدید نفرت کے عالم میں سوچا اور ایسے میں دل میں خواہش جاگی۔ وہ ایک بار جا کر آئینہ دیکھ کر آئے۔ قیمتی لباس جگر جگر زیورات میں وہ خود اس وقت کیسی لگ رہی ہے۔

''صرف چائے اچھی بناتی ہو یا کھانا بھی بنانا آتا ہے؟'' داور کو شاید اس وقت یہاں صرف وہی دکھائی دے رہی تھی۔

''مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔ نہ چائے نہ کھانا۔ میں بہت نکمی، نالائق ہوں۔''

جب اسے غصہ آتا تھا تب زبان سے ضرور کچھ نہ کچھ پھسل جاتا تھا اور آج اپنی بے عزتی پر وہ غصے میں بھی تھی۔

''اچھا امی ہم چلتے ہیں۔'' ثمین ایک بار پھر برداشت نہ کر سکی اور پیالی زور سے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لیکن ابھی سے، ایسے نہیں بیٹا۔ پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو۔ دونوں اب کھانا کھا کر جانا۔ میں نے تو تمہارے ابا کو فون بھی کر دیا ہے۔ وہ بھی تم سے ملنے آتے ہی ہوں گے۔''

''میں پھر کسی روز آ جاؤں گی امی!'' ایسا کہتے ہوئے ثمین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماں کو کچھ سمجھا دیا تھا، وہ اگلا فقرہ بولتے بولتے خاموش ہو گئیں۔

''پلیز آپ لوگ کھانا کھا کر جائیں۔'' زریں جیسے منّت کر رہی تھی۔ ثمین نے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا۔

''آپ سمجھائیے نا اپنی وائف کو، ان سے کہیں یہ کھانے پر تو رک جائیں۔'' زریں کے لہجے میں ایسا خوف اور التجا تھی کہ داور حیران ہوئے بغیر رہ نہیں سکا۔

''چلیے نا!'' ثمین اس کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔

''تم نے سنا نہیں تمہاری بھابھی کھانا کھا کر جانے کو کہہ رہی ہے۔''

''رہنے دیں، یہ اور اس کے کھانے، چلیے نا۔ مجھے یاد آ گیا ہے کچھ ضروری شاپنگ بھی کرنا ہے۔''

ثمین چل پڑی۔

داور کو بھی قدم بڑھانا پڑے لیکن جاتے جاتے اس نے زریں سے کہا۔

''ہم بہت جلد کھانا کھانے کے لیے آئیں گے لیکن شرط یہ ہے چائے کے سامان کی طرح کھانا بھی باہر سے نہ منگوایا جائے۔''

''نہیں نہیں بیٹا! میں اپنے ہاتھ سے بناؤں گی۔ وہ تو آج تم لوگ اچانک ہی آ گئے تو اس لیے۔'' انیقہ جلدی جلدی صفائی دینے لگیں۔

اور ان کے جانے کے بعد بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ زریں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ اسے یقین تھا وہ ان کے یونہی چلے جانے کا سارا الزام اس کے سر پر دھریں گی اور پتا نہیں کیا کیا سنائیں گی۔

''امی! یہ داور بھائی نے تو مجھے ذرا بھی لفٹ نہیں کرائی۔ اکلوتی سالی ہوتی ہوں میں ان کی۔'' شہوار نے بھی اپنا دکھڑا رو دیا۔

✿✿✿✿

''اپنے گھر والوں کو کسی روز کھانے پر انوائٹ کرو نا!'' داور نے ایک روز ناشتے کی ٹیبل پر آتے ہی کہا تھا۔

''کیوں آپ انہیں بتانا چاہتے ہیں۔ دکھانا چاہتے ہیں کچھ؟'' اس نے تیکھے انداز میں کہا تھا۔ حسنہ بیگم چونکیں ضرور بولیں نہیں۔

''مجھے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں نہ ہی یہ ہمارے گھر کا رواج ہے۔'' داور نے اس کی بات کو محسوس کیے بغیر آرام سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں آج شام ہی انہیں انوائٹ کر لیتی ہوں۔''

''نہیں نہیں۔ آج شام نہیں، تم کل لنچ پر بلا لو میں کل فارغ ہوں۔''

وہ اتنی عزت دے رہا ہے استقبال کے لیے گھر پر موجود رہنا چاہتا ہے تو ثمین کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

پھر داور نے جس طرح ہر بات میں دلچسپی لی۔ ملازموں کو مینیو کے بارے میں ہدایات دیں۔ کھانا بہت توجہ سے بنانے کا حکم دیا۔ وہ سب ثمین کے لیے حیرت انگیز بھی تھا اور خوشگوار بھی۔ لیکن اصل حیرت تو تب ہوئی جب مہمانوں کے آتے ہی ایک دم سے اس کا جوش وخروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ سنجیدہ اور بددل دکھائی دینے لگا۔

شہوار عاقب ثمین کے والدین اور سب سے پیچھے اکیلا ثاقب۔

''بہو نہیں آئی آپ کی؟'' حسنہ نے داور کے دل کی بات پوچھ لی۔

''وہ میکے گئی ہے۔'' انیقہ نے بتایا۔

داور سرسری سلام دعا کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب واپس آیا تو کہیں جانے کو تیار تھا۔ حسنہ نے پوچھا۔ ثمین نے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''کال آئی ہے۔ جانا ضروری ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ کوئی معذرت کیے بغیر باہر نکل گیا۔

✿✿✿✿

مجھے اس سے ملنا ہے۔ یہ دل کی آرزو تھی اور آج جب گھر آیا تو سامنے اسے موجود پا کر حیران رہ گیا۔ وہ اس وقت گیٹ کی سائیڈ پر بنے لان میں موجود تھی اور اس کی خوب صورتی کو سراہتی نظروں سے دیکھ رہی تھی، ٹی پنک سادہ اور عام سا سوٹ لیکن یہ رنگ اس کے چہرے پر بھی جھلک رہا تھا، وہ کتنی خوش اور مسرور تھی۔ ڈھیر سارے گلابوں کو دیکھ کر، جبکہ ثمین نے کہا تھا اب یہ گلاب موتیا کون لگاتا ہے۔ مجھے اس گھر کی ایک ایک انچ پر توجہ دینا پڑے گی۔

''زہے نصیب!'' داور اس کی جانب لپکا تھا۔

''السلام علیکم داور بھا۔۔۔۔!'' پھر اسے لگا شاید یہ شاندار شخص کوئی رشتہ جوڑنا مناسب نہ سمجھے اور بھائی کی جگہ صاحب لگا دیا۔

''اچھا کیا، بھائی کہتیں تو میں ناراض ہو جاتا۔'' وہ کھل کر مسکرایا۔

''مجھے پتا ہے اپنی حیثیت کا۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''نہیں اپنی حیثیت کا ہی تو نہیں پتا تمہیں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا تھا پھر بے حد قریب آ کھڑا ہوا۔

''آج کیسے راستہ بھول گئیں؟''

''ثمین جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے فون پر آنٹی سے کہا تھا۔''

''یہاں ملازموں کی فوج کس لیے ہے؟''

''لیکن ثمین جی کا کہنا تھا میکے سے بھی کوئی ان کی دیکھ بھال کے لیے آنا چاہیے۔ ملازمہ چھٹی پر تھی۔ اسی لیے آنٹی نے مجھے بھیج دیا۔''

''لیکن آپ کوئی کام نہیں کرو گی کہ میرے لیے تو خاص الخاص مہمان ہو اور اس روز لنچ پر کتنا انتظار کیا میں نے۔ آئیں کیوں نہیں؟''

زریں اب بھی نہ ٹھٹکتی، یہ کیسے ممکن تھا وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

''مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں زریں!''

زریں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی بے تابی کو دیکھا۔ دو قدم مزید پیچھے ہٹی پھر اندر کی جانب بھاگی۔

''سنو زریں! سنو تو۔'' اس کا یوں گھبرا کر بھاگ جانا داور کے جذبوں کو مزید ہوا دے گیا تھا۔

''ثمین جی کہاں ہیں آنٹی!'' وہ بدحواسی کے عالم میں ان سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

''ارے کیا ہوا خیریت تو ہے نا؟'' حسنہ نے اسے تھام لیا، اس کے کچھ کہنے سے پہلے داور اندر آ گیا اور حسنہ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

وہ تو پہلے ہی زریں کی یہاں آمد پر دل ہی دل میں ہزار وسوسوں کا شکار تھیں اور اب جیسے بدن سے جان ہی نکل گئی تھی۔

''داور! تم کب آئے؟'' بہ دقت تمام کہا تھا۔
''ابھی ابھی بالکل ابھی اور مجھے تو علم ہی نہیں تھا زریں آئی ہوئی ہے۔ پہلی بار ہمارے گھر آئی ہے۔ آپ نے کوئی خاطر تواضع بھی کی ہے اس کی۔''
''یہ ثمین کی دیکھ بھال کے لیے آئی ہے اسے فلو کے ساتھ ساتھ ٹمپریچر بھی ہو رہا ہے۔''
''ہاں بتایا ہے مجھے زریں نے اور میری سمجھ میں نہیں آتا ملازمین کی اتنی فوج کے ہوتے ہوئے اسے ایسی کیا کمی محسوس ہوئی تھی۔''
''بیماری میں کسی اپنے، کسی ہمدرد کی تیمارداری کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔''
''عجیب عورت ہے۔'' داور نے سر جھٹکا تھا۔
''جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ۔ میڈیسن تو لے لی ہیں اس نے لیکن شوہر کی توجہ اور محبت عورت کی آدھی بیماری بغیر کسی دوا کے ہی دور کر دیا کرتی ہے۔''
''ثمین ان عورتوں میں سے نہیں ہے اور نہ ہی میرے کسی انداز میں اتنی شدت ہے۔''
''کیوں نہیں ہے شدت داور! میں تمہیں بالکل سمجھ نہیں پا رہی۔'' وہ بے بس اور غصے سے چلائیں، پھر زریں کی موجودگی کے خیال سے دھیمی پڑ گئیں۔
''زریں! تم آؤ میرے کمرے میں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر داور کو وہیں چھوڑ کر چل دیں۔
''یاد رہے یہ آپ کے لیے نہیں آئی۔'' اس نے کہا تھا اور انہوں نے ان سنی کی تھی۔
کمرے میں آ کر حسنہ نے زریں کو بغور دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک پزل اور سخت ہراساں تھی۔ وہ تو اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں لیکن اب سوچ رہی تھیں، شاید یہ ممکن نہیں اور ادھر زریں کو اب تک دیکھی فلمیں، ڈرامے اور ناول یاد آ رہے تھے۔ عیاش امیر زادے، کمزور بے بس لڑکیاں۔
حسنہ کمرے سے باہر چلی گئیں اور زریں اس سارے منظر کو پھر سے سوچنے لگی اور چاہتی تھی، دوبارہ سوچنے پر ایسا کچھ یاد آ جائے جس سے وہ داور کے بارے میں اپنی سوچ کو غلط قرار دے سکے۔
لیکن وہ اس کی آنکھیں ''نہیں نہیں میرا اندازہ غلط نہیں ہے، ثمین خفا ہوتی ہے تو ہو مجھے آج ہی گھر واپس چلے جانا چاہیے۔ ثمین کی ساس مہربان خاتون ہیں میں طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا بہانا کر کے گھر جا سکتی ہوں۔ ثمین عادت کے مطابق برا تو مانے گی۔ لیکن مجھے اس کی خفگی کی پروا کیے بغیر یہاں سے جانا ہے۔''
اور جب اس نے حسنہ بیگم سے بات کی وہ تو جیسے تیار بیٹھی تھیں فوراً بولیں۔
''ہاں ہاں ٹھیک ہے ملازم سے کہتی ہوں گاڑی نکالے، تم آرام سے گھر پہنچ جاؤ گی۔''
''میں رک جاتی آنٹی لیکن۔۔۔''
''کوئی بات نہیں، ثمین بھی اب بہتر ہے اور یہاں دیکھ بھال کرنے والوں کی کمی بھی نہیں ہے۔''
''کیا بات ہے اماں جی ابھی تک کھانا نہیں لگایا گیا۔'' داور اچانک کمرے میں آیا تھا، اور بے حد خوش گوار لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
''لگتا ہے تمہاری بیگم کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی ہے اسی لیے اتنے خوش دکھائی دے رہے ہو۔''
ماں کی بات پر وہ بلاوجہ ہی ہنس پڑا پھر تفنن میں سر ہلا کر کہنے لگا۔ اسے کون سی خطرناک بیماری لگی

ہے بھلا، کچھ عورتوں کو شور کرنے، متوجہ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔''
''وہ بیوی ہے تمہاری۔'' حسنہ کو زریں کی موجودگی میں ثمین کے لیے اس کا ایسے کہنا بہت برا لگا تھا۔
''ہاں بدقسمتی سے۔'' اور اب کے چونکنے کی باری زریں کی تھی، وہ ثمین جسے خود پر بڑا ناز تھا، جو اپنے سامنے کسی کو کچھ جانتی ہی نہ تھیں، یہ اُس کا شوہر کیسی رائے رکھتا تھا اس کے لیے۔
''ثاقب! مجھے بہت چاہتے ہیں۔'' زریں کو خیالات کا اظہار بے ساختہ کر دینے کی عادت تھی۔
''جو چاہے جانے کے لائق ہو، اسے چاہا ہی جاتا ہے۔'' داور نے جھٹ سے کہا تھا۔
''ثمین جیسی بیوی قسمت والوں کو ملتی ہے قدر کرو اس ذہین لڑکی کی۔'' حسنہ کے انداز میں کچھ جتاتی کچھ سمجھاتی ہوئی تنبیہ تھی۔
''کیا وہ قدر کرنے کے لائق ہے تم بتاؤ زریں! تم تو اسے ہم سے زیادہ جانتی ہو۔''
''ہے ہے، یہ تُو اور تم کر کے بلانے کا بھلا کیا طریقہ ہے۔ ثمین کی بھابھی ہے، اس رشتے سے تمہاری بھی بھابھی ہوئی۔ احترام سے بات کرو۔'' حسنہ نے زریں کا بے حد گھبرایا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے ٹوکا۔
''بہت عزت کرتا ہوں یہ تُو اور تم اپنائیت کے اظہار کے لیے بھی تو بولا جاتا ہے۔''
''مم۔۔۔ میں ثمین جی کا حال پوچھ کر آتی ہوں۔'' زریں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔
''سو رہی ہے وہ۔ کیوں اپنی شامت بلوانا چاہتی ہو، بیٹھ جاؤ اور یہ بتاؤ کھانے میں کیا پسند کرتی ہو۔''
''آنٹی! مجھے گھر جانا ہے۔'' اس نے بے چارگی سے حسنہ کی جانب دیکھا کہ داور کی مسلسل نگاہ بہت پریشان کر رہی تھی۔
''گھر جانا ہے۔'' داور نے سن لیا، بولا۔ ''ٹھیک ہے کھانا کھا لو، میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔''
''نہیں نہیں، آنٹی میں نے ثاقب کو فون کر دیا تھا وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔'' داور سے بچنے کو اس نے جھوٹ بولا تھا۔
''مجھے بھی ایک کام سے جانا ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ راستے میں ہم زریں کو ڈراپ کر دیں گے اور زریں! میں ثاقب کو آنے سے منع کر دیتی ہوں۔''
حسنہ جانتی تھیں اس نے ثاقب کو فون نہیں کیا اسی لیے یہ بات کہی تھی۔
''آپ کو بھی آج ہی جانا ہے۔'' داور کے انداز کی خوش گواریت کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔
''بچی کو اکیلا تو نہیں بھیج سکتی نا!'' انہوں نے جتایا۔
''کیوں میرے کریکٹر پر شبہ ہے کیا؟''
''تم جاؤ اب ثمین کو دیکھو۔'' انہوں نے اکتا کر کہا۔
''زریں بتایا نہیں، کھانے میں تمہیں کیا پسند ہے؟''
''سب کچھ کھا لیتی ہوں۔'' اس نے مرے مرے انداز میں بتایا تھا۔

''یعنی آج سب کچھ بنوانا ہوگا۔'' وہ عجیب ترنگ میں تھا۔

''نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ بھی لیکن آج تو مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔'' وہ بار بار گھبراہٹ میں دوپٹا درست کر رہی تھی۔

''اپنا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔''

''آؤ بیٹا زریں! میں نے کچھ شاپنگ کی تھی۔ تمہیں دکھاتی ہوں۔'' حسنہ کو اسے یہاں سے لے کر جانے کا یہی بہانا سوجھا تھا۔

✡✡✡✡

ثمین کو یقیناً داور نے ہی اس کے جانے کی خبر کر دی تھی جس کا اس نے کافی برا مانا تھا۔ پہلے تو سیل اٹھا کر ماں سے رابطہ کیا۔ اسے زریں کے ارادے کے بارے میں بتایا پھر زریں کو اپنے کمرے میں بلوالیا۔

''واپس جانا چاہتی ہو تم؟'' اس کا انداز انتہائی سرد تھا اور آنکھوں سے غصہ جیسے برس رہا تھا۔

''وہ ثاقب کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔'' اس نے تھوک نگل کر جھوٹ بولا تھا۔

''میری اجازت کے بغیر تم نے گھر جانے کا ارادہ کس طرح کر لیا؟'' وہ اب سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

زریں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''یاد رکھو اب اگر تم میری اجازت کے بغیر یہاں سے نکل کر گھر جاؤ گی تو گھر کا گیٹ تمہارے لیے نہیں کھولا جائے گا۔ تم کیا سمجھتی ہو میری شادی ہو گئی تو اُس گھر میں اب میری حیثیت کچھ بھی نہیں رہی۔ یاد رکھو احمق! میری پوزیشن تو اب پہلے سے بھی مضبوط ہے۔''

زریں کا جی چاہا اسے بتا دے، جس شوہر پر اتنا غرور ہے۔ وہ تم سے کس قدر بے زار ہے اور اس کی نگاہ کی گرمی لہجے کی بے قراری ہی تو مجھے یہاں سے جانے پر مجبور کر رہی ہے لیکن وہ اتنی بے باک نہیں تھی اور اسے داور کے جذبے کی نہ پروا تھی اور نہ قدر۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو محبت صرف شوہر سے کرتی ہیں اور ان کے سارے جذبے صرف اور صرف شوہر کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ داور کا ہر انداز جہاں اسے خوف زدہ کر رہا تھا وہاں وہ اس کے لیے ذلت آمیز بھی تھا۔

زریں چپ چاپ ثمین کے کمرے سے باہر آ گئی اور داور جیسے منتظر کھڑا تھا۔ ہاتھ سے پکڑ کر یہ کہتا ہوا ایک طرف کو لے کر چل پڑا کہ مجھے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔''

''لیکن میں کچھ دیکھنا نہیں چاہتی۔'' اس نے سخت انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑانا چاہا لیکن یہ اس جیسی نازک سی لڑکی کے بس کی بات نہیں تھی اور جہاں وہ لے کر آیا۔ زریں ٹھٹک گئی۔ تصویریں ہی تصویریں، رنگ ہی رنگ اور کتنا گندہ ہو رہا تھا یہ کمرا۔ لگتا تھا برسوں سے کسی نے صفائی نہیں کی۔ باقی گھر سے بالکل مختلف اور الگ دکھائی دے رہا تھا۔

''ان تصویروں کو دیکھ رہی ہو؟'' لکڑی کی بڑی الماری میں کچھ چند تصویریں وہ اسے دکھا رہا تھا۔

''تمہاری ہی ہیں نا!'' وہ چپ چاپ تصویروں کو گھورتی چلی گئی۔

''اب تم کہو گی، میں نے تمہیں کب کہاں دیکھا اور تمہاری تصویریں کیسے بنالیں۔ تو میری جان! تم

تو کب سے میری سوچ میں، میرے خواب میں ہو۔ لوگ کہتے ہیں جو چہرہ ہمارا ذہن تراشتا ہے وہ دنیا میں نہیں ملتا۔ آئیڈیل سراسر سراب ہے لیکن تم زندہ حقیقت ہو زریں! لیکن میری کم نصیبی یہ کہ جب تم میری ہونے والی تھیں، تب کسی اور کی بنا دی گئیں۔ میرا بس نہیں چلتا کہ تمہیں ابھی اسی وقت اس سے جدا کر دوں۔''

''ایسا سوچیے گا بھی مت۔'' زریں کی آواز دھیمی لیکن مضبوط تھی۔

''بہت بھولی معصوم سی لڑکی ہو۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ایک جنت تمہاری منتظر ہے۔''

''مجھے ثاقب کے بغیر جنت بھی قبول نہیں۔''

''ابھی تمہیں اپنے نفع و نقصان کا اندازہ نہیں ہے۔ تمہیں کیا پتا جانم! جب یہ مغرور، بد دماغ عورت تمہیں حقارت بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔ تم پر حکم چلاتی ہے تو کتنا برا لگتا ہے مجھے، خیر! وہ دن دور نہیں جب تم اس سے تمام زیادتیوں کا بدلہ لے سکو گی۔ ویسے تو مذہب چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے لیکن اگر تم پسند نہیں کرو گی تو میں اسے چلتا کروں گا۔''

''کیا یہ شخص پاگل ہے یا اس نے نشہ کر رکھا ہے۔ کیا سمجھ رکھا ہے اس نے مجھے۔ آج پہلی بار میں اس کے گھر آئی ہوں تو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے مجھ سے۔ یقیناً یہ دولت کا نشہ ہے۔''

زریں نے نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ پھر وہ رکی نہیں، وہ تقریباً بھاگتی ہوئی رہائشی عمارت سے باہر آئی تھی لیکن ابھی وہ اس چار دیواری کی حدود میں تھی۔ یہ بہت بڑا ایریا تھا جہاں اونچے اونچے درخت تھے اور کچھ عمارتیں بھی تھیں سیدھی سڑک تھی جو باہر کے گیٹ تک جاتی تھی اور یہاں بھی رہائش والے حصے کے گیٹ کی طرح گارڈ موجود تھے۔

اس کالی سڑک سے گیٹ تک کا فاصلہ طے کرنے میں ہی اسے پندرہ منٹ لگ گئے تھے اور ہر قدم پر لگتا تھا۔ ابھی داور کے ملازم کہیں سے نمودار ہوں گے، اسے دبوچ کر پھر سے رہائشی عمارت میں لے جائیں گے۔ دل جیسے حلق میں آ گیا۔ ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ لیکن اسے رکنا نہیں تھا۔

پیچھے سے گاڑی آئی اور اس سے تھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑائے اور چہرے پر پسینے کے ننھے قطرے نمودار ہوئے۔ حلق میں بے انتہا خشکی محسوس کر کے اس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''آیئے بی بی! صاحب کہتے ہیں آپ جہاں کہیں وہیں آپ کو چھوڑ دیا جائے۔ آپ حکم کریں۔'' ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس دیہاتی سے شخص نے بڑے مؤدب انداز میں کہا تھا۔

''اوہ!'' وہ گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر آ بیٹھی اور ڈرائیور نے اس کی جانب کا دروازہ بند کر کے اپنی سیٹ سنبھال لی۔

''یہ کیا کیا میں نے؟ کیوں بھروسہ کر لیا اگر یہ مجھے کہیں اور لے گیا تو؟'' حواس بحال ہوئے تو وہ چونکی۔

لیکن گاڑی اب جانے پہچانے راستوں پر ہی رواں تھی۔ تقریباً چالیس منٹ اسے گھر تک پہنچنے میں لگے۔ گاڑی اسے گیٹ پر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ اس نے گیٹ دھکیلا تو بند پایا پھر بیل پر انگلی رکھ

دی۔ بہت دیر تک بیل بجتی رہی لیکن دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔

''تو کیا واقعی ثمین نے جو کہا تھا پورا کر دکھایا۔'' اسے لگا زمین پیروں تلے سے کھسکنے لگی ہے۔ بے چین ہو کر وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے لگی۔

''کیا ہے؟ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟'' آخر اسے بند گیٹ کے اس پار سے ساس کی آواز سنائی دی۔

''دروازہ کھولیں مجھے اندر آنے دیں۔''

''تمہیں ثمین کی بات یاد نہیں ہے یا تم اسے مذاق سمجھی تھیں؟''

''خدا کے لیے، خدا کے لیے، آپ میری بات تو سنیں۔'' وہ رونے لگی تھی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ غرّائی تھیں۔

''کہاں جاؤں گی میں۔ آپ ثاقب کو بلا دیں۔ مجھے اس سے بات کرنے دیں۔''

''ثاقب انجان نہیں ہے سب معلوم ہے اسے، وہ تم سے بات نہیں کر سکتا۔'' آواز دور ہٹ رہی تھی۔

وہ پھر فریاد کرنے لگی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ ہاں پڑوس کے دروازے ضرور کھل گئے۔

ایک پڑوسن سے ہی ادھار کچھ روپے لے کر وہ رکشا کر کے اپنے میکے پہنچی لیکن یہ فیصلہ وہ راستے میں کر چکی تھی ابھی اسے وہاں جا کر کچھ نہیں بتانا۔ کہانی عجیب سی ہی تھی اور اسے اپنے ابا کے مزاج کی بھی خبر تھی۔ وہ بہت غیرت مند شخص تھے۔

۞۞۞۞

اسے ثاقب کا انتظار آنے والے دنوں میں شدت سے رہا۔ گھر میں فون نہیں تھا۔ پڑوس سے وہ کر نہیں سکتی تھی کہ یہاں بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔

''زریں باجی! زریں باجی! اتنی بڑی گاڑی میں کوئی آیا ہے۔ آپ کے گھر کا پتا پوچھ رہا ہے۔ ہم لے آئے ہیں۔ ادھر باہر آپ کے دروازے پر کھڑا بلا رہا ہے آپ کو۔''

اسے پہلا خیال ہی ثاقب کا آیا، حالانکہ ثاقب کے پاس گاڑی نہیں تھی لیکن اس گھر میں تو ایک گاڑی تھی نا اور دروازے سے باہر جھانکتے ہی جو چہرہ اسے دکھائی دیا، اسے دیکھ کر اسے واپس پلٹنا ہی تھا۔

''تو یہ یہاں تک آ گیا۔ کیا سوچیں گے میرے گھر والے کیا وہ میری سچائی پر یقین کر لیں گے۔ انہیں کچھ کچھ اندازہ تو ہو چکا ہے میں نارمل حالات میں میکے سے نہیں آئی۔ کیا کروں، کیسے کہوں میں اسے۔''

وہ دروازے سے پیچھے ہٹ کر بڑی گھبراہٹ میں یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ داور اندر آ گیا۔

''زریں! تمہارے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے مجھے اطلاع تک نہیں دی، وہ تو آج اتفاقاً میں نے ثمین کی وہ گفتگو سن لی جو وہ فون پر اپنی ماں سے کر رہی تھی۔ جی تو چاہتا تھا پہلے اس عورت کو شوٹ کروں پھر تم تک آؤں کہ وفا کا تقاضا بھی یہی ہے۔''

''مت کریں ایسی باتیں، جائیں چلے جائیں، اصل مجرم تو آپ ہیں۔ جائیں جا کر خود کو شوٹ

کر لیں۔'' مارے ضبط کے اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

''مجھے غلط کیوں سمجھتی ہو میری جان۔ میری محبت جھوٹ نہیں ہے۔ وہ وقتی جنون بھی نہیں ہے۔ کبھی آزماؤ تو، تم تو مجھے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دے رہیں۔''

''میری پوزیشن کو سمجھیں داور صاحب! میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔''

''شادی مرد سے عورت کی ہوتی ہے۔ یہ تم نے کس کا انتخاب کر لیا۔ ارے کیا وہ مرد ہے، جس کی بیوی پر گھر کے دروازے ایک فضول ضد کی وجہ سے بند کر دیے گئے ہیں اور وہ سر جھکائے بیٹھا ہے۔ زریں! عقل کرو۔ کچھ ہوش سے کام لو۔''

''میں ہوش میں ہی ہوں۔ آپ بھی ہوش میں آ جائیے داور صاحب اور گھر جائیے۔ آپ کی بیوی آپ کا انتظار کر رہی ہو گی۔ میرے گھر والوں کو کسی بھی بات کا کوئی علم نہیں۔ خدا کے لیے انہیں لاعلم ہی رہنے دیں۔''

''ارے زریں! کس سے باتیں کر رہی ہو تم۔'' اماں نماز پڑھ رہی تھیں جوں ہی سلام پھیرا پوچھنے لگیں۔

''جاؤ جاؤ۔'' اس نے گھبرا کر داور سے کہا۔

''ایسے نہیں سب سے مل کر جاؤں گا۔ آخر تمہارے حوالے سے یہ سب میرے بھی اپنے ہیں۔''

''اف یہ ڈھیٹ شخص۔'' اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا پھر بولی۔

''ٹھیک ہے تو جائیں جا کر تعارف حاصل کریں۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔''

''سوچ لو فی الحال تمہاری نند کا شوہر کہلاتا ہوں تمہارا ایسا رویہ بھی ان کے ذہنوں میں کچھ سوال کو جنم نہیں دے گا کیا؟''

شاید وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ زریں کو نہ چاہتے ہوئے بھی قدم اٹھانے پڑے اور لب بھینچ کر اس کے لیے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

''صاحب! یہ سامان کدھر رکھنا ہے؟'' دروازے کے باہر سے کوئی پوچھ رہا تھا۔

''ہاں ہاں اندر لے آؤ۔'' داور کے کہنے کی دیر تھی۔ پھلوں کے کریٹ اور مٹھائی کے ٹوکرے اندر آنے لگے۔

''یہ یہ سب کیا ہے؟ آپ کیوں میری عزت کے درپے ہو گئے ہیں داور صاحب؟ پلیز میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ یہ سب واپس لے جائیں۔''

پر وہ ملازم تو صرف اپنے صاحب کا حکم ماننے کا عادی تھا۔ کان جیسے بند تھے، اس کے کہنے کا نوٹس نہیں لیا۔ تھک کر وہ بیٹھک کی جانب بڑھی۔

''آخر مجھ سے کس بات کی دشمنی نکال رہے ہیں۔ چلے جائیں یہ ساری سوغاتیں لے کر۔''

''ان لوگوں نے اس روز تم پر گھر کے دروازے بند کر دیے تھے۔'' وہ اس کی بات ان سنی کر کے بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے۔ آپ دخل دینے والے کون ہوتے ہیں؟'' زریں کا بس نہیں چل رہا

تھا، اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال باہر کرے۔

"میرے اور تمہارے معاملے الگ نہیں ہیں لیکن فی الحال تم اس بات کو سمجھ نہیں رہیں۔ ان لوگوں نے تم پر گھر کے دروازے بند کر کے ہماری قسمت کے دروازے کھول دیے ہیں، زریں اب تم وہاں نہیں جاؤ گی۔ بس خلع کا مقدمہ دائر کرو گی۔"

"میں آپ سے بہت عزت سے پیش آ رہی ہوں اس کا یہ مطلب نہیں۔۔۔۔ ثاقب میرا شوہر ہے اور میں بہت محبت کرتی ہوں اس سے۔"

"کیسا شوہر ہے جو اپنی بیوی کو گھر میں جائز مقام بھی نہیں دلوا سکتا۔"

باہر قدموں کی آہٹ ہوئی زریں نے کچھ کہتے کہتے لب بھینچ لیے۔ آنے والی اس کی ماں تھیں جو صحن میں اتنی سوغاتوں کے ڈھیر دیکھ کر تجسس کی تصویر بنی بیٹھک تک آ گئی تھیں، داور نے سلام کیا لیکن وہ جواب نہیں دے سکیں، ایسا شاندار شخص ان کے غریب خانے پر اور کتنی عزت سے سلام پیش کر رہا ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے بیٹی کی جانب دیکھنے لگیں۔

"یہ ثمین باجی کے شوہر ہیں۔"

"اوہ وعلیکم پتر، جی آیاں نوں۔" وہ ایک دم ہی پُرجوش ہو گئیں۔

"بیٹھو نا کھڑے کیوں ہو۔ اور سناؤ پتر! اپنی ثمین تو ٹھیک ہے نا؟"

زریں نے ماں کو کہتے سنا ہی وہ چولہے پر چائے کا پانی رکھنے آ گئی۔

پھر جب تک داور چائے ختم کر کے جانے کے ارادے سے نہیں اٹھا۔ اس کا دم اٹکا رہا پتا نہیں وہ کیا کہہ دے۔

"آپ نے کبھی بیٹی سے پوچھا یہ سسرال میں خوش بھی ہے یا نہیں؟" چائے سے فارغ ہوا تو زریں نے سوچا اب جانے کی اجازت مانگے گا لیکن اس نے جو سوال کیا وہ التجائیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہم نے بیٹی بیاہ دی، اب اس کی زندگی اسی گھر کے ساتھ ہے۔" ماں کا جواب اپنے رسم و رواج کے مطابق تھا۔

"یعنی وہ چاہیں تو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دیں۔"

"آئے ہائے خیر صلاّ کیا کہہ رہے ہو۔ پتر! بھلے مانس لوگ ہیں۔ میری بچی بھی ہر کسی کی عزت کرنے والی ہے۔ وہ بھلا ایسا کیوں کریں گے۔"

"پوچھیے گا اپنی بیٹی سے۔ شاید اب تو یہ کچھ سچ بول دے اور زریں! میری بات پر غور ضرور کرنا۔ تم خدمت کرنے، نفرت وصولنے کے لیے پیدا نہیں کی گئیں۔ سمجھو اپنے مقام کو۔"

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا اور اب ماں چہرے پر سوال سجائے اس کی صورت تک رہی تھی۔

"ہاں اب مجھے پوری بات بتاؤ۔"

"بس اماں! وہ ثمین جو ہے نا وہی کام خراب کرتی ہے۔ اسی کی شکایت پر بات بگڑی تھی اور مجھے میکے آنا پڑا۔ اسی لیے تو داور صاحب معذرت کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی بیوی کی بدمزاجی پر شرمندگی ہے۔"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ کتنی پاگل ہے تو زریں! اتنے دن سے میکے آئی بیٹھی ہے اور اصل بات کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ آخر سوچ کیا رکھا ہے تم نے؟"

"کچھ نہیں مجھے ثاقب کا انتظار ہے۔"

"اور ادھر وہ یہ سمجھے بیٹھے ہوں گے کہ تو غصے کی وجہ سے نہیں آ رہی اور کتنی بڑی بے وقوفی کر ڈالی تم نے۔ آج تمہارے ابا گھر آ جائیں، میں خود ان کے ساتھ تمہاری سسرال جاتی ہوں اور ہم دونوں ہی معذرت کریں گے ان سے۔"

"نہیں نہیں، آپ کو جانے کی ضرورت نہیں۔ مم۔۔۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"ہم بیٹی والے ہیں اور ہمیں سر جھکا کر ہی بات کرنی ہے۔ تم ہمارا خیال مت کرو۔"

"میرا تو کوئی قصور بھی نہیں ہے پھر بھی، پھر بھی۔۔۔"

وہ پھپھک کر رو دی کچھ تو ثاقب کی بے نیازی کا دکھ تھا کچھ داور کی یہاں آمد نے خون خشک کر ڈالا تھا۔ خوب ہی آنسو بہائے۔

زریں سوچ رہی تھی صبح وہ چلی جائے گی۔ گھر نہیں جائے گی۔ پہلے ثاقب سے ملنے اس کی دوکان پر جائے گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رات کے نو بجے ابا گھر آئے، روزانہ وہ دس ساڑھے دس سے پہلے نہیں آتے تھے۔ آج آتے ہی زریں کو آوازیں بھی دینے لگے۔

"کیا ہوا خیر تو ہے؟" نانی نے بھی اتنی ہی اونچی آواز میں پوچھا۔

"زریں پتر! ماں کہاں ہے تیری؟ تم دونوں جلدی سے تیار ہو جاؤ ہسپتال جانا ہے ہمیں۔"

"مگر کیوں ابا! خیر تو ہے نا؟" ہسپتال کا نام سن کر چونکنا ضروری تھا۔

"بس اللہ خیر ہی رکھے میری دھی رانی، وہ تمہارے سسر کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے ثاقب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے۔" ابا کی آواز لرز گئی تھی۔

"ہائے کب، زریں کے ابا؟" اماں نے بھی دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

ثاقب پرائیویٹ روم میں تھا جس وقت وہ تینوں کمرے میں داخل ہوئے یہاں اس کے سسر اور دیور عاقب موجود تھا۔ ثاقب پٹیوں میں جکڑا ہوا لیکن ہوش میں تھا اور زریں کو دیکھ کر اس کی ویران آنکھوں میں چمک لہرائی تھی۔ زریں تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے ثاقب کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"بھابھی! بھائی جان آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔" دیور نے اسے بتایا تھا اور وہ رونے لگی تھی۔

"ایسا مت کرو۔ اسے تسلی دو۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔" زریں کے والد نے سمجھایا۔

اس کے والدین ایک گھنٹہ یہاں ٹھہر کر واپس چلے گئے۔ اسے تو اب کہیں نہیں جانا تھا، اپنے گھر بھی نہیں وہ دن رات ثاقب کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

"تم نے جا کر رابطے کی بھی کوشش نہیں کی۔ ایسی بھی کیا اکڑ۔" اس کے والدین کے جانے کے بعد سسر صاحب کہہ رہے تھے۔

''ابو! اگر بھابھی نے فون کیا بھی ہوگا تو امی نے آپ کو تھوڑی بتایا ہوگا۔'' یہ اس کا چودہ پندرہ سالہ دیور تھا ثاقب سے زیادہ ذہین اور نڈر۔

''ثاقب دو روز سے ہسپتال میں ہے۔ خاصی سیریس چوٹیں آئی ہیں۔ بس اللہ نے کرم کیا زندگی بچ گئی ہے۔''

''کیا ثمین جی کو معلوم ہے؟'' بے ساختہ ہی وہ پوچھ گئی کہ خیال آیا تھا۔ داور نے تو اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

''نہیں وہ بے چاری تو اپنی ساس کے ساتھ فارم پر گئی ہوئی ہے داور بھی گیا تھا لیکن پھر جلد ہی واپس بھی آ گیا۔''

ثاقب دواؤں کے اثر میں تھا ذرا دیر کے بعد سو گیا۔ وہ یہیں بیٹھی رہی۔ کچھ دیر کے بعد انیقہ اور شہوار آ گئیں۔ اسے دیکھ کر انیقہ ٹھٹکیں اور سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔

''ثاقب بہت پوچھ رہا تھا اسے۔ اس لیے میں نے ان لوگوں کو اطلاع دے دی تھی۔ یہ اپنے والدین کے ساتھ آئی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ثمین خفا ہوگی۔'' انیقہ نے دبی زبان سے کہا۔

رشید صاحب خاموش رہے۔

''آپ کو پتا ہے نا کتنی حساس ہے وہ۔ اس روز یہ کام چور بہانہ بنا کر اس کے گھر سے چلی آئی تھی۔''

''بس کرو بیگم! شکر ادا کرو اللہ کا جس نے اسے زندگی دے دی ہے اور ہم کون سا اسے سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں یا ثمین کی جگہ دے رہے ہیں۔ میری بیٹی نے تو جو مقام بنایا ہے اپنی ذہانت، قابلیت سے بنایا ہے۔ اسے تو کوئی چیلنج کر ہی نہیں سکتا۔ تم ثاقب سے کچھ نہ کہنا اس بے چارے نے زندگی میں کون سی خوشی کون سی کامیابی دیکھی ہے اور اب یہ عمر بھر کی معذوری۔'' رشید صاحب کی آواز بھرا گئی۔

معذوری کے لفظ پر زریں چونکی اور رشید صاحب سے پوچھنے لگی۔

''ہاں زریں! ڈاکٹروں نے کوشش تو بہت کی لیکن ثاقب کو معذوری سے بچا نہیں سکے۔ اس کی دائیں ٹانگ گھٹنے کے نیچے سے کاٹنا پڑی ہے۔ تم یہ بات ثاقب سے مت کرنا ابھی وہ اس حادثے سے بے خبر ہے۔''

''ہاں بولو اب بھی رہو گی ثاقب کے ساتھ، دو گی اس کا ساتھ؟ ارے میں خوب جانتی ہوں تم جیسیوں کو۔''

اس کی ساس آنسو پونچھ رہی تھیں لیکن بہو کے لیے دل میں نرم گوشہ ابھی بھی نہیں تھا۔ زریں اٹھ کر باہر آ گئی اور کاریڈور میں کھڑے ہو کر چپکے چپکے بہت سے آنسو بہا ڈالے۔

''تم فکر نہ کرو اسے پتا نہیں چلا۔''

''دوکان ہی تو چلاتا ہے وہ۔ یہ کام تو ہے ہی بیٹھ کر کرنے کا میں اب دوکان میں زیادہ سامان ڈلوا دوں گا اور ثاقب سے کہوں گا تمہیں ہر ماہ جیب خرچ بھی دیا کرے۔ کچن تو ویسے بھی تم ہی دیکھتی ہو۔

اب بھی تم ہی دیکھو گی اپنی مرضی سے رہو جو چاہو کھاؤ پیو ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔''

وہ سمجھ گئی۔ یہ سب کہنے پر وہ کیوں مجبور ہوئے ہیں۔ کون سی بات انہیں پریشان کر رہی ہے۔ یقیناً انہیں یہ اندیشہ ستا رہا ہے کہ میں اس موڑ پر ثاقب کو چھوڑنے کا فیصلہ نہ کر لوں۔ خود غرض ہیں یہ لوگ۔

''میاں بیوی دکھ سکھ کے ساتھ ہوا کرتے ہیں بیٹا!'' وہ پھر سمجھانے لگے۔

''جی معلوم ہے۔'' وہ بالکل سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ کمرے میں واپس چلے گئے۔ زریں کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس وقت انیقہ کا سامنا کرے۔ اسی لیے یہیں کھڑی رہی اور اندر کمرے میں رشید صاحب بچوں کو سمجھا رہے تھے ثاقب کی حالت کے بارے میں بتا رہے تھے۔

''لچک پیدا کرو اپنے رویے پر۔ اگر وہ چھوڑ کر چلی گئی میرا بچہ جیتے جی مر جائے گا۔ اب ہمیں ثاقب کی خاطر ہی اپنا رویہ اس کے ساتھ بہتر بنانا ہوگا۔''

اگلے روز شام کو ثمین آئی تھی۔ فروٹ کے بہت سے ٹوکروں اور تین عدد ملازمین کے ساتھ، قیمتی لباس، خوب صورت اپنی قیمت کا اعلان کرتی جیولری اور ثمین کا کروفر، اب اس چھوٹے سے پرائیویٹ روم میں صرف ثمین ہی دکھائی دے رہی تھی۔ باقی سب پس منظر میں تھے۔ ثاقب کو تسلی دیتے ہر جملے کے آخر میں ایک جیسے الفاظ ہوتے۔

''سارا خرچ میں اٹھاؤں گی۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں۔''

وہ بہ مشکل آدھا گھنٹہ ہی بیٹھی پھر اٹھ کر چلی گئی لیکن اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک اس کا ذکر رہا۔ زریں نے دیکھا۔ ثاقب بالکل خاموش چپ چاپ لیٹا تھا۔ نظر ایک جگہ جمائے پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔ زریں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چونکا اور اس کی جانب دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ زریں نے اس کے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ بھی رکھ دیا اور مسکرانے لگی۔ اس نے دیکھا ثاقب کے چہرے کا تناؤ کم ہو رہا تھا۔ زریں کی قربت نے اسے پُرسکون کر دیا تھا۔

''تم گھر چلی جاؤ گی مجھے چھوڑ کر؟'' ثاقب نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''صرف تمہارے لیے کھانا بنانے جاؤں گی پھر آ جاؤں گی۔''

''نہیں، نہیں۔ تم مت جاؤ۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے زریں!''

''تم ڈرتے کیوں ہو ثاقب! میں تو ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں، سایہ ہوں تمہارا، ساتھ ساتھ ہی رہوں گی۔''

''جب اندھیرا ہو جاتا ہے نا زریں! تب سایہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔''

''تو پھر تم میرا اور اپنا تعلق بُت اور روح والا سمجھ لو ثاقب!''

اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے وہ تو بس ثاقب کو یقین دینا چاہتی تھی یہ خیال ہی اس کا قرار چھین لیتا تھا کہ ثاقب کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔ وہ اس کی جانب وسوسوں کا شکار ہے۔

اس کی باتوں نے ثاقب کو حوصلہ دیا اور وہ بڑے پیار سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

اور اسی وقت ہلکی سی دستک دے کر داور حسین کمرے میں آیا تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا اس پر نظر پڑتے ہی زریں نے وہ ہاتھ جس سے ثاقب کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ پیچھے کر لیا اور ڈری ڈری نظروں سے داور کو دیکھنے لگی، جبکہ رشید اور انیقہ جھٹ استقبال کے لیے بڑھے تھے۔

''مجھے ثمین نے بتایا تھا اسی لیے دیکھنے آیا ہوں۔'' وہ ان سے کہہ رہا تھا اور زریں اس کی ان نظروں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو رہی تھی۔

اس نے رشید صاحب سے پوری تفصیل سے پوچھا تھا۔ چوٹ کہاں کہاں لگی ہے اور اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔ زریں نے دیکھا اس کے لہجے میں تشویش تو کیا ہوتی ثاقب کے لیے ہلکی سی ہمدردی بھی نہیں تھی۔

''ثاقب کے پاس کون کون ہوتا ہے؟ اسے کب تک ہاسپٹل میں رکھنے کا خیال ہے؟ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟''

وہ بڑی تفصیل سے ایک ایک بات پوچھ رہا تھا۔ اس پورے عرصے میں زریں نے نہ تو ایک لفظ ادا کیا اور نہ ہی اس کی جانب رخ کیا۔ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر دیکھتی رہی۔

''اوکے! میں چلتا ہوں پھر چکر لگاؤں گا۔'' جب اس نے کہا تو زریں نے بھی سکون کا سانس لیا وہ اس کی آمد پر اک خوف سا اپنے اندر اترتا محسوس کر رہی تھی۔

❁❁❁❁

اس نے ساری تفصیل یونہی نہیں معلوم کی تھی، اگلے ہی روز وہ ایسے وقت میں موجود تھا، جب ثاقب کے پاس صرف زریں ہوتی تھی۔ ثاقب سو رہا تھا۔ وہ کوریڈور میں آ کر کھڑی ہوئی تھی اور ایسے ہی وقت میں داور کو آتے دیکھ کر اس کا دل نفرت اور بے زاری سے بھر گیا تھا۔

''دیکھا لگن سچی ہو تو کیسے کیسے راستے نکل آتے ہیں۔'' اس کے بہت قریب آ کر وہ رکا تھا اور کہہ رہا تھا۔ زریں نے پلٹنا چاہا اس نے شانے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ کر بے بس کر دیا۔

''وہ تمہارے قابل تو پہلے بھی نہیں تھا اور اب تو لنگڑا بھی ہو گیا ہے۔ خود اپنے لیے بھی بوجھ۔ وہ تم جیسے خوب صورت قیمتی خزانے کی حفاظت کیسے کرے گا اور تم تو وہ ہو زریں! جسے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ تم راج کرنے کے لیے، ناز اٹھوانے کے لیے پیدا کی گئی ہو، کہاں رول رہی ہو خود کو۔ اب تو وقت خود تم پر سب آشکارا کر رہا ہے۔ دنیا سے مت ڈرو، میں سالوں سے منتظر ہوں تمہارا۔ جب میرے آس پاس نہیں تھیں۔ تب سے محبت کرتا ہوں تم سے، خیالوں میں تراشتا رہا ہوں۔''

''جائیں چلے جائیں یہاں سے۔ مجھے آپ سے بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ کیسے مرد ہیں آپ۔ ذرا بھی غیرت نام کو نہیں۔ ذرا بھی اس رشتے کا لحاظ نہیں جو میرا آپ کے ساتھ ہے۔ کیوں یہ بات بھول جاتے ہیں میں کسی کی بیوی ہوں۔''

''تم اس کی بیوی بننے سے پہلے ہی میری تھیں اور میری ہی ہو کر رہو گی۔''

اس کے شانے پر دھرے داور کے ہاتھ کی گرفت سخت ہوئی تھی۔

''خود کو داؤ پر مت لگاؤ زریں! اور یہ مت بھولو۔ تم اپنے ساتھ ساتھ میرے ساتھ بھی زیادتی کر رہی ہو۔ قدر کرو محبت کی، یقین کرو تم اس فیصلے پر کبھی نہیں پچھتاؤ گی زریں! تم جو کہو میں وہی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔''

''تو جاؤ مر جاؤ۔'' وہ اتنا کہہ کر تیز قدموں سے کاریڈور پار کر گئی اور ہسپتال کی بیک کی طرف مڑ گئی وہ تنہائی میں بہت سا رونا چاہتی تھی۔

❁❁❁❁

اس کا خیال تھا اس کی اتنی سخت باتوں کے بعد اب کچھ روز تک تو داور اپنی صورت نہیں دکھائے گا۔ لیکن یہ بھول تھی اس کی وہ اگلے ہی روز موجود تھا۔ زریں یہیں اسٹور سے کچھ دوائیں لینے کے لیے نکلی تھی، تب ہی وہ آ ٹکرایا۔

''اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟'' وہ مسکرایا۔

''میرا خیال تھا۔ کل جو کچھ میں نے کہا تھا عقل آ گئی ہو گی۔'' اس نے منہ پھیر کر جواب دیا۔

''تمہیں پتا نہیں ہے زریں! محبت اختیاری جذبہ نہیں ہے۔ میرا دل تمہاری جانب ہمکتا ہے۔ میں بے چینی سے روزانہ اس وقت کا انتظار کرتا ہوں، جب مجھے تم سے ملنے آنا ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے تم ایک نظر بھی مجھ پر نہیں ڈالتیں۔ لیکن میں پھر بھی بہت اہتمام سے تیار ہوتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تمہیں مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں ہے لیکن تم کڑوا کسیلا جو بھی بولتی ہو مجھ سے بات تو کرتی ہو نا۔ تمہاری آواز سننا بھی تو میری آرزو ہے۔''

''آپ کسی کے شوہر ہو داور صاحب! اور آپ کی بیوی سے بھی میرا ایک رشتہ ہے۔ آپ اس بات کو کیوں بھول جاتے ہو۔''

''اوہ اگر تم اس رشتے کی وجہ سے ہچکچاہٹ کا شکار ہو رہی ہو تو میں یہ رشتہ ہی ختم کر دوں گا۔'' اس نے جوش کے ساتھ کہا۔

''اف نہیں پھر بھی نہیں۔ میں ثاقب کی بیوی ہوں اور بہت چاہتی ہوں اسے۔''

''زریں! مجھ سے ضد نہ کرو۔ تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا۔ کیا ثاقب تمہارے قابل ہے۔''

''مجھے یہ بات سمجھانے والے آپ کون ہوتے ہیں۔'' کوئی ثاقب کو یوں کہے اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

''اس دنیا میں مجھ سے بڑھ کر تمہارا خیر خواہ اور کون ہو گا زریں! میں ساری رات جاگتا رہا ہوں۔ میں بے چین رہا ہوں اسی سوچ میں گم کروٹیں بدلتا رہا ہوں آخر تمہیں کیسے مناؤں؟''

''آپ اس خیال کو دل سے نکال دو کہ میں کبھی مان جاؤں گی۔''

داور نے کچھ کہنا چاہا اسی وقت زریں کی نظر سامنے سے آتی ثمین پر پڑی تو وہ گھبرا کر داور سے دور جا کھڑی ہوئی۔ اس کی گھبراہٹ اور اس حرکت پر داور نے بھی سامنے دیکھا اور ہنس پڑا۔

''اس سے ڈرتی ہو، یہ عورت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مت ڈرا کرو۔'' زریں تیزی سے وارڈ کی جانب چل پڑی۔ داور نے رک کر ثمین کا انتظار نہیں کیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب زریں اور

داور روم میں پہنچے ثاقب جاگ رہا تھا۔ بے حد اداس اور الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ داور کو دیکھ کر زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لایا اور سلام کیا، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی پریشان سوچوں میں وہ اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اب دنیا داری نبھانے کی سکت اس میں نہیں تھی۔

''میں یہ دوائیں لینے گئی تھی۔'' زریں کو صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی حالانکہ ثاقب کی نظروں میں ایسا کوئی سوال نہیں تھا۔

کچھ دیر کے بعد ثمین بھی چلی آئی تھی۔

''آپ کب آئے؟'' سب سے پہلے اس نے داور سے پوچھا۔ اس کا چہرہ اور انداز بتا تا تھا اسے داور کو یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی لیکن وہ خوش بھی ہے۔

''ٹائم نہیں دیکھا تھا میں نے۔'' داور کا انداز اچھا نہیں تھا۔

''نہیں مطلب تھا کہ بتا دیتے۔ میں بھی ساتھ ہی آجاتی۔''

''تمہارے لیے گاڑی ہے نا گھر پر۔'' اب کے ثمین نے ثاقب اور زریں کے سامنے بے حد سبکی محسوس کی اور ثاقب کی جانب متوجہ ہو کر حال پوچھنے لگی۔

''آپ لوگ مجھ سے حال مت پوچھا کریں پلیز۔'' ثاقب کا انداز بے حد بے چارگی لیے ہوئے تھا۔

''ایسا نہیں سوچتے شکر کرو جان تو بچ گئی۔''

''کیا کروں گا ایسی زندگی جی کر۔''

''اوہو! تمہیں تو سمجھانا ہی فضول ہے۔'' ثمین میں زیادہ صبر برداشت کہاں تھی جو فروٹ لے کر آئی تھی۔ ابھی تک قریب رکھے تھے۔ اٹھا کر زریں کو پکڑانے لگی پھر بولی۔

''یہ میں ثاقب کے لیے لائی ہوں۔ اسے ہی دینا۔''

''جی بہت اچھا!'' اس کی بات کے مفہوم کو سمجھ کر زریں نے بھی بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''ثمین! اب تم چھوٹے گھر کی بیٹی نہیں بڑے گھر کی بہو ہو۔ اپنے دل کو بھی بڑا کرو۔ کتنی گھٹن ہے آج بھی تمہارے اندر اور تمہارے لہجے میں کتنا کروفر ہے۔ کیوں آخر کس لیے؟'' داور کے الفاظ تھے یا نوکیلے پتھر وہ تو جیسے سن ہو گئی تھی۔

اسے تو بہت مان تھا خود پر۔ اسے تو یقین تھا جس کی بنے گی وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان محسوس کرے گا۔ لیکن داور نے تو اسے نظر بھر کر بھی دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا نہ اس کے سراپے کو سراہا نہ کبھی اس کی ذہانت کی داد دی۔

داور کوئی عام سا شخص ہوتا تو شاید ثمین کا تنفر اسے علیحدگی کے فیصلے پر بھی مجبور کر دیتا مگر داور عام آدمی بھی تو نہیں تھا۔ اس کی دولت، اس کی طاقت ثمین کی کمزوری بن چکی تھی۔ وہ حکمرانی ہی تو پسند کرتی آئی تھی۔

''کب تک بیٹھو گے آپ؟'' اپنے غصے پر قابو پا کر بڑی دقت کے ساتھ اس نے داور سے پوچھا۔

''کیوں اس سوال کا کیا مطلب ہے؟'' ابرو چڑھا کر پوچھا گیا۔

اور ثمین اس سوال کا جواب نہیں دے سکی۔ ثاقب سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''زریں! کچھ چاہیے ہو تو بتا دینا تکلف سے کام مت لینا۔'' یہ داور کی آواز تھی۔

''بہت شکریہ صاحب! میری ضرورتیں پوری کرنے کو میرا باپ اور بھائی موجود ہیں اور اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں میرا شوہر بھی اچھا ہو کر گھر کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔''

پہلے ثمین داور کی بات پر حیران ہوئی تھی اور اب اسے زریں کی بدتمیزی سے جھٹکا لگا تھا، اسی وقت داور کو سیل فون نے متوجہ کر لیا اور وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

''تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ بدتمیز، جاہل گنوار عورت، ثاقب تم سمجھاؤ اسے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ میرے ہاتھوں ضائع ہو جائے۔ پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو۔ اری! یہ میں ہوں جو ثاقب کا اتنی اچھی جگہ پر علاج کروا رہی ہوں۔''

''اس نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔'' ثاقب نے دھیمی آواز میں صفائی دینے کی کوشش کی۔

''اچھا مجھے کچھ نہیں کہا، تو وہ جس کے ساتھ یہ زبان چلا رہی تھی کون تھا۔ بھول گئے ہو تم لگتا ہے۔ ٹانگ ہی ضائع نہیں ہوئی دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔''

اس نے پرس اٹھایا اور ہونہہ کہہ کر سر جھٹکتی کمرے سے چلی گئی۔

''اب کیا ہو گا زریں! تم اس کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ اگر اس نے پیسے دینے بند کر دیے تو میرا علاج کہاں سے ہو گا۔''

ثاقب بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''میں بھیک مانگ لوں گی۔'' زریں تنک کر بولی، پھر اسے ثاقب پر ترس آ گیا۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ''اب تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ ڈاکٹر چھٹی دے دے گا اور میرے پاس زیور بھی تو رکھے ہیں اگر ضرورت پڑی تو بیچ دوں گی۔ تمہارا علاج اسی جگہ سے مکمل کرواؤں گی۔''

''ابا بھی اب کم ہی چکر لگاتے ہیں۔ یہ حال عاقب کا بھی ہے۔''

''ابا اب دوکان کو بھی وقت دینے لگے ہیں نا اور عاقب بھی پڑھائی کے بعد ان کی مدد کرتا ہے، تم ذرا ذرا سی بات دل پر لے لیتے ہو۔ میں تو ہوں نا تمہارے پاس۔''

''ہاں زریں! پتا ہے میں سوچتا تھا شاید اب تم میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرو گی۔ میرے گھر آ کر تم نے کون سے سکھ دیکھے ہیں اور اب تو میں ناکارہ شخص ہوں، لیکن زریں! تم تو میری سوچ سے بالکل مختلف ثابت ہوئیں۔''

''محبت جو کرتی ہوں تم سے، تم سے جدائی کا سوچتے ہی میرا تو سانس رکنے لگتا ہے، شکر ہے خدا نے تمہیں زندگی تو دی ہے ورنہ میں کیا کرتی۔''

یہی فقرہ کمرے میں واپس آتے داور نے سنا اور وہیں سے پلٹ گیا لیکن اس کے اندر آگ بھڑک گئی۔

''اس شخص کو مجھ پر فوقیت دے رہی ہے جو اپنا بوجھ آپ اٹھانے سے بھی قاصر ہے۔ آج ماں باپ سر پہ نہیں رہیں تو بھیک مانگنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ رہے۔''

✿✿✿✿

ثاقب گھر آ گیا۔ بیساکھی کے سہارے زریں اسے روزانہ چلنے کی پریکٹس کرواتی رہی۔ اب وہ خود ہی چلنے بھی لگا تھا۔ رشید صاحب سے دوکان میں نیا سودا ڈلوانے کی بات کی تو انہوں نے بتایا۔

''ہاتھ بہت تنگ ہو گیا ہے۔ اب تو ثمین جو کچھ دے رہی ہے اسی سے گھر چل رہا ہے اور اتنی گنجائش ہی نہیں کہ سامان ڈلوا سکوں۔''

زریں نے سنا تو اپنا زیور اٹھا کر لے آئی۔

''ہاں ابا! اب تو کام بن جائے گا۔'' ثاقب خوش ہو گیا۔ انہوں نے بھی اثبات میں سر ہلا کر زیور کا ڈبا اٹھا لیا اور اگلے تین روز میں ثاقب کی دوکان سامان سے بھر گئی۔ صبح وہ ابا کے ساتھ دوکان پر چلا جاتا۔ شام کو وہی گھر واپس آتے ہوئے اسے بھی لے لیتے۔

ثمین اکثر چکر لگا لیتی تھی اور اسی کی زبانی علم ہوا تھا۔ داور چند عرب دوستوں کے ساتھ چولستان گیا ہوا تھا۔ ورنہ وہ تو اس خوش فہمی میں تھی کہ اس کی باتوں نے مزاج درست کر دیا ہے۔

باہر بیل ہو رہی تھی۔ اور ہواؤں نے طوفانی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ دوپٹا سنبھالتی وہ گیٹ تک آئی اور آنے والے کو دیکھ کر موڈ ہی غارت ہو گیا۔

''آپ اس وقت؟ میں نے تو سنا تھا بہت دنوں کے لیے چولستان چلے گئے ہیں۔''

''اور تم نے اللہ کا شکر ادا کیا ہوگا۔'' وہ مسکرایا اور بڑی پیاسی نظروں سے اس کے چہرے کو چوم رہا تھا۔

''ہاں واقعی شکر ادا کیا تھا۔ اب آپ جائیں گھر پر کوئی نہیں ہے۔'' اس نے گیٹ بند کرنا چاہا تو وہ اندر آ گیا اور بولا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ویسے کہاں گئے ہیں سب کے سب؟''

''بس یہیں قریب ہی، ابھی آ جائیں گے۔''

''یعنی میرے پاس وقت تھوڑا ہے۔'' اس نے بے تابی سے اس کی کلائی تھام کر ہاتھ اپنے دل کے مقام پر رکھ دیا اور بولا۔

''بہت یاد آئیں تم مجھے اور میں نے سوچا اگلی بار صحرا میں طلوع ہوتے سورج کا دلکش منظر میں تمہارے ساتھ دیکھوں گا۔''

''ہاتھ چھوڑیں، چھوڑیں ورنہ میں شور مچا دوں گی۔''

''گھر پر تو کوئی ہے نہیں اور موسم کا ایسا رنگ ہے کہ آواز آس پڑوس تک نہیں جا سکتی۔''

''ثاقب گھر پر ہی ہیں۔'' اس نے جتلایا۔ وہ ہنس پڑا۔

''اوہ! اس کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے، معذور انسان اپنا ہی بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے اور تم مجھے اس کا ڈراوا دے رہی ہو۔'' بجلی زور سے کڑکی، زریں نے بے ساختہ اپنے کمرے کی جانب دیکھا اور داور کو پرے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''چھوڑو مجھے بے غیرت انسان، نکل جاؤ میرے گھر سے، میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا

چاہتی۔''

''مگر تمہاری قسمت، تمہیں یہی صورت تمام عمر دیکھنا ہے۔'' اس کے لہجے کی نفرت پر جاگیردارانہ ذہنیت جاگ اٹھی، ہاتھ میں پکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کیا اور بولا۔

''ہم کسی عورت کے ایسے ناز اٹھایا نہیں کرتے۔''

''تو کس نے مجبور کیا ہے تمہیں، جاؤ چلے جاؤ۔ اب مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔'' وہ اس کی گرفت سے نکلنے کی بھرپور مزاحمت کر رہی تھی لیکن ناکام تھی اور پھر اور کچھ نہیں بن سکا تو اس کے بازو پر دانت گاڑ دیے، ایک دم سے گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اس سے جدا ہوئی اور بھاگ جانا چاہا لیکن شکاری اناڑی نہیں تھا۔ اس نے ایک ہی جست میں یوں دبوچا کہ ایک ہاتھ اس کے لبوں پر تھا۔ زریں کو لگا اس کی سانسیں گھٹ رہی ہیں، پھر وہ اسے اٹھا کر گھر سے باہر لے آیا۔ باہر اس کی جیپ اور ڈرائیور موجود تھا۔ زریں کو جیپ میں ڈالا اور ڈرائیور کو کوئی پتا بتا کر چلنے کو کہا۔ سارا راستہ وہ اسی طرح اس کا منہ بند کیے بیٹھا رہا۔ وہ تو جب اس درختوں والے جھنڈ میں واقع عمارت تک پہنچی تھی تو صدیوں کا سفر کر آئی تھی۔ اتنی نڈھال تھی کہ پیروں پر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ آنکھیں پھٹی پھٹی اور چہرہ زرد تھا۔

داور نے اسے ایک فرنشڈ بیڈ روم میں لا کر بٹھا دیا اور کچھ بھی کہے بغیر پلٹ گیا تھا۔ دروازہ لاک ہونے کی آواز پر وہ چونکی۔ شاید باہر اب قدموں کی آواز بھی قدم توڑ گئی تھی۔ یہ ویرانہ اجنبی گھر یہاں تک لانے والا ناقابلِ بھروسہ لیکن وہ صرف ثاقب کو سوچ رہی تھی۔ ''گھر پر کوئی نہیں، یہ موسم اسے وحشت زدہ کر دیتا ہے اس نے پہلے مجھے پکارا ہوگا پھر وہ میری تلاش میں باہر آیا ہوگا۔ میں کہیں نہیں ملی ہوں گی۔ کیا حال ہوا ہوگا اس کا۔'' وہ رونے لگی اور آنکھوں سے اس منظر کو دیکھنے لگی۔ ''کیا داور مجھے ہمیشہ کے لیے ثاقب سے دور کر دے گا۔ میں واپس ثاقب کے پاس کبھی نہیں جا سکوں گی۔'' اب وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

دو گھنٹے کے بعد بارش تھم گئی ہاں روشن دان کے شیشوں سے چمکتی بجلی کی روشنی اب بھی کمرے میں آ رہی تھی۔ بارش رکتے ہی جنگل جاگ اٹھا تھا۔ بڑے قریب سے اسے گیدڑوں کی ہاؤ ہو سنائی دے رہی تھی، ان کے ساتھ جنگلی کتوں کی آوازیں لیکن کچھ بھی اسے خوف زدہ نہیں کر رہا تھا۔ اس پر ایک ہی سوچ سوار تھی۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے یہاں سے بھاگنا ہے۔ ثاقب تو بہت پریشان ہو رہا ہوگا۔

✿✿✿✿

صبح ہونے کے قریب تھی۔ آسمان پر بادل چھٹ گئے تھے اور اب سورج طلوع ہونے سے پہلے کی سرخی چھا رہی تھی۔ وہ اس قدر الجھی ہوئی اور تھکن سے چور تھی کہ دروازے کا لاک کھلنے کی آواز بھی نہیں سن سکی یہاں تک کہ وہ سامنے آ کھڑا ہوا تھا ''تم ساری رات فرش پر بیٹھی رہی ہو، اوہ زریں! تم مجھے اتنی تکلیف کیوں دیتی ہو۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو لگا اس کا جسم فالج زدہ ہے، وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی۔

''زریں ڈرو نہیں۔ میں تمہارا اپنا ہوں۔ تمہاری محبت ہی میری اولین تمنا ہے زریں! خدا کے لیے اس سچائی پر یقین کرو، میری بات کو سمجھو۔''

''صاحب! مجھے گھر جانا ہے، رحم کرو مجھ پر۔ وہاں ثاقب میرے لیے پریشان ہو رہا ہوگا۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔''

اپنی بات کے جواب میں ایسا جواب وہ بدمزا ہوا۔

''تمہاری سوئی ثاقب پر ہی کیوں اٹکی ہوئی ہے۔ تم کتنی ناسمجھ ہو زریں! کیا تم نے کبھی یہ نہیں سوچا ثاقب کے ساتھ تمہاری زندگی کیسی ہوگی؟''

''وہ میرے شوہر ہیں صاحب! اور تم جیسے دلوں سے کھیلنے والے کیا جانو کہ محبت کیا ہوتی ہے۔''

''یہ تم مجھے کہہ رہی ہو، میں جو تمہاری چاہت میں اس حد تک آ گیا ہوں۔ یقین کرو میں ایسے کسی ارادے سے تو نہیں گیا تھا لیکن میرے جنون نے مجھ سے یہ سب کروا لیا ہے۔''

''حالانکہ تم جانتے تھے کہ میں کسی کی بیوی، کسی گھر کی عزت ہوں، محبت پا لینے کا ہی نام تو نہیں ہے۔ محبت تو محبوب کی خوشی چاہتی ہے۔ تم کہتے ہو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچو اور پھر محبت کا دعوا بھی کرتے ہو۔ ارے وہ پیار ہی کیا جو قربانی نہ دے سکے۔ مجھے ثاقب کے لیے جان بھی دینا پڑی تو میں دے دوں گی اور تم دعوا کرتے ہو محبت کا۔ ہونہہ! ہوس کے پجاری۔''

کیسی نفرت ٹپک رہی تھی اس کی آنکھوں سے۔ اس سے ایسا الزام برداشت نہ ہو سکا۔

''چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔''

داور کے چہرے سے اچانک ہی ہر احساس مٹ گیا تھا۔ سارے جذبوں کے رنگ نچڑ گئے تھے اور اس کی آواز کسی کنویں سے ابھری تھی لیکن زریں نے ان میں سے کسی بات پر بھی غور نہیں کیا، دوپٹا ٹھیک سے سر پر جمایا اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جہاں سے شہر شروع ہوتا ہے وہاں اتار دوں تو گھر تک چلی جاؤ گی نا؟''

وہ روڈ پر نظریں جمائے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں میں چلی جاؤں گی۔''

''میں خود چھوڑ آتا لیکن تمہاری ازدواجی زندگی کے لیے یہ سب اچھا نہیں ہوگا۔''

وہ اب بھی اس کی جانب دیکھنے سے گریزاں تھا۔ شہر کے آثار شروع ہو گئے، داور نے ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب گاڑی روک دی۔ خود ہی اتر کر ٹیکسی ہائر کی پھر اس کے پاس آ کر دروازہ کھولا اور بولا۔

''کرایہ میں نے دے دیا ہے۔ تم گھر جاؤ اور سنو۔ کبھی میرے لیے ہوس کے پجاری جیسا لفظ استعمال مت کرنا۔ میں تمہیں کھو رہا ہوں مگر تمہاری محبت میرے دل میں شاد و آباد رہے گی۔ تم نے کہا ہے نا محبت صرف پا لینے کا نام نہیں اور تم نے چیلنج بھی کیا ہے کہ میں محبت کے آداب سے واقف ہی نہیں ہوں تو زریں! جب بھی آزماؤ گی۔ آزمائش میں پورا اتروں گا آج سے جاگیردار مر گیا ہے اور مجنوں زندہ ہو گیا ہے۔ زریں! میں نے تمہیں وہ لوٹا دیا ہے جو تمہاری خوشی ہے اور میں اب تمام عمر کانٹوں پر رقص کروں گا۔''

اس نے اتنا کہہ کر گاڑی آگے بڑھا دی تھی اور زریں ٹیکسی میں آ بیٹھی۔

وہ داور کی کہی باتوں کو نہیں آنے والے وقت کو سوچ رہی تھی کیا جواب دوں گی، میں کہ میں نے

رات کہاں گزاری ہے۔ خوف ایک بار پھر پوری شدت سے اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا اور اچھے خاصے سرد موسم میں بھی اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور جب منزل آ گئی تو گویا جسم سے جان ہی نکل گئی وہ بڑی مشکل سے دروازے تک پہنچی تھی۔ اور خود کو گھسیٹتی ہوئی اندر تک آئی تھی۔

''زریں آ گئی ہے۔'' کسی کی آواز اس نے سنی تھی۔

''آ گئی ہے ہاں ہاں آنا تو یہیں تھا۔ گند سمیٹنے کو ہم بے وقوف ہی تو رہ گئے ہیں۔ اسے کہیے ابا اپنے میکے دفع ہو جائے ہمیشہ کے لیے۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔'' ثمین چلا رہی تھی، یقیناً ثاقب نے رات کو ہی ان لوگوں کو اطلاع کر دی ہوگی اس نے نگاہ اٹھا کر ان سب اجنبی چہروں میں ثاقب کا چہرہ تلاشنا چاہ اور وہاں پر بھی اسے ویسی ہی نفرت اور بے اعتنائی دکھائی دی جو باقی سب کے چہروں پر تھی۔

''کہاں گئی تھیں تم بولتی کیوں نہیں۔'' اس کی ساس نے شانوں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑا۔

''یہ کہیں بھی گئی ہو ہمیں اس سے مطلب نہیں ہے۔ بلائیں اس کے گھر والوں کو جو رات سے اس کی تلاشی کا ڈرامہ کر رہے ہیں۔'' ثمین پھر پھنکاری تھی۔

''بڑی نیک سعادت مند بہو اور بیوی سمجھنے لگے تھے آپ لوگ اسے، میں تو پہلے ہی سمجھ رہی تھی۔ ثاقب جیسے بے وقوف کے ساتھ کون عورت خوش رہ سکتی ہے۔ اصل بات ہی کچھ اور تھی۔ ثاقب کو اس نے جھانسہ دیا ہے۔ اس پردے کی آڑ میں یہ کچھ اور ہی کھیل، کھیل رہی تھی۔ دیکھ لیجیے کل آپ لوگ گھر سے نکلے۔ اس نے بھی موقع غنیمت جانا۔ وہ تو میرا خیال ہے موسم کی خرابی کی وجہ سے اسے پوری رات کے لیے رکنا پڑ گیا ورنہ یہ جلد آ جاتی اور ثاقب جیسے عقل کے اندھے سے تو کوئی بھی بہانا کرنا مشکل ہے ہی نہیں۔''

اس کے فریاد کرنے پر انیقہ اور ثمین اسے گھسیٹ کر یہاں سے لے گئیں۔ اسٹور میں دھکا دے کر ثمین بولی۔

''ہمیں اب تم سے کوئی مطلب نہیں کوئی صفائی مت دینا۔ ابھی تمہارے گھر والے آتے ہیں تو نکل جاؤ ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے۔''

''میری بات تو سنیں، خدا کے لیے سنیں۔'' لیکن دروازہ بند کر دیا گیا۔ ہاں اس نے ثمین کو یہ کہتے سنا۔

''اگر بے گناہ بھی تھیں تو ایک رات اس طرح گھر سے باہر گزارنے کے بعد، اب تم ہمارے باعزت گھرانے کے قابل نہیں رہیں اپنی منحوس صورت لے جاؤ یہاں سے۔''

کچھ دیر بعد جب کمرے کا دروازہ کھولا گیا تو اب اس کے سامنے اپنے والدین کی سُتی ہوئی صورتیں تھیں۔

''اف میرے ربا! یہ کس گناہ کی سزا ہے میرے لیے۔ میں کیسے ان کا سامنا کروں۔ میں کیسے انہیں یقین دلاؤں۔ میں بے گناہ ہوں، میں باعصمت ہوں۔''

وہ مارے شرمندگی اور خوف کے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی، اب ماں بھی نفرت کا اظہار کرے گی، باپ تو شاید ہمیشہ کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کرنے کا اعلان کر دے گا۔ لیکن

اس کی سوچ کے برعکس ان دونوں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا تھا۔ حالانکہ وہ خود صدیوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے۔

بڑے کمرے تک وہ اسے لائے تھے پھر اس نے اپنے باپ کی آواز سنی تھی۔ ''مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسہ ہے، وہ معصوم ہے، وہ کردار کی خراب ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا، وہ آپ لوگوں کے گھر میں پیش آیا۔ ایسا کرنے والا یقیناً آپ لوگوں کے دشمنوں میں سے تھا لیکن آپ لوگ بزدل ہیں۔ اصل مجرم کی تلاش کی کوشش ہی نہیں کر رہے، سارا الزام کمزور لڑکی پر دھر دیا ہے تو ٹھیک ہے میں اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں، جب عقل ٹھکانے آ جائے تو میری بات پر غور کر لینا۔''

''ہاں ہاں۔ گندی پوٹ تم جیسے لوگ ہی اپنے گھروں میں رکھ سکتے ہیں۔ ہم باعزت لوگ ہیں چار لوگوں میں نام ہے ہمارا۔''

ثمین پھر چلائی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ بھی چلا اٹھے اور ساری حقیقت اس کے منہ پر دے مارے

''لیکن کیا کوئی یقین کرے گا نہیں کبھی نہیں۔ سب اسے ثمین کے خلاف میری سازش قرار دیں گے۔''

✡✡✡✡

''کیا بات ہے آج کل میکے کے بہت چکر لگ رہے ہیں۔''

داور کو معلوم تھا ثمین وہاں جا کر زریں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے، اسی لیے اسے ٹوک رہا تھا، حالانکہ آج کل تو وہ خود بھی اپنے آپ میں نہیں تھا، جس تصور سے اس نے محبت کی تھی، جسے پانا ہی زندگی کی آرزو تھی، اسے اپنے ہاتھوں کھو کر وہ بے حد بے چین تھا رات کو گھر نہیں آتا تھا۔ اور دن میں چند گھنٹوں کے لیے ہی اس کی وحشت زدہ صورت دکھائی دیتی تھی۔

''یہاں رہو تو کس کے لیے آپ کو تو میں نظر ہی نہیں آتی۔'' ثمین پھٹ پڑی تھی۔

''تم نظر آنے والی شے ہی نہیں ہو بیگم صاحبہ! تو میں کیا کروں۔'' س نے عجیب بے چارگی سے کہہ کر اسے آگ لگا دی تھی۔

''اپنی نظر کا علاج کروائیں۔''

''میری نظر بالکل ٹھیک ہے۔ بس اس میں بسا کوئی اور ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' اب ثمین کے انداز میں پہلے والا غصہ اور کاٹ نہیں تھی۔ ایک جملے نے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔

''تسلی رکھو، وہ میری دسترس میں ہے ہی نہیں۔''

''توبہ، ہر وقت کے ڈائیلاگ ادھر ہمارے گھر میں پریشانیاں ہی پریشانیاں رہی ہیں۔ میرے لیے وہ سب پریشانیاں کیا کم ہیں جو آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے ہیں۔''

''کیوں کیا ہوا ہے تمہارے گھر کو؟'' اس کے لیے تو صورت حال جاننا ضروری تھا۔ اب تک تو کھو دینے کے احساس نے پاگل بنائے رکھا لیکن ثمین کی بات نے جیسے اسے چونکا دیا تھا۔

وہ نیچ خاندان کی بے کردار لڑکی کب سے ہمیں بے وقوف بنا رہی تھی۔ اب پکڑی گئی ہے۔ اپنی طرف سے تو بڑی چالاکی کی تھی، اس کے گھر والے میری طرف آئے ہوئے تھے۔ پیچھے گھر میں وہ اور

ثاقب تھے۔ ثاقب بے چارے کی حیثیت ہی کیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گئی گھر سے، پوری رات باہر گزاری ہے اس نے، پتا نہیں کہاں منہ کالا کیا ہے اور دیدہ دلیری دیکھیں صبح پھر ہمارے دروازے پر موجود تھی۔ ثاقب پر ہم دباؤ ڈال رہے ہیں طلاق دے دے اس کو، لیکن وہ احمق تیار نہیں ہو رہا۔ بہت روتا ہے اس کمینی کے لیے، بیمار کر ڈالا ہے خود کو لیکن یہ تو طے ہے وہ اب اس گھر میں نہیں گھس سکتی۔''

وہ بول رہی تھی اور داور کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

''میری وجہ سے، صرف میری وجہ سے وہ اجلی پیشانی داغ دار ہوئی ہے۔ اس کے دامن پر دھبا لگا ہے۔ میں تو اسے خوش دیکھنے کی خاطر اپنا دل خنجر میں پرو چکا تھا، لیکن میں یہ بھول گیا تھا۔ دنیا بہت ظالم ہے۔ وہ اس ایک رات کا پورا پورا حساب لے گی۔''

وہ تیزی سے کمرے سے نکلا۔ ثمین نے اس کی عجلت کو دیکھا ضرور لیکن زیادہ حیران نہیں ہوئی۔ وہ اکثر ہی اس کے پاس موجود ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور پر غائب ہو جاتا اور کبھی تو بے چین ہو کر کمرے سے ہی نکل جایا کرتا تھا۔

داور کچھ دیر سخت پریشانی اور غصے کے عالم میں لان میں ٹہلتا رہا تھا پہلے تو یہ جی میں آئی ثمین کو ہمیشہ کی نیند سلا دے یہی فساد کی جڑ ہے اسی نے زریں کی زندگی عذاب کر رکھی ہے لیکن نہیں جو داغ اس پر لگا ہے جو الزام اس پر دھرا گیا ہے وہ تو جوں کا توں رہ جائے گا۔

اب اس نے دوبارہ سوچا، پھر ڈرائیور کو بلایا اور اسے کچھ سمجھانے لگا۔ اسے ایسا کرتے ہوئے صرف دو تین منٹ لگے، اس کے بعد اس نے کوئی نمبر ملایا اور کہیں دوسری جگہ بات کرنے لگا۔ اب وہ پہلے کی طرح مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ ثمین تیار ہو کر نکلی گاڑی میں بیٹھی۔ اس نے لائبریری کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھا اور پھر کسی کا نمبر ملانے لگا۔ ثمین کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ فی الحال اسے کہیں نہیں جانا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد اس نے والدہ کے ساتھ بیٹھ کر لنچ کیا پھر ثمین کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ فون انیقہ نے اٹینڈ کیا۔ اس کی آواز سن کر مسرت کا اظہار کرنے لگیں۔

''آپ ثمین کو بلا دیں۔ ضروری بات کرنا ہے۔''

''ثمین تو ادھر نہیں آئی بیٹا!''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تین گھنٹے پہلے وہ ڈرائیور کے ساتھ آپ لوگوں کے ہاں جانے کا کہہ کر نکلی تھی، میں نے ٹرائی کیا ہے اس کا موبائل بند ہے اور گاڑی بھی ابھی تک واپس گھر نہیں آئی۔''

یہ سن کر انیقہ کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی، وہ گھبرا کر رشید صاحب کو آوازیں دینے لگیں۔

''کہاں جا سکتی ہے، ہو سکتا ہے کچھ ضروری شاپنگ یاد آ گئی ہو اور شاپنگ میں اتنا وقت تو لگ جاتا ہے۔''

رشید صاحب نے ایک لمحے کے لیے بھی منفی انداز میں نہیں سوچا۔

''چلیں دیکھ لیں۔ جیسے ہی وہ گھر آئے مجھے اطلاع کر دیں۔''

پھر آدھا گھنٹہ ٹی وی دیکھنے کے بعد، اس نے پھر ان کے ہاں فون کر کے یہ اطلاع دی۔

''یہاں سے کچھ دور جا کر ثمین نے گاڑی ایک سپر اسٹور کے قریب رکوائی تھی اور ڈرائیور کو ایک لسٹ دے کر کچھ چیزیں لانے کو کہا تھا۔ وہ کہتا ہے مجھے بہ مشکل آدھا گھنٹہ ہی لگا اور جب میں واپس آیا تو بیگم صاحبہ گاڑی میں نہیں تھیں۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وہ واپس آ جائیں گی لیکن یہ انتظار بے سود رہا۔''

''ہائے میرے اللہ خیر رکھنا، داور بیٹا! تم جا کر پتا تو کرونا۔'' انیقہ نے دل تھام لیا۔

''ڈرائیور کہتا ہے میں نے کچھ لوگوں سے پوچھا تھا۔ پتا چلا کہ وہ خود ہی ایک سفید رنگ کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں چلی گئی ہیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے تم خود پتا کرو۔''

''کیا پتا کروں؟ عجیب بات کرتی ہیں آپ۔ لوگوں سے یہ پوچھتا پھروں کہ میری بیوی ڈرائیور کو منظر سے ہٹا کر کس کے ساتھ فرار ہوئی ہے۔''

''دا۔۔۔ داور خدا کے لیے میری پاک باز معصوم بیٹی پر ایسا الزام مت دھرو ہم آ رہے ہیں تمہاری طرف۔''

''براہ مہربانی ایسی حماقت مت کیجیے گا۔ میری ماں کا دل بڑا کمزور ہے۔ ایسی خبر سن کر اگر انہیں کچھ ہوا تو میں کسی کو بخشوں گا نہیں۔''

پھر وہ خود ثمین کے میکے پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ اتنا تنا ہوا تھا کہ وہ سب شدید پریشانی میں ہونے کے باوجود ڈر گئے تھے اور اس سے کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔

''اب پورے آٹھ گھنٹے ہو چکے ہیں۔'' اس نے جتلایا۔

''وہ ایسی نہیں ہے اس کے ساتھ یقیناً کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ تم پولیس میں اطلاع کیوں نہیں کرتے۔'' انیقہ سسکنے لگی۔

''کیا دھندا کرتے ہیں آپ، پہلے بہو غائب ہوئی اب بیٹی۔ یقیناً یہ سب آپ کی کسی ذاتی دشمنی کا نتیجہ ہے۔'' وہ سسر سے کہہ رہا تھا۔

''ہماری کسی سے کیا دشمنی ہوگی بیٹا! بس قسمت ہی خراب ہے۔''

''بہو کہاں ہے آپ کی، اسے بلائیے تاکہ کچھ پوچھ سکوں شاید کوئی سراغ مل جائے۔''

''وہ۔۔۔ وہ تو میکے گئی ہے۔ میں ابھی فون کر کے بلوا لیتی ہوں۔'' انیقہ ایک جوش سے اٹھیں یقیناً داور کی بات میں وزن تھا اور پھر سب نے دیکھا انیقہ اس کے والد سے بات کر رہی تھیں، اسے واپس لے کر آنے کو کہہ رہی تھیں۔

''آ رہی ہے اپنے باپ کے ساتھ، راستہ کچھ لمبا ہے تقریباً گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں یہیں بیٹھتا ہوں۔''

''میں نہ کہتا تھا زریں بے گناہ ہے۔ وہ قصوروار ہو ہی نہیں سکتی۔'' اس نے ثاقب کی آواز سنی تو اس کے چہرے کی جانب دیکھا جہاں اس کے آنے کی خبر نے سرخی سی دوڑا دی تھی۔

''کتنا خوش نصیب ہے یہ شخص۔'' داور نے آنکھیں موند کر سر صوفے کی بیک سے ٹکا دیا۔ اور پھر

زریں اس کے سامنے تھی۔ اپنے والد کے ساتھ آئی تھی۔ دونوں ہی کسی مجرم کی مانند سر جھکائے خاموش کھڑے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ داور اٹھ کر اس کے والد صاحب سے ملا اور بولا۔

''ثمین غائب ہوگئی ہے یہ لوگ فکر مند ہیں حالانکہ مجھے تو پورا یقین ہے وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔''

اس خبر کو زریں کے والد نے تو حیرت سے سنا، جبکہ زریں نے داور کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

''پہلے یہ لوگ کہتے تھے زریں اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ بھاگی ہے، اب کہتے ہیں زریں کو بلوا کر اس سے اغوا کرنے والے کا پتا پوچھتے ہیں۔ شاید ثمین کا سراغ مل جائے تو گویا ان دونوں کا عاشق ایک ہی ہے۔''

ان باپ بیٹی کے آتے ہی داور کا لہجہ اور لفظ کتنے سفاک ہو گئے تھے۔

انیقہ تو یہ سوچ کر بیٹھی تھیں۔ اس کے باپ کو فوراً چلتا کروں گی اور زریں سے قسم لوں گی۔ وہ اس بات کا ہمیشہ پردہ رکھے گی لیکن داور تو ان کے سامنے ہی وار پر وار کرتا جا رہا تھا۔

''ثاقب! میں آ گئی ہوں۔'' زریں کو مطلب تھا تو صرف ثاقب سے، وہ دیکھنا چاہتی تھی ثاقب اس سے خفا تو نہیں ہے، اسی بے چینی میں سب کو نظرانداز کر کے اس کی جانب لپکی تھی۔

''زریں! تم کتنی کمزور ہو رہی ہو؟'' یہ ثاقب کی آواز تھی۔ داور نے رخ موڑ لیا اور بولا۔

''میں چلتا ہوں۔ کوئی خبر آئے گی تو اطلاع کر دیجیے گا۔'' پھر وہ رکا نہیں۔

اور رات جیسے آنکھوں میں کٹ گئی۔ اتنی سردی میں بھی رشید صاحب، عاقب اور ثاقب جا کر گلی میں کھڑے ہو کر انتظار کرتے رہے، شاید کوئی گاڑی اسے بھی چھوڑ جائے گی۔ داور نے پولیس میں رپورٹ کروانے سے منع کیا تھا اور رشید صاحب خود بھی رپورٹ کروانے کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے۔

رات گزر گئی پھر دن بھی گزر گیا۔ انیقہ کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ بستر سنبھال لیا۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ جب ثمین گلی کے موڑ سے دکھائی تھی عاقب ''ثمین باجی آ گئیں۔'' کا نعرہ لگا کر اس کی جانب لپکا تھا۔ وہ اسی کے سہارے گھر میں آئی تھی۔ ستا ہوا چہرہ، تھکا ہوا جسم اور زریں کو یہاں دیکھ کر وہ لرز گئی۔

آج ہر چہرہ ہی سوال اس سے کر رہا تھا جو کل تک زریں کے لیے تھا۔ پتا نہیں کس نے داور کو بھی اطلاع کر دی اور ذلت کا سفر تو اب شروع ہوا۔ ثمین کو آج پتا چلا، بے گناہ ہوتے ہوئے جب گناہ گار ٹھہرایا جاتا ہے تو دل پر کیا گزرتی ہے۔ اپنے ہی جب بے اعتبار ہو جائیں تو زندگی کتنی مشکل لگنے لگتی ہے۔

داور نے اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ فیصلہ سنا کر وہ رکا نہیں اور اس کے پیچھے لپکنے کی جرأت صرف زریں کر سکی۔

''کیوں اتنی کڑی سزا دیتے ہو اسے، ساتھ لے جاؤ پلیز۔''

''کم از کم اتنے دن تو وہ ضرور یہاں رہے گی جتنے روز تم میکے میں رہی ہو، میں مطمئن تو ہوں اب تم

پر یہ لوگ انگلی نہیں اٹھا سکیں گے، لیکن پھر بھی اگر یہ ایسا کریں تو مجھے ضرور بتا دینا۔''
پھر وہ پیاسی نگاہ میں اسے سمو کر بولا تھا۔
''میں تمہاری محبت نہ سہی لیکن تم میرا عشق ضرور ہو اور دیکھو، میں اس آزمائش میں پورا اترا ہوں نا، میں نے تمہیں اسے سونپ دیا ہے جو تمہاری محبت تھا۔ تمہاری خوشی کے لیے۔ تم زندگی کے ہر موڑ پر مجھے پکار سکتی ہو، میں تمہارے لیے زندگی کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔''
''داور!'' آج وہ اس کے لیے رو پڑی تھی۔

✡✡✡✡

پھر اسی رات داور کو دل کا دورہ پڑا تھا اور زریں نے سجدے میں گر کر رو رو کر اللہ سے اس کی زندگی کی دعائیں مانگی تھیں۔ وہ موت کی دہلیز کو چھو کر پلٹ آیا تھا، تب زریں نے ساری رات شکرانے کے نفل پڑھتے گزار دی تھی۔
ثمین کو حسنہ گھر لے گئی تھی کہ وہ تو اس سارے واقعے سے ہی بے خبر تھیں۔
آنے والے سالوں میں داور نے کبھی ثمین کے میکے کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا، ہاں ثمین آجاتی ہے۔ اسے ثاقب کے بچوں کی کشش ادھر آنے پر مجبور کرتی ہے کہ داور نے اسے یہ خوشی نہیں دی، ثمین اب بہت بدل گئی ہے۔ زریں سے اس کا رویہ ماضی کے رویّے سے بالکل مختلف ہے کہ غرور کی پٹی آنکھوں سے اتار کر جب ایک عورت بن کر دیکھا ہے۔ سوچا ہے تو معاملے کا سرا اس کے ہاتھ میں آ گیا لیکن داور چپ ہے زریں چپ ہے تو پھر وہ کیوں بولے۔
ہاں اس نے زریں کو داور کے نام پر چونکتے ضرور محسوس کیا۔
اور زریں جو ایک وفا شعار بیوی ہے محبت کرنے والی ماں ہے۔ جب ثمین کی زبانی یہ سنتی ہے۔
''وہ بہت تنہائی پسند ہو گیا ہے اور کبھی کبھی ساری رات جاگ کر گزار دیتا ہے۔'' تو جی چاہتا ہے اس کے پاس جائے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اعتراف کرے۔
''ثاقب میرا شوہر ہے لیکن مجھے تمہاری محبت پر بھی فخر ہے اور۔۔۔ اور یہ کہ میں تمہیں سوچتی ہوں داور! جب میں اللہ کے حضور سجدہ کرتی ہوں تو سب سے پہلے دعا میں تمہارا نام آتا ہے۔'' لیکن وہ کیسے بتائے، وہ کیسے کہے۔ ''اب مجھے داور سے محبت ہے۔'' پھر وہ وفا شعار بیوی اور محبت کرنے والی ماں کے ٹائٹل سے محروم ہو جائے گی بس چپ ہی رہنا ہے اہلِ دل کے لیے یہی دستور ہے۔

✡✡✡✡